مومن

حالاتِ زندگی

اور

ان کے کلام پر تنقیدی نظر

از

کلب علی خاں، فائقؔ رامپوری

مجلسِ ترقیِ ادب ۲۔ نرسنگھ داس گارڈن کلب روڈ۔ لاہور

ناشر

سید امتیاز علی تاج ستارۂ امتیاز

ناظم

مجلس ترقیٔ ادب ، لاہور

مطبوعہ

ریڈنگ پرنٹنگ پریس ، اردو بازار ، لاہور

زیر اہتمام

نذر محمد آپل

بار اول ، تعداد ۱۰۰۰

قیمت : پانچ روپے آٹھ آنے

۱۹۶۱ء

فہرس

چوتھا باب

پانچواں باب

چھٹا باب

حرف اول

سیاسی حالات

عالمگیر کی وفات سے مغلیہ خاندان کی بنیادیں ہل گئیں ، مرہٹوں کی طاقت ختم نہ ہونا تھی نہ ہوئی، راجپوتوں کے بھی حوصلے بلند ہوگئے، سکھ جو قابل اعتنا نہ تھے، انھوں نے پنجاب میں قیامت صغریٰ برپا کر دی ، محمد معظم اپنے بھائیوں محمد اعظم اور کام بخش کو ختم کر کے خانگی نزاع سے مطمئن ہو گیا لیکن راجپوتوں اور مرہٹوں کا بندوبست نہ کر سکا، راجپوتوں سے صلح کو فتح عظیم سمجھ کر وہ پنجاب کی طرف متوجہ ہوا (ربیع الاول ۱۱۲۱ھ) ، سکھوں کو وقتی طور پر شکست ہوئی مگر امرا کی آرام طلبی سے کسی نئے ملک کی تسخیر کی امید نہیں کی جا سکتی بلکہ اسی عہد میں طوائف الملوکی کے آثار نمایاں ہو گئے ۔ دکن اور شمالی ہند میں بعض سر کش افراد اپنے جوہر ذاتی سے ملک کے کچھ حصے پر اپنا قبضہ جما بیٹھے ، محمد معظم جو بہادر شاہ کہلایا تھا ، محرم ۱۱۲۴ھ میں دنیا سے رخصت ہوا اور جہاندار شاہ اپنے بھائیوں کے مقابلے میں کامیاب ہو کے وارث تخت و تاج ہوا لیکن دس ماہ بعد اس نے تخت کے ساتھ جان بھی دی ۔ امرا کی نوازش سے اب تاج حکومت فرخ سیر کے سر پر آگیا لیکن جب شاہی خاندانوں میں سے جرأت اور مردانگی رخصت ہو جائے تو انھیں حکومت امرا بخشتے ہیں ، وہ خود قوت بازو سے حاصل نہیں کر سکتے ، عبداللہ خاں اور حسین علی خاں حکومت پر چھا گئے ، فرخ شاہ کی حیثیت شاہ شطرنج کی رہ گئی ۔ اس اقتدار کو مٹانے کی کوشش میں فرخ سیر نے ۹ جمادی الثانی ۱۱۳۱ھ کو جان دی ، مرزا بیدل نے اس موقع پر

کیا خوب کہا ، مصرع : سادات بوے نمک حرامی کردند ۔ اس کے بعد پانچ مہینے کے عرصے (۸ جمادی الثانی ۱۱۳۱ھ تا ۵ ذی قعدہ ۱۱۳۱ھ) میں رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ دو بادشاہ تخت پر بٹھائے گئے اور دونوں دنیا کو جلدی خیر باد کہ گئے ۔ اب قرعۂ فال روشن اختر کے نام پڑا جو بادشاہ ہو کر محمد شاہ کہلایا، عبداللہ خاں قطب الملک اور حسین علی خاں سید برادران کی خود رائی حد کو پہنچ گئی ، ایرانی اور تورانی پارٹیاں جو مغلیہ حکومت کے استحکام کا باعث تھیں، ان کو نظر انداز کر دیا گیا تھا ۔ جب محمد شاہ نے اپنی بے بسی کا اظہار کیا تو دونوں پارٹیوں نے حمایت کا وعدہ کیا اور آخر حسین علی خاں کو قتل (۶ ذی حجہ ۱۱۳۲ھ) کر کے قطب الملک کو اکیلا چھوڑ دیا ، قطب الملک نے محمد شاہ کو تخت سلطنت سے اتارنے کی کوشش کی لیکن گرفتار ہوا (۱۴ محرم ۱۱۳۳ھ) ۔ اب محمد شاہ کو آزادی نصیب ہوئی ، اقتدار تورانی پارٹی کے حصے میں آیا ، محمد امین خاں کچھ مدت وزیر رہ کر چل بسا ، اس کی جگہ نظام الملک کو وزارت پیش کی گئی لیکن ایک طرف امرا جوڑ توڑ میں مصروف تھے، ادھر محمد شاہ کوکی کے اشارے پر چل رہا تھا اور امور سلطنت اس کے مشورے پر طے پاتے؛ چنانچہ یہ شعر اسی کی وضاحت کرتا ہے :—

مرداں نہ کنند خاک بر سر چہ کنند
امروز زنے بجائے عالم گیر است

صمصام الدولہ بھی نظام الملک کے خلاف تھا ، آخر بہانہ کر کے نظام الملک دکن چلا گیا ، محمد شاہ نے مصلحتاً قمر الدین خاں کو وزیر اعظم کر دیا ، وزیر بھی بادشاہ کی طرح عیش پسند بادہ خوار تھا ۔ نظام الملک کے ہمسایہ مرہٹے تھے ، ان سے نظام الملک نے چشم پوشی کی اور انھیں شمالی ہند کی طرف بڑھنے کی ترغیب دی ، راجپوت اور مرہٹے مغل حکومت کی کمزوری سے طاقت پکڑ چکے تھے ، ادھر دھلی کے برابر جاٹ بھی ابھر رہے تھے ، ۹ ذی الحجہ ۱۱۴۹ھ کو مرہٹوں نے

دھلی کو (نواح شہر) لوٹ کر مغل حکومت کی کمزوری کا پردہ چاک کیا ، رھی سہی کسر نادر شاہ نے دو حملے کر کے پوری کر دی ۔ دلّی میں نادر شاہ کا داخلہ شرفا اور اُمرا ، عوام اور خواص کی تباھی کا پیش خیمہ تھا ، معمولی سی افواہ اور جھگڑے پر دلّی کے تیس ہزار باشندے تہ تیغ ھو گئے ، دلّی کے شاھی خزانے پہلے ھی تصرف میں آ چکے تھے ، ۱۵ کروڑ روپیہ بطور تاوان جداگانہ وصول کیا گیا ، اس کے علاوہ تختِ طاؤس جو شاھجہان کی یادگار تھا ، نادر شاہ کے قبضے میں آ گیا ، بے شمار دولت لے کر ایران کو روانہ[1] ھوا ۔ مؤرخ کے قلم نے وہ نقشہ نہیں کھینچا جو ایک شاعر کے شعر سے ظاھر ھوتا ھے ، عوام اور خواص کے دل میں جو درد تھا وہ تاباں نے کتنے پر اثر لہجے میں ادا کیا ھے :

داغ ھے حملۂ نادر سے مرا دل تاباں
نہیں مقدور کہ جا چھین لوں تختِ طاؤس

دلّی کا اقتصادی نظام اس قتل و غارت سے تباہ ھو گیا مگر محمد شاہ کی رنگ رلیوں میں فرق نہ آیا ، صوبے مرکزی حکومت سے آزاد ھو چلے تھے : مہابت جنگ بنگال و بہار وغیرہ میں مختار بنا بیٹھا تھا ، نظام الملک دکن میں ، اودھ کے صوبے میں صفدر جنگ کی حکومت تھی اور فرخ آباد میں بنگش رئیس اور روھیل کھنڈ میں روھیلہ سردار آزاد ریاستوں کی بنیاد ڈال چکے تھے ، دلّی کے برابر سورج مل جاٹ اپنی طاقت بڑھا رھا تھا ، راجپوت بھی مرھٹوں سے کم نہ تھے کہ احمد شاہ ابدالی کا حملہ ھندوستان پر ھوگیا ۔ محمد شاہ کو خبر ملی تو تو وزیر اعظم قمر الدین خاں کو مقابلے کے لیے جانے کا حکم دیا ، وزیر اعظم نے ناکامی کی ذمہ داری سے بچنے کے لیے ولی عہد احمد شاہ کو ساتھ لے جانے کی استدعا کی ، ادھر امرا کو خط لکھے کہ مدد کو آئیں ، روانگی میں اتنی دیر لگائی کہ احمد شاہ نے ۱۱ جنوری ۱۷۴۸ء لاھور فتح کر لیا ، ۱۱ مارچ ۱۷۴۸ء کو وزیر اعظم کی فوج

---

۱ - ۵ مئی ۱۷۳۹ء تاریخ روانگی از دھلی ۔

کا ابدالی فوج سے مقابلہ ہوا، ایک گولہ وزیر کے لگا اور کام تمام ہوا۔ ایشری سنگھ راجہ جے پور فرار ہو گیا، معین الملک پسر وزیر نے موت کی خبر کو چھپایا اور لڑائی جاری رکھی۔ اتفاق سے ابدالی کے ذخیرۂ آلات آتشیں میں آگ لگ گئی اور اس طرح ''فتح خدا ساز'' نصیب ہوئی لیکن محمد شاہ کچھ دن بعد دنیائے فانی کو خیر باد کہ گیا (۲۶ ربیع الآخر ۱۱۶۱ھ)۔ میر کا بیان ہے (ذکر میر صفحہ ۶۸) کہ محمد شاہ کے مرنے کی خبر پانی پت کے قریب ملی، صفدر جنگ نے تخت و تاج (۱۴ اپریل ۱۷۴۸ء) ولی عہد احمد شاہ کو پیش کیا اور ۲ جمادی الاول ۱۱۶۱ھ (۱۹ اپریل ۱۷۴۸ء) کو پانی پت میں رسم تخت نشینی ادا کی۔ احمد شاہ کے عہد میں ارباب کمال کی ناقدری بڑھ گئی، احمد شاہ کی ماں اودھم بائی کے ہاتھ میں سلطنت کا نظام آ گیا، جاوید خاں کے اشارے پر وزیر بھی مقرر اور علاحدہ ہوتے، صفدر جنگ کا اختلاف تورانی پارٹی سے شدید ہوگیا، اس نے دربار میں ایرانی پارٹی غالب رکھی، سادات خاں میر بخشی نے راجپوتوں کے خلاف محاذ قائم کیا اور صفدر جنگ نے روہیلوں اور بنگشوں کے مقابل لیکن دونوں اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہو سکے، صفدر جنگ احمد خاں بنگش سے شکست کھا کر (۲۲ شوال ۱۱۶۳ھ، ۱۳ ستمبر ۱۷۵۰ء) کچھ عرصے بعد آیا تو وزارت خطرے میں پائی، آخر جاوید خاں کو رشوت دے کر وزارت بچائی اور پھر پٹھانوں کو مٹانے چلا، اپنی امداد کے لیے جاٹوں اور مرہٹوں کو بلایا، اس طرح بنگشوں اور روہیلوں کو اس نے شکست دے کر سر اونچا کیا، پٹھانوں نے دامن کوہ میں پناہ لی۔ ادھر شاہ ابدالی کے آنے کی خبر گرم ہوئی، احمد شاہ نے صفدر جنگ کو لکھا کہ فوراً صلح کر کے آئے، صفدر جنگ نے مرہٹوں کے دباؤ سے صلح پٹھانوں سے کر لی اور دلّی پہنچا، اس عرصے میں معین الملک شاہ ابدالی سے تنہا جنگ کرتا رہا، ابدالی کا مطالبہ تھا کہ نادر شاہ کے ساتھ جو عہد ہوا تھا، اس پر عمل کیا جائے، نواب بہادر جاوید خاں نے گھبرا کر لاہور اور ملتان کے صوبے دے کر صلح کر لی، ابدالی اپنی

جانب سے معین الملک کو پنجاب کا گورنر مقرر کر کے چلا لیا ۔ صفدر جنگ ۲۵ اپریل ۱۷۵۲ء کو پچاس ہزار مرہٹہ فوج کے ساتھ جمنا کے کنارے پہنچا ، ابدالی واپس جا چکا تھا ، صفدر جنگ برہم ہوا کہ مرہٹوں کو پچاس لاکھ روپے موعودہ رقم کہاں سے ادا کرے ، مرہٹوں نے دلّی کا نواحی علاقہ لوٹنا شروع کر دیا ، آخر غازی الدین خاں فیروز جنگ نے تحریک کی کہ اگر اسے دکن کا صوبہ دے دیا جائے تو وہ مرہٹوں کو لے جائے گا ، مجبوراً بادشاہ نے یہ مطالبہ مانا اور غازی الدین خاں مرہٹوں کو ساتھ لے کر (جون ۱۷۵۲ء) دلّی سے چلا تو لوگوں کو چین نصیب ہوا ۔ صفدر جنگ نواب بہادر خواجہ سرا کے اقتدار سے تنگ آچکا تھا ، آخر ۲۷ شوال ۱۱۶۵ھ مطابق ۲۷ اگست ۱۷۵۲ء کو دعوت پر بلا کر ختم کر دیا ، صفدر جنگ کی اس حرکت سے بادشاہ ناراض ہو گیا ، نواب بہادر بادشاہ کی ماں اودھم بائی کا بھی منظور نظر تھا ، اودھم بائی نے تورانی امراء کی ہمت افزائی کی ، شہاب الدین ، غازی الدین خاں فیروز جنگ کا سولہ سالہ لڑکا بڑا ذہین اور ہوشیار تھا ، غازی الدین خاں آسے صفدر جنگ کی نگرانی میں دے کر دکن گیا تھا ۔ جب غازی الدین خاں کا ۷ ذی الحجہ ۱۱۶۵ھ کو انتقال ہوا تو شہاب الدین صفدر جنگ کے پاس گیا ، صفدر جنگ نے تسلی اور دلاسا دیا ، شہاب الدین بولا کہ میرے باپ آپ ہیں ، جب آپ زندہ ہیں مجھے کیا غم ، صفدر جنگ نے بادشاہ سے سفارش کر کے غازی الدین خاں کو عماد الملک خطاب دلایا ، عماد الملک صفدر جنگ کے گھر آتا جاتا تھا اور وزیر اعظم کو اس پر پورا اعتمادِ تھا ۔ آہستہ آہستہ تورانی امراء کو اودھم بائی کی حمایت نے منظم کر دیا ، آخر صفدر جنگ اور بادشاہ میں کھلی جنگ چھڑ گئی ، صفدر جنگ نے جاٹوں کو حمایت پر بلایا ، عماد الملک نے صفدر جنگ کو شکست دینے کے لیے شیعہ سنّی ہنگامہ برپا کیا ، ادھر راجپوتوں اور مرہٹوں کو بلایا ، چھ ماہ کی کشمکش کے بعد مصالحت ہوئی اور (محرم ۱۱۶۷ھ مطابق ۷ نومبر ۱۷۵۳ء) کو صفدر جنگ اپنے صوبہ اودھ کی طرف

چلا ، انتظام‌الدولہ وزیر اور عمادالملک مستقل میر بخشی ہو گئے (۱۳ مئی ۱۷۵۳ء) - عمادالملک مرہٹوں کو رقم کہاں سے دیتا اس لیے سورج مل جاٹ سے رقم وصول کرنے کے لیے مرہٹوں کو لے کر گیا ، سورج مل جاٹ قلعہ بند ہو گیا اور لڑائی طویل ہو گئی- عمادالملک نے توپ خانہ لینے عاقبت محمود خاں کشمیری کو دہلی بھیجا ، انتظام‌الدولہ سورج مل کو بچانا چاہتا تھا ، توپ خانہ نہ دیا ، ادھر شاہی خط سورج مل جاٹ کے نام پکڑا گیا ، صفدر جنگ سے بھی مدد چاہی ، عمادالملک کو اس سازش کا پتا ہو گیا ، اس نے سورج مل جاٹ سے صلح کر لی ، احمد شاہ شکار کے بہانے سے سکندرہ میں تھا کہ ملہار راؤ ہلکر نے شاہی کیمپ پر ۲۵ ، ۲۶ مئی ۱۷۵۴ء کی درمیانی رات میں حملہ کیا ، احمد شاہ جان بچا کر نکل گیا ، شاہی مستورات مرہٹوں کے قبضے میں آ گئیں، اب عمادالملک اور مرہٹے دہلی کی طرف بڑھے ، احمد شاہ نے جان بچانے کے لیے عمادالملک کی ہر بات مان لی ، وزارت اس کے قبضے میں آئی ، عمادالملک نے ۱۰ شعبان ۱۱۶۷ھ بروز یک شنبہ (۲ جون ۱۱۵۴ء) کو احمد شاہ کو معزول کر کے اس کی آنکھوں میں سلائی پھیر دی گئی اور عزیزالدین خلف جہاندار شاہ کو عالم گیر ثانی کے لقب سے تخت نشین کیا گیا-

عالم گیر ثانی

اپنے پیش رووں سے مختلف نہ تھا ، شاہانہ اولوالعزمی عالم گیر اول کے بعد ناپید ہو چکی تھی ، ایک نو عمر وزیر کے ہاتھوں میں یہ بوڑھا طوطا وہی کہتا تھا جو عمادالملک کہلواتا لیکن عشرت دوستی میں یہ دوسروں سے کم نہ تھا- فروری ۱۷۵۶ء میں حضرت بیگم دختر محمد شاہ سے (جو سولہ سال کی تھی اور حسین و جمیل تھی) شادی رچانی چاہی تھی لیکن حضرت بیگم نے اس بوڑھے کو دھتکار دیا اور خود کشی کی دھمکی دی ، عماد الملک نے پنجاب سے بیوۂ معین الملک (جو عمادالملک کی ممانی تھی) کو

علاحدہ کر کے آدینہ بیگ کے سپرد کر دیا، احمد شاہ کو اطلاع ملی، اُس نے اکتوبر ۱۸۵۶ء میں پنجاب پر قبضہ کر لیا اور سیدھا دھلی پہنچا۔ نجیب الدولہ نے شاہ ابدالی کی آمد کا خیر مقدم کیا، عمادالملک اپنی ممانی اور شاہ ولی خاں وزیر کی معرفت معذرت خواہ ہوا، وزارت پیشکش کی شرط پر بحال رہی، عمادالملک کے پاس روپیہ کہاں تھا، وہ دوآبہ سے رقم لانے کا وعدہ کر کے ابدالی سردار جان باز خاں کو لے کر مع شاہزادہ ہدایت بخش و مرزا بابر فرخ آباد پہنچا اور یہاں سے ساز و سامان لے کر شجاع الدولہ کو دھمکی دی کہ وہ صفدر جنگ کا سامان مع نذر شاہی پیش کرے، بڑی مشکل سے پانچ لاکھ اُس کے ھاتھ لگے، اِدھر دلّی کو ابدالی کی فوج نے دل کھول کر لُوٹا، شرفا کی عورتوں نے خود کشی کر لی، متھرا کو بُری طرح لُوٹا گیا اور قتل عام ہوا، جمنا کا پانی متعفن ہو گیا۔ جب ابدالی کی فوج میں ہیضہ پھوٹ پڑا تو مجبوراً واپسی کی ٹھہرائی، چلتے چلتے اُس نے حضرت بیگم دختر محمد شاہ سے اپنی شادی کی اور اپنے بیٹے تیمور شاہ کی عالم گیر ثانی کی لڑکی سے، عالم گیر ثانی کی سفارش پر نجیب الدولہ کو امیرالامرا مقرر کیا اور واپسی کے وقت دوبارہ دلّی کو لُوٹ کر چلتا بنا، لوٹ کے مال کا اندازہ نو کروڑ سے بارہ کروڑ روپے تک کیا گیا ھے۔

عمادالملک اس وقت فرخ آباد میں تھا، اُس نے احمد خاں بنگش کو امیرالامرائی کا اُمیدوار کیا اور مرہٹوں کو دعوت دی، مرہٹے (رگھو ناتھ راؤ) آ گئے، دلّی کا محاصرہ ہو گیا، غلہ گراں بکنے لگا، غرض ایک ماہ کے بعد نجیب الدولہ کو بمصالحت دھلی سے نکالا (۳ ستمبر ۱۷۵۷ء)، نجیب الدولہ اپنے علاقے کو گیا، مرہٹے ملک کے ہر حصے میں چھا گئے تھے، عمادالملک نے دلّی کو بچانے کے لیے مرہٹوں کو نجیب الدولہ کی طرف متوجہ کر دیا، مرہٹوں نے پنجاب سے تیمور شاہ پسر احمد شاہ ابدالی کو نکال دیا، شاہزادہ عالی گوھر اپنی جان بچائے بھرتا تھا، آخر نجیب الدولہ کے مشورے سے بنگال کی طرف چلا، شجاع الدولہ نے ہمت افزائی کی، مرہٹوں کی تاخت و تاراج سے

خواص و عوام تنگ تھے ، نجیب الدولہ نے شاہ ابدالی کو مدد کے لیے طلب کیا جو مرہٹوں کے محاصرے میں تھا ، ابدالی افغانستان کے مسائل سے فارغ ہو کر برصغیر پاک و ہند کی طرف متوجہ ہوا ، مرہٹے مقابلے سے فرار ہونے لگے اور نجیب الدولہ سے مرہٹے صلح کر کے اپنی فکر میں لگ گئے ، عالم گیر ثانی بھی عمادالملک سے تنگ آ چکا تھا ، اُس نے بھی شاہ ابدالی کو خط لکھا کہ عماد الملک سے بچائے ، یہ خط عماد الملک کے ہاتھ پڑ گیا اور اُس کے قتل کا باعث بنا - عماد الملک نے جب شاہ ابدالی کے آنے کی خبر سنی تو ۸ ربیع الثانی ۱۱۷۳ھ کو عالم گیر ثانی کو دھوکے سے قتل کرا دیا اور محی الملت کو شاہجہان ثانی کا لقب دے کر عمادالملک نے ۳۰ نومبر ۱۷۵۹ء کو تخت نشین کیا - جب اپنے باپ کے قتل کی اطلاع عالی گوہر نے سنی تو بمقام کٹھولی متصل پٹنہ ۴ جمادی الاول ۱۱۷۳ھ کو شاہ عالم کے لقب سے تخت نشین ہوا -

شاہ عالم ثانی از ۴ جمادی الاول ۱۱۷۳ھ تا ۷ رمضان ۱۲۲۱ھ

عمادالملک نے شاہ ابدالی کی آمد کی خبر سنی تو مغل شاہزادوں اور محلات کے ہمراہ حسن گڈھ (دوآب) کے قلعے میں آ گیا (۸ دسمبر ۱۷۵۹ء) - ابدالی ۲۷ نومبر ۱۷۵۹ء کو سرہند پہنچا ، مرہٹوں نے ۲۴ دسمبر کو ابدالی فوج سے تراوڑی کے نواح میں شکست کھائی ، ۲۵ دسمبر کو اطلاع ملی کہ ابدالی کی فوجوں نے دریائے جمنا کو عبور کر لیا ہے اور نجیب الدولہ بھی سکر تال سے روانہ ہو گیا ہے ، سہارنپور کے قریب دونوں مل گئے ، دتا جی دلّی کی طرف روانہ ہوا ، ۲۸ دسمبر ۱۷۵۹ء کو عمادالملک بھی دلّی پہنچ گیا ، روہیلے ابدالی کی امداد کے لیے لونی (دلّی سے ۶ میل پر ہے) میں مقیم ہوئے ، دتا جی نے ۶ جنوری ۱۷۶۰ء کو دلّی آ کر نظام الدین اولیاء کے مزار کو لُوٹا ، ۹ جنوری کو دتا جی لڑائی میں مارا گیا ، عمادالملک بھرت پور بھاگ گیا ، ابدالی نے دلّی کا انتظام یعقوب علی خاں کے سپرد کیا - ۲۷ جنوری

۱۷۶۰ء کو ابدالی نے ڈیگ کا محاصرہ کیا اور اُس کے ایک دستے نے ملہار راؤ ھلکر کو سکندر آباد میں شکست دی ، ھلکر جان سلامت لے گیا ۔ ابدالی انوپ شہر میں آ کر خیمہ زن ہوا اور شجاع الدولہ کو بلانے کی کوشش کی ، آخر نجیب الدولہ کے مجبور کرنے سے سات ہزار فوج کے ساتھ ۱۸ جولائی ۱۷۶۰ء کو ابدالی سے انوپ شہر میں مل گیا ، ادھر دکن سے بھاؤ بڑا لشکر لے آیا ، ۲۲ جولائی ۱۷۶۰ء کو ملہار راؤ ، جنکوجی وغیرہ عمادالملک کے همراہ دہلی میں داخل ہو گئے ، یعقوب خاں قلعہ بند ہو گیا ، ۲۹ جولائی کو بھاؤ آ گیا ، ۳ اگست ۱۷۶۰ء کو یعقوب خاں نے قلعہ سپرد کر دیا ۔ شجاع الدولہ چاہتا تھا کہ ابدالی کی مرہٹوں سے صلح ہو جائے ، ابدالی نیم رضامند ہوگیا تھا مگر نجیب الدولہ کی مخالفت سے خاموش رہا اور اپنے وزیر کی رائے مصالحت کی ٹھکرا دی ، ۱۶ اکتوبر ۱۷۶۰ء کو بھاؤ نے کنج پورہ فتح کر لیا اور پٹھانوں کی یہ ریاست بری طرح تباہ کی گئی ۔ احمد شاہ ابدالی اس اطلاع سے جوش میں آ گیا اور جمنا کو باغ پت کے قریب یکم نومبر ۱۷۶۰ء کو عبور کر کے پانی پت کے پاس پہنچا ، جہاں بھاؤ آ چکا تھا ۔ سورج مل جاٹ بھاؤ کی رائے سے متفق نہ تھا اس لیے رسد رسانی کے بہانے اپنے علاقے میں مقیم تھا ، ابدالی نے یہ بندوبست کیا کہ مرہٹوں کو رسد نہ پہنچے ، ابدالی فوج کے دستوں نے مرہٹوں کی رسد کے راستے بند کر دیے ، ابدالی فوج کو رسد ملتی رہی ۔ آخر مرہٹوں نے صلح سے مایوس ہو کر فیصلہ کن لڑائی ۱۴ جنوری ۱۷۶۱ء کو شروع کی ، آغاز میں مرہٹہ فوج کا پلہ بھاری تھا ، پٹھانوں کے دستے پسپا ہونے لگے ، مرہٹوں کے توپخانے نے قیامت ڈھا دی ، ہزاروں کو خاک و خون میں لٹا دیا لیکن روہیلوں نے جان کی بازی لگا دی اور توپخانے پر قبضہ کر لیا ، ابراھیم خاں گاردی میر آتش زخمی ہو کر گرفتار ہوا ۔ احمد شاہ ابدالی نے جب اپنی سپاہ میں شکست کے آثار دیکھے تو اپنی محافظ فوج کو جو نوجوانوں پر مشتمل تھی ، حکم دیا کہ بھاگتے ہوؤں کو روکیں ، نہ مانیں تو قتل کر دو ۔

اس فوج نے بھاگتی فوج کو روکا ، اب لڑائی جم گئی کہ اچانک مرہٹے فرار ہوتے گئے، وشواس راؤ پیشوا کا بیٹا مارا گیا اور اس کے بعد بھاؤ ، بڑے بڑے مرہٹے سردار قتل ہوئے۔ ملہار راؤ ہلکر اور مادھو جی سندھیا (جو لنگڑا ہو گیا) فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ، میلوں تک مرہٹوں کی لاشیں نظر آتی تھیں دیہات کی مستورات تک نے مرہٹوں کو لوٹ لیا ، مقتولین ۳۲ ہزار کے قریب تھے ، قیدیوں کی تعداد ۲۲ ہزار بتائی گئی ہے۔ مؤلف جام جہاں نما نے زر و جواہر کے علاوہ پچاس ہزار گھوڑے، دو لاکھ گائیں اور کئی ہزار اونٹ اور پانسو ہاتھی مرہٹوں کے کیمپ سے ہاتھ آنے کا ذکر کیا ہے ، بیس ہزار مرہٹوں کو سورج مل جاٹ نے ایک ایک کمبل اور دو دو روپے فی کس دے کر دکن روانہ کیا۔

۲۹ جنوری ۱۷۶۱ء کو ابدالی دلی میں داخل ہوا ، مرہٹوں کے ایام اقتدار میں شہر کی حالت خراب ہو چکی تھی ، دیوان خاص کی نقرئی چھت اتار کر مرہٹے اپنے مصرف میں لا چکے تھے ۔ احمد شاہ کے آنے سے غلّہ اور بھی ناپید ہو گیا ، اس نے شاہی محلات میں قیام کیا اور آرام کرنا چاہا لیکن درانی فوج کی سرکشی کی وجہ سے جو گھر جانے کے لیے بے تاب تھے ، عزم سفر کرنا پڑا ، ۲۰ مارچ ۱۷۶۱ء کو دھلی سے روانگی کا حکم دیا ۔ لوٹتے ہوئے فوج ۔ تین دن تک دلی میں لوٹ مار کی ، عماد الملک وزارت کا امید وار تھا ، راجہ ناگر مل کے ذریعے یہ مہم چلائی گئی ، شاہ ولی خاں ۔ ابدالی کو راضی کر لیا لیکن شاہی محلات کی مخالفت کی وجہ سے یہ تجویز بروئے کار نہ آ سکی ۔ شجاع الدولہ بھی متوقع تھا کہ وزارت اسے ملے گی لیکن پٹھانوں اور مغلوں میں چھیڑ چھاڑ ہو گئی اور مذہبی جھگڑا کھڑا ہو گیا ۔ شجاع الدولہ نے اودھ جانے کی اجازت مانگی ابدالی نے اجازت دی ۔ ۷ مارچ کو روانہ ہو کر ۱۲ مارچ ۱۷۶۱ء کو شجاع الدولہ اپنے علاقے میں داخل ہوا ، ابدالی نے شاہ عالم کو فرماں رواں مقرر کیا ، جواں بخت کو

جو ولی عہد تھا قائم مقام بنایا، نجیب الدولہ مدارالمہام ہوا۔ واپسی میں احمد شاہ ابدالی پر سکھوں نے بڑے سخت حملے کیے، تمام سپاہی مال غنیمت سے لدے تھے، بچاؤ کس طرح کرتے اس لیے نقصان اٹھا کر افغانستان پہنچے۔ شاہ عالم اس وقت بنگال کی تسخیر میں مصروف تھا اس لیے دلی پر نجیب الدولہ کی حکومت چلتی رہی۔ عمادالملک عضو رفتہ کی طرح بھرت پور میں پناہ لینے پر مجبور ہوا، یہیں راجہ ناگر مل دیوان تن مقیم تھا اور میر اس کے زیر سایہ بری بھلی زندگی گزار رہے تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو مرہٹوں کی اس شکست سے بہت فائدہ پہنچا، وہ جنوبی ہند کی سیاست میں دخل دے کر کامیاب ہو چلے تھے، اب اُنھوں نے صوبۂ بنگال کی طرف توجہ کی۔ علی وردی خاں کے انتقال پر اس کے جانشینوں میں جھگڑا ہو گیا، سراج الدولہ کامیاب رہا، اس کی وطن دوستی میں کوئی شبہ نہیں لیکن انگریزوں نے سازش سے بہت غداران وطن اپنے ساتھ ملا لیے تھے، اس طرح بہت جلد اُنھوں نے سراج الدولہ کو تخت سے اتار دیا (۹ رجب ۱۱۶۹ھ تا ۶ شوال ۱۱۷۰ھ)۔ میر جعفر سے اس کی تخت نشینی پر بے شمار دولت کھینچی، آخر کب تک فرمائشیں پوری ہوتیں، جب اس کا ہاتھ رکا تو تخت ریاست بھی اس کے داماد قاسم خاں عالی جاہ کے سپرد کیا گیا (۷ شوال ۱۱۷۰ھ تا ۹ ربیع الاول ۱۱۷۴ھ)۔ قاسم علی خاں نے انگریزوں سے نیاز مندی برتی مگر عزت اور غیرت فروخت نہ کر سکا، شاہ عالم جو تسخیر بنگالہ کا عزم کیے ہوئے تھا اور ابھی تک اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا تھا، قاسم علی خاں کی امداد پر آمادہ ہوگیا جو انگریزوں سے مصروف پیکار تھا۔ شجاع الدولہ جو شاہ عالم سے خلعت وزارت حاصل کر چکا تھا، وہ بھی مصلحتاً شاہ عالم کے ساتھ اس میں آ کر شامل ہوا مگر دونوں ناکام رہے (۲۳ اکتوبر ۱۷۶۴ء مطابق ۲۶ ربیع الثانی ۱۱۷۸ھ بکسر کی شکست ہوئی)۔ شجاع الدولہ یہ چاہتا تھا کہ شاہ عالم کے نام پر بنگال اور دوسرے علاقوں کی تسخیر کرے؛ چنانچہ ۱۱۷۶ھ

میں نواب احمد خاں بنگش کے خلاف فوج کشی کی گئی ، روھیلے نواب احمد خاں کی مدد کو پہنچ گئے ، شاہ عالم نے نجیب الدولہ کو طلب کیا ، وہ بھی آیا لیکن روھیلوں اور بنگشوں کے خلاف لڑنا ممکن نہ تھا اس لیے نجیب الدولہ نے مصالحت کرا دی ۔ اس لڑائی میں عماد الملک احمد خاں کی مدد کے لیے بھرت پور سے آیا تھا اور سورج مل جاٹ بھی آگرہ آ کر موقع کا منتظر تھا (ابدالی کے جانے کے بعد ۱۲ جون ۱۷۶۱ھ کو سورج مل نے دھوکے سے آگرے پر قبضہ کر لیا تھا)۔ ۱۶ مئی ۱۷۶۳ء مطابق ۳ ذی قعدہ ۱۱۷۶ء کو نجیب الدولہ دلّی واپس ہونے لگا ، نجیب الدولہ دلّی پہنچا تو سورج مل جاٹ نے چھیڑ چھاڑ کی ۔ باوجود صلح و آشتی سورج مل باز نہ آیا اور دلّی پر حملہ کیا اور ۲۵ یا ۳۱ دسمبر ۱۷۶۳ء کو مر گیا ۔ (تاریخ محمدی میں ۲۵ جمادی الثانی ۱۱۷۷ ء مطابق ۳۱ دسمبر ہے) ۔ اس کے بعد جواھر سنگھ نے دلّی کا محاصرہ کیا اور مرھٹے ، سکھ ، جاٹ متحد ہو کر بھی نجیب الدولہ کو شکست نہ دے سکے ۔ احمد شاہ ابدالی کی آمد کی خبر سے یکم رمضان ۱۱۷۸ھ مطابق ۲۲ فروری ۱۷۶۵ء کو مرھٹوں نے صلح کرا دی ، عمادالملک بھی محاصرہ کرنے والی فوج کا شریک تھا ۔ شاہ عالم نے اس عرصے میں دلّی کی خبر نہ لی ، وہ شجاع الدولہ کے ساتھ پورب کی خاک اڑاتا رھا ، جب اس نے دیکھا کہ شجاع الدولہ سے اس کی مطلب برآری نہیں ہو سکتی تو اس نے کمپنی کے نمائندوں سے مصالحت کر لی اور ۱۲ اگست ۱۷۶۵ء کو فرمان جاری کر کے کمپنی کو بنگال اڑیسہ کی دیوانی دے ڈالی ، مئی ۱۷۶۵ء میں شجاع الدولہ نے مرھٹوں اور عمادالملک کی امداد سے انگریزی فوج سے مقابلہ کیا اور شکست کھائی ، آخر ۱۶ اگست ۱۷۶۵ء کو شجاع اور کمپنی کا معاھدہ ھوا ، اس طرح شاہ عالم نجم الدولہ اور کمپنی کے درمیان ۱۹ اگست ۱۷۶۵ء کو معاھدہ ھوا ، الہ آباد میں اس کا قیام طے پایا ۔ یہ ایک طرح کی انگریزی قید تھی ، نجیب الدولہ شاہ عالم کی غیر موجودگی میں دلّی کو دشمنوں کے حملے سے بچاتا رھا ، آخر میں علالت کی وجہ سے اس نے شاہ عالم کو لکھا کہ تخت کو آ کر سنبھالیے ، شجاع الدولہ اور

انگریزوں کی مصلحت اسی میں تھی کہ شاہ عالم ان کے زیر اثر رہے۔ شاہ عالم دونوں کو آزما چکا تھا اس لیے مرہٹوں سے عہد و پیمان ہوئے، مجبوراً اجازت دی (۱۳ اپریل ۱۷۷۱ء)۔ سرائے عالم پر شجاع الدولہ ۳۰ اپریل کو ملا، نواح فرخ آباد میں ٹھہرا، نبی گنج میں تین ماہ گزارے، ۱۸ نومبر کو مادھوجی سندھیا آیا، شاہ عالم ۶ جنوری ۱۷۷۲ء کو دلی دروازے کے راستے دہلی میں داخل ہوا۔ چند دن بعد مرہٹوں نے بادشاہ کو ابھارا کہ ضابطہ خاں کے خلاف فوج کشی کی جائے، بادشاہ بھی ضابطہ خاں سے اس کی سرکشی کی وجہ سے ناراض تھا اس لیے راضی ہو گیا۔ میر تقی میر لکھتے ہیں کہ بادشاہ کی ٹال مٹول کو مرہٹوں نے نظر انداز کر دیا اور ضابطہ خاں کے خلاف فوج کشی کی گئی، میں بھی ساتھ تھا، (۱۰ شوال ۱۱۸۵ھ)۔ ضابطہ خاں میں دور اندیشی اور معاملہ فہمی نہ تھی، پھر اس کے تعلقات امرأ سے اچھے نہ تھے، سندھیا اور نجف خاں وغیرہ نے پایاب راستے تلاش کیے۔ ۱۹ ذی‌قعدہ ۱۱۸۵ھ کو چاندی گھاٹ پر گنگا کو نجف خاں اور سندھیا نے عبور کیا، مقابلے میں سعادت خاں آفریدی اور اس کا بھائی صادق محمد خاں مارے گئے، اس خبر سے روہیلوں میں خوف و ہراس پھیل گیا اور ضابطہ خاں نے فرار ہونے میں عافیت سمجھی، تمام روہیلے سردار نانک متہ کے جنگل (ترائی) میں پناہ گزیں ہوئے، جو فوج مقابلہ کر رہی تھی اس نے بھی ہتھیار ڈال دیے، مرہٹوں نے بڑی بیدردی سے عوام[1] کو لوٹا

۱- شہر آشوب قائم اس واقعہ کی تفصیل پیش کرتا ہے، دو بند اس شہر آشوب کے پیش کیے جاتے ہیں :- (کلیات قائم مخطوطہ رامپور)

لشکر میں مرہٹے کے جو کوئی ہوئے ہیں بند　　دیکھے ہیں ان کے ظلم کے سب پست او ربلند
اب نام فوج سن کے وہ اڑ جائیں جوں پرند　　سچ ہے جس کو سانپ سے پہنچے کبھو گزند
رسی کو جانتا ہے، کہ مار سیاہ ہے

سمجھا تو اس قدر بھی اے بھڑوے خبیث خر　　کس پر ہوا یہ مظلمہ، ٹوٹا کنھوں پہ زر
ہر نیک و بد پہ آدمی کرتا ہے یاں نظر　　تو تو خدا کے فضل سے اس باپ کا پسر
جس کا خطاب شاہ حماقت پناہ ہے

اور روھیل کھنڈ کا تمام علاقہ تباہ و برباد ہو گیا ، نجیب الدولہ کے مال و اسباب کے علاوہ دو کروڑ روپیہ عوام سے بھی مرھٹوں نے لوٹا ، بادشاہ کو دو سو دبلے گھوڑے اور چند پرانے پھٹے خیمے ملے اس لیے مرھٹوں سے دل پھیکا پڑ گیا مگر احتجاج فضول تھا (میر ذکر میر) اس لیے ناکام دلی آئے ، نجف خاں نے بادشاہ کو سمجھایا کہ جاٹوں سے ملک لیا جائے ، بادشاہ نے بے سوچے سمجھے اجازت دی ، نجف خاں نے دس پندرہ ہزار مفلوک الحال جمع کر کے جاٹوں کے مقبوضہ علاقے پر قبضہ کر لیا اور وہ اس کی انتہائی جرأت تھی ، اس سے اس کی ہمت بڑھ گئی ۔ مرھٹے اور اس کے حامی اس رنگ کو دیکھ کر گھبرا گئے کہ بادشاہ کہیں ھاتھ سے نہ نکل جائے اس لیے ضابطہ خاں کو بخشی گری کا امیدوار بنا کر مع جاٹ فوج کے مرھٹوں نے دلّی کا محاصرہ کر لیا ۔ نجف خاں نے جرأت سے مقابلہ کیا لیکن اس کے سپاھی بھاگ کھڑے ہوئے ، کچھ بہادر ساتھی ڈٹے رہے ، پرانا شہر اس ھنگامے میں تباہ ہو گیا ، دوسرے دن پھر نجف خاں نے مقابلہ کیا آخر تیسرے دن حسام الدولہ نے صلح کر لی ، نجف خاں کو دھلی سے نکلنا طے پایا ، ضابطہ خاں کا علاقہ وغیرہ برقرار رھا ، آخر جنوری ۱۷۷۳ء میں نجف خاں کی خدمات مرھٹوں نے حاصل کیں اور دلّی سے کوچ کیا ۔

اس وقت شاہ عالم اور اس کی دلی کا جو حال تھا ، اس کا اندازہ میر کے بیان سے کیجیے (ذکر میر صفحات ۱۲۶ ، ۱۲۷) :- حاصل کلام شرارت پیشہ مغل ، فساد انگیز مرھٹے جانے والے ھیں اور حضرت ظل سبحانی قدسی صفات دو تین منشیوں کے ساتھ کسی آنے جانے والے کی تشویش کے بغیر قلعہ معلیٰ میں اطمینان سے رھیں گے ، اگر قلعہ حصار کے ھر ھر کنگرے کی دن میں سو بار سیر کو نکلیں تو کس کا حجاب مانع ہوگا اور اگر بازار میں پیدل نکلیں حاجب کہاں کہ ھٹو بچو کہے ، یہ رنگ نظر آتا ھے کہ اھل حرفہ جنگل کو نکل جائیں اور سپاھی بھیک مانگیں ، ھر شخص اپنا راستہ لے ، خوب شہر کی رونق ہوگی ؟ (جنوری ۱۷۷۳ء) ۔

مرہٹے پھر کمزور علاقوں کو پامال کرنے لگے تھے، جاٹ اور راجپوت بھی باہم الجھنے لگے، شجاع الدولہ نے پہلے فرخ آباد پر ہاتھ صاف کیا اور پھر روہیل کھنڈ پر للچائی نظریں ڈالیں، انگریزی فوج کی حمایت حاصل تھی، آخر کمپنی سے ساز باز کر کے روہیل کھنڈ پر چڑھائی کی، قدیم روہیلے سردار ایک ایک کر کے دنیا سے رخصت ہو چکے تھے، ان کے بیٹے آپس میں دست و گریباں تھے۔ حافظ رحمت خاں کا بیٹا عنایت خاں مقابلے میں آ کر خود کو دوسروں کی نظر میں ذلیل کر چکا تھا اسی لیے شجاع الدولہ نے براہ راست ہر ایک کو خط لکھے کہ اس کی مخالفت صرف حافظ رحمت خاں سے ہے اور وہ بھی ان کی بد معاملگی سے، وہ کسی بھی علاقے کو ضبط نہیں کرنا چاہتا۔ اس لیے نوجوان امرائے روہیل کھنڈ جو حافظ رحمت خاں کے خلاف تھے، شجاع الدولہ سے مل گئے، انگریزی فوج کے ساتھ شجاع الدولہ بڑی شان سے چلا، حافظ رحمت خاں بھی معمولی سپاہ کے ساتھ مقابل ہوئے، لاھی کھیڑے کے نشیب میں دریائے بھگل کے کنارے انگریزوں نے توپخانہ قائم کیا، ۱۱ صفر ۱۱۸۸ھ مطابق ۲۳ اپریل ۱۷۷۴ء کو سنیچر کے دن صبح کے وقت دونوں فوجیں صف بستہ ہوئیں، شجاع الدولہ کے لشکر کی تعداد ایک لاکھ پندرہ ہزار تھی اور حافظ رحمت خاں کی تعداد چالیس ہزار بیان کی گئی ہے، حملہ کا آغاز انگریزی توپخانے کی گولہ باری سے ہوا، حافظ صاحب کی فوج جم کر لڑنے لگی کہ احمد خاں بخشی جو شجاع الدولہ سے ملا ہوا تھا، بھاگ کھڑا ہوا، اس کے بھاگنے سے بغیر تحقیق دوسرے فوجی بھاگنے لگے۔ روہیلوں کا ایک بازو ٹوٹ چکا تھا مگر وہ جم کر لڑتے رہے اور توپخانے پر قبضہ کرنے کی کوشش کی مگر انگریزی توپخانہ محفوظ رہا۔ آخر ایک گولہ حافظ رحمت خاں کے لگا جس کے صدمے سے حافظ صاحب گھوڑے سے گر پڑے پگڑی سر سے اتر گئی، خدمت گاروں نے اٹھا کر سر پر پگڑی رکھی اور منہ میں پانی ڈالا، ایک دو مرتبہ ہونٹ ہلے اور دن کے بارہ بجے نہ تھے کہ جان نکل

گئی - کرنل چمپین کہتا ہے :

چالیس ہزار ان کی سپاہ ہوگی ، وہ نہایت مردانہ اور دلیرانہ ہم سے لڑے ، بہت دفعہ روہیلے ہمارے لشکر میں گھس آئے اور اپنے جھنڈے گاڑ دئے تاکہ اوروں کو حوصلہ آگے بڑھنے کا ہو - بارہا ہماری توپوں کو چھیننے کا قصد کیا مگر ہماری توپوں نے ان کو بڑھنے نہ دیا ، جب پاس آئے ان کو اڑا دیا - اُن کی بہادری کو بیان کرنا ناممکن ہے - (اخبار الصنادید ج-۱ صفحہ ۵۰۱) -

شجاع الدولہ نے اس فتح کے بعد روہیل کھنڈ کو اس طرح تباہ کیا جس کی مثال تاریخ میں مشکل سے ملے گی ، فرخ بخش کے مؤلف کا بیان ہے کہ مسجدوں، مدرسوں، خانقاہوں اور مقبروں میں تلنگے گوبر سے چوکا لگاتے اور کھانا پکاتے ہیں. . آنولہ ــــ دارالاسلام تھا ــــ شجاع الدولہ کی فتح کے بعد اس شہر کی یہ نوبت پہنچی کہ اخون محمد رحیم کی مسجد میں ــــ رنڈیاں اور فاحشہ عورتیں رہنے لگیں اور علانیہ اس میں بیٹھ کر کسب کراتیں ، ان سے یہ کوئی تعرض نہیں کرتا کہ تم مسلمانوں کے ایک مقدس مقام میں ایسا کیوں کرتی ہو ....

اس واقعے کے متعلق لارڈ میکالے نے ــــ کہا تھا (اخبار الصنادید ج-۱ صفحہ ۵۳۱) -

اس کے بعد خوفناک لڑائی ہندوستان کی خوب صورت وادی اور روہیل کھنڈ کے شہروں میں شروع ہوئی ، وہ تمام ملک ایک شعلۂ جوالہ تھا ، ایک لاکھ سے زیادہ آدمی جنگل اور بن میں اپنا گھر چھوڑ کر چلے گئے اور یہ سمجھے کہ بھوک اور بیماری سے مرنا اور شیر و نہنگ کے مُنہ میں پڑنا اُس ظالم کے پھندے میں پھنسنے سے اچھا ہے جس کے ہاتھ عیسائی گورنمنٹ نے اُن کی جان و مال اور عزت و آبرو ، جورو بچے سب بیچ ڈالے ہیں ــــ

شاہ عالم نے اس فتح میں شمولیت کے لیے اپنا نمائندہ نجف خاں کو

مقرر کیا ، شجاع الدولہ کو جلد ھی پیام اجل آ پہنچا ، (۲۴ ذی القعدہ ۱۱۸۸ھ) اور آصف الدولہ اس کا بیٹا تخت ریاست پر بیٹھا۔ شمالی ھند انگریزوں کے زیراثر آ چکا تھا ، جنوبی ھند میں حیدر علی خاں نے انگریزوں کو نکالنے کی کوشش کی مگر اس کی موت نے یہ کام مکمل نہ ھونے دیا (۱۷۸۲ء) ۔

اس کا بیٹا سلطان ٹیپو انگریزوں کے مقابلے میں جما رھا ، نجف خاں نے ۳ فروری ۱۷۷۴ء کو جاٹوں سے آگرے کا قلعہ لے لیا ، دلّی کا یہ حال تھا کہ شاہ عالم حسام الدولہ کے اثر میں تھا ، نجف خاں دلّی میں آیا ، بادشاہ نے چند سال کا حساب مانگا اور حساب فہمی کے بعد آٹھ لاکھ روپے کے مطالبے میں اسے معزول کر کے ۵ جون ۱۷۷۳ء کو قید کر دیا گیا ، عبدالاحد خاں مجدالدولہ کو مختار بنایا گیا ، کچھ مدت شاہ عالم کو مجدالدولہ نے بھی کھلایا ، آخر نجف خاں نے کافی جد و جہد کے بعد آرام کی تلاش میں دلّی کا رخ کیا ، ۱۵ نومبر ۱۷۷۹ء کو مجدالدولہ معزول ھو کر قید ھوا اور نجف خاں امیرالامرائی پر فائز ھوا ، اب نجف خاں نے عیش و عشرت کی طرف توجہ کی ۔ دلّی کا علاقہ سکھوں ، جاٹوں وغیرہ سے کچھ دنوں کے لیے محفوظ ھو گیا لیکن مالی مشکلات بڑھتی گئیں ، علاقوں میں جاگیردار آزاد ھو گئے ، ملک کا نظام تہ و بالا ھو چکا تھا ، ”جس کی لاٹھی اس کی بھینس“ یہی اصول بن چکا تھا ۔ شاھی اخراجات کہاں سے ھوتے ، نجف خاں انگریزوں کے گوالیار (۱۷۸۱ء) تک آنے کی وجہ سے پریشان تھا ، آخر ۶ اپریل ۱۷۸۲ء مطابق ۲۲ ربیع الآخر ۱۱۹۶ھ کو نجف خاں معمولی سی بیماری کے بعد دنیا کو خیرباد کہ گیا ۔ دلّی میں بے چینی پھیل گئی ، آخر فراسیاب خاں امیرالامرائی حاصل کرنے میں کامیاب ھو گیا (۱۹ اپریل ۱۷۸۲ء) ، پھر محمد شفیع امیرالامرا ھوا ، ۲۳ ستمبر ۱۷۸۳ء کو محمد شفیع کو ختم کر دیا گیا ، اب دوبارہ افراسیاب خاں امیرالامرا (۹ اکتوبر ۱۷۸۳ء) ھوا لیکن ۲ نومبر ۱۷۸۴ء کو زین العابدین برادر محمد شفیع نے افراسیاب خاں کا کام تمام کر دیا ، شاہ عالم ثانی اس روزانہ کے جھگڑوں سے تنگ آ چکا تھا اس لیے سندھیا سے دوستی غنیمت جانی ، سندھیا کو بھی

اپنی مطلب برآری کے لیے شاہ عالم کی ضرورت تھی ، ۲۱ ذی الحجہ ۱۱۹۸ھ کو پٹیل شاہ عالم سے ملا ، خلعت ہفت پارچہ وغیرہ سے سرفراز ہوا (بحالت سفر آگرہ ، سفر ۱۶ شوال ۱۱۹۸ھ مطابق ۲ ستمبر ۱۷۸۴ء) - فراقی مؤلف وقائع عالم شاہی نے جو واقعات سپرد قلم کیے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ عالم غیرت و حمیت سے دست بردار ہو چکا تھا، پٹیل کے اشارے پر ہر کام موقوف تھا ، حکومت پٹیل کی تھی اور نام شاہ عالم کا ، ۲۰ محرم ۱۱۹۹ھ کا واقعہ عبرتاً نقل ہے :-

کہا گیا کہ وکلائے جے پور سے معاملہ کرنے پٹیل وغیرہ گئے ہیں ، طے نہ ہوا تو دو تین دن میں کوچ ہوگا - آخر دن میں آنند راؤ نرسی نے فرد مطالبات پٹیل نظر سے گذاری اور دستخط فرما دیے اور کہا "مختارالسلطنت عظمیٰ پٹیل کو میں نے کر دیا" . . . . . پٹیل سے ارشاد ہوا کہ مابدولت کو جاگیر سے کچھ مطلب نہیں ، کہ تین سال کی خشکی اور مفسدوں کے ہنگاموں سے آمدنی نہ رہی ، ملک جانے اور تم ، مجھ کو نقدی چاہیے ، اس کے بعد پٹیل رخصت ہوا -

۲۱ محرم ۱۱۹۹ھ - پٹیل اپنے حواریوں کے ساتھ ـــ حاضر ہوا ، خلعتِ فاخرہ ، چہارقب ، خدمت وکیل مطلق اور مختاری امور شاہی اور مورچھل ، نالکی، خطاب "مختار الممالک وکیل مطلق عمدۃالامرا فرزند عالی جاہ مہاراجا دھراج سری ناتھ مادھو راؤ سندھیا بہادر منصور زماں" سے مفتخر ہوا ، اس سے پہلے کوئی ہندو راجا اس خدمت پر سرفراز نہ ہوا تھا اور چارقب امیر تیمور سے اب تک کسی کو نہ ملا تھا . . . . . بطور شکرانہ آنند راؤ نرسی نے چند مٹھی چاندی کے پھول پٹیل کے سر پر بادشاہ کے روبرو دائیں بائیں نچھاور کیے ، فراش ، خادم ، دربان وغیرہ شاہی ملازم لُوٹنے کو ٹوٹ پڑے ، عجیب پُر لطف منظر تھا ، (صفحات ۴۲ تا ۴۴ وقائع عالم شاہی) - ۴ صفر ۱۱۹۹ھ حضرت نے یہ دوہرہ اپنا کہا ہوا پٹیل کی پگڑی پر لگوایا اور اس دوہرے کو خود پڑھا :-

ملک مال سب کھوے کر پڑے تمھارے بس
مادھو ایسی کیجیو، آوے تم کو جس

دلّی پر آئے دن سکھ اور گوجر حملے کرتے رہتے تھے اور بادشاہ مرہٹوں کے ساتھ سفر میں ہر کام کو تقدیر پر ٹالتا، آخر غلام قادر خاں پسر ضابطہ خاں نے بھی مرہٹوں کی بالا دستی ختم کر کے شاہ عالم کو اپنے زیر اثر لانے کی کوشش کی، شاہ عالم کا ناظر منظور علی خاں مل گیا، جنگ کے بعد شاہ عالم نے ملک غلام قادر خاں کے سپرد کر دیا، (۱۲ شوال ۱۲۰۲ھ)۔ غلام قادر خاں نے بیالیس اشرفیاں بادشاہ سے قرض لے کر نذر پیش کی، خطاب روشن الدولہ اور منصب وکالت مطلق ملا، اسمٰعیل بیگ کو خطاب احتشام الدولہ اور امیر الامرائی ملی، شاہ عالم سے روپے کا مطالبہ کیا گیا جو پورا نہ کر سکا، ۲۷ شوال کو بیدار بخت بادشاہ ہوا، روزانہ شاہ عالم اور اس کے بیٹوں اور متعلقین کو قسم قسم کی اذیتیں دی جاتیں، اس ترکیب سے بے شمار دولت اور سامان اس کے قبضے میں آیا۔ ۹ ذی قعدہ ۱۲۰۲ھ کو شاہ عالم ثانی کی آنکھیں نکالی گئیں، ۱۷ ذی حجہ ۱۲۰۲ھ کو اپنا سر مرزا اکبر کے زانو پر رکھ کر سو رہا اور اپنی تلوار اور چھری اس کے پاس رکھ دی اور پھر ایک تھپڑ گردن پر مار کر کہا کہ موقع تھا کہ میرا کام تمام کر دیتے، آخر مرہٹے مدد کو آ گئے۔ ۱۷ ربیع الاول ۱۲۰۳ھ کو دھلی سے بھاگا، ''شاملی'' (۱۹ دسمبر) میں پکڑا گیا، ۳ مارچ ۱۷۸۹ء کو بڑے عذاب سے قتل کیا گیا، سر لٹکایا گیا، بیدار بخت زندہ درگور ہوا۔ ستمبر ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے مرہٹوں کو دلّی سے بے دخل کر دیا اور شاہ عالم انگریزوں کے زیر سایہ آ گیا، پنشن مقرر ہوئی اور باقی زندگی نام نہاد شاہی میں (جو اسیری تھی) گذار کر ۷ رمضان ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۹ نومبر ۱۸۰۶ء دنیا سے رخصت ہوا۔ انگریزوں نے اس عرصے میں ہندوستانی ریاستوں کو یکے بعد دیگرے اس طرح ختم کیا کہ محسوس بھی نہ ہو سکا۔ سلطان ٹیپو نے خداداد ذھانت ورثے میں پائی تھی، اس نے انگریزوں کے خطرات

سے ہندو اور مسلمانوں کو آگاہ کیا لیکن کسی نے اس کی بات پر توجہ نہ کی، مرہٹوں اور نظام نے انگریزوں کا ساتھ دیا، خود اُس کے امرا غداری پر آتر آئے اور وہ شیر مرد، گیدڑوں کا شکار ہو گیا، (۴ مئی ۱۷۹۹ء)، آصف الدولہ نے کمپنی کی ہر طرح امداد کی، ماں اور دادی کو تنگ کیا اور رقم سے بار بار مدد کی، انگریزوں نے اس طرح تنگ کیا، کہ اُسے اپنی زندگی سے بیزاری ہو گئی، اس کے عہد وزارت میں راجا چیت سنگھ بنارس کی ریاست سے معزول کیا گیا (۱۱۹۵ھ) اور فیض اللہ خاں والیٔ رام پور سے پندرہ لاکھ روپیہ جزیہ لیا گیا (۱۷ فروری ۱۷۸۳ء تاریخ معاہدہ)۔ فیض اللہ خاں کے مرنے کے بعد بڑا بیٹا محمد علی خاں (۱۸ ذی حجہ ۱۲۰۸ھ) تخت نشین ہوا۔ بد مزاجی کی وجہ سے اُمرا نے ۱۳ محرم ۱۲۰۹ھ محمد علی خاں کو زخمی کیا (بعد میں مر گئے) اور غلام محمد خاں نے چھوٹے بھائی کو تخت نشین کیا، آصف الدولہ سے منظوری چاہی، جو نہ دی گئی اور غلام محمد خاں کی تنبیہ کے لیے انگریزی فوج کے ساتھ آصفی فوج روانہ ہوئی، ۲۸ ربیع الاول ۱۲۰۹ھ (۲۴ اکتوبر ۱۷۹۴ء) کو بھٹورہ کے میدان (علاقہ بریلی) میں رام پوری فوج سے مقابلہ ہوا، پہلے ہی حملے میں انگریزی فوج کو شکست ہو گئی۔ مؤلف عمادالسعادت کا بیان ہے کہ اڑھائی سو کے قریب گورے اور پچاس سردار کام آئے اور سترہ سو کے قریب تلنگے (ہندوستانی پیادے) مارے گئے، رام پوری فوج لُوٹ مار میں مصروف ہو گئی، جنرل ابر کرومبی نے بقیہ فوج سے، جو پوشیدہ تھی حملہ کر دیا، گولیاں اور گولے برسنے لگے، کچھ مارے گئے باقی رام پوری فوج تباہ ہو گئی، آصف الدولہ جو محمد علی خاں مرحوم کے بھائی بنے تھے، انھوں نے رام پوری خزانے پر قبضہ کر لیا اور نصف ریاست رام پور کا رقبہ اودھ کا جزو قرار دیا، احمد علی خاں خلف نواب محمد علی خاں کو تخت نشین کیا، (اس لڑائی میں کرنل جارج برنگٹن نجو خاں کے ہاتھ سے قتل ہوا، یہ کرنل سلطان ٹیپو کے خلاف کئی لڑائیاں لڑ چکا تھا)۔ ۲۸ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ مطابق ۲۱ ستمبر ۱۷۹۷ء کو آصف الدولہ عالم فانی سے گزر گیا،

وزیر علی خاں جو آصف الدولہ کا متبنٰی تھا تخت نشین ہوا لیکن نواب سعادت علی خاں کی مخالفت کی وجہ سے اور آزادانہ روش کے باعث ۲ جنوری ۱۷۹۸ء کو معزول ہوا اور نواب سعادت علی خاں تاج دار اودھ ہوئے۔ انگریزی دباؤ سے مجبور ہو کر ۱۰ نومبر ۱۸۰۱ء کو اضلاع روھیل کھنڈ، فرخ آباد، مین پوری، اٹاوہ، کانپور، فتح گڑھ، الہ آباد، اعظم گڑھ، بستی اور گورکھپور کمپنی کے قبضے میں چلے گئے (سعادت علی خاں ۲۲ رجب ۱۲۲۹ھ مطابق ۱۲ جولائی ۱۸۲۴ء)۔ مرھٹوں کی طاقت اگرچہ پہلے جیسی نہ رھی تھی لیکن ان کی دست رس دور دور تک تھی: پیشوا سندھیہ کے زیر اثر تھا، نانا فرنویس کمپنی کے ارادوں سے باخبر تھا، وہ کمپنی سے ٹکّر لینا چاھتا تھا لیکن ۱۳ فروری ۱۸۰۰ء کو وہ فوت ہو گیا اور کمپنی کے اراکین کی سازشوں کا جواب دینے والا نہ رہا، ھلکر کو کمپنی نے توڑ لیا اور دونوں نے مل کر پونہ کے مقام پر پیشوا اور سندھیہ کی فوجوں کو شکست دی (۲۵ اکتوبر ۱۸۰۲ء)، پیشوا نے سب سڈی ایری سسٹم کو قبول کر کے اپنی آزادی ختم کر دی (۶ دسمبر ۱۸۰۲ء عہد نامہ بسین) اور دوبارہ آسے پونے کی گدی پر بٹھایا گیا، سندھیہ اور بھونسلہ چاھتے تھے کہ پیشوا کو انگریزی قید سے آزاد کریں لیکن انگریزی آھنی جال میں وہ خود بھی پھنس گئے، ۲۳ ستمبر ۱۸۰۳ء کو ویلزلی نے سندھیہ کو شکست دی اور ۱۱ دسمبر ۱۸۰۳ء کو گوال گڈھ کا قلعہ ویلزلی کے قبضے میں آیا، ادھر جنرل لیک نے ۲۹ اگست ۱۸۰۳ء کو علی گڑھ پر قبضہ کیا، ۱۷ اکتوبر ۱۸۰۳ء کو آگرے کے قلعے پر قابض ہوا۔ سندھیہ کی شکست کا باعث یورپی افسر تھے، جب ھلکر کمپنی کے کمینے ارادوں سے واقف ہوا تو آس نے جنگ کی ٹھانی اور پہلے اپنے یورپی افسروں کو ختم کیا، کمپنی کی فوج کو ترساں اور ھراساں کرتا ہوا ھلکر ادھر آدھر چکر لگاتا رہا، آخر بھرت پور میں پناہ لی۔ ۳ جنوری ۱۸۰۵ء کو جنرل لیک نے قلعہ بھرت پور کا محاصرہ کر لیا، تین بار حملہ کیا اور ناکام رھا، آخر راجا بھرت پور سے صلح کر کے ھلکر کو اکیلا

چھوڑ دیا، ہلکر نے رنجیت سنگھ شیر پنجاب سے امداد چاہی، اُس نے صاف انکار کر دیا ، آخر ۲۴ دسمبر ۱۸۰۵ء کو ہلکر نے جارج بارلو کے معاہدے کو تسلیم کرکے کمپنی کی اطاعت قبول کر لی ؛ اس طرح شاہ عالم کے زمانے میں برصغیر پاک و ہند کمپنی کے زیر اقتدار آ چکا تھا ۔

ابوالنصر معین الدین اکبر شاہ ثانی

شاہ عالم کے انتقال پر اکبر ثانی ولیعہد بادشاہ ہوا ، اس کی ولادت ۷ رمضان ۱۱۷۳ھ مطابق ۱۷۵۹ء میں ہوئی تھی ، ۷ رمضان ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء) میں تخت نشین ہوا اور ۲۸ جمادی الثانی ۱۲۵۳ھ کو قریباً اسی سال کی عمر میں چل بسا ۔ شاہ عالم کی حکومت آخر میں دلی تک محدود تھی ، اس کی حکومت قلعہ معلیٰ کی چار دیواری تک محدود رہی ، شاہ عالم نے کچھ روپیہ اپنی جزرسی سے جمع کر لیا تھا ، ایک لاکھ روپیہ[1] مہینے میں اس کا خرچ کس طرح چلتا ، کچھ مدت تک پس انداز سے ضرورتیں پوری ہوئیں ، اضافہ پنشن کی درخواست کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ شاہانہ مصارف کہاں سے ہوتے ، قلعہ معلیٰ کے اندر جرائم پیشہ جمع رہتے تھے کہ اُن سے باز پرس[2] نہ ہوگی ۔ انگریزوں نے رسمی وقار میں کمی کر دی ؛ بادشاہ کو

---

۱ - ۲۴ ستمبر ۱۸۰۳ء کو جنرل اکٹر لونی نے دلی کے قدیم شہنشاہی شہر میں مالی اور فوجی عمل دخل کر لیا اور شاہ عالم مرہٹوں کی قید سے نکل کر انگریزوں کی حفاظت میں آ گیا ، وظیفہ "۸۸۵۰۰" ماہانہ مقرر ہوا اور دس ہزار سالانہ تیوہاروں کے لیے مقرر ہوا (بہادر شاہ ظفر - امیر احمد علوی) ۔

۲ - مولوی ذکاء اللہ لکھتے ہیں : قلعہ میں بادشاہ کو کل اختیار تھا ، وہاں انگریزی حکومت کو مداخلت نہ تھی اس لیے اُس کی عجب کیفیت تھی ، سارے شہر کے بد معاش اُس میں گھسے رہتے تھے ، شہر سے مال چرا کر لے جاتے تھے ، قلعے میں کھلے بازار بیچ کر کھا جاتے ،— شہزادے عجیب عجیب حرکتیں کرتے ، کبھی مال چراتے کبھی کسی کو قتل کرتے (صفحہ ۳۴۶ تاریخ ہندوستان جلد نہم) ۔

معلوم تھا کہ وہ اب بادشاہ نہیں ہے، کمپنی حاکم ہے، اس طرح بے بسانہ زندگی گذارتا رہا اور انگریزوں سے رحم کی توقع میں عمر گذار دی ۔ سید احمد شہید کی تحریک اسی کے زمانے میں پروان چڑھی اور ختم ہو گئی ۔

محمد سراج الدین ابو ظفر بہادر شاہ

بہادر شاہ کی تاریخ پیدائش ۲۸ شعبان ۱۱۸۹ھ ہے، شنبہ کے دن قلعۂ دہلی میں پیدا ہوا ، اس نے اپنے دادا شاہ عالم کی نگرانی میں تعلیم و تربیت پائی ، شاہ عالم کے نابینا ہونے کا حادثہ اس کے سامنے پیش آیا ، مرہٹوں ، سکھوں اور جاٹوں، روہیلوں کی چیرہ دستی سے آشنا تھا۔ آخر میں اس کے دادا نے انگریزوں کی سر پرستی قبول کر لی تھی جو اس کے باپ (اکبر شاہ ثانی) نے بھی تسلیم کی اور جب وہ دنیا سے سدھارا تو بہادر شاہ نے ۲۸ جمادی الثانی ۱۲۵۳ھ کو کانٹوں بھرا تاج سر پر رکھ لیا ، وزارت مرزا مغل کے سپرد ہوئی جو نہایت ہی خائن اور کمینہ تھا، پھر میر حامد علی خاں وزیر ہوئے اور ان کے بعد مرزا شاہرخ ، آخر میں محبوب علی خاں خواجہ سرا مختار کار اور حکیم احسن اللہ خاں احترام الدولہ دخیلی امور شاہی تھے ۔ ایک لاکھ پنشن ماہانہ اور چند دیہات کی آمدنی پر بادشاہ کا گذارا تھا ۔ رزیڈنٹ انگریزی نے بادشاہ کی ذلت کے مختلف طریقے[1] اختیار کیے ؛ افسران بالا کی کوشش یہ تھی

---

۱ - ذاتی معاملات میں فرنگی مداخلت - ایجنٹ بہادر کی تحریر آئی کہ حضور نے بابو سورج نرائن کو مختار کار بنایا ہے، اس کی فضول خرچی سے حضور قرضدار ہو جائیں گے ، آمدنی کے موافق خرچ رکھیں ۔

بہادر شاہ اور فرنگی ! بادشاہ کی نذر جو گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف کی طرف سے سال گرہ مبارک اور نوروز وغیرہ جشنوں کے موقع پر پیش کی جاتی تھی ، ۱۸۴۳ء سے لارڈ ایلن برا نے بند کر دی تھی—فرمانروائے دہلی کا نام سکے پر نقش ہوتا تھا ، وہ ۱۸۳۵ء سے بند ہوا ، گورنر جنرل کی مہر سے

باقی صفحہ ۲۴ پر :

که قلعے سے بادشاہ کو بے دخل کر دیا جائے - رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں :—

بے شک یہ ایک دانائی کی بات تھی کہ بادشاہ کے مرنے کے بعد پادشاہی خاندان قلعے سے باہر چلا جائے ، سلاطین کے سب حقوق موقوف ہو جائیں - یہ کام کچھ مشکل نہ تھا ، لارڈ ڈیل ہوزی اس کام کو بغیر تاخیر کرنا چاہتے تھے ، اپنے نزدیک بادشاہ کے مرنے کا انتظار دیکھنے کی کچھ ضرورت نہ تھی ، غالباً بادشاہ کو اگر کافی ترغیب دی جائے گی وہ قلعہ خالی کر دیں گے - وہ یہ سمجھتے تھے کہ قطب ایسا مقدس مقام ہے جہاں ایک ولی اور باپ دادا کی قبریں ہیں ، بہادر شاہ اور اس کے خاندان کے آدمی آباد ہونے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳ :

''فدوی خاص بادشاہ'' کے الفاظ خارج کیے گئے اور ہندوستانی رئیسوں کو ہدائت کی گئی کہ وہ بھی اپنی اپنی مہروں سے بادشاہ کی نسبت اس قسم کے بے معنی الفاظ خارج کر دیں -

ایجنٹ کی باز پرس بادشاہ سے | ایجنٹ بہادر نے دریافت کیا ہے کہ ایجنٹ اور کپتان قلعہ کی اجازت کے بغیر مسمی کتلی عیسائی قلعے کے اندر آیا تھا ، وہ کس طرح حضور میں باریاب ہو سکا . . . . بادشاہ سلامت نے اپنے نمائندے کی زبانی ایجنٹ کو کہلا بھیجا . . . . ایجنٹ بہادر نے کہا آئندہ قلعے کے اندر آمد و رفت نہ رکھنے پائے - بات یہ تھی کہ ولی عہد کے متعلق جو انگریزی میں نوشت خواند ہوتی تھی کتلی اس کو طول میں ڈالنا چاہتا تھا -

بہادر شاہ کی تذلیل | گوروں نے اپنے دل بہلانے کے لیے لاہوری دروازے پر بہادر شاہ کی ایک تصویر بنائی تھی جس کے گلے میں پھانسی ڈالی تھی —— ایک سرکاری افسر نے بادشاہ کی تعظیم کے لیے اپنے سر سے ٹوپی آتاری تو اس پر انگریزی اخباروں نے لعن طعن کا تار باندھ دیا - (صفحات ۱۸۳ تا ۲۰۳ بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد از رئیس احمد جعفری) -

میں کوئی اعتراض نہیں کریں گے اور اگر اعتراض کریں گے تو اس بات پر غور کیا جائے گا کہ آیا ان پر دباؤ زیادہ نہ ڈالنا چاہیے یا یہ تدبیر آخر کو کی جائے کہ اگر وہ قطب میں جا کر آباد نہ ہوں تو ان کا وظیفہ بند کر دیا جائے۔ ۱۸۵۰ء کے موسم بہار میں لارڈ ڈیل ہوزی کے پاس سے مراسلہ آیا جس میں اس باب میں ہدایتیں لکھی ہوئی تھیں، بعض ممبروں نے لارڈ ڈیل ہوزی کی درخواست کے برخلاف اپنی رائے کو بڑے زور سے ظاہر کیا تھا۔

(صفحہ ۲۱۳ ، بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد)

بہادر شاہ کے عہد کے سیاسی حالات میں جنگ افغانستان خاص اہمیت رکھتی ہے ، باسو کا بیان ہے :—

اہل افغانستان نے بیگمات پر حملہ ہوتے دیکھا ، اُن کے ملک کو لوٹ لیا گیا ، ہر اس چیز کو تباہ و برباد کر دیا گیا جو اُن کے نزدیک مقدس و متبرک تھی۔ ان مناظر نے ان کی رگوں میں خونِ انتقام دوڑا دیا، آزاد افغانستان کے باشندے ان بد اعمالیوں کو برداشت نہیں کر سکتے تھے ، ان کی نگاہوں میں انگریز ذلیل ہو چکے تھے ، ان کے نزدیک انگریز کا وجود انسانیت ، شرافت اور اخلاق سے عاری ہو چکا تھا . . . . . افغانوں نے انگریزوں کی بد عہدیوں کے پیش نظر اس امر کا فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے وطن کو ان کے وجود سے پاک کریں گے ، ان کے طرز تفکر میں شاہ شجاع تمام مصائب کا سر چشمہ تھا . . . . . . جب شاہ شجاع اپنے وطن کو خیر باد کہتے ہوئے کابل سے روانہ ہوا ، تو راستے میں گولی کا نشانہ بنا دیا گیا .....

برنز کے خلاف بھی افغانستان میں نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہو چکے تھے — وہ ایک غدار تھا جس نے افغانوں کے لیے مصائب کے دروازے کھول رکھے تھے . . . . . دن کی روشنی میں وہ کابل میں قتل کیا گیا ، سیکناٹن افغانستان میں کلائیو کا کھیل نہیں کھیل سکتا تھا . . . جب

میکناٹن اور اکبر خاں معاہدے سے متعلق گفت و شنید کر رہے تھے تو میکناٹن کو قتل کر دیا گیا ۔ (کمپنی کی حکومت از باری صفحات ۲۲۲ ، ۲۲۳) ۔

٦ جنوری ۱۸۴۲ء کو انگریزی قافلہ کابل سے جلال آباد روانہ ہوا ، اور راستے میں موت کے گھاٹ آتار دیا گیا ، صرف ڈاکٹر برائڈن زندہ رہا جس نے جلال آباد کے قلعے میں یہ داستان جا کر سنائی ؛ چنانچہ اپریل ۱۸۴۲ء میں افغانستان پر فوج کشی کی گئی اور کابل کے بازاروں میں آگ لگائی گئی ، اسی زمانے میں امیرانِ سندھ کو تنگ کیا گیا اور اگست ۱۸۴۳ء میں کمپنی کے علاقے میں شامل کر لیا گیا ۔

۱۸۳۹ء میں مہاراجا رنجیت سنگھ نے وفات پائی اور انگریزوں کو مداخلت کا موقع میسر آ گیا ، ۱۸۴۹ء میں سکھوں نے ہار مان لی اور پنجاب میں انگریزی اقتدار مستقل ہو گیا ۔

اقتصادی حالات

عالم گیر کا جس وقت انتقال ہوا ہے تو خزانۂ شاہی میں نو کروڑ روپیہ سوائے طلا آلات و نقرہ غیر مسکوک باقی تھا ۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ تیرہ کروڑ روپیہ تھا . . . . . . نوکران سابق کو آٹھ نو مہینے کی طلب اور نئے ملازموں کو دو ماہہ اور توپ خانے اور تمام کارخانوں کے ملازموں اور خدمۂ محل کو سہ ماہہ دیا جائے . . . . اس طرح دو کروڑ روپیہ تقسیم کیا ، خان خاناں کو ایک کروڑ روپیہ نقد و جنس انعام دیا . . . . . . اس داد و دھش کا نتیجہ یہ ہوا کہ اندوختۂ سابقہ بے دردی سے ضائع کیا گیا ، بعد میں سید عبداللہ خاں قطب الملک اور حسین علی خاں نے اپنے زمانۂ وزارت میں شاہی اموال کو برباد کیا ، سلطنت کا اقتصادی نظام غیر ملکی حملوں اور صوبائی اور علاقائی بغاوتوں سے درہم برہم ہوتا رہا ، ملک کی زمینیں بنجر اور غیر آباد ہوتی گئیں ، خاص کر دھلی کے نواح کا علاقہ زیادہ تباہ حال

ہو گیا، مغلیہ دربار میں ایرانی اور تورانی پارٹی کی کشمکش حکومت کے زوال اور اقتصادی تباہی کا پیش خیمہ بنی، پھر مختلف گروہ جو عالم گیر کی وفات کے بعد اُبھر رہے تھے اُن کی کوششیں عوام اور خواص کے لیے مصیبت کا باعث بن گئیں، مرہٹے، راجپوت، سکھ جاٹ، روہیلے سب ہی مغل حکومت کی بنیادیں ڈھا رہے تھے، ہر ایک نے ملک کا کچھ نہ کچھ حصہ اپنی جولاں گاہ ٹھہرایا، ان کے حملوں کی تاب عوام اور خواص میں نہ تھی۔ عالم گیر سے مرہٹوں کا انتظام نہ ہو سکا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد اس کے بیٹوں کی خانہ جنگی سے ہر ایک نے فائدہ اٹھایا، راجپوت اور جاٹ پیش پیش تھے، پنجاب میں سکھوں نے بابا بندہ کی قیادت میں قتل و غارت کے علاوہ بستیوں کو دل کھول کر لوٹا، مسلمانوں کو خصوصیت سے پائمال کیا گیا۔ مرکز پھر بھی مضبوط تھا اور صوبوں کے محاصل آ رہے تھے اس لیے حکومت کا کاروبار چل رہا تھا لیکن مرہٹوں کے مطالبۂ سردیش مکھی اور چوتھ سے عوام پسنے لگے، مغل نظام حکومت میں کاشتکار بھی خوش حال نہ تھے، اُن کو مجبور کیا گیا تھا کہ وہ اپنا پیشہ چھوڑ کر دوسرا پیشہ نہ اختیار کریں، روہیلے اور بنگش پٹھان شمالی ہند میں داخل ہوئے اور مختلف امرا کی جاگیروں پر زبردستی قبضہ کر لیا، ان امرا میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ نئے مالکوں سے قبضہ حاصل کر سکتے مگر عوام پر دباؤ ڈالا جاتا کہ وہ مطالبہ پرانے آقاؤں کو بھی ادا کریں، وہ طبقات جو سپاہی پیشہ تھے، وہ حکومت کی بدنظمی سے اپنے پیشے چھوڑ کر دوسرے کام اختیار کرنے لگے؛ یہ سلسلہ بہادر شاہ اول سے لے کر محمد شاہ کے عہد تک چلتا رہا اور اس کے آغاز عہد میں راجا جے سنگھ اور گردھر بہادر نے اس بات پر نظر کر کے کہ افواج کی آمد و رفت اور گرانیٔ غلہ سے اکثر پرگنوں کے باشندے پریشان حال ہو رہے ہیں اس لیے انھوں نے بادشاہ سے التماس کیا کہ جب تک رعایا بحال ہو اور ملک کا بندوبست ہو، جزیہ معاف کیا جائے،

بادشاہ نے جزیہ[1] معاف کیا۔ خزانۂ شاہی خالی تھا، امرا اپنے اندوختہ سے سامان امارت مہیا کرتے، فوج کی تنخواہیں بھی اپنے پاس سے ادا کرتے تھے جیسا کہ مظفر علی خاں کے حالات میں ہے کہ اسے اجمیر کا صوبہ دار بنایا گیا، بسبب عسرت و بے سر انجامی کے قصبہ رواڑی سے آگے نہ بڑھا تھا کہ خبر آئی اجیت سنگھ راجا جودھپور اجمیر آ گیا، اس کے پاس تیس ہزار سوار . . . ہیں امرا میں سے حیدر قلی خاں لڑائی کے لیے آمادہ تھا مگر اجازت نہ دی . . . . مظفر علی خاں کا سارا سامان سپاہ نے اپنی تنخواہ[2] میں لے لیا اور اس نے صوبہ داری کا فرمان اور خلعت بادشاہ کی خدمت میں بھیج دیا اور خود جے پور چلا گیا، اس کے تعاقب میں بعض زمینداروں اور مفسدوں نے بادشاہی ملک کو تاخت و تاراج کیا، راجا اجیت سنگھ نے نارنول کو خوب لوٹا۔

محمد شاہ کے امرا میں نظام الملک باحوصلہ اور دور اندیش اور منتظم تھا لیکن صمصام الدولہ وغیرہ اس کے خلاف تھے، خود محمد شاہ عیش و عشرت کا دل دادہ تھا۔ نظام الملک دکن میں جا کر بیٹھ رہا اور وہاں اپنی ریاست کی بنیاد ڈالی۔ مرہٹوں سے اس نے مصالحت کر لی اس لیے مرہٹے برابر شمالی ہند کی طرف بڑھتے رہے، [۱۱۴۹ھ میں انہوں نے دلّی کو (میلہ کالکا، نواح دہلی) لوٹ کر عوام اور خواص کو خوف زیادہ کر دیا لیکن محمد شاہ کی آنکھیں نہ کھلیں]، ۱۱۵۱ء میں نادر شاہ نے شکست دی اور دلّی میں ۵۸ دن قیام کیا، ۱۱ ذی الحجہ ۱۱۵۱ھ (۱۱ مارچ ۱۷۳۹ء) کو اس نے قتل عام کا حکم دے کر دلّی کی زمین کو لالہ زار بنا دیا۔ مال غنیمت کا شمار نہیں، فریزر[3] نے مالِ غنیمت کا اندازہ ستر کروڑ کیا ہے،

---

۱ - تاریخ ہندوستان جلد نہم صفحہ ۱۹۸ ذکاءاللہ (۱۱۳۳ھ)

۲ - تاریخ ہندوستان جلد نہم صفحہ ۱۹۹ و ۲۰۰ ذکاءاللہ (۱۱۳۳ھ)

۳ - میر تقی میر حیات اور شاعری - از ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صفحہ ۱۰۵ -

یہ دولت ایک دن کی نہیں آٹھ پیڑھیوں کی جمع کی ہوئی تھی ۔ انند رام مخلص کا خیال ہے کہ صرف جواھرات کی قیمت پچاس کروڑ سے کم نہ ھوگی ۔ اسی مالِ غنیمت میں تخت طاؤس اور کوہِ نور ھیرا بھی تھا اور تین سو ھاتھی ، دس ھزار گھوڑے اور اتنے ھی اونٹ علاوہ تھے . . . . یہ سانحہ ھوش ربا بھی محمد شاہ کو بیدار نہ کر سکا ، گپتا کا بیان ہے :—

نادر شاہ کے حملے نے مغل حکومت کے رعب و داب کو عوام کے دلوں سے ختم کر دیا . . . . . محمد شاہ افیون کے استعمال کے باعث اپنی صحت خراب کر بیٹھا اور محل سے کم نکلتا تھا . . . . بد انتظامی کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ نادر شاہ کے حملے کے فوراً بعد بہترین فصل ہوئی اور چیزوں کی قیمتیں گر گئیں لیکن کسی نے سنجیدگی سے انتظامِ سلطنت درست نہیں کیا ، امرائے دربار اور خود بادشاہ صوفیا کی صحبتوں کے عادی ھو گئے اور اُن کی توجہ امورِ ملکی سے ھٹ گئی ۔ گپتا ایک معاصر مؤرخ کا بیان نقل کرتے ھیں :—

کہ جب کسی علاقے میں مرھٹوں کے حملے کی خبر پہنچتی تو بجائے امداد بھیجنے کے بادشاہ اور وزیر عیش و عشرت اور سیر و شکار میں مشغول ھو جاتے تاکہ یہ غم دور ھو سکے ۔ اس طرح ملک کے مالیہ کی صورت بھی ابتر ھو گئی اور فوج کی تنخواھوں کا بھی خیال نہ تھا ۔

امرا بھی دادِ عیش کیوں نہ دیتے ، وہ غلاموں کی تنخواہ بھی ادا نہ کرتے تھے اور بے دریغ عیش و عشرت میں رقم برباد کرتے ؛ چنانچہ عمدۃ الملک امیر خاں انجام کے حالات میں ملتا ہے کہ محمد شاہ کے اشارے سے اس کے پرانے ملازم نے کسی سابقہ رنجش کی بنا پر دیوان خاص میں داخل ھوتے وقت اُسے قتل کر دیا ، اس کے مکان پر لاش لے جائی گئی تو ملازموں نے تجہیز و تکفین نہ ھونے دی ، فوج کی چودہ ماہ کی تنخواہ اس پر واجب تھی ، بادشاہ نے ضبطیٔ مال کا حکم دیا تھا مگر تعمیل کیسے ھوتی ، ملازمان مانع آئے ، آخر صفدر جنگ نے فرید خاں اور سیدی بلال کو بھیجا

کہ وہ سامان فروخت کر کے فوج کی تنخواہ ادا کر دیں ، چار دن کے بعد اسے دفن کیا گیا اور جب تک ملازموں نے تنخواہ پوری وصول نہ کر لی ، فرید خاں اور سید بلال آزاد نہ ہوئے ۔

مؤرخ کا فرض ہوتا ہے کہ واقعات کی صحیح ترجمانی کرے لیکن شعرا بھی اس سلسلے میں اپنے فرض سے غافل نہ تھے؛ چنانچہ آبرو نے کہا ہے :—

اب زمانہ ہے بے طرح بگڑا کیا بنے روزگار کی صورت
دلی میں دردِ دل کا کوئی پوچھتا نہیں مجھ کو قسم ہے خواجہ قطب کے مزار کی

سید محمد شاکر ناجی نے ہنگامۂ نادری پر شہر آشوب لکھا تھا جس کے دو بند امرا کی نا اہلیت اور اقتصادی بد حالی کے گواہ ہیں :—

لڑے ہوئے تو برس بیس اُن کو بیتے تھے دعا کے زور سے دائی، ددا کی جیتے تھے
شرابیں گھر کی نکالے مزے سے پیتے تھے نگار و نقش میں‌ظاہر گویا کہ چیتے تھے
گلے میں ہنسلیاں ، بازو اوپر طلا کی نال

قضا سے بچ گیا ، مرنا نہیں تو ٹھانا تھا کہ میں نشان کے ھاتھی اوپر نشانا تھا
نہ پانی پینے کو پایا وھاں نہ کھانا تھا ملے تھے دھان جو لشکر تمام چھانا تھا
نہ ظرف و مطبخ و مکاں ، نہ غلہ و بقال

سید عبدالحی تاباں جس کے حسن و جمال کے تمام معاصر شعرا مداح ھیں، اس نے عوام و خواص کے جذبات کی ترجمانی بہترین الفاظ میں کی ہے ، نادر شاہ کے حملے سے جو نقصانات ہوئے اُن کی طرف بھی اشارہ کیا ہے :—

داغ ہے ھاتھ سے نادر کے مرا دل تاباں
نہیں مقدور کہ جا چھین لوں تختِ طاؤس
فرش پر مخمل کے جو سوتے تھے ھائے
اب میسر اُن کو نہیں ھوتا ہے ٹاٹ

گھر کے گھر خاک میں مل گئے ہیں فلک کے ہاتھوں
پر نہیں اس کی خرابی کے کچھ آثار ہنوز

شیخ ظہور الدین حاتم نے بھی ایک شہر آشوب میں ملک کی اقتصادی بد حالی کا نقشہ کھینچا ہے :-

شہوں کے بیچ عدالت کی کچھ نشانی نہیں
امیروں بیچ سپاہی کی قدر دانی نہیں
بزرگوں بیچ کہیں بوئے قدر دانی نہیں
تواضع کھانے کو چاہو کہیں تو پانی نہیں
گویا جہاں سے جاتا رہا سخاوت و پیار

امیر زادے ہیں حیران اپنے حال کے بیچ
تھے آفتاب پر اب آگئے زوال کے بیچ
پھرے ہیں چرخ سے ہر دن تلاشِ مال کے بیچ
وہی گھمنڈ امارت کا پر خیالؔ کے بیچ
خدا جو چاہے تو پھر ہو پر اب تو ہے دشوار

جہاں میں صاحبِ خس خانہ گھاس والے ہیں
جنھوں کے محل تھے، ان کو کھنڈر کے لالے ہیں
کئی جو ہم نے بھی ٹکڑے کھلا کے پالے ہیں
سو اب دماغ میں وہ رانی خاں کے سالے ہیں
وہ ہیں سلام طلب ہم سے جب کہ ہوویں دو چار

عجب یہ اُلٹی بہے ہے گی باؤ دلّی میں
کہ شاہ باز، چڑی مار کی ہے انٹی میں
روغن فروش کی ہیں پانچوں انگلیاں گھی میں
جنگل کو چھوڑ کے بوم آ بسے ہیں بستی میں
نجیب چھوڑ کے شہروں کو ہیں جنگل میں خوار

مرزا محمد رفیع سودا کا جدی پیشہ سپاہ گری تھا ، باپ نے تجارت میں شہرت حاصل کی ، سودا نے تجارت اور ملازمت کے مزے اڑائے ، نادری لوٹ ان کی نظر سے گزری تھی ، عوام اور خواص دونوں سے وابستہ رہے اس لیے شہر آشوب لکھ کر ملک کے جذبات کی صحیح ترجمانی کی ہے :-

یہ جتنے نقدی و جاگیر کے تھے منصب دار
تلاش کر کے ڈھلیتی انھوں نے ہو ناچار
ندان قرض میں بنیوں کے دی سپر تلوار
گھروں سے اب جو نکلتے ہیں لے کے وہ ہتھیار
بغل کے بیچ تو سونٹا ہے ہاتھ میں کچکول

دیا بھی واں نہیں روشن تھی جس جگہ فانوس
پڑے ہیں کھنڈروں میں آئینہ خانہ کے مانوس
کروڑ دل پُر از امید ہو گئے مایوس
گھروں سے یوں نجبا کے نکل گئے ناموس
ملی نہ ڈولی انھیں ، جو تھے صاحبِ چنڈول

نجیب زادیوں کا ان دنوں ہے یہ معمول
وہ برقع سر پہ ہے جس کا قدم تلک ہے طول
ہے ان کی گود میں لڑکا ، گلاب کا سا پھول
اور ان کے حسبِ طلب کا ، ہر ایک سے یہ اصول
کہ خاکِ پاک کی تسبیح ہے جو لیجیے مول

احمد شاہ کے عہد میں ملک کی حالت اور تباہ ہو گئی ، محمد شاہ کا انتقال اس وقت ہوا جب احمد شاہ ، شاہ ابدالی کے مقابلے میں گیا ہوا تھا ۔ اسی لڑائی میں قمر الدین خاں وزیر اعظم بھی کام آیا ، وزارت نظام الملک کے حصے میں آئی لیکن کچھ دن بعد وہ بھی دنیا سے چل بسا ۔ صفدر جنگ نے احمد شاہ کی تخت نشینی کی رسم ادا کی اس لیے مستحق وزارت ہو گیا ،

تورانی پارٹی محروم رہی۔ احمد شاہ کی ماں اودھم بائی (نواب قدسیہ، قبلۂ عالم) ایک رقاصہ تھی، جب اُس کا بیٹا بادشاہ ہوا تو اُسے خطابات سے نوازا گیا؛ جاوید خاں خواجہ سرا سے اس کا ربط ضبط تھا، وہ بھی نواب بہادر سے مخاطب ہوا۔ اودھم بائی کے دستخطوں سے احکام جاری ہونے لگے۔ صفدر جنگ وزیر، سادات خاں ذوالفقار جنگ اور نواب بہادر کی جاگیرات محفوظ تھیں جن سے آمدنی ہوتی تھی، باقی امرا کی جاگیریں غیر محفوظ اور غیر مفید تھیں۔ اکثر فوجیوں اور دربانوں کو ملازمت سے جواب دے دیا گیا تھا، جو باقی تھے اُن کی تنخواہیں ادا نہ ہوتی تھیں۔ ایک دن دربانوں نے یہ کیا کہ ایک کتیا اور گدھا پکڑ لائے اور محل کے دروازے پر باندھ دیا، جو محل میں داخل ہوتا اُسے روکتے اور کہتے "پہلے انھیں سلام کرو، کتیا حضرت قدسیہ اور گدھا نواب بہادر ہے"۔ سرکار[1] بحوالہ شاکر خاں درباری معتمد خاص احمد شاہی بیان کرتے ہیں:—

کہ فوجیوں کی تنخواہوں کی ادائیگی تین سال تک ملتوی رہی، انھوں نے تنگ آ کر یہ رویہ اختیار کیا کہ جس کے ہاتھ جو شاہی چیز آگئی وہ لے گیا، فوجی امرا کے مکانوں میں داخل ہو جاتے جو چیز مل جاتی وہ اٹھا لاتے اور بیچ ڈالتے، خواص اور تجارت پیشہ لوگوں کا سامان جو نظر آتا وہ جبریہ لے جاتے اور فروخت کر دیتے، دہلی میں اس رویے سے اتنا خوف و ہراس پیدا ہو گیا کہ امرا اپنے گھر کچھ نہ رکھتے، مٹی کے برتنوں میں کھانا کھاتے؛ بالکل قبائلی دور دہلی کے اندر نظر آتا تھا۔ جب سرکاری اشیاء بیچ کر فوجیوں کی تین سال کی واجب الادا، تنخواہیں ادا کی گئیں تو لوگ بازاروں اور گلیوں میں حکومت کا مذاق اڑاتے تھے۔

عالم گیر ثانی کے عہد میں یہ سلسلہ اور بھی ترقی کر گیا، حکومت مغلیہ کے قریباً تمام صوبے یا آزاد ہو چکے تھے یا باغی عناصر نے ان پر قضبہ کر لیا تھا، غیر ملکی حملوں کا سلسلہ جاری ہو چکا تھا، مرہٹوں

---

۱ - سرکار جلد اول صفحات ۱۹۴، ۱۹۵ -

کے حملوں سے پورا ملک تہ و بالا تھا ۔ عماد الملک پر بھی مرہٹوں نے دباؤ ڈالا کہ ۵۰ لاکھ روپے ادا کرے ، وہ رقم کہاں سے ادا کرتا ، سرکاری ملازموں کی تین سال کی تنخواہ بھی ادا نہ ہوئی تھی ، آخر جبریہ وصولی شروع کی؛ تجارتی مال پر ٹیکس لگا دیا ، دکان داروں اور تاجروں نے هڑتال کر دی تو عماد الملک نے مرہٹوں کو ۲۲ گاؤں سہارنپور کے اور کچھ خالصہ زمین اور صرف خاص کی زمین دے ڈالیں ، فوجوں نے بغاوت کی اور عماد الملک کو رسوا کیا ، آخر ۷ جمادی الاول ۱۱۷۰ھ مطابق ۲۸ جنوری ۱۷۵۷ء میں شاہ ابدالی نے دلّی پر حملہ کیا اور اس طرح دلّی کو لوٹا کہ لوگ نادر گردی کو بھول گئے ۔ واپسی کے وقت بھی ابدالی فوج نے اچھی طرح لوٹا ، دوبارہ داخلہ مرہٹوں سے فیصلہ کن لڑائی کے سلسلے میں ہوا ، پانی پت کی جنگ سے پہلے مرہٹوں نے دلّی پر قبضہ کیا، دیوان خاص قلعۂ دهلی کی چاندی کی چھت اکھیڑ لی ، محمد شاہ کی قبر سے اور نظام الدّین اولیاؒ سے سونے چاندی کے برتن وغیرہ قبضے میں کیے گئے اور پانی پت کی فتح کے بعد ۲۹ جنوری ۱۷۶۱ء کو شاہ ابدالی دهلی میں آیا ، دو ماہ قیام کیا ، اس مرتبہ بھی بری طرح لوٹا جس کا معاصرین تفصیلی ذکر کرتے ہیں؛ دلّی کے لوگوں پر جو کچھ بیتی اُس کا بیان ممکن نہیں البتہ هزاروں خاندان دهلی سے ترک وطن کر گئے ۔ اس سے قبل مرہٹوں کے حملوں سے بر صغیر پاک و هند پامال هو چکا تھا اور هندو مسلمان اُن کے هاتھوں تباہ هو رہے تھے، عماد الملک نے عالم گیر ثانی کو قتل (۸ ربیع الثانی ۱۱۷۳ھ مطابق ۲۹ نومبر ۱۷۵۹ء) کر کے محی الملت کو تخت نشین کر چکا تھا مگر جب ابدالی بر صغیر پاک و هند میں داخل هوا تو عالی گوهر کو جو بنگال مین تھا نامزد کر کے بھرت پور میں پناہ گزین هو چکا تھا ، ادهر عالی گوهر شاہ عالم کے لقب سے ۴ جمادی الاول ۱۱۷۳ھ مطابق ۲۴ دسمبر ۱۷۵۹ء کو کھٹولی متصل پٹنہ میں تخت نشین هو چکا تھا اور آوارگی کے ایام پورے کر رها تھا ، بکسر کی لڑائی (۲۳ اکتوبر ۱۷۶۴ء) کے بعد اُس نے اپنی قسمت انگریزوں کے حوالے

کر دی ، کمپنی کے ہاتھوں جو کچھ بہار بنگال وغیرہ میں گذرا ، اُس کی داستان بہت طولانی ہے ؛ مختصراً بقول علامہ عبداللہ یوسف علی یہ کہا جا سکتا ہے کہ اقتصادی تباھی سے معاشرتی اور اخلاقی تباھی بھی ھو گئی ، وہ لکھتے ھیں :—

سیاسی انقلابات کے بعد اقتصادی انقلابات نہایت ھی ھولناک واقع ھوے اور اُن کی اھمیت اور حقیقت کا اظہار صاف صاف الفاظ میں نہیں ھو سکتا ہے ؛ بنگال جو مغلیہ سلطنت کا سب سے زرخیز اور خوش حال صوبہ تھا اور جسے سلطنت ھند کی پیداوار کا ذخیرہ کہا جاتا تھا ، اُس کا اب یہ حال ھو گیا کہ چند ھی دنوں میں غیر آباد ھو کر رہ گیا ، کاشتکار زمینیں چھوڑ چھوڑ کر بھاگ گئے ، زمینداروں کو کاشت کے لیے کاشتکاروں کی خوشامد کرنی پڑتی تھی ، جدید نظام مال گزاری جس کی رو سے نہایت سخت لگان عائد کیا گیا تھا اور اُس پر عمل بھی نہایت سختی سے ھونے لگا تھا ، اکثر زمینداروں کی تباھی کا باعث ھوا ، ذاتی تعلقات کا لحاظ جو پرانے دستور العمل کی کامیابی کا راز تھا ، نئے نظام میں بالکل مفقود تھا ، ۱۷۷۰ء کے قحط کا اثر ملک پر کئی سال تک باقی رھا ، انگلستان کا ایک وکیل ولیم ھکی ۱۷۸۲ء اور ۱۸۰۸ء کے درمیان میں تین بار ھندوستان آیا اور آخری مرتبہ قریباً ڈیڑھ لاکھ روپے کی رقم خطیر اپنے ساتھ لے گیا ، اس نے ۱۷۸۹ء کے قحط کا حال اپنی کتاب میں لکھا ہے : اس قحط کے زمانے میں کلکتے کے شہر میں بے کس اور لاچار لوگوں کا ایک دریا اُمڈا چلا آ رھا تھا ، نعشیں اور سسکتے ھوے لوگ جا بجا بر سرِ راہ پڑے ملتے تھے ، متواتر کئی ھفتے تک روزانہ پچاس کی اوسط تعداد میں لوگ مرتے رھے ۔ (صفحات ۹ ، ۱۰ انگریزی عہد میں ھندوستان کے تمدن کی تاریخ) ۔

وین سٹارٹ کمپنی کے ملازموں کی بدعنوانیوں کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے :—

جہاں تک تجارت کا تعلق ہے ، میر جعفر سے کسی جدید رعایت کا

مطالبہ نہیں کیا گیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ کمپنی کو مزید مراعات کی ضرورت بھی نہ تھی . . . . تاہم جب ہمارا سیاسی اثر رو نما ہوا تو اس وقت کمپنی کے ملازموں نے ان اشیاء کی تجارت شروع کر دی جن کی انہیں اجازت نہ تھی -

سیر المتاخرین کا مصنف بنگالی رعایا کی تباہی کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتا ہے :—

انگریز اپنی رعایا کے لیے کسی قسم کا التفات روا نہیں رکھتے ، انہیں رعایا سے کسی قسم کی ہمدردی نہیں۔ وہ لوگ جو انگریزی حکومت کی رعایا ہیں ہر جگہ تباہ ہو رہے ہیں — انہیں مفلس بنا دیا گیا . . . . . . اے خدا اپنے مظلوم اور تباہ حال بندوں پر رحم فرما ، اے خدا انہیں اس مصیبت سے نجات دلا جس میں وہ گرفتار ہیں۔ ایڈ منڈ برک کی فاکس ایسٹ انڈیا بل ۱۷۸۳ء پر یہ تقریر قابل غور ہے :— (کمپنی کی حکومت ۔ مؤلفہ باری صفحات ۹۸ ، ۹۹ طبع دوم) -

تاتاری حملہ یقیناً خراب تھا لیکن ہمارا تحفظ ہندوستان کو تباہ کر رہا ہے ، وہ تاتاریوں کی دشمنی تھی اور یہ ہماری دوستی ہے - ہمارے مفتوحہ علاقے کی بد حالی آج بھی ویسی ہے جیسے بیس سال پیشتر تھی . . . . ہر وہ روپیہ جو انگریز نفع میں حاصل کرتا ہے در اصل ہندوستان کا نقصان ہے ——————— (کمپنی کی حکومت صفحہ ۱۰۰) -

جیسا جیسا کمپنی کا حلقۂ اقتدار بڑھتا گیا ، لوگوں کے ذرائع آمدنی مسدود ہوتے گئے ، 'زبردست مارے اور رونے نہ دے' کا معاملہ تھا - نواب محمود خاں نبیرہ نواب ضابطہ خان (جنھوں نے جنگ آزادی میں حصہ لے کر شہادت پائی ۱۸۵۸ء) نے ایک خط میں [جو گورنر آگرہ (مٹکاف) نے نواب معین الدّین خاں کے مشاھرے کے بند ہونے کے بارے میں لکھا تھا اور واضح کیا تھا کہ تمھارے والد نے ۱۸ لاکھ سے زیادہ رقم کمپنی سے وصول

کی ، اگر وہ چاہتے تو تمھارے لیے جائداد خرید کر چھوڑ جاتے اور اگر اب کچھ دیا جائے گا تو مدد معاش کے طور پر لابدی ضروریات کے لیے] واضح کیا ہے کہ ہمارے والد معین الدّین خاں نے کمپنی کے ایما سے لاڈر لیک اور گورنر جنرل کے عہد و پیمان کے بعد قلعہ بھولگا اور دھرم کوٹ وغیرہ جاگیر راجگان پنجاب چھوڑ دی اور دولت راؤ سندھیہ اور جسونت راؤ ھلکر کے احسانات سے قطع نظر کر کے کمپنی سے تعلقات کیے اس لیے حسب ذیل وجوہ کی بنا پر مشاہرہ ہمارا حق ہے :-

۱ - گورنر جنرل نے وعدہ احسان اور سلوک اور اعزاز اور احترام روز افزوں تا قیام کمپنی اپنی مہر لگا کر کیا تھا ۔

۲ - مقررہ قاعدہ تمام حکومتوں کا رہا ہے کہ بعد انتقال رئیس وظیفہ اس کے متعلقین کا بند نہیں کرتی ہیں ، لاڈر لیک کے دیے ہوے وظیفہ وغیرہ بھی جاری ہیں ، ہمارے والد مقروض مرے ہیں اس لیے مشاہرہ بند کرنے کے معنی ہماری ہلاکت ہے ۔

۳ - قاعدہ یہ رہا ہے کہ ہر امیر کے انتقال پر بادشاہان وقت نے حکم کمی یا بیشی ان کی اولاد کے بارے میں صادر کیا ہے ، مطلقاً بند کرنے کا حکم نہیں دیا ہے ۔

۴ - ہندوستان میں مختلف سرکاریں تھیں ، اگر کسی وجہ سے کسی کی روزی کسی وجہ کے ایک سرکار سے بند ہو جاتی تو دوسری سرکار سے اس قدر یا اس سے زیادہ جاری ہوتی ۔ اب کہ خدا کے فضل سے تمام والیان ملک کی دولت سرکار کمپنی کے قبضے میں آ چکی ہے ، کمپنی کے محروم کہاں جائیں اور کس سے شکایت کریں ۔

۵ - بادشاہان روے زمین شرفا ، نجبا ، امرا اور رؤسا کی وجہ معاش اس وجہ سے مقرر کرتے تھے کہ بادشاہ وقت خلیفہ فی الارض ہوتا تھا اور تمام ہر قوم کے لوگوں کے رزق کا کفیل ۔ دوسری بات یہ ہے کہ وظیفہ یاب

لوگ لڑائی کے دن معاونت کرتے اور ان کی دعائیں بھی مشکل کشائی کرتیں - تیسری صورت یہ ہے کہ مخلوقِ خدا کسی سرکار سے وابستہ نہ ہو اور ان کی معاش اور گزران کے تمام وسائل جو اس حکومت سے وابستہ ہوں مسدود ہو جائیں تو لا محالہ ایسی حکومت برباد ہوگی - وغیرہ وغیرہ

اس خط پر بھی کوئی کار روائی نہ ہوئی تو جلال الدّین خاں (برادر خورد محمود خاں) نے دکن جانے کا اردہ کیا اور ۱۰ جنوری ۱۸۳۷ء مطابق ۲ شوال ۱۲۵۲ھ کو آگرہ پہنچ گئے ، کمشنر بریلی نے بھی اطلاع دی کہ کچھ وظیفہ مقرر کر دیا جائے ورنہ دکن چلے جائیں گے اور وہاں جانا مناسب نہیں - گورنر نے سو سو روپیہ ماہانہ تنخواہ مقرر کر دی ، جلال الدّین خاں نے قبول کر لی لیکن محمود خاں نے قبول نہ کی ، ستمبر ۱۸۳۸ء میں محمود خاں کی تنخواہ ہزار روپیہ مقرر ہوئی - (تذکرۂ کاملان رام پور مؤلفہ حافظ احمد علی خاں صفحات ۳۶۶ تا ۳۸۳) -

اس ایک واقعے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب تمام شرفا جن کے وظیفے بند ہوئے یا املاک ضبط ہوئیں، یعنی خواص نان شبینہ کو محتاج ہوجائیں تو عوام کی بد حالی کس حد تک پہنچ چکی ہوگی ، دلّی کے باشندے ابدالی کے حملوں میں ترک وطن کر کے فیض آباد ، لکھنؤ ، فرخ آباد ، عظیم آباد اور مرشد آباد وغیرہ میں جا کو آباد ہو گئے ، مرہٹوں کے اقتدار کے زمانے میں دلّی انتہائی بد حالی کو پہنچ چکی تھی لیکن اودھ میں خوش حالی تھی جیسا کہ واجد علی شاہ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے :-

دفعہ ۴۸ میں جنرل اوٹرم تجویز کرنل سلیمن مورخہ ۵ مارچ ۱۸۵۵ء لکھتے ہیں کہ خزانہ سلطانی تین برس سے خالی اور تنخواہ مردم فوج کی اور پچاس لاکھ بابت تنخواہ عملہ۔ آمدنی بہ نسبت خرچ کے کم اور بادشاہ کو قرض بھی نہیں ملتا ،......

"یہ سب خیالات بے اصل محض ہیں۔کل قرضہ قریب چالیس لاکھ ۔ اور

سب نوکر ہماری سرکار کے آٹھ لاکھ روپے کے ہیں... ہماری رقم مال گزاروں پر اس سے زیادہ واجب تھی۔ آخر اس جھوٹ سے مقصد ؟

دوسری دلیل — تقسیم کے وقت ۱۸۰۱ء میں ہمارے پاس ایک کڑور پینتیس لاکھ روپے کا ملک تھا... اب نان کاریں ، روزینہ ، چندہ تعلق داروں اور غریبوں کا دس بارہ تیرہ لاکھ روپیہ اس پر بڑھ گیا ہے۔ جرنل اوڈرم کی رپورٹ میں ایک لاکھ چوبیس لاکھ روپے ظاہر کیے ہیں، رقم نانکار وغیرہ بارہ تیرہ لاکھ روپے ملا کر ایک کروڑ پینتیس لاکھ روپے ہو جاتے ہیں۔ ہم نے رعایا سے زیادہ ستانی نہیں کی .....

دلیل چوتھی — اگر ہم ظلم وستم کرتے تو ملک ویران ہو جاتا ، معتمدالدولہ آغا میر با وصف کا زیادہ مال و دولت یہاں سے لے جانا ناگوار تھا ، جب تک زندہ رہا واپسی کی آرزو میں تھا ، مرنے کے بعد اس کے بیوی بچے سب کوشش کر کے یہاں آ گئے، قریب پچاس ہزار آدمی علاقہ اودھ کے سرکار کمپنی کی فوج میں نوکر ہیں اور ان کے بال بچے یہیں رہتے ہیں۔

پانچویں دلیل — خاص لکھنؤ کی آبادی سات برس میں کافی بڑھ گئی ہے ، ہزاروں مکان پختہ بن گئے ، خوش حالی کا اندازہ خوش پوشاکی وغیرہ سے ہو سکتا ہے۔

دلیل چھٹی۔ بقایا کی وصولیابی کا طریقہ ہمارے یہاں یہ ہے کہ کبھی معاف ہو جاتا ہے ، کبھی دو تین برس میں وصول کیا جاتا ہے ، کبھی خام تحصیل کے سپرد ہو جاتا ہے لیکن کمپنی کے علاقہ بنگالہ میں دیکھ لیا جائے کہ بیسواں حصہ زمینداروں کا نہ رہا ، سب نیلام مطالبے میں کر لیا اور آج وہ لوگ بھیک مانگ رہے ہیں۔

ملازمین اور پیشہ وروں کے بارے میں واجد علی شاہ نے مزید کہا ہے:—

قریب لاکھ نوکر اس سرکار کے — قریب لاکھ کے کے نوکر ہمارے نوکروں کے اور لاکھ نوکر زمینداروں ، مال گزاروں کے بے روزی ہوگئے، موقوفی

روزی زیادہ قتل نفسی سے کہی جاتی ہے ، آج تو لاکھوں آدمی برباد ہوگئے ، آئندہ جو کچھ ہو سو ہو۔ دوسرے موقوف ہو جانا بہت سی نانکاروں ، یومیوں ، چندوں کا کہ سبب بربادی بہت آدمیوں کا ہوا ۔ تیسرے متصدی اہل قلم کہ پشتہا پشت سے نوکر اس سرکار کے تھے ، بالکل موقوف ہو گئے ، کیوں کر انصاف ہو سکتا ہے کہ رہنے والے اس ملک کے کہ حق خدمت اور مدد کرنے کا سرکار پر رکھتے تھے ، معاش سے بے نصیب ہو جائیں اور لوگ رہنے والے غیر ملکوں کے کہ ان کو اس ملک میں کچھ حق نہیں ہے ، چاکریاں پاویں ۔

چوتھے سوداگر پارچہ ریشمی وغیرہ کے مثل اطلس اور گرنٹ اور کمخواب اور گل بدن اور مشروع اور آور پیشے والے مثل زری بافوں اور گوٹہ بافوں کے سب کا کام خراب ہو گیا ، کس واسطے کہ جس قدر پہننا ایسی چیزوں کا ہمارے ملک میں اور ہماری سرکار میں رواج تھا ، اور جگہ نہیں ۔ مشہور ہے مال ساخت بنارس سے تین حصے فقط ہمارے ملک میں صرف ہوتا تھا ، باقی آور سب ملکوں میں اور بنگالہ وغیرہ میں ۔ ظاہر ہے کہ ہزار میں سے ایک آدمی ایسا لباس پہنتا ہوگا بالجملہ کلکتہ سے بنارس الہ آباد تک جو ملک جمعی ڈیرھ کروڑ کا فرض کیا جائے ، ہمارے ملک کی رونق سرسبزی سب بات میں اس سے زیادہ ہوگی ۔ [جواب بلو بک (ضبطی اودھ) از جانب نواب واجد علی شاہ تاجدار اودھ مطبوعہ صفحات ۲۸ تا ۳۶] ۔

اقتصادی بد حالی کے پیش نظر دلی سے ارباب کمال ترک وطن پر مجبور ہو گئے تھے ، یہ سلسلہ محمد شاہ کے آخر عہد سے شروع اور بہادر شاہ کے عہد تک جاری رہا ۔ سوز اور سودا گئے ، میر اور قائم نکلے ، آخر میں شاہ نصیر نے خاک دکن میں آرام کیا ، غالب اور مومن کی بھی آرزو یہی تھی مگر دلی کی محبت نے دامن نہ چھوڑا ، غالب کلکتے گئے اور پھر مرکز پر آ گئے ، مومن نے اپنے چچا کو ایک خط میں لکھا :۔

که دلّی جاہل بد اعمال کفار کے قبضے میں ہے اور شریف اور نجیب کی قدر کرنا کیمیا کی طرح نایاب اور دولت اور اقبال عنقا، مجبوراً لکھنؤ جانے کا ارادہ ہے وہاں اگر مقصد دلی حاصل نہ ہوا تو دکن آنے کا خیال ہے جہاں راجا چندو لال شاعروں کی خصوصاً قدر دانی کر رہا ہے ...

اس سے واضع ہوتا ہے کہ جہاں جہاں ریاستیں تھیں وہاں کچھ نہ اقتصادی حالات سازگار تھے اور کمپنی کے علاقے میں اقتصادی نظام عمّال حکومت کے ہاتھوں درہم و برہم تھا۔

مرزا مظہر جان جاں کے حالات میں ملتا ہے کہ وہ دعوت کے قبول کرنے میں تامل کرتے اور فرماتے تھے :-

اگرچہ دعوت قبول کرنا سنت طریقہ ہے لیکن اس زمانے میں نیتوں کے بگاڑ اور شرائط نہ ہونے کی وجہ سے اسکا نہ قبول کرنا بہتر ہے اسلیے کہ اکثر لوگ تنگیٔ معاش سے معذوری اور مجبوری کی حالت میں ہیں، دعوت کا کیا ذکر اور تکلف کر کے زر سود سے دعوت کرتے ہیں، اس سے دعوت کی مشروعیت واضح ہے اور میں نے اس قسم کی دعوتوں کے نقصانات کا تجربہ اور نور فراست سے اندازہ کر کے ترک کرنا ضروری سمجھا ہے ...

(معمولات مظہریہ صفحہ ۱۱۳ مطبع محمدی لاہور)

مذہبی فضا

برصغیر پاک و ہند میں مذہب کا ہمیشہ اقتدار رہا، اکبر کا دین الٰہی حکومت کے بل بوتے پر بھی نہ چل سکا، دارا کی شکست اور عالم گیر کی فتح کا فیصلہ مذہب کی قوت اور پشت پناہی سے ہوا، عالم گیر سُنی تھا اور فتاوائے عالم گیری اُس کے عہد حکومت کا زریں کارنامہ ہے، اُس کے بیٹے محمد معظم اور اعظم مختلف نظریات میں الجھے رہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مسلم فرقوں کو تنظیم کا موقع مل گیا۔ مرہٹوں کی تنظیم بھی

مذہبی رنگ میں کی گئی تھی ، اب سکھوں نے بھی جنگی بنیادوں پر اپنے مذہب کو چلایا ، بابا بندہ نے اس حقیر جماعت کو آسمان پر پہنچا دیا، راجپوت عالم گیر کی زندگی میں خاموش رہے لیکن اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی راجپوتوں نے مسلمانوں کو تنگ کرنا شروع کر دیا - یہ کشمکش کبھی دب گئی کبھی ابھر گئی ؛ احمد آباد میں ہولی پر ہندو مسلم فساد ہوا ، دھلی میں حافظ عبداللہ واعظ ملتان اور خواجہ جعفر برادر صمصام الدولہ کی گفتگو شیعہ سنی مناظرے تک پہنچ گئی ، دونوں کو دھلی سے نکال کر یہ شورش ختم کی گئی ، پھر کشمیر میں ہندو مسلم فساد ہوا ، سید حسین علی خاں اور سید عبد اللہ قطب الملک نے اپنے عہد امارت میں معاملات مذہبی بھی اپنے دیوان رتن چند کے سپرد کر دیے اور قاضیوں اور مفتیوں کا تقرر اس کے مشورے سے ہوتا ، اس سے مسلمانوں نے سبکی بھی محسوس کی لیکن کاروبار چلتا رہا ، دلّی میں ۱۰ شعبان ۱۱۴۱ھ کو مسلمان جوتہ فروش ہولی کے ہنگامے میں شہید ہوا ، قاتل ہندو جوھری تھا ، مسلمانوں نے استغاثہ کیا لیکن روشن الدولہ نے جوھری کی حمایت کی ، قمرالدین خان وزیر اعظم نے مسلمانوں کی حمایت کی اور نتیجہ یہ ہوا کہ جامع مسجد میں جمعہ کے دن روشن الدولہ کی خوب کفش کاری ہوئی ، بڑی مشکل سے جان بچائی اور یہ ہنگامہ کافی بڑھ گیا لیکن یہ معمولی واقعات ہندو مسلم تعلقات پر اثر انداز نہ تھے - مرقع دھلی (مؤلفہ سالار جنگ درگاہ قلی خاں متوفی ۱۱۸۰ھ) سے مسلم مقابر وغیرہ پر ہندوؤں کی آمد و رفت ثابت ہوتی ہے :-

حضرت نصیر الدین چراغ دھلی | مزار انور پرانی دلی سے تین کوس پر واقع ہے - اتوار کا دن زیارت کے لیے مخصوص ہے ، خصوصاً دیوالی کے مہینے میں عجیب ہجوم ہوتا ہے - اس مہینے میں ہر اتوار کو پوری دھلی کی آبادی زیارت کو جاتی ہے اور خیمے ڈیرے قائم کر کے مزار کے اطراف میں جو چشمے ہیں ، غسل کرتے ہیں ، اکثر متعدی امراض سے شفا پاتے ہیں ،

مسلمان اور ہندو دونوں زیارت میں ایک دوسرے پر سبقت کرتے ہیں، دن نکلنے سے سورج ڈوبنے تک قافلے آتے جاتے رہتے ہیں، عرس مبارک بھی شاندار ہوتا ہے، محمد شاہ بادشاہ نے مرقدِ مبارک کا پختہ احاطہ بنوا دیا ہے، اتنا بڑا صحن کسی درگاہ کا نہیں۔

ایک طرف تو رقص و سرود اور شعر و سخن کی محفلیں برپا ہوتیں اور دوسری طرف قرآن و حدیث کے ذکر و اذکار ہوتے، صوفیائے کرام کا اثر مجلسی زندگی میں نمایاں نظر آتا ہے۔ میر محمد حسین نے بیگو گیت کا دعویٰ کیا، فرخ سیر اور محمد شاہ اس کے معتقد تھے، محمد شاہ نے فقرا کو خطابات عطا کیے۔ مصنف مرقع سخن نے حافظ شاہ سعد اللہ، شاہ غلام محمد، میر سید محمد، شاہ کمال، شاہ رحمت اللہ اور مرزا مظہر جان جاں وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

اودھ میں ملا نظام الدین فرنگی محلی اور دلّی میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی اولاد نے علوم معقولی اور منقولی کی اشاعت میں جس قدر کوشش کی، اس سے بر صغیر پاک و ہند کے تمام گوشے منور ہو گئے، مولانا عبدالعلی بحرالعلوم شمع علم روشن کیے ہوئے تھے اور ادھر شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، دونوں آفتاب و ماہتاب تھے، علما مذہبی احکام کے رائج کرنے میں حکومتِ وقت سے مرعوب نہ ہوتے تھے، صوفی عالم تھے اور عالم صوفی، علمِ دین کے مرکز بے شمار تھے، جہاں جہاں امرا اور رؤسا ہوتے وہیں دو چار علما بھی نظر آتے، غازی الدین خاں کا مدرسہ دلّی میں بڑے مدرسوں میں شمار ہوتا تھا، مرزا مظہر جو صوفی اور شاعر شمار ہوتے ہیں، ان کی نسبت شاہ ولی اللہ لکھتے رہے ہیں:—

آں چہ قدر ایشاں ما مردم می دانیم، شما چہ دانید، احوالِ مردم ہند بر ما مخفی نیست کہ خود مولد و منشا فقیر است وبلادِ عرب را نیز دیدہ ایم و سیر نمودہ، احوال مردمِ ولایت از ثقات آں جا شنیدہ ایم و تحقیق کردہ کہ عزیزے بر جادۂ شریعت و طریقت و اتباع کتاب و سنت ہم چنیں استوار و مستقیم باشد

و در ارشاد طالبانِ شانِ عظیم و نفس قوی دارد ، دریں جزوِ زماں مثلِ ایشاں در بلادِ مذکور یافته نمی شود بلکه در هر جزوِ زمان و وجود ایں چنیں عزیزاں کمتر بوده است ، چه جائے ایں زماں که پر فتنه و فساد است. . . . (ود کوثر صفحات ۶۳۷ ، ۶۳۸ از شیخ اکرام) -

مولانا فخرالدین دهلوی کا فیضان بھی دهلی میں عام تھا اور عمادالملک جیسا متلون مزاج اُن کے زمرۂ مریدیں میں نظر آتا ھے - رام پور کا دینی مدرسہ ۱۷۷۴ء میں قائم ھوا اور مولوی عبدالعلی بحرالعلوم اور ملا حسن برادر عم زاد بحرالعلوم اس کے ابتدائی اساتذہ میں تھے - اسی طرح غوث گڑھ ، بریلی ، لکھنؤ ، بھوپال ، حیدر آباد وغیرہ کے دینی مدارس تھے - رام پور کے علماء میں بیشتر وہ ھیں جو برصغیر پاکستان سے روھیل کھنڈ پھنچے اور وھیں ابدی نیند سو گئے - صوفیا میں بھی مشہور صوفی حافظ جمال اللہ گجراتی (متوفی ۳ صفر ۱۲۰۹ھ) اور مولانا جمال‌الدین لاھوری شاگرد شاہ ولی اللہ محدث دھلوی و خلیفۂ مولانا فخرالدین دھلوی پنجاب سے رام پور پھنچے اور مخلوق کو راہِ حق دکھا کر واصل بحق ھو گئے - مولانا جمال‌الدین نے ایک سو تین سال کی عمر میں ۲۹ جمادی الاول ۱۲۴۱ھ میں وفات پائی - شریعت اور طریقت کا یہ ملا جلا رنگ اسلام کی اشاعت میں ممد و معاون ھوا ، نجیب‌الدولہ کے عہد امیرالامرائی میں علوم دینی کی اشاعت کا چرچا تھا ؛ حکیم قدرت اللہ قاسم کا بیان ھے کہ میں نے بھی اسی عہد میں تعلیم حاصل کی لیکن مادھو جی پٹیل کے اقتدار نے دھلی کی مجلسی زندگی بدل دی ، مرزا مظہر اس زندگی سے بیزار نظر آتے ھیں :—

به جذب قسمت و جاذبۂ احباب فقیر از دهلی به سنبهل رسید و امروهه و مراد آباد راهم دید تا به انتخاب پردازد که رخت اقامت در کجا اندازد و متعلقاں را طلبیده نگاه دارد ، که از تشویشات هر روزۂ دهلی تنگ آمده ام— آدم برائے طلب متعلقان فرستادم ، آنها عذر هاے مسموع نوشته ناچار مراجعت دهلی اتفاق افتاد - (مکتوب چهلم ۱۱۸۵ھ صفحه ۴۸ کلمات طیبات) -

۱۱۶۶ھ میں عمادالملک اور صفدر جنگ کی آویزش بڑی خطرناک صورت اختیار کر گئی اور عمادالملک نے صفدر جنگ کے وزارت سے ہٹانے کے لیے مذہبی حیلہ تراشا ، شیعہ سنی ، نعرہ دلی کی فضاؤں میں گونجا اور صفدر جنگ کی روانگی (محرم ۱۱۶۷ھ) کے بعد یہ نعرہ اودھ کی فضاؤں میں تحلیل ہو گیا۔ پانی پت کی جنگ کے بعد شجاع الدولہ کے ہمراھیوں اور پٹھانوں میں اسی اختلاف کی بنا پر تلواریں کھنچ گئیں اور آصف الدولہ کے عہد میں یہ آویزش علمی حیثیت میں نمودار ہوئی ، دھلی کی تہذیب میں جو بات دبی ہوئی تھی وہ اودھ میں کھل گئی - بہادر شاہ کے عہد میں بھی کچھ نامی علما دہلی میں رہ گئے تھے ، سر سید احمد خاں نے چند علما کا ذکر آثارالصنادید میں کیا ، اس میں اکبر ثانی کے عہد کے علما بھی شامل ہیں :-

۱ - مولانا شاہ عبدالعزیز خلف شاہ ولی اللہ ، پندرہ سال کی عمر میں فارغ التحصیل ہوئے ، مولانا رفیع الدین اور مولانا عبدالقادر آپ کے بھائیوں نے آپ ھی سے تعلیم پائی ، علم حدیث و تفسیر بعد آپ کے تمام ھندوستان سے مفقود ہو گیا - اسی برس کی عمر میں بھی دریائے علمی موجزن تھا (ولادت ۱۱۵۹ھ ، وفات ۷ شوال ۱۲۳۹ھ)

۲ - شاہ رفیع الدین خلف شاہ ولی اللہ ، تحصیل علم عموماً اور سند حدیث خصوصاً اپنے والد سے لی - (ولادت ۱۱۶۳ھ، وفات ۵ شوال ۱۲۳۳ھ)

۳ - مولوی عبدالقادر صاحب خلف شاہ ولی اللہ . . . تمام عمر مسجد اکبر آبادی کے ایک حجرے میں بسر کی . . . (ولادت ۱۱۶۷ھ وفات ۱۲۲۸ھ مطابق ۱۸۲۳ء) -

۴ - مولوی مخصوص اللہ فرزند رشید مولانا رفیع الدین . . . بیس پچیس برس تک شاہ عبدالعزیز صاحب کے وعظ میں قرأت کلام مجید و حدیث کی ، علم میں یکتا ، اب گوشہ نشین ھیں - (وفات ۱۲۷۳ھ مطابق ۱۸۵۷ء)

۵ - مولانا عبدالحی شاگرد و داماد شاہ عبدالعزیز صاحب ؛ مناظرے میں بے نظیر . . . سید احمد صاحب کی بیعت کے بعد تا دمِ زیست آپ کے ساتھ رہے ، بواسیر سے انتقال ہوا - (۸ شعبان ۱۲۴۳ھ)

۶ - محی السنت قامع البدعت مولانا محمد اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ . . . . شاہ عبدالقادر صاحب نے ان کے والد کے مرنے کے بعد بطور فرزند پالا اور اپنی نواسی بھی انھیں دی ، پندرہ سولہ برس کی عمر میں فارغ ہوئے ، معقولات و منقولات میں بے مثل . . . فقہ کا یہ حال تھا کہ ہر مسئلے کو آیات و حدیث کے ساتھ مستند فرماتے . . . سید احمد صاحب سے بیعت کی ، حج سے مشرف ہوئے ، بدعات کی مخالفت میں کافی خطرات مول لیے اور آخر میں ان کے اثر سے نماز جمعہ عید جیسی ہونے لگی ، روز جمعہ اور سہ شنبہ کو مسجد جامع میں وعظ کہتے ، چودہ پندرہ برس ہوئے کہ بالا کوٹ میں شہید ہوئے - (۱۲۴۶ھ)

۷ - مولانا محمد اسحٰق نواسہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے ، نانا سے حدیث پڑھی اور بیس سال تک اُن کے سامنے طلبہ کو پڑھائی ، بعد وفات شاہ صاحب خلیفہ ہوئے ، حج فرمایا ، پھر تشریف لا کر مواعظ و نصائح سے خلق کو راہ دکھائی ، بعد مدت کے از بسکہ شعائر اسلام میں ضعف اور رسوم کفر و بدعات میں قوت ہوتی جاتی تھی ، نیت ہجرت کو مصمم کر کے تمام قبایل کو ہمراہ لے کر راہی مکہ معظمہ ہوئے - ایک سال انتقال کو ہوا - (ولادت ۱۱۹۲ھ وفات ۱۲۶۲ھ)

۸ - مولوی محمد یعقوب کہیں برادر مولوی محمد اسحٰق . . . علم و فضل میں اقران روزگار سے پایہ کم نہیں رکھتے تھے . . . بھائی کے ساتھ ہجرت کی - (وفات ۲۷ ذی قعدہ ۱۲۸۱ھ) -

۹ - مولانا محمد صدر الدین خاں ، صدرالصدور دھلی شاگرد شاہ عبدالعزیز

صاحب (ولادت ۱۲۰۴ھ متوفی ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ء) ۔

۱۰ - مولوی رشید الدین خاں شاگرد رشید مولانا رفیع الدین نیز شاگرد شاہ عبدالقادر صاحب و عبدالعزیز صاحب ، علم ھندسہ و ھیئت میں یکتا ، مدرس مدرسہ شاہ جہاں آباد ، ستر برس کی عمر میں انتقال ھوا ، وفات کو تیرہ چودہ برس ھوئے (۱۲۴۶ء) ۔

۱۱ - مولانا فضل امام خیرآبادی حاوی علوم معقول ، و منقول ، سند اکابر روزگار ۔ (۵ ذی قعدہ ۱۲۴۴ھ)

۱۲ - مولانا نواب قطب الدین خاں تحصیل علم فقہ و احادیث مولانا محمد اسحاق صاحب سے کی ، تقرب سلطانی حاصل ہے ۔ (ولادت ۱۲۱۹ھ وفات ۱۲۸۹ھ)

۱۳ - مولوی فضل حق خیر آبادی خلف مولوی فضل امام ، تحصیل علوم عقلیہ و نقلیہ کی اپنے والد سے کی ، جمیع علوم اور فنون میں یکتائے روزگار ھیں اور منطق اور حکمت کی تو گویا انھیں کی فکر عالی نے بنا ڈالی ہے ۔ (ولادت ۱۲۱۱ھ وفات ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ) ۔

۱۴ - مولوی عبدالخالق ۔ ۱۵ - مولوی نذیر حسین ۔ ۱۶ - مولوی محبوب علی ۱۷ - مولوی نصیر الدین شافعی ۔ ۱۸ - مولوی کریم ۔ ۱۹ - مولوی محمد نورالحسن ۔ ۲۰ - مولوی کرامت علی ۔ ۲۱ - مولوی مملوک العلی ۔ ۲۲ - مفتی سید رحمت علی خاں ۔ ۲۳ - آخون شیر محمد ۔ ۲۴ - مولوی سید امان علی ۔ ۲۵ - مولوی محمد جان ۔ ۲۶ - نوازش علی ۔ ۲۷ - مولوی محمد رستم علی خاں ۔ ۲۸ - حاجی محمد ۔ حفاظ وغیرہ ۔

مذھب کا احترام لوگوں کے دلوں میں جاگزیں تھا ، انگریزی تہذیب و تمدن سے نفرت تھی ، دین میں پختگی دلیل شرافت سمجھی جاتی ، انحراف کی جرأت لوگوں میں نہ تھی ۔ بہادر شاہ ظفر نے اودھ کی دولت و ثروت سے مرعوب ھو کر اور اپنی کم مائیگی کا خیال کرتے ھوئے تبدیلیٔ مذھب کا ارادہ کیا ، عوام میں چرچا ھوا اور بڑی لے دے ھوئی ، آخر کو بہادر شاہ

نے اپنی صفائی پیش کی اور غالب نے مثنوی لکھ کر بادشاہ کا حق نمک ادا کیا۔ سلاطین مغلیہ مذہبی تقاریب بڑے اہتمام سے مناتے تھے، وقائع عالم شاہی میں ہے:

۲۰ محرم ۱۱۹۹ھ۔ حکم دیا کہ حضرت حسنینؓ اور شہدائے کربلاؓ کی نیاز کا کھانا اور شربت تیار ہوں۔

یکم شوال ۱۱۹۸ھ۔ جامع مسجد آگرہ میں نماز پڑھی۔

بہادر شاہ کے عہد تک مذہب کا احترام شاہان وقت کرتے اور ہندو مسلم تقاریب میں ذاتی دلچسپی ظاہر کرتے، عوام اور خواص مذہبی رنگ میں ڈوبے ہوئے، مذہب کے احکام سے سرکشی کی تاب کسی میں نہ تھی۔ بہادر شاہ کے متعلق رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں:—

مذہبی معاملات میں بہادر شاہ اتنے خوش عقیدہ تھے کہ وہ جن مراسم اور تقریبوں میں حصہ لیتے تھے، یہ غور نہیں کرتے تھے کہ حقیقتاً ان کی مذہبی حیثیت کیا ہے؟

آخری چہار شنبہ کے مراسم:۔ بادشاہ سلامت لال قلعے میں رونق افروز ہیں، ماہ صفر کے آخری چہار شنبے کے دن باغ حیات بخش میں تشریف لے گئے، مٹی کی ایک ہانڈی میں خود بدولت نے اشرفی ڈالی، ہانڈی کو پاؤں سے توڑ کر زمین کی گھاس کو پاؤں سے روندا، پھر دیوان خانے میں آ کر مسند آرا ہو کر دربار کیا، مرشد زادے اور ملازم آداب بجا لائے، منصرم جواہر خانہ نے کشتی میں سونے چاندی کے چھلے پیش کیے، حضور نے پانچ چھلّے اٹھا کر اپنی انگلی میں پہن لیے، پندرہ چھلّے زینت محل کو اور پانچ دوسری بیگمات کو دیے . . .

(بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد، صفحہ ۱۳۹)

اسی طرح محرم کے مہینے میں بادشاہ فقیر بنتے، سبز کپڑے پہنتے اور گلے میں سبز جھولی ڈالتے تھے اور چاندی کی زنجیر کمر میں ڈال کر

گشت کرتے تھے ۔ ساتویں کی مہندی بڑی دھوم دھام سے آٹھتی تھی . . .
(صفحہ ۱۳۱)

دوسرے فرقوں کے پیشواؤں کا احترام مجلسی زندگانی کا اہم جزو تھا ان کی مذھبی تقاریب میں شرکت کی جاتی اور ان کی خوشنودی حاصل کرنا ضروری سمجھی جاتی تھی ، اردو شعرا بھی اس میں حصہ لیتے تھے اساتذہ کے کلام میں ہولی اور بسنت وغیرہ کی نظمیں ملتی ھیں ۔ نواب آصف الدولہ ھوں یا دوسرے مسلم امرا اپنی رعایا کی دل دھی کے لیے ایسی تقریبوں میں حصہ لیتے چنانچہ بہادر شاہ کے حالات میں ھے :۔

تقریب ھولی کے سلسلے میں حضور والا نے اهل کاروں کی نذریں قبول فرمائیں ، تخت کے کہاروں کو ایک اشرفی انعام میں عنایت فرمائی اور ارشاد فرمایا آج چھٹی ھے جاؤ ، گاؤ بجاؤ ، پیو پلاؤ پھر . . . .
(بہادر شاہ ظفر اور ان کا عہد ، صفحہ ۱۷۳)

یہ تھی مذھبی فضا جس سے امیر ، غریب عالم ، جاھل ادیب اور شاعر سبھی شرشار تھے ۔

علمی و ادبی ماحول

ایک زمانہ تھا کہ شاھان وقت علمی مسائل سے واقفیت رکھتے تھے اور ان کے اوقات میں سے علمی مسائل کے لیے بھی وقت مخصوص تھا ، امرا بھی ان کی تقلید میں معلومات کی کوشش کرتے ، خود تحصیل علمی کرتے اور مصاحبوں میں علما ، فضلا کو شامل کرتے ۔ اورنگ زیب کی علمی دلچسپیاں مشہور ھیں لیکن اس کے بیٹے بھی اس کے نقش قدم پر چلے ؛ چنانچہ محمد معظم (شاہ عالم اول) کے متعلق ذکا اللہ کا بیان ھے :۔

سفر کے اندر اکثر تعطیلوں اور جمعوں میں وہ خود نماز دربار کے خیمے میں پڑھاتا اور قران مجید کی سورتیں ایسے خوش لہجے اور قرأت میں

پڑھا کرتا کہ بڑے فصیح اہل عرب بھی اس پر فریفتہ ہو جاتے، وہ آخر شب کی عبادت کو کبھی ترک نہیں کرتا . . اول شب میں اس کے پاس فضلا و علمائے دینی کی ایک جماعت جمع ہوتی تھی، وہ حدیثوں کو خود بیان کرتا، اس کو بہت حدیثیں یاد تھیں اور علم فقہ خوب جانتا تھا، اس نے تمام فرقوں کے مذہبوں کی تحقیقات کی تھی اور آزاد خیالوں کی کتابیں پڑھی تھیں اور ہر ایک کے عقائد سے واقف تھا، اس سبب سے متعصب دینداروں نے اس کی مذہبی رایوں پر بدعتی ہونے کا الزام لگایا، اس کا سبب یہ تھا کہ اس کی قابلیت پر وہ حسد کرتے تھے . . (تاریخ ہندوستان جلد نہم صفحہ ۴۰)

شاہزادہ کام بخش کے متعلق بھی رائے سننے کی ہے :-

ارادت‌خاں شاہزادہ کام بخش کا حال یہ لکھتا ہے کہ اس کا حافظہ بڑا قوی تھا، وہ عالم تھا اور خوش‌تحریر منشی تھا۔(تاریخ ہندوستان جلد نہم صفحہ۳۳)

شاہ عالم اول کے وزیر خان خاناں کا ذکر کیے بغیر یہ داستان نا مکمل رہے گی :-

خان خاناں کے مزاج میں تصوف غالب تھا، علم سے بہرہ تھا۔ اس نے ایک کتاب علم سلوک اور تصوف میں تالیف کی، اس کا نام ’’الہامیہ‘‘ رکھا، بعض مقدمات و فقرات اس کے متکلمین کے نزدیک شرع کے خلاف تھے۔ (تاریخ ہندوستان جلد نہم صفحات ۲۵، ۲۶)

اسی طرح علمی اور ادبی سرگرمیاں ہر عہد میں جاری رہیں، محمد شاہ کے عہد کا مشہور امیر ’’صمصام الدولہ امیر الامرأ خان بہادر منصور جنگ‘‘ جو میر کے مربی بھی تھے، ان کے مکان پر علمی مباحث ہوا کرتے تھے، اس کا ذکر فائز دہلوی کے حالات سے ملتا ہے :-

فائز کے رسالۂ مناظرات میں وہ مکالمے درج ہیں جو فائز اور بعض‌علما میں امیر الامرأ صمصام الدولہ کے مکان پر مختلف اوقات میں بعض مذہبی‌مسائل کے متعلق ہوئے تھے..... (رسالہ آج کل سالنامہ ۱۹۵۱ صفحہ ۱۲ فائز دہلوی از ادیب لکھنوی)

ہر ہر شہر میں امرا کے مکانات پر ایسی علمی مجالس ہوتی تھیں اور باوجود حکومت کے انتشار کے لوگوں میں تحصیل علم و ادب کا ذوق تھا، لوگ دور دراز کے سفر کرتے اور اپنے ذوق کی تشنگی بجھاتے۔ کم سنی میں تکمیل علم ہو جاتی: شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، شاہ عبدالعزیز محدث، مولانا فضل حق خیر آبادی وغیرہ نے کم عمری میں تکمیل علوم کی اور آخر عہد میں مولانا ابوالکلام آزاد کی زندہ مثال ہے جنھوں نے ۱۴، ۱۵ سال کی عمر میں اپنی قابلیت کا لوہا منوا لیا۔ درگاہ قلی خاں نے ۱۱۵۱ھ کی ادبی مجالس کے ساتھ دوسری سرگرمیوں کا بھی ذکر کیا ہے، وہ بیدل کے ذیل میں لکھتے ہیں:

مرزا بیدل | قبر ان کی پرانی دلی میں ایک چھوٹے سے احاطے میں ہے، ۳ صفر کو عرس ہوتا ہے، ان کے تلامذہ اور شہر کے موزوں گو ان کی روح سے استفادہ کرنے حاضر ہوتے ہیں اور دور قمر کی طرح مجلس ترتیب دیتے ہیں۔ کلیات بیدل کا لکھا ہوا، درمیان میں رکھ کر شعر خوانی ہوتی ہے، اس کے عنوان پر یہ رباعی لکھی ہے:

اے آئینہ طبع تو ارشاد پذیر در کسبِ فوائد ننہائی تقصیر
مجموعۂ فکر ما صلائے عام است سیرے کن و قسمتِ تسلی برگیر

اس کے بعد اعلیٰ قدر مراتب ہر ایک اپنے اشعار سناتا ہے اور حاضرین محظوظ ہوتے ہیں۔ محمد سعید ان کا بھتیجا جو معنیٔ بیگانہ کی طرح مرزا کی نسبتِ معنوی سے بیگانہ ہے، حاضرینِ مجلس کی تواضع میں مشغول ہوتا ہے۔ . . (مرقع دہلی ورق ۸ نسخہ حبیب گنج)۔

مرزا مظہر جان جاں کے ذکر میں لکھتا ہے:۔

۳ صفر کو جو مرزا بیدل کا عرس ہوتا ہے، دہلی کے تمام شاعر ان کے مزار پرجمع ہوتے ہیں، بعد افتتاح دیوانِ مرزا بیدل کی پہلی غزل جو پڑھتا ہے، وہ آپ ہی ہیں اور در حقیقت ان کی تقدیم اربابِ معنی کے لیے مستحسن ہے، ان کا کلام از ابتدا تا انتہا دل گداز ہے۔ . .

شیخ علی حزیں کے متعلق قیام دہلی کا بیان خالی دلچسپی سے نہیں :-

ہندوستان بہشت نشان میں مہمان ہے ، بلندی طبع اور تقدس فطرت میں سخنورانِ زمانہ میں ممتاز ، ایرانی الاصل ہے ، وارستہ مزاجی کی بدولت بطور سیاح فقیرانہ لباس میں دہلی آیا ، ہر جگہ اور ہر محفل میں سر آنکھوں پر بٹھایا گیا ، گوشہ نشینی اختیار کی ہے اور نہایت استغنا سے زندگی بسر کر رہا ہے اور اغنیا حسنِ خدمت کے طور پر اُس کی ضروریات کی ذمہ داری لیے ہوئے ہیں ، سہ پہر کو صحن مکان میں صفائی اور آب پاشی ہو کر چوکیوں کا فرش ہوتا ہے اور نکتہ سنج اور موزوں طبع جمع ہوتے ہیں ، شعر و شاعری کا چرچا ہوتا ہے . . . . .

عبدالخالق وارستہ کے بارے میں لکھا ہے :- منصب داری کے باوجود درویشانہ مزاج ہے ، مکان آراستہ پیراستہ ہے اور مجمع شعرا رہتا ہے -

میرزا ابوالحسن آگاہ کی نسبت بیان کرتا ہے :- عظیم اللہ کے رفقا میں سے ہے ، شعرا کا دوست اور ہمنوا ، مرزا بیدل کے عرس کے دن کلام بیدل کا قاری یہی ہوتا ہے اور ہمیشہ فکر شعر میں غرق - (مرقع دہلی)

یہ ادبی صحبتیں امرا ہی سے وابستہ نہ تھیں بلکہ عوام اور خواص سبھی دلچسپی لیتے تھے - سراج الدین علی خاں آرزو کے مکان پر قیام دہلی (۱۱۳۲ھ) سے مشاعرہ ہوتا تھا اور ان ہی کی ترغیب سے ریختہ گوئی کی ترقی ہوئی - ایرانی شعرا ہندی فارسی گو شعرا کے قائل نہ تھے، آرزو کو یہ بات کھٹکنے لگی اور انھوں نے اپنے حلقۂ اثر میں یہ کوشش کی کہ مقامی بولی میں (اردو) شاعری کی جائے ، خود اپنے مکان پر مشاعرے کیے، نو آموزوں کو اصلاحیں دیں اور اسی طرح اردو کے پودے کو سینچ کر عظیم الشان درخت بنا دیا ؛ شاہ مبارک آبرو ، آرزو کے قرابت دار اور شاگرد رشید تھے، سودا اور میر بھی انھیں کے دامن میں تربیت پا کر بامِ شہرت تک پہنچے-

صوفیائے کرام بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نہ رہے اور مرزا مظہر جان جاں نے اپنی تربیت سے بہت سے نمایاں شاعر پیدا کیے جن میں انعام‌اللہ خاں یقین نے شہرت پائی اور بقول بعض اگر یقین زندہ رہتا تو میر کی شاعری ماند پڑ جاتی ۔ امرا نے بھی سرپرستی میں کمی نہ کی ؛ اگرچہ محمد شاہ کی نسبت کسی شاعر کی سرپرستی کرنے کا حوالہ نہیں ملتا ہے لیکن اس کی نسبت شعر و سخن کی طرف کی گئی ہے، اس کا مقرب بارگاہ امیر عمدۃالملک امیر خاں انجام اردو کا بہترین شاعر تھا اور اردو شعرأ کا سرپرست تھا ، شاہ ظہور الدین حاتم ، جعفر علی خاں زکی ، وغیرہ اس کے متوسل تھے، اس کو اس حد تک شاعری سے شغف تھا کہ جب الہ‌آباد کی صوبہ داری سے اسے محمد شاہ نے طلب کیا ہے تو اس نے جواب میں ایک شعر لکھ کر بھیجا جس کا مصرع ہے :

اب یہی احسان ہے تیرا جو ہوں آزاد ہم

مختلف امیروں کے نام ارباب کمال کی سرپرستی کے ذیل میں لیے جاتے ہیں ؛ چنانچہ میر نے اپنے مربیوں میں :—

رعایت‌خاں پسر عظیم‌اللہ‌خاں ہمشیرزادۂ نواب قمرالدین خاں وزیر اعظم۔
جاوید خاں خواجہ سرا (نواب بہادر) احمد شاہ بادشا ۔
راجہ ناگر مل دیوان خالصہ و نائب وزیر وغیرہ وغیرہ۔

نواب اسد یار خاں اکبر آبادی انسان تخلص سے بھی اردو شعرأ متوسل تھے ، قائم چاند پوری نے ایک مقطع میں اس کا ذکر کیا ہے ۔

نواب نعمت اللہ خاں بخشی ۔ بسنت خاں خواجہ سرائے محمد شاہ ،

عالم‌گیر ثانی بھی شعر و سخن سے دلچسپی رکھتا تھا، حاتم نے اس کے ایک مصرع پر تضمین کی ہے :

جی میں آتا ہے کہ شاہی میں گدائی کیجیے

نظام‌الملک بھی شاعر تھا اور امیرالامرا صمصام‌الدولہ بھی، عمادالملک

علم و فضل کے ساتھ بہترین خوش نویس تھا اور شاعر بھی ، اس کی تعریف میں سودا نے قصائد کہے ہیں ، میر نے ذکر میر میں اس کی تعریف کی ہے ، قائم کے اس ذوقِ سخن کی داد دی ہے ۔

شاہ عالم ثانی کو قسمت اچھی نہ ملی ، ہاتھ پاؤں بہت مارے ، وہ شعر و سخن میں اعلیٰ دست رس رکھتا تھا اور ہندی ، اردو ، فارسی تینوں زبانوں میں شاعری کرتا تھا ، اس کے دربار سے بعض شعرأ وابستہ بیان کیے گئے ہیں ، وقائع عالم شاہی میں بھی اس کے دربار میں شعر و شاعری کا ذکر ملتا ہے ۔ چند نام قابل ذکر ہیں :—

۱ - رضی ۔ نواب سیف الدولہ سید رضی الدین خاں بہادر صلابت جنگ

۲ - سید میر غالب علی خاں میر منشی شاہ عالم ثانی

۳ - سخنور ۔ لالہ دیوالی سنگھ منشی ،،

۴ - شفیق ۔ مظہر علی خاں خواص ،،

۵ - شکیبا ۔ شیخ غلام حسین شعرائے درباری ،،

۶ - غلام ۔ کنور گوپال (مقرب) درباری ،،

۷ - فقیر ۔ میر فقیر اللہ ،، ،، ،،

۸ - مشتاق ۔ مشتاق علی خاں ،، ،،

۹ - شہرت ۔ مسخرۃالدولہ قرم ساق خاں بہادر پھکڑ جنگ درباری شاہ عالم ثانی ۔

اس کے علاوہ جواں بخت ولی عہد شاہ عالم ثانی کو بھی شعر و سخن سے دلچسپی تھی ، لکھنؤ میں ۱۱۹۸ھ میں پہنچ کر بڑے اہتمام سے مشاعرے کیے اور اس عہد کے بڑے بڑے شعرأ اس مشاعرے میں شریک ہوئے، اس کے متوسلین میں جرأت کے استاد جعفر علی حسرت اور میر شیر علی افسوس ، نوا بدایونی عباس خاں ارادت شاگرد قائم وغیرہ تھے۔ مرزا علی لطف کہتا

ہے کہ شہزادے کے اصرار سے میں بھی اس کے مشاعرے میں شریک ہوا تھا[1] (۱۲۰۲ھ میں بنارس میں انتقال ہوا) ۔

مرزا سلیمان شکوہ سلیمان (دوسرے بیٹے شاہ عالم ثانی کے) بھی شاعر تھے اور رجب ۱۲۰۳ھ میں جب لکھنؤ پہنچے ، تو انشأ ، مصحفی ، جرأت ، شیخ ولی اللہ محب شاگرد سودا ، کاظم علی جوان ، رنگین ان کے دربار سے متوسل تھے ، میر سوز بھی مداحوں میں تھے ، مصحفی اور انشأ کا معرکہ ان کی ملازمت کے ایام میں پیش آیا ، ۱۲۵۳ھ میں انتقال ہوا ، صاحب دیوان گزرے ہیں ۔

انشأ بھی شاہ عاہ عالم کے متوسل شعرأ میں شمار ہوتے ہیں ، میر جب دلّی میں تھے (قبل ۱۱۹۶ھ) تو شاہ عالم ثانی نے میر صاحب کو یاد کیا ، میر صاحب نہیں گئے ۔

اس کے علاوہ شاہ عالم ثانی کے امرا میں بھی ادب دوست تھے ، ابوالقاسم خاں صافی (متوفی ۱۱۹۰ھ) اور وجیہ‌الدین خاں وجیہ‌الدولہ بریں تخلص وغیرہ بھی شعرأ کی سرپرستی کرتے تھے ، یہ دونوں میر کے مربی تھے (ذکر میر) ۔ نظام الدین ممنون کی نسبت صاحب مجموعۂ نغز نے لکھا ہے کہ اُسے فخرالشعرأ کا خطاب دیا گیا ، یہ خطاب شاہ عالم کی طرف سے ملا ہوگا چونکہ ۱۲۲۱ھ میں مجموعۂ نغز مرتب ہو چکا تھا اور یہی شاہ عالم ثانی کا سال وفات ہے ۔

نواب محمد یار خاں ۱۱۸۵ھ میں اُردو شعرأ کی سرپرستی کر رہے تھے ، امیر تخلص کرتے تھے ، شیخ کبیر علی کبیر نے ترغیب شاعری کی دلائی ، اُستادی کے لیے سودا اور سوز پر نظر پڑی جو اُس زمانے میں فرخ آباد میں مقیم تھے ، خط لکھے گئے مگر دونوں نے انکار کر دیا ، ٹانڈہ معمولی گاؤں تھا ، فرخ آباد میں دلّی کے کافی امرا اور ارباب کمال جمع تھے اس لیے توجہ

---

۱ - ان کی بیوی جنیا بیگم بھی شاعرہ تھی ، ملاحظہ ہو مجموعۂ نغز ج-۱ صفحہ ۱۷۸ -

نہ کی ، بسولی سے قائم بلائے گئے ، استاد منتخب ہوئے ، اسی زمانے میں فدوی لاہوری ، نعیم دھلوی ، مصحفی وغیرہ جمع ہو گئے، درباری شعرأ کا مرقع تیار کرایا لیکن مرہٹوں کے حملے سے (ضابطہ خاں کے خلاف ذی الحجہ ۱۱۸۵ھ) یہ بزم سخن اجڑ گئی ، قائم تادم زیست ساتھ رہے اور جب ۱۱۸۸ھ میں امیر رام پور (مصطفیٰ آباد) پہنچے تو یہ بھی ساتھ گئے اور وہیں ۱۲۰۸ھ میں یہ آفتاب سخن غروب ہو گیا۔

فرخ آباد میں نواب احمد خاں والیٔ ریاست کو شاعری سے شوق نہ تھا لیکن نواب کا دیوان مہربان خاں رند باذوق تھا، اس نے میر، سوز وغیرہ کو جب ۱۱۶۸ھ میں فرخ آباد پہنچے، روک لیا اور شاگردی اختیار کی۔ ۱۱۷۰ھ میں سودا بھی فرخ آباد پہنچے، انہیں بھی روک لیا، ۱۱۸۴ھ تک سودا وہیں رہے، محمد تقی تقی مرثیہ گو بھی دھلی سے ، فرخ آباد جا کر مقیم ہو گیا۔ نواب سالار جنگ کو خاندانی ذوق ارباب کمال کی سرپرستی کا تھا ، محرم ۱۱۶۸ھ میں سراج الدین علی خاں آرزو کو ساتھ لے گئے ، کچھ اور شعرأ بھی بعد میں اودھ پہنچے اور وہیں مقیم ہو گئے ، میر حسن بھی ان ہی کا متوسل تھا ، شجاع الدولہ نے سودا کو بلایا ، فرخ آباد سے فیض آباد پہنچے ، شجاع الدولہ نے بڑی قدردانی کی ، ان کا انتقال ۱۱۸۸ ھجری میں ہو گیا۔

نواب آصف الدولہ نے سودا کی قدردانی کی ، جب ۴ رجب ۱۱۹۵ھ کو سودا عالم فانی سے رخصت ہوئے تو سالار جنگ کی ترغیب سے میر کو زادِ راہ خط کے ساتھ بھیجا گیا۔ میر آغاز ۱۱۹۶ھ میں لکھنؤ آ گئے، قدر دانی ہوئی، آصف الدولہ نے اپنا کلام سنایا ، میر صاحب کا کلام سنا ، سفر و حضر میں میر صاحب ساتھ رہے ، شکار پر گئے تو انہیں بھی ساتھ لے گئے۔ میر سوز سے اصلاح لیتے تھے ، آصف تخلص تھا ، ۲۸ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ کو آصف الدولہ دنیا سے اٹھ گئے اور میر محفل کے رخصت ہونے سے محفل سونی ہو گئی، میر دل برداشتہ ہو گئے مگر کہاں جاتے، سوز ۱۲۱۳ھ میں آصف

کے پیچھے روانۂ ملک عدم ہو گئے ۔ اب میدانِ سخن مصحفی ، جرأت، انشا، رنگین کے ہاتھوں رہا ، ہر ایک نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ، ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالی ، مصحفی نے آتش کو بنایا اور قدر دانوں نے ناسخ کو ، اب لکھنؤ میں ناسخ اور آتش کی معرکہ بازی ہوئی ، دلّی میں شاہ عالم ثانی کے بیٹے اکبر ثانی تخت نشین ہوئے جو شعاع تخلص کرتے تھے ۔ ولی عہدی کے زمانے ہی شعر و سخن کی طرف توجہ تھی ، مرزا عبدالمقتدر طفل ان کے دیوان و خانساماں تھےاور بھولا ناتھ عاشق پیشکار رسالہ خاص بزمانۂ ولی عہدی تھے ، ان کے بیٹے مرزا ابو المظفر بہادر ظفر تخلص بھی شعر و سخن سے شیفتگی رکھتے تھے ، شاہ عالم ثانی کے امرا میں امین الدولہ ، معین الملک ، ناصر جنگ بہادر عرف مرزا لیڈو امیر تخلص بھی دلّی یادگاری مشاعرے کر کے نام پیدا کر گئے ، ان کے مشاعروں میں کافی رسہ کشی رہی ، ایک طرف حکیم انشاء اللہ خاں انشا ، برکت اللہ خاں برکت ، مشتاق علی خاں مشتاق وغیرہ تھے، دوسری جانب حکیم ثناء اللہ خاں فراق ، مرزا عظیم بیگ عظیم ، حکیم قدرت اللہ قاسم وغیرہ تھے ، نوبت شعر و سخن سے گذر کر تلوار اور تیر تک پہنچی لیکن میر مشاعرہ نے صلح کرا دی ۔ (قبل۱۲۰۳ھ) ۔

اب دلّی کے مشاعرے نئی نسل کے ہاتھ میں آ گئے ، شاہ نصیر نے سنگلاخ زمنیوں میں طبع آزمائی کر کے شعرائے وقت کو چیلنج دیا کہ کون اس کڑی کمان کو سیدھا کر سکتا ہے، وہی نو آموز جو کل تک قابل اعتنا نہ تھے اب تیور دکھانے لگے ، نواب الٰہی بخش معروف تو شاہ نصیر کے سامنے سر جھکا سکتے تھے ، حافظ عبدالرحمٰن احسان تو نظر نیچی کر سکتے تھے لیکن نئی نسل کے قائد نظام الدّین ممنوں تھے ۔ مفتی صدر الدّین آزردہ نے سادگی و پرکاری کا سبق اُستاد سے سیکھا اور زندگی بھر اسی کی تبلیغ کرتے رہے ، غالب جب آگرے سے دلّی آئے تو شاہ نصیر اور عبدالرحمٰن احسان کو جگت اُستاد پایا ، قلعے میں احسان کا سکہ چلتا تھا اور باہر شاہ نصیر کا ، شاہ نصیر اودھ جا کر لکھنؤ میں بھی معرکہ جیت آئے تھے (بقول شاگردان

نصیر) لیکن مصحفی نے لکھا ہے کہ یہاں (لکھنؤ) آ کر آسے قدرِ سخن معلوم ہو گئی ، دلی سے بڑے بڑے شعرا پورب کو چلے گئے تھے ، خواجہ میر درد کا رنگ کسی سے نبھ نہ سکا ، شاہ حاتم کو نہ سودا نے منہ لگایا نہ میر نے اس لیے اس روش پر آستاد بننا ممکن نہ تھا ، یہی زمانہ تھا کہ محمد ابراہیم ذوق بزم سخن میں شامل ہوئے اور شاہ نصیر سے کچھ مدت اصلاح لے کر منحرف ہو گئے ۔ اس کے بعد مومن بھی اسی آستاد زمانہ (شاہ نصیر) کے سلسلۂ تلامذۂ میں داخل ہوئے لیکن ذہانت خدا داد نے شاہ نصیر کے رنگِ سخن اپنانے سے انکار کر دیا اور چند غزلوں کے بعد وہ بھی باغیوں کی جماعت میں شامل ہو گئے ۔ شاہ نصیر دلی میں یہ ذلت کیسے برداشت کر سکتے تھے آنھوں نے زور طبع دکھا کر حریفوں سے اعتراف شکست کرانا چاہا لیکن جو قدم ذوق نے آٹھایا تھا ، آسی پر غالب چلے اور وہی روش مومن نے اختیار کی ۔ یہ اجتہادانہ قدم دنیائے شاعری میں انقلاب لایا ؛ غالب نے طرز بیدل اختیار کی اور اس میں کمال پیدا کیا اور مومن نے مضمون آفرینی اور بلند پروازی کے ساتھ عام روش سے ہٹ کر پُر اثر انداز میں سادگی و پرکاری سے غزل کے اندر اپنا بلند مقام پیدا کیا ، ذوق نے زبان اور بیان سے غزل میں وسعت پیدا کی اور قصائد میں سودا کے دوش بدوش چلا ، غالب ، مومن اور ذوق کے شاگردوں نے اردو زبان کو معراج کمال تک پہنچا دیا ، شیفتہ کے ذوق شعری کے غالب اور مومن دونوں مداح تھے ، شیفتہ نے حالی جیسا ادیب پیش کیا ، آزردہ کی بزم سخن اور شیفتہ کی مجلس ادب سے جو شاعر یا ادیب نکلا وہ آفتاب اور ماہتاب بن کر نکلا ۔ مولوی فضل حق خیر آبادی عالم بھی تھے اور شاعر اور ادیب اور نقاد بھی ، منیر سے بحالت اسیری قصیدہ بطرز عربی لکھانا انھیں کا کام تھا ، غالب کا انتخاب کلام آن کی بالغ نظری کا ثبوت ہے ، غالب کو حالی نے زندہ کیا اور ذوق کو آزاد نے ، ضرورت تھی کہ مومن کو بھی اسی انداز میں پیش کیا جاتا ، مومن پر بعض آدمیوں نے قلم آٹھایا اور بہت کچھ لکھا

لیکن اس کی زندگی کے بیشتر گوشے بے نقاب نہ ہو سکے، شیفتہ یا حکیم احسن اللہ خاں مومن کو زندہ کر سکتے تھے مگر یہ کام وہ نہ کر سکے، مومن کی زندگی کو گذشتہ تاریخ کی روشنی میں پرکھنے کی ضرورت ہے۔

مغلیہ حکومت کے سیاسی، اقتصادی اور مذہبی ماحول نے مجلسی زندگی پر کیا اثر ڈالا، ارباب کمال نے اس فضا میں کچھ کھویا یا پایا، ایک طرف رقص و سرود کی محفل برپا ہو اور دوسری طرف قرآن اور حدیث کی مقدس مجلس، اس کا اثر ہمارے شعرا پر کیا ہوا؟ خواجہ میر درد کا صوفی ہونا اور ساتھ ہی موسیقی میں ماہر فن ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ سوز، سودا، جرأت، رنج اور مومن وغیرہ کا موسیقی میں ماہر ہونا ان کی جدت پسندی کا ثبوت ہے؟ حکمت و فلسفہ، نجوم، شطرنج بازی کے ساتھ شعر و شاعری، اسے یک رنگی کہا جائے گا یا دو رنگی، طوائف سے تعلقات رکھنے والے عشق پردہ نشیں کے قائل ہوں کیا معنی، حسرت اور جرأت نے جو کچھ کہا ہے کیا وہ اردو شاعری کے مذاق کے خلاف ہے، امرد پرستی کے ترجمان حقیقی شاعر کہلائیں اور جرأت اور مومن ہوس کارانہ شاعری کے مدعی! ضرورت ہے کہ اس شاعر اعظم (مومن) کے کلام پر ناقدانہ نظر ڈالی جائے اور اس کا مقام اسے دلایا جائے، اس میں نہ غالب سے بڑھانے[1] کی ضرورت ہے نہ گھٹانے[2] کی، ذوق اور غالب استاد ہیں اور ان کا مقام اپنی جگہ بہت بلند ہے لیکن غزل میں (جس کی صحیح ترجمانی مومن نے کی ہے) مومن کا مقام کیوں نہ متعین کیا جائے مومن کے فارسی خطوط کو پہلی بار سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے، ممکن ہے کہیں غلطی ہو گئی ہو جس کی نشان دہی پر شکر گزار ہوں گا۔ ۱۶ جولائی ۱۹۶۱ء۔

فائق رام پوری

---

۱ - ''مومن و غالب'' معجز سہسوانی کی نظر میں (ماہنامہ ادیب علی گڑھ مئی ۱۹۶۰ء)۔
۲ - مومن کا تغزل - نظیر صدیقی صفحہ ۳۴ نگار جون ۱۹۵۳ء -

پہلا باب

ابتدائی حالاتِ زندگی

خاندانِ مومن

مومن کے مورث اعلیٰ شاہ عالم ثانی کے زمانے میں دہلی آئے[1]۔ یہ دو بھائی کشمیری الاصل تھے؛ ایک کا نام کامدار خاں اور دوسرے کا نام نامدار خاں تھا، دونوں فن طب میں مہارت رکھتے تھے، شاہی طبیبوں میں داخل ہوگئے (روزنامچہ مولوی عبدالقادر خاں مخطوطہ صفحہ ۱۳۷ : مسکن بزرگان وے کشمیر است و جد و برادر جدش و نیز پدر و عمش نامور اند و بطبابت معروف)۔ غالباً ۱۷۶۱ء مطابق ۱۱۷۵ھ میں نواب نجیب الدولہ کے زمانۂ امیر الامرائی میں یہ دونوں بھائی ہندوستان پہنچے۔ شاہ عالم اس وقت انگریزوں سے بر سر پیکار تھا: ۲۳ اکتوبر ۱۷۶۴ء کو بکسر کی لڑائی نے انگریزوں کے لیے راستہ اقتدار کا کھول دیا تھا، بنگال، بہار، اڑیسہ تینوں

---

۱ - مومن نے غلام ضامن کرم کو ایک خط میں خاندان کے متعلق صرف اس قدر لکھا ہے:

سعد قلی خاں بہادر یکے از خاندان ما است که ثروت بیگم شمرو که مسجود این کمترین بے هنر و بن است، داشت و نام خود به صحیفۂ عالم شاهی و سیر المتاخرین به هم نشینی نجف خاں و نجیب خاں گذاشت۔ از قصیده:

گر یک یک از آبا شمرم تا به کیومرث کس نیست که تا چرخ نیفراشت علم را

صوبوں کی دیوانی سرکار کمپنی کو دی گئی اور چھبیس لاکھ روپیہ سالانہ ادا کرنا بذمہ کمپنی آیا ، شاہ عالم الہ آباد میں مقیم ہو گیا اور ۱۷۷۱ء تک وہیں رہا ، (تاریخ ہندوستان جلد نہم صفحہ ۳۱۴ از مولوی ذکاء اللہ دہلوی) - دہلی بیرونی حملوں سے محفوظ تھی اس لیے دونوں بھائی وہاں اطمینان سے وہاں رہتے رہے - ۶ جنوری ۱۷۷۲ء کو شاہ عالم دہلی میں داخل ہوا - حسام الدولہ کشمیری کا بادشاہ پر اثر تھا ، اس سے پہلے سیف الدولہ کشمیری (برادر عاقبت محمود خاں کشمیری) شاہ عالم کے مزاج میں دخیل تھا اور حسام الدولہ کے زوال کے بعد عبدالاحد خاں کشمیری نے ۱۴ ربیع الاول ۱۱۸۷ھ مطابق ۵ جون ۱۷۷۳ء کو اقتدار سنبھالا ، (وقائع عالم شاہی ، فراق و ذکر میر صفحہ ۱۲۸ و مقدمہ مثنویات میر جسٹس سلیمان صفحہ ۱۰) اور ۶ ذیقعدہ ۱۱۹۳ھ مطابق ۱۵ نومبر ۱۷۷۹ء کو نجف خاں نے مقید کر کے شاہ عالم ثانی کو اپنی حفاظت میں لیا ، (وقائع عالم شاہی صفحہ ۱۰) - کامدار خاں ، نامدار خاں چونکہ کشمیری معزز خاندان سے تھے (جس کی تصدیق[1] شیفتہ اور دوسرے تذکرہ نویسوں نے کی ہے اور

---

۱ - ۶ جنوری ۱۷۷۲ء کو شاہ عالم دہلی میں بادشاہی کے بعد پہلی بار داخل ہوا اور مرہٹوں کے زیر سایہ شاہی کرتا رہا - حسام الدولہ اور عبدالاحد خاں بادشاہ کے مزاج میں دخیل رہے ، نجف خاں ادھر آدھر قسمت آزمائی کرتا رہا ، مارچ ۱۷۷۶ء میں قلعہ ڈیگ جاٹوں سے چھن کر بخشی گیری اور امیر الامرائی ملی ، ۱۵ نومبر ۱۷۷۹ء کو عبدالاحد خاں کو قید کر کے شاہ عالم پر قابو پایا لیکن جلد ہی ۶ اپریل ۱۷۸۲ء کو چل دیے اور افراسیاب خاں و مرزا شفیع وغیرہ کوس امیرالامرائی بجا کر دنیا سے چل بسے - مرہٹے پھر بھی شاہ عالم پر مسلط رہے ، آخر ستمبر ۱۸۰۳ء میں لارڈ لیک نے مرہٹوں کو شکست دے کر دہلی سے بے دخل کیا - اس لڑائی میں نواب نجابت علی خاں خلف مرتضیٰ خاں بڑیچ جاگیردار رہتک نے انگریزوں کا ساتھ دیا اس لیے بجائے رہتک ، پرگنات جھجر ، دادری ، بہادر گڑھ وغیرہ نواب نجابت علی خاں کو ملے اور نواب فیض طلب خاں

باقی صفحہ ۳ پر

عرش مصنف حیات مومن نے علوی سادات لکھا ہے (جس کی تصدیق نہ ہو سکی صفحہ ۳۰) اس لیے بقدر ضرورت معاش کا انتظام نواب نجیب الدولہ نے کر دیا ہوگا۔ اس عہد میں حکیم قدرت اللہ قاسم صاحب مجموعہ نغز (قدرت‌اللہ قاسم)، کے بقول علم و فضل کا چرچا تھا اور اہل علم کی قدر تھی۔ شاہ عالم کے دہلی آنے پر حسام الدولہ کشمیری یا عبدالاحد خاں کی سفارش سے چند گاؤں بلاھہ [مرزا وجیہ دہلوی، (مومن) اخبار امروز سنڈے ایڈیشن جنوری ۱۹۵۳ء میں لکھتے ہیں: آپ کے چچا حکیم غلام علی صاحب اور والد صاحب کو موضع بلاھہ پرگنہ نارنول میں بطور جاگیر عطا ہوا تھا۔ یہ بیان غلط ہے، حکیم غلام علی نامی مومن کے چچا نہ تھے] وغیرہ پرگنہ نارنول میں بطور جاگیر مل گئے اور دونوں بھائی شاہی طبیبوں میں داخل ہو گئے، دہلی کے بیشتر قدیم مشاہیر نادر شاہ اور ابدالی اور مرہٹوں وغیرہ کے حملوں کے بعد دہلی کو چھوڑ کر جا چکے تھے لیکن بعض مشاہیر نے ثبات پا سے کام لیا اور بگڑے حالات میں بھی دہلی کو نہ چھوڑا۔ مولانا فخرالدّین دہلوی، مرزا مظہر جان جاں، خواجہ میر درد جیسے صوفی اور شاعر، شاہ عبدالعزیز محدّث و مفسّر، شاہ رفیع الدّین محدّث و مفسّر، شاہ عبدالقادر محدث و مفسّر جیسے عالم، ہمت خاں موسیقار، راگ رس خاں بین نواز وغیرہ ارباب کمال دہلی کی شان قائم رکھے ہوئے تھے، اس لیے دہلی لٹنے پر بھی دہلی ہی تھی۔ دونوں بھائی فارغ البالی سے گزر بسر کرتے رہے، نامدار خاں کی ولادت ۱۱۵۰ھ کے

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲:

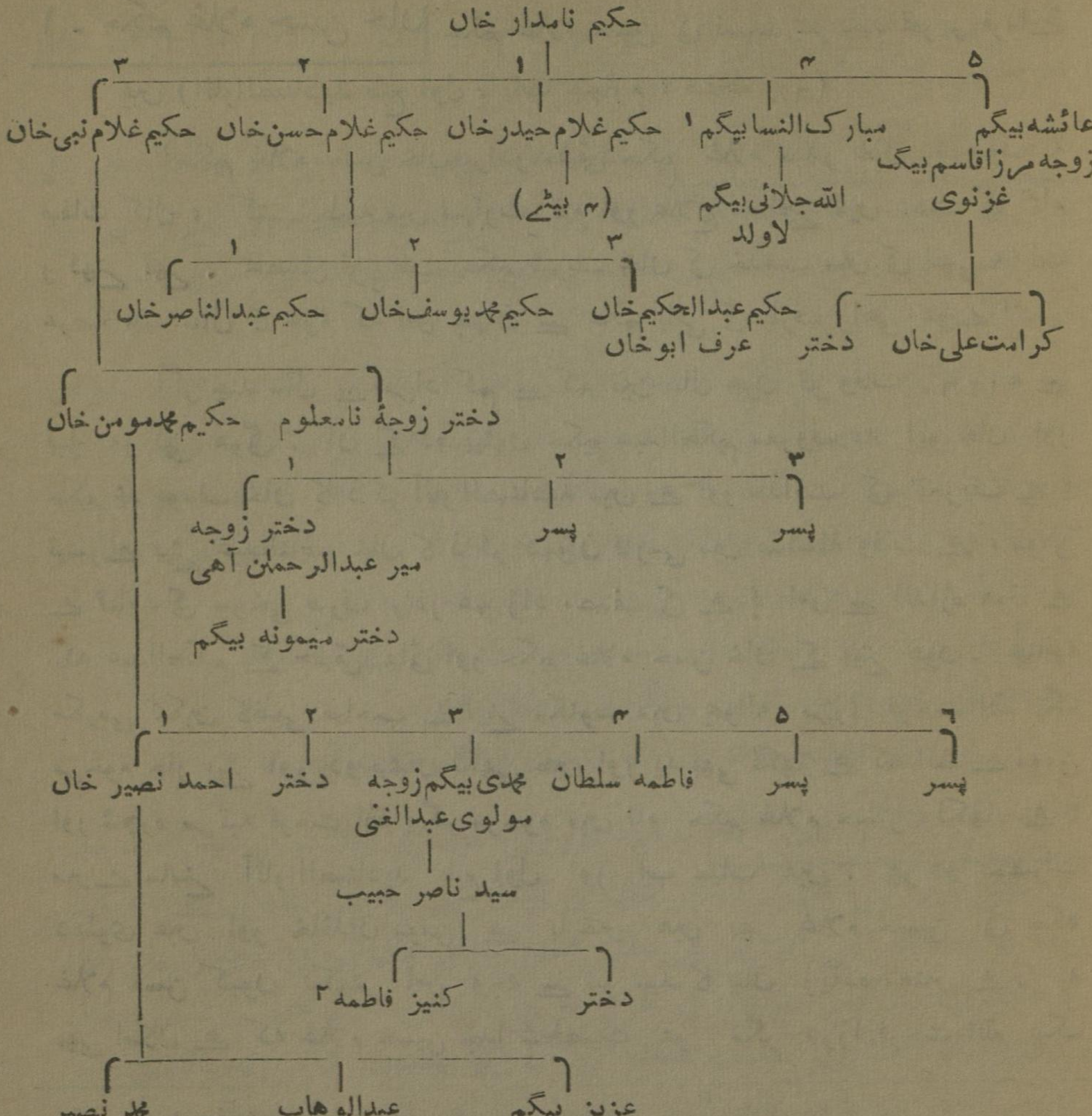
نجابت علی خاں کے بہنوئی کو پاٹودی، بعد میں انگریزوں نے جھجر، بادلی، کانوڈہ، نارنول و کانٹی نجابت علی خاں کو، بہادر گڑھ اور پاٹودہ اور بدھوانہ و دادری اسماعیل خاں اور فیض محمد خاں کو دیے، (صفحات ۳۱۳ و ۳۱۴ سلسلۂ تاریخ عالم جلد اول مختصر تاریخ اسلام و ذکر میر صفحات ۱۲۱ تا ۱۳۰ و تاریخ ہندوستان جلد نہم صفحات ۳۲۰ تا ۳۴۳)۔

متصل ہوئی ہوگی - یہ نہیں کہا جا سکتا کہ نامدار خاں کی شادی کس خاندان میں ہوئی، نہ ہمیں نام معلوم ہوسکا۔ مومن نے اپنی دادی یعنی زوجۂ نامدارخاں کا قطعۂ تاریخ وفات کہا ہے جس سے ۱۲۳۷ھ بر آمد ہوتے ہیں ، مصرع :

دخلت بالنعیم رضوان نے

اس بیوی سے حکیم نامدار خاں کے تین لڑکے اور دو لڑکیاں یادگار رہیں، اس کے علاوہ کسی اور اولاد کا تا حال علم نہیں۔ آب حیات میں حکیم غلام حسن خاں اور حکیم غلام حیدر خاں اور حکیم غلام نبی خاں کا ذکر ہے ، آثار الصنادید میں سر سید احمد خاں نے حکیم غلام حسن خاں اور حکیم غلام حیدر خاں کا حال لکھا ہے - غلام نبی خاں آثار الصنادید کی تالیف سے بائیس سال پہلے دنیا چھوڑ چکے تھے ، اسی وجہ سے غالباً سر سید نے حکیم غلام نبی خاں کا حال نہیں لکھا - مومن کا شجرۂ نسب اس طرح ترتیب پاتا ہے :

(شجرۂ نسب صفحہ ۵ پر ملاحظہ ہو)



۱۔ مبارک النسا بیگم اور عائشہ بیگم کے نام میرے کرم فرما تمکین کاظمی صاحب نے اپنے مکتوب مورخہ ۲۰ مئی ۱۹۶۰ء میں تحریر فرمائے تھے جو شجرہ مرتبہ

باقی صفحہ ٦ پر

۱ - حکیم غلام حسن خاں | حکیم غلام حسن کی نسبت سر سید تحریر فرماتے ہیں (آثارالصنادید طبع اول ، باب چہارم ، صفحہ ٦٨)

"حکیم غلام حسن خاں برادر حقیقی حکیم غلام حیدر خاں موصوف بہ صفاتِ کمال ، کتب طبیہ میں مہارتِ تام اور علاج معالجے میں دست گاہ تمام رکھتے تھے ، تحصیل فنِ طب حکیم شریف خاں کی خدمت میں کی تھی ، اب عرصۂ چند سال کا ہوا کہ اس جہان سے عالم باقی کی طرف راہی ہوئے"۔

اگر چند سال سے مراد کم سے کم تین سال ہوں تو وفات ۱۲٦٠ھ سے قبل ہو گئی ہوگی ۔ ان کے دو بیٹوں حکیم عبدالحکیم معروف بہ ابو خاں اور حکیم محمد یوسف خاں کا ذکر آثار الصنادید میں ہے اور حذاقت کی تعریف ہے ، تیسرے بیٹے عبدالناصر خاں کا ذکر دیوان فارسی میں بسلسلۂ وفات ہے ، مومن نے قطعہ کی سرخی صرف برادر عم زاد مصنف کی ہے ؛ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عبدالحکیم کے حقیقی بھائی اور حکیم غلام حسن خاں کے بیٹے ہوں ۔ چنانچہ مکرمی تمکین کاظمی صاحب نے اپنے مکتوب میں بحوالہ مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم چار بیٹے اور دو بیٹیاں لکھی ہیں اور یہ بھی لکھا ہے کہ انشاے مومن اور شجرہ مرتبہ فرحت اللہ بیگ مرحوم میں نام حکیم غلام حسین لکھا ہے ۔ میرے سامنے آثار الصنادید طبع اول اور آب حیات ہیں ، ہر دو حضرات دہلوی ہیں اور خاندان مومن سے با خبر ہیں پھر غلام حسین کی جگہ غلام حسن کیوں لکھتے اس وجہ سے سر سید کا بیان زیادہ معتبر ہے ۔ یہ بھی امکان ہے کہ غلام حسین جدا شخصیت ہو مگر مرزا فرحت اللہ بیگ

بقیہ حاشیہ صفحہ ٥

مرزا فرحت اللہ بیگ سے ماخوذ ہیں ، ان کے شکریے کے ساتھ درج کیے جاتے ہیں ۔ (فائق)

۲ - مکرمی ناظر حسن صاحب لیکچرار فارسی گورنمنٹ کالج شیخوپورہ کی تحقیق ہے کہ وہ نسل سید ناصر حبیب سے نہیں (مکتوب جون ۱۹٦٠ء) اور پروفیسر ضیاء احمد صاحب نے دختر ناصر حبیب لکھا ہے ، (مقدمہ دیوان مومن)

خود بھی حکیم نامدار کے چار بیٹے نہیں بتاتے؛ پھر کتابت کی غلطی بھی ہو سکتی ہے خواہ انشائے مومن کے کاتب کی ہو یا آثار الصنادید کی۔

۲۔ حکیم غلام حیدر خاں حکیم غلام حیدر خاں، حکیم نامدار خاں کے دوسرے بیٹے حکیم شریف خاں کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ سر سید آثار الصنادید، طبع اول، (باب چہارم صفحہ ۶۴) میں ان کی تعریف اس طرح لکھتے ہیں:

ارشد تلامذۂ حکیم شریف خاں سے ہیں، مقاماتِ کتبِ طب موافق زعم راقم کے جیسے ان کی خدمت میں حل ہوتے ہیں غالب تو یہ ہے کہ اس جزوِ زماں میں اور کہیں نہ ہوتے ہوں۔ خدمت اساتذۂ کرام مثل مولانا مخدومنا مولوی عبدالعزیز دھلوی اور مولوی رفیع الدّین اور مولوی عبدالقادر صاحب ارفع اللہ درجاتہم سے سالہا سال استفادہ کیا اور انواع فیوض حاصل کیے، شفائے کامل ان کے دستِ حق پرست میں ودیعت ہے۔ راقم کو حضرت موصوف کی خدمت میں نسبت شاگردی حاصل ہے۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ ۱۲۶۳ھ تک حیات تھے۔

۳۔ حکیم غلام نبی خاں حکیم غلام نبی خاں کے حالات سر سید احمد خاں نے قلمبند نہیں کیے ہیں۔ نامدار خاں کی اولاد میں یہ بھی نامدار رہے، طبابت پیشہ تھا، غالباً اپنے والد سے بھی طبی کتابیں پڑھی ہوں گی اور حکیم شریف خاں کے شاگردوں میں اپنے بھائیوں کی طرح یہ بھی داخل ہوئے ہوں۔ کتب معقول و منقول شاہ عبدالعزیز صاحب محدّث اور ان کے بھائیوں شاہ رفیع الدّین اور شاہ عبدالقادر سے پڑھی ہوں گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ مسائل خانگی میں کم دخل دیتے ہوں گے جس کی وجہ سے ان کے فرزند مومن خاں آزادانہ روش پر ابتدا ہی سے چل پڑے۔ اپنے بھائیوں سے پہلے ۱۲۴۱ھ میں دنیا سے چل بسے۔ مومن نے تاریخ وفات لکھی ہے:

جہانِ نکوئی، نکوئے جہاں وحیدِ زماں، والدِ مہرباں

غرض آ گیا وقتِ موعود جب گئی تن سے وہ جانِ عشرت طلب
جنازہ اٹھایا، فرشتوں نے آہ تو ''قد فازا فوزاً عظیماً'' کہا (۱۲۴۱ھ)

آب حیات کی روایت ہے کہ جب سرکار انگریزی نے جھجر کی ریاست نواب فیض طلب خاں کو عطا فرمائی تو پرگنۂ نارنول بھی اس میں شامل تھا، رئیس مذکور نے ان کی جاگیر ضبط کر کے ہزار روپیہ سالانہ پنشن ورثائے حکیم نامدار خاں کے نام مقرر کر دی۔ پنشن مذکور میں سے حکیم غلام نبی خاں صاحب نے اپنا حصہ لیا اور اس میں سے حکیم مومن خاں صاحب نے اپنا حق پایا۔ اس کے علاوہ ان کے خاندان کے چار طبیبوں کے نام پر سو روپیہ ماہوار پنشن سرکار انگریزی سے بھی ملتی تھی، اس میں سے ایک چوتھائی ان کے والد کو اور ان کے بعد اس میں سے ان کو حصہ ملتا رہا۔ (ڈاکٹر عبادت یار خاں صاحب نے مقدمۂ کلیات مومن میں لکھا ہے کہ حکیم غلام نبی خاں اپنے زمانے کے مشہور طبیبوں میں تھے، اس کے متعلق نہ مومن کا بیان ملتا ہے نہ کسی اور تذکرے میں یہ روایت ملتی ہے۔ بغیر دلیل یہ رائے قابل قبول نہیں)۔ جھجر کی ریاست بقول مصنف مختصر تاریخ اسلام مطبوعہ ۱۹۰۴ء صفحات ۳۱۳، ۳۱۴، انگریزوں نے ۱۸۰۳ء میں نواب نجابت علی خاں کو اس صلے میں دی تھی کہ نواب نے مرہٹوں کے خلاف جنگ میں کمپنی کا ساتھ دیا تھا۔ نواب پہلے رہتک کا جاگیر دار تھا، انگریزوں نے رہتک کی بجائے پرگنات جھجر، دادری، بہادر گڑھ وغیرہ نواب نجابت علی خاں کو دیے اور نواب فیض طلب خاں کو جو نجابت علی خاں کا بہنوئی تھا اور کمپنی کا ساتھ دیتے ہوئے زخمی ہوا تھا، پاٹودی جاگیر میں دی۔ پھر اس کی تقسیم اس طرح کی کہ جھجر، بادلی، کانونڈہ، نارنول، کانٹی نجابت علی خاں کو اور بہادر گڑھ، پاٹودہ، بدھوانہ اور دادری اسماعیل خاں اور فیض محمد خاں کو دیے، نواب نجابت علی سردار اعلیٰ اور باقی اس کے ماتحت قرار پائے۔ نجابت علی خاں ۱۲۲۹ھ میں مر گیا، اس کا بیٹا فیض محمد خاں جانشین ہوا۔ وہ ۱۲۵۱ھ میں مر گیا، اس کا

فرزند فیض علی خاں رئیس ہو کر ۱۲۶۱ھ میں فوت ہوا اور اس کا خلف الرشید نواب عبدالرحمان صاحب ۱۲۷۵ھ مطابق ۱۸۵۷ء میں تحریک جنگ میں حصہ لینے کے الزام میں پھانسی پا گیا اور اس کا علاقہ ، ایک کروڑ روپیہ نقد و جنس انگریزوں نے ضبط کر لیا ، پاٹودی کی ریاست نواب فیض طلب خاں کی اولاد میں جاری رہی (۱۹۴۸ء)۔ اس تاریخ سے آب حیات کی روایت غلط ثابت ہو جاتی ہے ، اس روایت کو بغیر تحقیق بعد کے تذکرہ نگاروں نے نقل کیا ہے ۔ حقیقتاً ۱۸۰۳ء مطابق ۱۲۱۸ھ سے بلاهه وغیرہ دیہات پرگنہ نارنول کے شاہی اقتدار سے نکل کر کمپنی کے اقتدار میں آ گئے اور اسی وقت سے خزانۂ ریاست جھجر سے ہزار روپیہ سالانہ مومن کے والد اور چچا وصول کرتے رہے ۔ رہی یہ روایت کہ انگریزی خزانے سے بھی مومن کے والد اور چچا وغیرہ سو روپیہ ماہانہ پنشن پاتے تھے ، اس روایت کا ماخذ نہ معلوم ہو سکا ۔ ممکن ہے کہ کمپنی نے اس جاگیر سے محرومی کے عوض میں شکایت پر بارہ سو روپیہ سالانہ بطور امداد ورثائے حکیم نامدار خاں کے نام مقرر کر دیا ہو ۔ اس سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ ۱۲۱۸ھ میں حکیم نامدار خاں[1] حیات نہ تھے ، وہ اس سے پہلے رحلت پا چکے تھے ۔ امداد کی تقسیم اس طرح ہوگی : بنام حکیم غلام حسن خاں ، حکیم غلام حیدر خاں ، حکیم غلام نبی خاں، چوتھے وارث کا نام نہ معلوم ہو سکا جو انگریزی خزانے سے وظیفہ پاتے تھے ۔ اس طرح حکیم غلام نبی خاں کو ۲۵ روپیہ ماہانہ کی مستقل آمدنی تھی اور مطب سے بھی کچھ آمدنی ضرور ہوتی ہوگی ۔ اس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مومن کا گھرانا متوسط الحال تھا ۔

ڈاکٹر عبادت یار خاں کی یہ روایت بے بنیاد ہے (مقدمہ کلیات مومن ، صفحہ ۱۰) کہ حکیم مومن کے گھرانے میں فارغ البالی تھی ۔

---

۱ - اخبار امروز سنڈے ایڈیشن جنوری ۱۹۵۳ء میں مرزا وجیہ دہلوی نے مومن کے نجی زندگی کے کچھ حالات کے تحت حکیم نامدار خاں کو مومن کا حقیقی چچا لکھا ہے جو سراسر غلط ہے ۔

ولادت

ولادت حکیم محمد مومن خاں، مومن ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۰ء

مومن حکیم غلام نبی خاں کے گھر ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۰ء میں کوچۂ چیلاں میں پیدا ہوئے۔

آزاد مرحوم نے آب حیات صفحہ ۳۴ میں سال ولادت ۱۲۱۵ھ مطابق ۱۸۰۰ء لکھا ہے۔ عرش (حیات مومن صفحہ ۳۷)، مولوی عبدالحی (گل رعنا صفحہ ۲۹۷)، ڈاکٹر زور (تاریخ ادب اردو صفحہ ۱۳۱)، نسیم قریشی (اردو ادب کی تاریخ صفحہ ۱۰۴)، ڈاکٹر موہن سنگھ دیوانہ (تاریخ ادب اردو بزبان انگریزی صفحہ ۱۳۰)، ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی (دلّی کا دبستان شاعری صفحہ ۲۴۲)، آغا محمد باقر (تاریخ نظم و نثر اردو صفحہ ۱۰۲)، رام بابو سکسینہ (ترجمہ تاریخ ادب اردو صفحہ ۳۰۶) وغیرہ اسی سنہ کی تائید کرتے ہیں۔ سرخوش (اعجاز سخن صفحہ ۲۹۵) اور نظامی (قاموس المشاہیر جلد دوم صفحہ ۲۳۹) تاریخ ولادت ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۷ء لکھتے ہیں جو غلط ہے اور کوئی حوالہ بھی اس سلسلے میں نقل نہیں کیا ہے۔

معاصرین نے سنہ ولادت تعین نہیں کیا ہے لیکن ان کے بیانات سے مدد ملتی ہے، مولوی عبدالقادر خاں غمگین لاہوری ۱۸۲۵ء مطابق ۱۲۴۰ھ سے قبل لکھتے ہیں (روزنامچہ صفحہ ۱۳۸ مخطوطہ کتاب خانہ حبیب گنج علی گڑھ):۔

مقام ولادت و سکونت کوچہ چیلاں دہلی

"در شاعران نوجوان مومن خان است کہ متصل کوچہ چیلا و نزدیک تر از مکان معروف بہ کالاں محل (کلاں محل) خانہ دارد"۔ دہلی کی آخری شمع جسے ۱۲۴۰ھ میں یا اس سے قبل نوجوان کہا گیا ہو، اس کے متعلق قیاس کیا جا سکتا ہے کہ کم از کم اس کی عمر پچیس سال ضرور ہوگی چونکہ عموماً چالیس سال یا چالیس سال سے زیادہ عمر والے پر جوان کے لفظ کا اطلاق کیا جاتا رہا ہے۔ مصحفی نے

ریاض الفصحا میں اثر (صفحہ ۳۲) اور زائر (صفحہ ۱۱۷) کو جو چالیس سال سے زیادہ عمر رکھتے ہیں ، جوان لکھا ہے ، میر حسن عسکری زار پسر میر (صفحہ ۱۱۹) کی نسبت لکھا ہے "جو کچھ موزوں کرتا ہے ناسخ کو دکھاتا ہے یا ناسخ کہ کر دے دیتے ہیں ورنہ سن بلوغ کے آغاز میں یہ فصاحت اور بلاغت کب حاصل ہوتی ہے "۔ اُس کی عمر قریب تیس سال کے ہوگی ۔

کریم الدّین تذکرۂ شعرائے اردو صفحہ ۳۴۴ میں جو ۱۸۴۷ء میں لکھا گیا ہے ، لکھتے ہیں :—

اب عمر اُن کی قریب چالیس برس کے ہوگی ۔

کریم الدّین کے بیان سے سال ولادت ۱۸۰۷ء قرار پاتا ہے ، ظاہر ہے کہ کریم الدّین کا قیاس غلط ہے ۔ غالب کی عمر کے بارے میں کریم الدّین ۱۸۴۷ء (تذکرۂ شعرائے اردو صفحہ ۳۷۷) میں لکھتے ہیں :

عمر ان کی اس سال میں قریب ساٹھ برس کے ہوگی ۔

غالب اور مومن کی عمر میں بیس سال کا تفاوت ہونا مضحکہ خیز ہے ۔ ۱۸۲۵ء میں جو شہرت عام بقول مولوی عبدالقادر رام پوری ، کر چکا ہو ، اُس کی ولادت ۱۸۰۷ء میں خلاف عقل ہے ۔ غالب کی ولادت بقول کریم الدّین ۱۷۸۷ء ہونا چاہیے جو نہیں ، غالب ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو پیدا ہوئے (مطابق ۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء) اس لیے کریم الدّین کی بیان کردہ عمر خلاف قیاس اور غلط ہے ۔ شیفتہ نے دیوان مومن کا دیباچہ ۱۲۴۳ھ میں تحریر کیا تھا ، یہ دیباچہ آج بھی کلیات مومن مطبع نولکشور طباعت ششم دسمبر ۱۹۳۰ء میں شامل نظر آتا ہے ۔ نیز دیوان مومن (مطبوعہ مطبع رفاہ عام دہلی محلہ قاضی حوض گذر الہ آباد ۱۱ فروری ۱۸۴۶ء صفحات ۵ ، ۶) میں شیفتہ رقم طراز ہیں :—

و بزمانہ کہ تہذیب این دلفریب بستان اتفاق افتاد از ہجرت ہزار و دو صد و چہل و سہ سال بروفق ہلال گشتہ بود و سنین عمرش کہ چون عمر

خضر[۴] از حد شمار بر کران باد ، به بست و نه رسیده ۔

اس صراحت سے شیفتہ کے بقول مومن کا سال ولادت آغاز 1215ھ قرار پاتا ہے ، ۱۲۴۳ھ میں اس کی عمر انتیس سال تک پہنچتی تھی ۔ اس روشنی میں یقین کے ساتھ کہ سکتے ہیں کہ مومن کا سال ولادت ۱۲۱۵ھ تھا ۔ اس کی تائید مثنوی شکایت ستم (جس کا سال تصنیف ۱۲۳۱ھ ہے) کے ایک شعر سے ہوتی ہے جس میں سترہ سال کی عمر ظاہر کی گئی ہے :—

دیکھیں آگے دکھائے کیا کیا دن ہے ابھی سترہ برس کا سن

نام محمد مومن خاں (آب حیات (صفحات ۴۱۲ ، ۴۱۳) کی روایت ہے :—

بزرگ جب دلّی میں آئے تو چیلوں کے کوچے میں رہے ، وہیں خاندان کی سکونت رہی ۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کا مدرسہ وہاں سے بہت قریب تھا ، ان کے والد کو شاہ صاحب سے کمال عقیدت تھی ۔ جب یہ پیدا ہوئے تو حضرت ہی نے ان کے کان میں اذان دی اور مومن خاں نام رکھا ۔ گھر والوں نے اس نام کو ناپسند کیا اور حبیب اللہ نام رکھنا چاہا لیکن شاہ صاحب کے نام سے نام پایا ۔

حیات مومن کے مصنف عرش گیاوی (صفحہ ۳۷) لکھتے ہیں :—

شاہ صاحب نے "مومن علی" نام رکھ دیا ، گھر والوں کی طرف سے دوسرا نام حبیب اللہ پیش کیا گیا مگر شاہ صاحب نے فرمایا "نہیں" ۔ عورتوں نے پھر دست بستہ عرض کیا کہ حضور ! مومن تو جولاہے کو کہتے ہیں ، کوئی اور نام رکھ دیجیے ۔ حضرت نے فرمایا "نہیں ! اسی نام سے یہ دنیا میں نام پائے گا" ۔ آخر وہی ہوا ۔

عرش صاحب کی روایت کسی حوالے کے بغیر ہے ، بات وہی ہے جو آب حیات میں ہے البتہ نام میں اختلاف کیا ہے ، "مومن علی" نام صرف غلط نقل کیا ہے ۔ جو کتابیں عرش صاحب کی نظر سے گذری ہیں و

ہمارے بھی پیش نظر ہیں، کسی نے ''مومن علی'' نام نہیں لکھا ہے۔ سب سے قدیم حوالہ نام کے سلسلے میں گلشن بے خار (صفحہ ۱۹۵) نیز دیباچہ دیوانِ مومن (کلیات مومن صفحہ ۴، مطبع نولکشور، طباعت ششم) سے ملتا ہے :- ''محمد مومن خاں''

اس کی تائید صاحب گلستان سخن (صفحہ ۴۴۳) اور کریم الدّین (تذکرہ شعرائے اردو صفحہ۴۴۳، گلدستۂ نازنیناں صفحہ۲۰۱)، سرسید احمد خاں (آثار الصنادید باب چہارم طبع اول صفحہ ۱۹۲)، نواب صدیق حسن خاں (شمع انجمن صفحہ ۴۴۸)، طفیل احمد یادگار شعرا صفحہ ۱۹۹ (ترجمہ فہرست کتب خانہ شاہ اودھ مرتبہ اسپرنگر (Sprenger)، نظامی (قاموس المشاہیر جلد دوم صفحہ ۲۳۹)، نساخ (سخن شعرا صفحہ ۴۶۷)، مولانا عبدالحی (گل رعنا صفحہ ۲۹۷ طبع سوم)، انشائے مومن خاں[1] مؤلفہ حکیم احسن اللہ صاحب (مطبع سلطانی ۱۲۷۱ھ صفحہ۷)، نسخہ[2] دیوان‌فارسی مومن و انشائے فارسی مومن مکتوبہ آہی (مخطوطہ رضا لائبریری رام پور) - اکثر تذکرہ نگاروں نے صرف ''مومن خاں'' نام نقل کیا ہے، ملاحظہ ہو جلوۂ خضر جلد اول (صفحہ ۲۳۰)، داستان غدر (طبع اول صفحہ۷)، گلستان ہمیشہ بہار (صفحہ ۱۱۰)، روزنامچہ مولوی عبد القادر خاں (مخطوطہ حبیب گنج صفحہ ۱۳۸)، تاریخ ادب اردو (طبع اول صفحہ ۳۰۶) تذکرہ طور کلیم (طبع اول صفحہ ۹۷) بزم سخن (طبع اول صفحہ ۱۰۶)، بہادر شاہ ظفر (صفحات ۱۰۴، ۱۱۴)، مقدمہ کلیات مومن مرتبہ ڈاکٹر عبادت یار خاں (صفحہ ۱۰)، یادگار غالب (صفحہ ۲۳) وغیرہ -

---

۱ - کدام کافر کیش است کہ از حال محمد مومن خاں گرامی برادرم آگاہ نیست -

۲ - الحمد و المنۃ للہ کہ انشائے جناب حکیم محمد مومن خاں مرحوم از دست عاصی بلا اشباہ سر تا پا گناہ آہی ہیچ مداں.............الحمدللہ و المنۃ کہ دیون فارسی حکیم محمد مومن خاں مرحوم المتخلص بہ مومن از دست عاصی بلا اشباہ سر تا پا گناہ ، بتاریخ ہفدہم شہر جمادی الثانی ۱۲۸۹ھ یوم جمعہ وقت عصر باتمام رسید بمنہ و کرمہ ، الٰہی چنانکہ ایں دیوان بخیر و سعادت لباس تمامی در بر کشید ، انجام آہی ہیچمداں ہم‌حسن انجام پذیرد...........

حبیب اللہ نام کی صراحت کسی قدیمی معاصر تذکرہ میں نہیں ملتی۔ اگر یہ نام مستورات کی طرف سے تجویز کیا گیا تھا اور رائج نہ ہو سکا تو قیاساً ہم آب حیات کی روایت کی یہ تاویل کر سکتے ہیں کہ حکیم احسن اللہ خاں کی والدہ جو مومن کی حقیقی پھوپھی تھیں، اُن کی تجویز ہوگی۔ اُن کے شوہر کا نام حکیم عزیزاللہ تھا اور بیٹے کا نام احسن اللہ، اسی مناسبت کی وجہ سے حبیب اللہ نام تجویز کیا ہوگا مگر تائید نہ ہو سکی اور یہ نام خود بخود ختم ہو گیا۔ مومن نے اپنے نام کا معما بھی نظم کیا ہے جو یہ ہے:—

کیفیت وصال بس اب کچھ نہیں رہی
کیوں کر نہ ہوں ملول میں، شب کچھ نہیں رہی

''ملول میں'' سے شب یعنی لیل کو خارج کر دیں تو باقی ''مومن'' رہ جاتا ہے۔ خان نام کا جزو نہیں بلکہ خطاب ہے، شاہی زمانے میں اکثر خاندانوں میں نسلاً بعد نسل خانی خطاب جاری رہتا تھا۔ ''مومن'' کے تمام رشتہ‌داران کے اسماء کے ساتھ ''خان'' شامل نظر آتا ہے، اسی طرح ''محمد'' نام سے پہلے بالعموم لکھا جاتا تھا اور بعض اسماء سے اجدائی میں بے رابطی نظر آتی۔ ان کے شاگرد رشید محمد مصطفیٰ خاں کے نام کا جزو ''محمد'' نظر آتا ہے لیکن عموماً تذکرہ نویسوں نے اختصار سے کام لے کر مصطفیٰ خاں نام لکھا ہے۔ یہی صورت ''مومن'' کے نام کی ہے، معاصرین نے عموماً ''محمد مومن خان'' نام لکھا ہے، بعض نے کوتاہ قلمی سے کام لیا اور صرف ''مومن خاں'' نقل کر دیا ہے۔ مومن کا نام صحیح ''محمد مومن خاں'' ہے۔

ابتدائی زندگی

مومن غلام نبی خان کی بڑی اولاد تھے، ان سے پہلے کوئی اور اولاد ہوئی ہو اور زندہ نہ رہی ہو نہیں کہا جا سکتا البتہ اتنا ثابت ہے کہ غلام نبی خاں کے دو اولادیں زندہ رہیں: مومن اور اُن کی چھوٹی بہن جن کی لڑکی جوان ہو کر میر عبدالرحمٰن آہی کے نکاح میں آئی اور اسی وجہ سے

مومن آھی کو نہ صرف داماد سمجھتے رہے بلکہ منہ بولا بیٹا بھی بنا لیا تھا ۔ اس وجہ سے والدین کی محبت کا مرکز مومن ھی بنے رہے ، ان کے گھر امارت ھی تھی جیسا کہ بعض تذکرہ نویس[1] لکھتے رہے ھیں نہ افلاس ۔ متوسطالحال[2] خاندان تھا اس لیے ناز و نعمت سے پرورش پائی ہوگی ، اکلوتا لڑکا ھر ایک کی آنکھ کا تارا ھوتا تھا، پھر صورت بھی پاکیزہ پائی تھی اس لیے مومن نہ صرف والدین کے پیارے تھے بلکہ دوسرے رشتہ داروں کے بھی چہیتے بن گئے، ھر طرف سے ناز برداری کی گئی اور مومن کی طبیعت میں ضد اور ھٹ نے جگہ پیدا کر لی ۔ خاندان عوام و خواص کی نظر میں محترم تھا اس لیے تفاخر کا جذبہ پیدا ھونا ضروری تھا ۔ ان کے چچا زاد بھائی حکیم محمد یوسف خاں ، حکیم عبدالحکیم خاں ، حکیم عبدالناصر خاں وغیرہ تھے ، نہیں کہا جا سکتا کہ ان میں سے کون مومن کا ھم عمر تھا ، بچپن کے ساتھی کون کون تھے، ان کی صراحت سے ھم قاصر ھیں ۔

سلسلۂ تعلیم (آب حیات (طبع پانزدھم صفحہ ۴۱۲) کی روایت ہے کہ شاہ عبدالعزیز صاحب کا مدرسہ مکان سے بہت قریب تھا اس لیے غالباً وھیں ابتدائی تعلیم پائی ھوگی یا مکان پر شرفا کے دستور کے مطابق تعلیم پائی ھوگی ۔

مطابق روایت آب حیات (صفحہ ۴۱۳ طبع پانزدھم) ۔

قوت حافظہ بچپن کی معمولی تعلیم کے بعد جب ذرا ھوش سنبھالا تو والد نے

---

۱ ۔ امارت اور ریاست مومن کو ورثے میں ملی صفحہ ۳ مقدمہ کلیات مومن مرتبہ ڈاکٹر عبادت یار خاں بریلوی ، حکیم مومن کے گھر میں فارغ البالی تھی ، صفحہ ۱۰ ۔

۲ ۔ نیز پدرش و عمش نامور اند و بطبابت معروف ، مواضع جاگیر آناں شامل خالصہ شریفہ شدند ، اکنوں مانند دیگر خاندان ھائے قدیم دھلی بہ عسرت بسر می برند ۔

شاہ عبدالقادر صاحب کی خدمت میں پہنچایا ، ن سے عربی کی ابتدائی کتابیں[1] پڑھتے رہے - حافظہ کا یہ حال تھا کہ جو بات شاہ صاحب سے سنتے تھے ، فوراً یاد کر لیتے تھے ، اکثر شاہ عبدالعزیز صاحب کا وعظ ایک دفعہ سن کر بعینہ اسی طرح ادا کر دیتے تھے -

تعلیم عربی | مولوی کریم الدّین صاحب تذکرۂ شعرائے اردو (صفحہ ۳۴۴ مطبوعہ ۱۸۴۸ء) کا بیان ہے :—

حال ان کی استعداد کا یہ ہے کہ عربی میں ''شرح ملا''[2] تک اور فارسی خوب جانتے ہیں -

اس سے اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے تکمیل درسیات (عربی) تو نہ کی تھی البتہ عربی میں کافی دست رس رکھتے تھے ، فارسی رقعات میں آیات کا بر محل استعمال اس پر دال ہے -

تعلیم فارسی | سرخوش (اعجاز سخن صفحہ ۲۹۶ ، بحوالۂ مخزن اکتوبر ، نومبر ۱۹۱۴ء) لکھتے ہیں :—انھوں نے فارسی عبداللہ خاں علوی سے جو عدیم المثال عالم تھے ، تحصیل کی تھی -

اس روایت کی تصدیق یا تکذیب نہیں کی جا سکتی جب تک

---

۱ - ڈاکٹر عبادت یار خاں مقدمہ کلیات مومن میں تحریر کرتے ہیں :—

شاہ عبدالقادر جیسے استادوں سے درسیات کی تکمیل کی -

آب حیات کی روایت عبدالکریم صاحب رفیق دیرینہ مومن کی ہے ، ان کی روایت ہے کہ مومن نے ابتدائی عربی کی کتابیں پڑھیں لیکن ڈاکٹر صاحب نے کتب درسیہ کی تکمیل کا دعویٰ کیا ہے حوالہ کوئی نہیں دیا اس لیے یہ رائے قابل تسلیم نہیں -

۲ - مومن کے اشعار ذیل اس کی علمی استعداد کو ظاہر کرتے ہیں :—

کس قدر حکمت اشراق سے دل جلتا ہے ہو گئے شعلۂ دوزخ ، مرے دل کے انوار

غم بے قدریٔ ہیئت سے جگر چاک ہوا خرق افلاک سمجھتا تھا میں کتنا دشوار

اصل مآخذ معلوم نہ ہو لیکن فارسی میں جو مہارت حاصل کی ، اُس کا اندازہ حسب ذیل آراء سے ہو سکتا ہے ۔

شیفتہ (گلشن بے خار صفحہ ۱۹۶) :—

گاھے گاھے کہ داد سخن سنجی و سحر آفرینی می دھد بر جان دری زبانان منت‌ها می نہد ...... باوجود تخالف لسانین ھر دو لفظ چنداں دست گاھے نصیب او گشتہ کہ پارسیاں از آن خود می انگارند ۔

سر سید احمد خاں (صفحہ ۱۹۲ آثارالصنادید باب چہارم طبع ۱۸۴۷ء) :—

ان کے فروغ ضمیر سے الفاظ دری ، کوکبِ دُرّی ..... اگر یہ کہا جائے کہ شیرینیٔ زبان حافظ اور نمک سخن سعدی اور متانت تراکیب انوری اور نشست الفاظ خاقانی اور آیانی (کذا) عبارات ابوالفضل ہندی اور تازگی معانی کمال الدّین اصفہانی اور سوا اس کے جو خوبی صف شعراً سے کسی کے ساتھ مختص ہے ، سب ان کے کلام معجز نظام میں ہے......

کریم الدّین (گلدستہ نازنیناں صفحات ۱۰۲ و ۱۰۳) :—

خاقانی ھر چند کہ زبان فارسی کا زمان مقدم میں گزرا لیکن اگر وہ بھی ھوتا تو جبین نیاز آستان اس شاعر پر گھستا مر جاتا ، وہ لطافت جو کلام فارسی اس شاعر کے میں ھے ، ھرگز نہ پاتا ، کلام اُس کے کو اگر سحر کہیں تو بجا ھے.....

کریم الدّین (تذکرہ شعرائے اردو مطبوعہ ۱۸۴۸ء صفحہ ۲۴۳) :—

اور فارسی خوب جانتے ھیں ۔

حالی :—ذیل کی غزل نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کے مکان پر جو مشاعرہ ھوتا تھا ، اُس میں پڑھی گئی تھی ۔ دلّی کے تمام نامور شعراً کا

جو وہاں فارسی کی غزلیں لکھ کر لے جاتے تھے، مرزا نے اس میں ذکر کیا ہے۔ (یادگار غالب صفحہ ۲۲۹)

ہند را خوش نفسانند سخن‌ور کہ بود   باد در خلوتِ شاں مشک‌فشاں ازدمِ شاں
مومن و نیّر و صہبائی و علوی انگاہ   حسرتی، اشرف و آزردہ بود اعظمِ شاں

عرش، حیات مومن (صفحہ ۳۷) میں لکھتے ہیں :—

تعلیم بھی ان کی اسی مدرسے میں ہوئی، کچھ کتابیں تبرکاً شاہ عبدالعزیزؒ صاحب سے اور بقیہ علامہ شاہ عبدالقادرؒ سے پڑھیں اور یہیں سے عربی، فارسی، حدیث، فقہ، منطق، معانی وغیرہ کی تکمیل ہوئی۔

عرش گیاوی کی رائے کہ تعلیم شاہ عبدالعزیز صاحب کے مدرسے میں ہوئی، قیاساً ہے، تحریری ثبوت اس کا پیش نہیں کیا گیا ہے۔ آب حیات میں شاہ عبدالقادر صاحب[1] سے تعلیم حاصل کرنا لکھا ہے اور یہ روایت قدیم

۱۔ شاہ عبدالقادر صاحب کی وفات میں اختلاف ہے، سیرت سید احمد شہید صاحب حاشیہ صفحہ ۱۱۶ میں مولانا غلام رسول مہر ۲۲ جمادی الثانی ۱۲۲۸ھ، مطابق ۲۰ جون ۱۸۱۳ء بہادرشاہ ظفر (صفحہ ۲۹۶) ۱۹ رجب ۱۲۳۰ھ اور صفحہ ۲۹۷ پر حدائق الحنفیہ صفحہ ۴۷۱ کے منظور الٰہی ۱۲۴۲ھ مادہ وفات لکھا ہے۔ (از رئیس احمد جعفری)۔ مولوی عبدالقادر خاں روزنامچہ میں ان تینوں بھائیوں کی نسبت تحریر کرتے ہیں :—

مولانا عبدالعزیز خلف و خلیفہ بالاستحقاق جناب شاہ ولی اللہ محدث چہ بزبان اردو و چہ فارسی و چہ تورانی و مغل زایان دھلی و چہ ایرانی و چہ عربی کم‌تر دیدہ ام... و برادر مولوی رفیع الدین بہ کمال جامعیت التفات بافادۂ فنون ریاضیہ بیشتر داشت و حافظہ اش کہ زیادہ از ذہن وقاد وے بود بخلاف مولانا کہ براقی ذہن تفوق بہ حافظہ عدیم النظیر وے داشت و مولوی عبدالقادر بہ ہر سہ برادر کمال بود، ہمہ فنون را دانستے لیکن افادۂ تفسیر و حدیث‌معمولش بود، بہ مسجد اکبر آبادی بیگم درویشانہ یکرو با یگانہ و بیگانہ بسر بردے۔ اول آن بزرگوار فرمان یافت، و بعد ازاں مولوی رفیع الدین کہ در جملہ خاندان قوی‌المزاج بود بہ مرض ہیضہ ناگہاں درگذاشت (۵ شوال، ۱۲۳۳ھ)۔

ہے اور درست معلوم ہوتی ہے۔ شاہ عبدالقادر صاحب کی نسبت سر سید احمد خاں آثار الصنادید (صفحہ ۹۰ باب چہارم) میں لکھتے ہیں :

تمام عمر مسجد اکبر آبادی کے حجرے میں بسر کی، وفات کو تیس پینتیس برس گذرے۔

شاہ عبد القادر صاحب تمام عمر مسجد اکبر آبادی میں رہے، مومن نے تعلیم بھی مسجد اکبر آبادی میں ان سے پائی، مدرسۂ شاہ عبدالعزیز صاحب میں تعلیم پانے کا کوئی حوالہ نہیں ملتا، شاہ عبدالعزیز صاحب سے تبرکاً کتابیں پڑھنا بھی غلط روایت ہے۔ سر سید احمد خاں (آثار الصنادید صفحہ ۹۱) شاہ رفیع الدّین کے متعلق لکھتے ہیں :—

شاہ عبدالعزیزصاحب کے بڑھاپے کے باعث سلسلۂ تعلیم ان کے سپرد رہا۔

اگر بارہ تیرہ سال یہ خدمت انجام دینا مان لی جائے تو شاہ رفیع الدّین صاحب کی وفات ۵ شوال ۱۲۳۳ھ کے پیش نظر ۱۲۲۰ھ سے شاہ عبدالعزیز صاحب درس تدریس کا سلسلہ چھوڑ چکے تھے۔ مولانا محمد اسحاق صاحب کے حال میں لکھا ہے (آثار الصنادید صفحہ ۱۰۴) کہ شاہ عبدالعزیز صاحب کے سامنے بیس برس تک طلبہ کو حدیث پڑھائی اس لیے تبرکاً شاہ عبدالعزیز صاحب سے کچھ کتابیں پڑھنا ثابت نہیں۔

اب مومن کی زبانی آپ بیتی سنیے، ''مثنوی شکایت ستم'' میں لکھتے ہیں :—

یعنی طفلی سے ہوں میں پیر مغاں — بلدِ راہِ گم رہانِ جہاں
تھے برس ہم شمارۂ افلاک — کہ ہوا پائمال صورتِ خاک
پائے بچپن میں دل کا آ جانا — کچھ سمجھتے نہ تھے یہ کیا جانا
لذّت آئی جو لفظِ اُلفت سے — پڑھتے دائم الف کے آگے تے
بس کہ تھا دل میں شکوۂ بیداد — سبق الحمد کا نہ رہتا یاد
حفظ قرآن و یاد مصحف رو — فرصت اک دم نہ روزوشب میں کبھو
دن کو ورد زباں سبق ناچار — رات بھر درسِ شوق کی تکرار

حفظ قرآن | نو برس کی عمر میں مومن بقول خود حفظ قرآن میں مشغول تھے اور اسی زمانے میں سلسلۂ تعلیم میں خلل پیدا ہو گیا ۔ پڑوس میں کسی لڑکی سے محبت ہو گئی ، توجہ تعلیم سے ہٹ گئی ۔ حافظ قران ہو گئے تھے یا نہیں ، یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا لیکن مومن کی قوت حافظہ کی جو روایت بیان کی جاتی ہے (آب حیات صفحہ ۴۱۳) کہ اکثر شاہ عبدالعزیز صاحب کا وعظ ایک دفعہ سن کر بعینہ اسی طرح ادا کر دیتے تھے ، اس سے قیاس ہوتا ہے کہ مومن حافظ قرآن بھی تھے ۔

محبت بڑھتی رہی اور تعلیم گھٹتی رہی ، بارھویں سال تک تعلیم چھوڑ چکے تھے ۔ آخر ان کی چوری چھپے کی محبت کھل گئی ، لوگوں میں چرچے ہونے لگے تو اس نے ملاقات بند کر دی ، آخر میں محبوبۂ اولیں جنت کو سدھار گئی ، ان کی محبت رنگ لائی ، جان پر بن گئی ، علاج معالجے ہونے لگے ، غالباً یہی زمانہ ترک تعلیم کا ہوگا ۔ طبیبوں کی دوا کارگر نہ ہوئی ، آخر خود دل کو سنبھالا ، ایک دن سو رہے تھے کہ ایک پڑوس کی لڑکی آ کر دلدھی کرنے لگی اور مومن بارہ سال کی عمر میں ایک مصیبت سے چھوٹ کر دوسری میں مبتلا ہو گئے ، پھر وہی پچھلے سبق محبت کے یاد ہونے لگے ۔ تیرھویں سال میں تھے کہ ایک پڑوسن نے دونوں کو یکجا سوتا دیکھ لیا اور سب کو بتا دیا ۔ یہ خبر عام ہو گئی ، مومن باھر مردانہ مکان یا دیوان‌خانے میں تھے ، اندر بلائے گئے ۔ اقربا نے کیا کچھ نہ کیا خود مومن کا بیان ہے (صفحات ۲۷۲ تا ۲۷۴ ، کلیات مومن) :—

بد زبانوں نے آ کے مُنہ پر کہا ۔ جا ، کہ تو اپنے کام کا نہ رہا
ہم کو بد نام کر دیا تو نے ۔ اے زبوں کار ، کیا کیا تو نے
ہم سمجھتے تھے اب تلک معصوم ۔ یہ سیاہ کاریاں نہ تھیں معلوم
لاغری کی جو یوں حکایت تھی ۔ جور استاد کی شکایت تھی
ہوئے واقف نہ حرفِ مطلب سے ۔ بیٹھنا واں تھا ، اٹھ کے مکتب سے
سر مفہوم کا دماغ کہاں ۔ جب مزا دے زباں کو ، سیم دھاں

تو سہی ہم بھی ناک میں دم لائیں　　بھیجیں مکتب میں پھر بزور پڑھائیں

مومن تیرہ سال کی عمر میں آستاد بن گئے تھے ، اول تو رونے لگے جب حقیقت پوچھی تو کہنے لگے ''سب جھوٹ'' :-

مجھ سا نادان عشق کیا جانے　　شوقِ زلفِ سیاہ بلا جانے
آپ کو میں ہلاک کرتا ہوں　　لیے مرتے ہو کس پہ مرتا ہوں

دیگر علوم

علمِ طب | بہر حال یہ سلسلۂ تعلیم دوبارہ جاری ہوا ہوگا لیکن مومن تکمیل نہ کر سکے ۔ اس لیے انھیں مطب میں بٹھایا گیا ۔ آب حیات کی روایت (صفحہ ۳۱۴) یہ ہے :-

جب عربی میں کسی قدر استعداد ہو گئی تو والد اور چچا حکیم غلام حیدر خاں اور حکیم غلام حسن خاں سے طب کی کتابیں پڑھیں اور انھیں کے مطب میں نسخہ نویسی کرتے رہے ۔

مولوی کریم الدّین کی روایت (گلدستۂ نازنیناں صفحہ ۱۰۲ ، تذکرۂ شعرائے اردو صفحہ ۳۴۴) ہے :-

طب میں بھی مہارت ہے ۔ حکیم اس پایے کے کہ بو علی سینا اگر تمام عمر قانون طبابت کے سیکھنے میں گنوائے پر ان کے سامنے نبض دیکھنے کا شعور نہ آئے ۔ ?

ترجمہ فہرست اشپرنگر (Sprenger) از طفیل احمد (یادگار شعرا صفحہ ۱۹۹) میں ہے :- اچھے طبیب ہیں ۔

سید علی حسن خاں (بزم سخن صفحہ ۱۰۷) طب کی مہارت کا ذکر کرتے ہیں :- علاوہ ازیں در طب دست گاہ وافر داشت ۔

نساخ شعرا (صفحہ ۴۶۷) میں لکھتے ہیں :- طب میں خوب دخل رکھتے تھے ۔

طور کلیم (صفحہ ۹۷) میں ہے :— در طب ید طولیٰ داشت۔

مومن خود کہتے ہیں :—

طبیب وہ ہوں کہ ہو سوز سینۂ بلبل نظارۂ رُخ گلفام سے مجھے محسوس
ز فخر نسبتِ چوں من حکیم دھلی را رسد ز نسبتِ یونان زمیں ہزاراں عار
مجھ تلک پہونچے ہیں آب و جد سے ورثۃً نکتہ ہائے لقمانی
ہوں وہ نباض جس کے ناخن میں حرکاتِ عروقِ شریانی

ایک فارسی خط سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ نواب فیض محمد خاں والیٔ جھجر کے دربار میں بطور شاھی طبیب بھی تین ماہ تک فرائض انجام دیتے رہے لیکن نواب کی بے رُخی دیکھ کر دھلی آگئے۔ جب نواب نے وجہ ترک ملازمت پوچھی تو مومن نے کہا کہ میں نے کسی طمع کی بنا پر آقائے قدیم کی رفاقت ترک نہ کی بلکہ تین ماہ سے بے التفاتی آپ کی دیکھ رھا تھا اور میرے بارے میں جو نا مہربانی اور بے رُخی ہوتی، میں اسے بے تکلّفی پر محلول کر رھا تھا لیکن جب مجھے آپ کی بے توجہی تحقیق ہو گئی تو میں نے آپ کی صحبت سراسر تعلیم کو خیر باد کہا؛ یہ الزام غلط ہے کہ علاج میں ناکامی دیکھ کر میں آگیا، یہ رائے غلط ہے، میری نظر میں شفائے مرض خدائے تعالیٰ کے ھاتھ ہے اور فنا بھی اُسی کے قبضے میں۔ حذاقت کے معنی یہ ہیں کہ رائے میں کم غلطی ہو نہ یہ کہ خون ملک الموت گردن پر ہو۔۔۔۔ میں نے کب مسیحائی کا دعویٰ کیا ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔ (رقعہ فارسی، انشائے مومن مطبوعہ مطبع سلطانی ۱۲۷۱ھ مملوکۂ پنجاب یونیورسٹی لاہور)۔

نواب فیض محمد خاں کا نام ہم نے متعیّن کیا ہے جونکہ مومن کی جاگیری پنشن جھجر سے ملتی تھی۔ حکیم احسن اللہ خاں ان کے پھوپھی زاد بھائی بھی پہلے نواب احمد بخش والیٔ فیروزپور جھرکہ کے ملازم تھے اور اُن کی رحلت کے بعد اسدالدولہ نواب فیض محمد خاں والیٔ جھجر کے پاس اسی منصب

عمدہ پر مقرر ہوئے، اس رئیس کے انتقال پر چندے خانہ نشین ہوئے، (آثار الصنادید صفحہ ۵۸) ۔ اس کا امکان ہے کہ حکیم احسن اللہ خاں کی سفارش سے یہ بھی جھجر میں ۱۲۴۰ھ تا ۱۲۵۱ھ کے درمیان ملازم ہو گئے ہوں اور آزادانہ روش کے باعث یہ پابندی نہ اٹھا سکے یا نواب احمد بخش خاں کے یہاں ملازمت کر لی ہو؛ چونکہ وضاحت نام کی نہیں ہوتی ہے اس لیے قیاساً جھجر کی ملازمت زیادہ قرین قیاس ہے، اس کے علاوہ کسی اور جگہ طبی ملازمت کا حال نہ معلوم ہو سکا۔

عرش گیاوی کا یہ لکھنا (صفحہ ۳۹ حیات مومن) صحیح نہیں ہے:

اس فن میں یہ آبرو پائی کہ اب تک طب کی بڑی بڑی کتابوں میں اُن کے نام پہ نسخے موجود ہیں۔ در حقیقت یہ اُن کی انتہائی ذہانت تھی کہ موجدانِ فنِ طب کے نقشِ پا تسلیم ہوئے اور صاحبِ تصنیف بھی ہوئے۔

اگر عرش صاحب اُن طبی کتابوں کے نام لکھ دیتے جن میں مومن کے طبی نسخے موجود ہیں تو ہماری معلومات میں اضافہ ہوتا لیکن بغیر حوالہ یہ بات قابل تسلیم نہیں؛ اسی طرح ڈاکٹر عبادت یار خاں (مقدمہ کلیات مومن صفحہ ۱۰) کی یہ رائے بھی مبالغہ آمیز ہے:—

درسیات کی تکمیل کی اور اس کے بعد طب کی طرف متوجہ ہوئے اور اس فن کو کمال تک پہنچایا۔

سر سید احمد خاں نے کاملین دہلی (آثار الصنادید) کے زمرۂ شعرأ میں مومن کا ذکر کیا ہے اور حکما کی فہرست میں حکیم احسن اللہ خاں، حکیم غلام نجف خاں، حکیم صادق علی خاں، حکیم امام الدّین خاں، حکیم غلام حیدر خاں، حکیم نصراللہ خاں، حکیم فتح اللہ خاں، حکیم پیر بخش، حکیم حسن بخش، حکیم غلام حسن خاں، حکیم محمد یوسف خاں، حکیم عبدالحکیم خاں کا حال لکھا ہے۔ ان حکماء میں سے حکیم غلام حیدر خاں اور حکیم غلام حسن خاں مومن کے حقیقی چچا، حکیم محمد یوسف خاں اور حکیم

عبدالحکیم خاں چچا زاد بھائی اور حکیم احسن اللہ خاں پھوپھی زاد بھائی ھیں۔ اس فہرست میں مومن کو شامل نہ کرنا ظاھر کرتا ھے کہ انھیں شاعری میں شہرت تھی نہ کہ حکمت و طب میں، اس لیے ڈاکٹر صاحب کا بیان قابل قبول نہیں۔ اس بحث کا یہ مطلب نہیں کہ مومن حکیم ھی نہ تھے بلکہ حکیم تو تھے لیکن دھلی کے مشہور اطبأ میں نہ تھے۔ اپنے پھوپھا حکیم عزیزاللہ صدیقی کی بیماری میں کئی مرتبہ دیکھے گئے لیکن یا تو وہ مومن سے ناراض تھے یا علاج پسند نہ کرتے تھے اس لیے مومن کو نہ بلایا اور مومن اپنی پھوپھی والدہ حکیم احسن اللہ خاں سے مل کر چلے آئے (رقعہ فارسی)۔ مومن نے حکیم احسن اللہ خاں کو ایک فارسی خط لکھا ھے جس میں صبح سے رات تک کے مشاغل کا بیان ھے؛ اس میں شاگردوں کی نشست، بحث و مباحثہ، علم نجوم و رمل، مشاورات کا ذکر کیا ھے، طب کے سلسلے میں کوئی اشارہ نہیں کیا ھے۔ معلوم ھوتا ھے کہ طب کو بطور پیشہ مومن نے نہیں اپنایا تھا، صرف تفریحاً یہ مشغلہ دوست احباب کے لیے جاری رکھا تھا اس لیے سر سید احمد خاں نے بھی حکمأ دھلی میں ان کا حال نہیں لکھا۔ اگر وہ طب کے فن کو بطور پیشہ اختیار کرتے تو ضرور شہرت اور ناموری حاصل کرتے۔ آنھوں نے حکیم غلام حسن خاں کو ۱۲۳۹ھ کے متصل ایک خط لکھا ھے، اس میں اودھ یا حیدر آباد دکن جانے کا ارادہ ظاھر کیا ھے اور مہاراجہ چندو لال کی شاعر نوازی کا خصوصی حوالہ دیا ھے۔ اس سے ظاھر ھوتا ھے کہ فن طب میں آنھیں کمال نہ تھا بلکہ شاعری میں کمال تھا اور اسی لیے شاہ نصیر وغیرہ کی قدر افزائی سے متاثر ھو کر وہ خود بھی لکھنؤ اور حیدر آباد دکن کو پسند کرنے لگے تھے اگرچہ جانا نصیب نہ ھوا۔

علم نجوم و رمل | کریم الدین گلدستہ نازنیناں (صفحہ ۱۰۲) میں رقم طراز ھیں:— فنون حکمیہ اور احوالات سیارات میں گوھر نایاب۔

اور تذکرۂ شعرائے اردو (صفحہ ۳۴۴) میں لکھا ہے :—

سومن مذکور علم نجوم اور رمل سے بھی بہت خوب آگاہ ہے۔

تذکرۂ طور کلیم (صفحہ ۹۷) کے مؤلف کی روایت ہے :— و در نجوم پایۂ والا۔

آب حیات (صفحات ۳۱۴ و ۴۱۴ طبع پانزدہم) میں نجوم کے متعلق تفصیلی بیان ملتا ہے جو نقل کیا جاتا ہے :—

تیز طبیعت کا خاصہ ہے کہ ایک فن پر دل نہیں جمتا، اس نے بزرگوں کے علم یعنی طبابت پر تھمنے نہ دیا، دل میں طرح طرح کے شوق پیدا کیے۔ شاعری کے علاوہ نجوم کا خیال آیا، اُس کو اہل کمال سے حاصل کیا اور مہارت بہم پہنچائی۔ ان کو نجوم سے قدرتی مناسبت تھی، ایسا ملکہ بہم پہنچایا تھا کہ احکام سن سن کر بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے۔ سال بھر میں ایک بار تقویم دیکھتے تھے، پھر برس دن تک تمام ستاروں کے مقام اور اُن کی حرکات کی کیفیت ذہن میں رہتی تھی۔ جب کوئی سوال پیش کرتا، نہ زائچہ کھینچتے نہ تقویم دیکھتے، پوچھنے والے سے کہتے تم خاموش رہو جو میں کہتا جاؤں اُس کا جواب دیتے جاؤ، پھر مختلف باتیں پوچھتے تھے اور سائل اکثر تسلیم کرتا جاتا تھا۔ ایک دن ایک غریب ہندو نہایت بیقرار اور پریشان آیا، ان کے بیس برس کے رفیق قدیم شیخ عبدالکریم اُس وقت موجود تھے۔ خان صاحب نے اُسے دیکھ کر کہا کہ تمہارا کچھ مال جاتا رہا؟ اُس نے کہا "میں لٹ گیا"۔ کہا "خاموش رہو جو میں کہوں اُسے سنتے جاؤ، جو بات غلط ہو اُس کا انکار کر دینا"۔ پھر پوچھا کیا "زیور کی قسم سے تھا"؟ "صاحب ہاں! وہی عمر بھر کی کمائی تھی"۔ "کیا تم نے لیا ہے یا تمہاری بیوی نے۔ کوئی غیر چرانے نہیں آیا"۔ اُس نے کہا "میرا مال تھا اور بیوی کے پہننے کا زیور تھا، ہم کیوں چراتے"۔ ہنس کر فرمایا "کہیں رکھ کر بھول گئے ہوگے۔

مال کہیں باہر نہیں گیا‘‘۔ اس نے کہا ’’صاحب سارا گھر ڈھونڈ مارا کوئی جگہ باقی نہیں رہی‘‘۔ فرمایا ’’پھر دیکھو‘‘۔ گیا اور سارے گھر میں اچھی طرح دیکھا ، پھر آ کر کہا ’’صاحب میرا چھوٹا سا گھر ہے ، ایک ایک کونہ دیکھ لیا ، کہیں پتا نہیں لگتا‘‘۔ خان صاحب نے کہا ’’اسی گھر میں ہے تم غلط کہتے ہو‘‘۔ کہا ’’آپ چل کر تلاشی لے لیجیے میں تو ڈھونڈ چکا‘‘۔ فرمایا ’’میں یہیں سے بتاتا ہوں‘‘ یہ کہ کر اسی کے گھر کا سارا نقشہ بیان کرنا شروع کیا ، وہ سب باتوں کو تسلیم کرتا جاتا تھا ۔ پھر کہا ’’اس گھر میں جنوب کے رخ ایک کوٹھری ہے اور اس میں شمال کی جانب ایک لکڑی کا مچان ہے، اس کے اوپر مال موجود ہے جا کر لے لو‘‘۔ اس نے کہا ’’مچان کو تین دفعہ چھان مارا ، وہاں نہیں ملا‘‘۔ فرمایا ’’اس کے ایک کونے میں پڑا ہے‘‘۔ غرض وہ گیا اور جب روشنی کر کے دیکھا تو ڈبہ اور اس میں سارا زیور جوں کا توں وہیں سے مل گیا ۔

بہادر شاہ ظفر (صفحات ۱۵م و ۱۶م ، از رئیس احمد جعفری) میں ایک اور واقعہ نقل کیا گیا ہے :-

ایک روز مومن خاں صاحب اپنی حویلی میں تشریف فرما تھے ، ان کے ہندو شاگرد سکھا نند بھی بیٹھے تھے ۔ مومن نے ان سے کہا ’’میاں سکھا نند تم بیٹھے انتظار کرتے رہو ، میں حکم لگا چکا ہوں کہ جب تک پورب کی طرف سے اس چھپکلی کا جوڑا نہ آ جائے یہ دیوار سے نہ جائے گی ، اس کا جوڑا آئے پر آئے‘‘۔ سکھا نند حکیم تھے ، رقم تخلص کرتے تھے ، دھرم پورے میں رہتے تھے ، کوئی چالیس سال کی عمر تھی ، ’’ریختے‘‘ میں شاہ نصیر کے اور ’’رمل‘‘ میں خان صاحب کے شاگرد تھے ، بڑے خوش پوشاک ، خوش وضع ، خوش اخلاق ، ظریف الطبع ، حلیم ، خوبصورت اور شکیل آدمی تھے ،

استاد کا ایسا ادب کرتے تھے جیسے کوئی بیٹا باپ کا ادب کرتا ہے۔ حکیم صاحب کی باتیں سن کر 'بہت مناسب' کہتے رہے۔ اُن سے گفتگو کر کے حکیم صاحب ہماری طرف متوجہ ہوئے، کہنے لگے "ارے بھائی صہبائی! تم تو کئی دن سے نہیں آئے، کہو خیریت سے ہو اور آپ کے ساتھ یہ صاحب کون ہیں؟" مولوی صہبائی نے کہا "یہ پہلے کالج میں میرے شاگرد تھے، اب مطبع کھول لیا اور وہاں مشاعرہ کرنا چاہتے ہیں، آپ کو تکلیف دینے آئے ہیں"۔ حکیم صاحب نے کہا "بس مجھے معاف ہی کیجیے، اب دھلی کے مشاعرے شریفوں کے جانے کے قابل نہیں رہے، ایک صاحب ہیں جو اپنی اُمت کو لے کر چڑھ آتے ہیں، شعر سمجھنے کی تو کسی کو تمیز نہیں، مفت میں واہ واہ، سبحان اللہ کا غل مچا کر طبیعت منغض کر دیتے ہیں"۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک بنارس کا سوداگر کپڑوں کے دو گٹھے لے کر آیا، شہر میں جب کوئی آتا تو حکیم صاحب کے پاس اُس کا آنا لازمی تھا۔ ریشمی کپڑوں سے ان کو عشق تھا، کوئی کپڑا پسند آتا تو پھر قیمت کی پرواہ نہیں کرتے تھے، جو مانگتا دیتے۔ اس سوداگر نے آ کر گٹھری مزدور کے سر پر سے اُتاری، اس میں سے پٹ سے چھپکلی نیچے گری اور دوڑ کر سامنے کی دیوار پر چڑھ گئی۔ جو چھپکلی پہلے سے دیوار پر جمی بیٹھی تھی، وہ لپک کر اس سے آ ملی اور دونوں مل کر ایک طرف چلے گئے (دلّی کی آخری شمع صفحات ۳۶ و ۳۷)، (انشائے فارسی صفحات ۲۴۴ تا ۲۴۶)۔

مومن نے تقویم[1] کے جو دیباچے تحریر کیے ہیں، اُن سے مہارت علم نجوم کا اندازہ ہو سکتا ہے:-

---

۱- انشائے مومن خاں ملاحظہ ہو تقویم ۱۲۴۸ھ (صفحہ ۲۰۹) و تقویم ۱۲۴۹ھ (صفحہ ۲۱۶) و تقویم ۱۲۵۰ھ (صفحہ ۲۲۴)۔

دوازدهم ذی‌حجه سال هزار و دویست و پنجاه و دو ، از میل نیر گیتی افروز ، اوج پیغمبری از داغ رشک سینه سوز ، خورشید خاوری طاقت شکن ، گردون پایه ، بلند دستان ، برهم کیش ، افلاک و انجم پرستان ناسخ احکام سعد اکبر و نیر اعظم به مدار طیبه از مرکز عالم صلواة‌الله‌علیه والسلام و علی‌آله واصحابه الکرام و تاریخ بست و یک از سارج هزار و هشت صد و سی و هفتم دوره همنشین از ولادت عیسی[۴] گردون سریر خاسف بدر منیر پهاگن سدی ، ترودشی هیزده صد و نود و سه سنه بکرماجیتی که مصطلح و مرسوم هندی نژادان رصد بند است و روز ایرای از اسفندیارند ماه الٰهی دو هزار چهل و هفت سال اسکندر دانش پسند ، آغاز تخاقوی میل و همین سال از اثنا عشریه ترکان که مترجان پارسی سال مرغ تحریر کنند و مهندسان تازی لسان بکلمه عام الطیر تعبیر ، بعد مرور شش ساعت و نیم از شب سه شنبه که شانزده گهڑی و پانزده پل به محاورهٔ منجان هند بود و تحویل آفتاب جهان تاب در بیت‌الشرف حمل است و وائی سال بقوت عرضی ابتر ، از زحل ابتدائے طلوع آخرین نیم دقیقه هجدهم درجه جدی از اجزای سپهر است 'رب‌اللیل زهره' و رب‌الساعة و مستولی مثلثه ناری جرم مهر سهم الحوادث به ترازو جاگزین و کدخدای وسط‌السمایا تحت‌الشعاع شمش کدام زیر زمین ، تیر اصغر در خوشه ، بر سهم الحنطه ، نور افشان و خداوند بیت تاسع را بمقابله نگران کیوان راجع سوی مریخ و مشتری به تزیع‌السیر گرم نظاره و خضاب‌بهرام و طیلسانِ قاضی بناخنِ شیر پاره پاره ، دقیقه یابان هند و بابل نظر بر مناسبت صاحب دور سلاطین و امرأ را بنارنجی لباس زرباف مشرّف و مخلع سازند و رمز شناسان روم اختیار رنگِ آبی را بگو نه گونه برهان جزو آسانی بر طرازند مرا که نه ستاره پرستم نه از بادهٔ سپاس افلاک سیه مست،

نه فرمان روایان دانش خر را فرمان برم نه آرزو مند خلعت و زر چه افتاد که یک یک از منسوبات کواکب بشارم و رنگ و جوهر ملابس و فروش و مشابہت صور و نقوش بنگارم گرفتم پایۂ ما نشناسی، بے خبرم پندارد و دانا دلے را به تشنیع نادانی بیازارد ، ادا فہمان طرز سخن و آگاہان ِ ایں مشکل‌تر فن نیکو شناسند که شناساترے از من ہیچ زمانه نبوده و ہیچ دانشورے با چنیں تمیز و فراست و تمریخ سعد و نحس زبان نکشوده ، اگر به تتبع اسلاف در آمیزم ، آب ِ غیرت تقلید سوز چگونه ریزم همه کس می دانید که اوستاد هر مس و من یکیست و بجز خالق ِ عقول و نفوس بتعلیم دیگرے نیاز مند نیست ، آنکه شمس را نور داده ، مرا شعور بخشیده و آنکه کلاه برتری بفرق احرام اشری نهادۂ خیال مرا از چرخ اطلس بالاتر رساینده ......

ایک فارسی[1] رقعے میں اپنی اختر شناسی کا بیان کیا ہے ، اس کے علاوہ مختلف اشعار سے علم نجوم سے وابستگی کا اظہار ہوتا ہے ، چند اشعار نمونةً پیش ہیں :-

کروں جو گردش انجم کی میں رصدبندی فدا ہو وجد میں آ کر روان ِ بطلیموس

مرے کلام سے ہیں گونہ گونہ فائدہ‌مند ادیب و نبض شناس و منجم و فاضل
زحل پرست جو میری عزیمت ِ منظوم پڑھے تو لخلخۂ مشک ہو دخان ِ مقل

---

۱ - افسوس که مومن اس اعتقاد کے باوجود که کوئی ذره بغیر خدا کے حکم کے حرکت نہیں کر سکتا ، ستاره پرست ہے اور اس قدر بے تعلقی کے باوجود صبح سے شام تک اُسطرلاب ہاتھ میں ، ہر ایک کے سوالات کا جواب دیتا ہے اور سورج غروب ہونے پر رصد بندوں کی مجلس سے اُٹھتا ہے (رقعه فارسی بنام حکیم احسن الله خاں مخطوطه رضا لائبریری رام پور) -

کس قدر حکمتِ اشراق سے جی جلتا ہے　　ہو گئے شعلۂ دوزخ مرے دل کے انوار
غم بے قدریٔ ہیئت سے جگر چاک ہوا　　خرقِ افلاک سمجھتا تھا میں کتنا دشوار

نہ یہ سمجھا ہوں سیر اختر سے　　علمِ ظنی نہو وے ایقانی
میرے سینے کے صفحے میں ہے رقم　　علمِ دانا دلانِ یونانی
میں روش دانِ حکمِ برجیسی　　میں ادا فہمِ سیر کیواتی

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس　　آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

. . . . . .　　سیارہ شناسم و ندانم

روزم ہمہ شب شبم چہ باشد　　تا طالع و کوکبم چہ باشد

قصائد میں اپنی اختر شناسی کا ثبوت دیا ہے، شاعری کی طرح علمِ نجوم سے بھی مومن کو خصوصی دلچسپی تھی۔

شطرنج آب حیات (صفحہ ۴۱۳ طبع پانزدہم لاہور) میں ہے :-

شطرنج سے بھی ان کو کمال مناسبت تھی، جب کھیلنے بیٹھتے تھے تو دنیا مافیہا کی خبر نہ رہتی تھی اور گھر کے نہایت ضروری کام بھی بھول جاتے تھے۔ دلّی کے مشہور شاطر کرامت علی خاں سے قرابت قریبہ[1] رکھتے تھے اور شہر کے ایک دو شاطروں کے سوا کسی سے کم نہ تھے۔

مرزا فرحت اللہ بیگ کی روایت (دھلی کی آخری شمع صفحہ ۲۳) اس طرح ہے :-

جب میں (کریم الدّین پانی پتی) اور مولانا صہبائی دونوں پہنچے تو

---

۱ - تمکین کاظمی صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ کرامت علی خاں مومن کے حقیقی پھوپھی زاد بھائی تھے — فائق۔

حکیم صاحب (مومن) مرزا رحیم الدین حیا (مشہور شاطر متوفی ۱۸۸۷ء مدفن رام پور) سے کہ رہے تھے کہ صاحبِ عالم تمہارے شطرنج کے نقشوں نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے، ایک ہوں دو ہوں، آخر یہ روز روز کی فرمائش کوئی کہاں تک پوری کرے۔ صاحب عالم نے کہا "استاد! کیا کروں رزیڈنٹ بہادر کے پاس ولایت سے شطرنج کے نقشے حل کرنے کو آیا کرتا ہوں، تو کچھ تو میں خود حل کر کے ان کے پاس بھیج دیتا ہوں، جو سمجھ میں نہیں آتے وہ آپ کے پاس لے آتا ہوں" حکیم صاحب نے نظر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا، ہمارا سلام لے کر کہا "بیٹھیے بیٹھیے"۔ ہم بیٹھ گئے اور پھر وہ صاحب عالم کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے "میاں حیا! جو نقشہ تم لائے ہو، وہ تو میرے خیال میں کوئی پیچیدہ نہیں ہے۔ تم کہتے ہو سرخ مہروں کو مات ہوگی، میں کہتا ہوں سبز کو ہوگی، تم بساط بچھاؤ میں ابھی سمجھائے دیتا ہوں۔ اچھا ذرا مولوی صہبائی سے بات کر لوں......."

بہادر شاہ ظفر میں رئیس احمد جعفری (بہادر شاہ ظفر صفحہ ۲۱۶، بحوالہ امیرالروایات صفحہ ۱۶۱) نے ایک اور روایت نقل کی ہے :—

۱- مسدس بے نظیر صفحہ ۴۲ (میر یار علی جان صاحب ریختی گو) میں مرتب محمد علی خاں اثر حیا کی نسبت لکھتے ہیں :—

صاحب عالم مرزا رحیم الدین حیا ابن صاحب علم مرزا کریم الدین رسا دلی کے لال قلعے میں ۱۲۱۳ھ میں پیدا ہوئے، شاہ نصیر کے شاگرد تھے، شطرنج بھی خوب کھیلتے تھے، (ان کے بیٹے مرزا علیم الدین اور مرزا ولی الدین فدا وغیرہ دربار میں ملازم بزمرۂ مصاحبین رہے اور بہترین شاطر تھے)۔ انتخاب یادگار (صفحہ ۱۱۸) میں امیر مینائی لکھتے ہیں :—اٹھتر برس کا سن ہے، شطرنج بھی خوب کھیلتے ہیں، وطن قدیمی ان کا دہلی ہے مگر مدت سے اس سرکار فیض آثار سے تعلق ہے... ..شاہ نصیر دہلوی کے شاگرد رشید ہیں۔

خاں صاحب نے فرمایا کہ مولوی سراج احمد صاحب خورجوی فرماتے تھے کہ مومن خاں اور مولوی فضل حق صاحب شطرنج کھیلا کرتے تھے اور مومن خاں کھیل میں غالب رہتے تھے - ایک مرتبہ مرزا غالب نے مولوی فضل حق سے کہا کہ آپ اس سے تیز طبع اور ذہین ہیں پھر کیا بات ہے کہ مومن خاں سے مات کھا جاتے ہیں - مولوی فضل حق صاحب نے فرمایا کہ مومن بھیڑیا ہے ، اُسے اپنی قوت کی خبر نہیں ہے ، وہ عشق و عاشقی کے قصوں میں پھنس گیا ، اگر علمی مشغلے میں پڑتا ، اُس وقت اُس کے ذہن کی حقیقت معلوم ہوتی ، فی الحقیقت نہایت ذہین آدمی ہے -

کرامت علی خاں شاطر سے مومن کی دلبستگی کا اندازہ اُس تاریخ سے ہوتا ہے جو دیوان فارسی میں ملتی ہے :—

منصوبۂ مرگ بیں کہ بے مات　　نگذاشتہ ہیچ آدمی را
زیں خانہ ، بہ خانۂ عدم برد　　یک کشت کرامت علی را
افسوس کہ طرفۂ شہ رخ خورد　　نا دیدہ ، عرائے مدعی را
تا آں کہ شمارِ سال تاریخ　　ذچ کردہ ، رقومِ ہندسی را
گفتیم کرامت علی خاں　　تہ کرد بساطِ زندگی را

۱۴۲۲ —— ۱۶۳ = ۱۲۵۹ھ

مومن کی شطرنج سے دلچسپی اس حد تک بیان کی گئی ہے کہ گھر کے ضروری کاموں سے بے نیاز ہو جاتے تھے ، ہر شاطر کی خصوصیت یہی بیان کی جاتی ہے اور مومن اس زمرے سے باہر نہ تھے - کرامت علی خاں اُستاد تھے مگر ان سے کم تھے ، مولوی فضل حق صاحب اور مرزا رحیم الدّین حیا سے بازی جیتتے تھے - شیفتہ اور منشی صدر الدّین آزردہ بھی غالباً شطرنج کے شیدائی ضرور ہوں گے ؛ چونکہ منشی صدر الدّین آزردہ اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے مکانات دہلی میں مرکز اجتماع تھے اس لیے شعر و سخن کے علاوہ شطرنج کی بساط کا جمنا بھی امکانی امر ہے -

موسیقی سے لگاؤ سید ناصر حبیب ناصر نبیسۂ مومن کی روایت ہے (مقدمہ دیوان صفحہ ۲۵ مرتبۂ پروفیسر ضیاء احمد بدایونی) کہ مومن مرحوم کی رنگین مزاجی نے موسیقی کے فنِ لطیف کی طرف توجہ کی تو وہ نام پیدا کیا کہ لوگ ان کے کمال کے معترف ہو گئے، نظیر بین باز نے جو اُس زمانے میں اُستاد تھے، اُن کے انتقال پر بین اُٹھا کر رکھ دی کہ اب دلّی میں کوئی قدر داں نہیں رہا۔

خاندان خواجہ میر درد کو موسیقی سے خصوصی وابستگی تھی، خواجہ میر درد کے یہاں ہر مہینے کی دوسری اور چوبیسویں کو محفل سماع منعقد ہوتی تھی۔ یہ سلسلہ اُن کے مرنے کے بعد بھی جاری رہا، شاہ عالم ثانی بھی ان جلسوں میں شریک ہوتا تھا (ایک بار مجلس سماع میں پاؤں پھیلاتے ہوئے شاہ عالم ثانی نے معذرت کی کہ پاؤں میں درد ہے اس وجہ سے گستاخی معاف فرمائی جائے۔ خواجہ میر درد نے چیں بجبیں ہو کے کہا "پھر اس محفل میں آنے کی ضرورت نہ تھی، آداب محفل کا لحاظ رکھنا ضروری ہے")۔ چنانچہ مومن کے خسر خواجہ محمد نصیر رنج کو بھی موسیقی میں کمال حاصل تھا، اُن کے زمانے میں بھی محفل سماع منعقد ہوتی تھی اور علمأ و مشائخ اور اکثر امرا شرکت کرنا فخر سمجھتے تھے (گل رعنا صفحہ ۱۷۱)۔ خواجہ محمد نصیر کے مرنے پر مولوی یوسف علی صاحب سجادہ نشیں نے بھی اسے جاری رکھا۔ مومن کو نہ تنہا شعر و سخن سے وابستگی تھی بلکہ موسیقی سے بھی لگاؤ ہو گیا۔ مثنوی قول غمیں ۱۲۳۶ھ اور مثنوی تف آتشیں تالیف ۱۲۴۱ھ میں مومن لکھتے ہیں:

نغمہ سنجی و خوش الحانی و بس شعر گوئی و غزل خوانی و بس
زمزمہ سازی سے دم سازی چنگ نوازی، گوش نوازی

لیکن یہ شوق مومن کو بہت پہلے پیدا ہو چکا تھا۔ قول غمیں (۱۲۳۶ھ) جو امۃ الفاطمہ طوائف کی محبت کی یادگار ہے، اُس سے ملاقات دہلی کی کسی طوائف کے یہاں ہوئی تھی اور مومن کا یہاں روزانہ ورود ہوتا تھا، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ موسیقی کے دلدادہ تھے اور ایسی مجالس میں شمولیت

ضروری سمجھتے تھے ۔ ایک طوائف کی فرمائش سے اس کی بھاوج کو خط لکھا ہے جس کا عنوان ہے :-

رقعہ بفرمانِ مطربہ—بنام زن برادرش کہ ذریعہ پیغام با زن محبوبہ‌اش بود آخر خود میل خاطر رسانید امّا بکام نرسید ۔

دیوان فارسی میں ایک قطعہ تاریخ وفات امامن نامی طوائف کا ملتا ہے :-

خزاں دیدہ شد نوگلے ، در جوانی جوانی چنیں ، باغ امکان ندارد
امامن کہ مانند او لعبتے خوش پسِ پردہ گردونِ گرداں ندارد
چو امید وصلش بہ مردن فتادہ خوشا درد مندے کہ درمان ندارد
چہ گویم ز سالِ وفاتش چہ گویم غم و رنج و آزار پایاں ندارد

۱۲۶۰ھ

اس روشنی میں ناصر حبیب ناصر کا بیان صحیح معلوم ہوتا ہے لیکن نظیر بین باز کا مومن کے مرنے پر بین رکھ دینا غلط ثابت ہوتا ہے ۔ آثار الصنادید میں سر سید احمد خاں نے دھلی کے کاملان موسیقی کا حال لکھا ہے ، یہ فہرست ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء کی ہے یعنی وفاتِ مومن سے پانچ سال قبل ، اس میں نظیر بین باز کوئی ماہر موسیقی نہیں البتہ میر ناصر احمد کا نام ملتا ہے ، سر سید احمد خاں ان کے متعلق لکھتے ہیں (صفحہ ۲۲۷) :-

سادات سے...... ان کے نانا همت خاں تھے ، ان سے ھی فن موسیقی حاصل کیا ، یہ نغمہ سرائی اور بین نوازی میں یکتائے روزگار ہوتے ، یہ بھی خواجہ شاہ محمد نصیر کی مجلس میں شریک ہوتے ، ان کے بعد انتقال مولانا یوسف علی سجادہ نشین کی مجلس میں شریک ہوتے ، اب جانب اودھ روانہ ہوئے ہیں ۔

مومن نے چنگ نوازی کا خود بیان کیا ہے اور بین نوازی سید ناصر حبیب ناصر کے بیان سے ثابت ہے البتہ میر ناصر احمد بین باز پر ترجیح دینا صرف تعلّی ہے ۔

تعویذ نویسی پروفیسر ضیاء احمد صاحب لکھتے ہیں کہ بعض تذکروں سے پتا چلتا ہے کہ فن عملیات میں دخل تھا - (مقدمۂ دیوان مومن صفحہ ۲۵ مرتبہ ضیاء احمد صاحب) -

مصنف حیات مومن (صفحہ ۴۲) کا بیان ہے :-

حقیر عرش جب آپ کی پوتی صاحبہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو اس نے اس قصے کو بھی سنا (سنار کے زیور گم ہونے کا واقعہ) ، نیز وہ یہ بھی کہتی تھیں کہ وہ عامل تھے ، گنڈے تعویذ کی بھی اُن کی دھوم تھی -

مومن قصیدہ نعتیہ میں اپنی تعویذ نویسی کا ذکر فخریہ طور پر کرتے ہیں - (کلیات مومن صفحہ ۱۵ طبع نولکشور ۱۹۳۱ء) :-

طلسم ماہ لکھوں گر پئے زباں بستن بنائے سہر دھن چرخ ، نکتۂ جاسوس
یقین کہ زہرہ و خورشید میں مقابلہ ہو پڑھوں جو میں پئے دوری، دعائے بدریطوس

قصائد میں فخریہ اشعار میں کواکب کا بار بار ذکر کیا ہے، اس سے اتنا واضح ہے کہ عملیات سے دلچسپی ضرور تھی اگرچہ اُن کا مسلک آزاد تھا لیکن شاہ عبدالعزیز محدّث دہلوی سے خاندانی عقیدت ظاہر کرتی ہے کہ وہ تعویذ نویسی کے خلاف نہ تھے -

دوسرا باب

حالاتِ زندگی

شاعری

آغاز شاعری ۱۲۲۷ھ مومن نے اپنی پہلی مثنوی ''شکایتِ ستم'' میں شعر گوئی کا ذکر کیا ہے، وہ روایت کرتے ہیں کہ دوسری محبوبہ سے جب ملاقات ہوئی تو اُس وقت بارہ سال عمر تھی :—

سالِ عمر اب تھے ہم شمار بروج　　　کہ ہوا اخترِ بلا کا عروج

یہ سلسلۂ محبت ایک سال تک چلتا رہا، اتفاقاً ایک دن دوپہر کے وقت آنکھ لگ گئی اور ایک عورت نے دونوں کو بہم دیکھ لیا، اُس نے سب میں چرچا کر دیا، گھر والے برہم ہو گئے، ڈانٹ ڈپٹ کی گئی۔ اُنھوں نے قسمیں کھائیں کہ میں بے خبر ہوں، مجھ پر بہتان لگایا گیا ہے، میں اپنی جان دے دوں گا۔ آخر ماں باپ اس ڈھونگ سے پسیج گئے مگر ''ماہ سیما'' سے ملاقات پر پابندی لگا دی۔ یہ فیصلہ بہت جاں گسل تھا، جدائیٔ محبوبہ میں حالت بگڑنے لگی، رات کی نیند اور دن کا چین رخصت ہوا، محبوبہ کو دیکھتے اور کچھ نہ کہتے۔ اس حالت میں حسبِ حال اشعار وردِ زباں ہوتے :—

مضطرب سامنے پھروں ناچار　　　وردِ لب، اپنے حسبِ حال اشعار

حسبِ حال اشعار جو وردِ زبان تھے اُن کی صراحت قیاساً یہی کی جا سکتی ہے کہ مومن کے اشعار ہوں گے ۔ تیرہ سال کی عمر میں شعر کہنا خلاف قیاس نہیں ، غالب نے بھی اِسی عمر میں کوچۂ شاعری میں قدم رکھا ، داغ بھی مدعی ہیں کہ بارہ سال کی عمر میں طرحی غزل کہی تھی ، مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم بھی بارہ تیرہ سال کی عمر سے شعر کہتے تھے ۔ مومن کی فطانت و ذہانت سے بھی یہی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ تیرہ سال کی عمر میں وہ شعر اور سخن کی طرف مائل ہو گئے اور حالیہ جذبات کی ادائیگی کا اس سے موزوں اور کوئی ذریعہ نہ تھا ، وہ اشعار مبتدیانہ ہوں گے اور ہماری دست رس سے باہر ہیں ۔ مومن کی ولادت (۱۲۱۵ھ) کے لحاظ سے ۱۲۲۷ھ میں مومن میدان شاعری میں آترے ، شاعری کا سلسلہ بڑھتا گیا اور اُستاد عصر شاہ نصیر کے سامنے زانوے تلمذ تہ کیا ، چند غزلوں کی اصلاح کے بعد شاہ نصیر سے برگشتہ ہو گئے ۔ کہاں صنعت ایہام کے پرستار اور کہاں مومن آزاد ، دونوں کے راستے علاحدہ تھے اس لیے رشتۂ تلمذ منقطع ہو گیا ۔ ۱۲۳۱ھ میں سلسلۂ محبت ٹوٹ گیا اور جدائی کا باعث شاعری ہوئی ۔ خود کہتے ہیں کہ میں دیوان خانے کا دروازہ بند کر کے حسبِ حال شعر کہنے میں مشغول تھا ، محبوبہ نے ملاقات کے لیے دلالہ کی معرفت بلوایا ۔ استغراق کا یہ عالم تھا کہ فوراً نہ جا سکے اور کہا شعر کہ کر ابھی آتا ہوں ۔ دلالہ نے محبوبہ کو بھڑکا دیا ، کہا ”وہ تو کسی اور سے اختلاط میں مصروف ہے اور آنے سے انکار کر دیا“۔ یہ سن کر محبوبہ برہم ہو گئی اور ہمیشہ کے لیے روٹھ گئی ۔ مومن کی زبانی سنیے :—

ایک دن جو بلانے آئی وہ دن نہ تھا ، تھی شبِ جدائی وہ
ڈھونڈھ کر ہر ٹھکانے میں ظالم پہنچی دیوان خانے میں ظالم
بند دروازہ واں کا تھا ناگاہ در کشائے سخن ، دلِ آگاہ
شوق کو مشقِ نالۂ موزوں باندھتا تھا ، میں دل کشا مضموں
آ کے بولی کہ کوئی ہے تو بول آج کیا بندوبست ہے در کھول

میں نے بیتاب ہو، کہا کیا ہے لگی کہنے تمہیں بلایا ہے
کہا میں نے کہ رہ کے آؤں گا ایک دو شعر کہ کے آؤں گا

آخر میں مثنوی کے سترہ برس کا سن ظاہر کیا ہے، اس سے اتنا نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ۱۲۳۱ھ میں وہ مشق سخن میں مصروف تھے۔ یہ واقعہ ۱۲۳۱ھ سے قبل بھی پیش آ سکتا ہے یا ہم تاریخ جدائی کا یہی سال قرار دیں تب بھی ۱۲۳۱ھ سے پہلے مصروف سخن ثابت ہیں۔ مومن ۱۲۳۱ھ میں فن شعر میں ضرور اہم مقام پیدا کر چکے تھے، شعر کی محویت میں محبوبہ سے ملاقات میں تاخیر کرنا فن شعر سے دلچسپی کو واضح کرتا ہے۔

دوسری مثنوی ''قصۂ غم'' ۱۲۳۵ھ میں شاعری سے وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے یار باشی کا بیان بھی کرتے ہیں، اس وقت مومن کی عمر بیس سال تھی:—

دیوانوں سے شوق بے نہایت اشعار کا ذوق بے نہایت
تصحیحِ سخن پہ، طبع مائل علمِ شعرا میں فردِ کامل

بے بذلہ سُنی نہ بات کوئی ختم اُس پہ ہوئی، لطیفہ گوئی
ہر پیر و جواں سے آشنائی سارے ہی جہاں سے آشنائی

تصحیحِ سخن پہ طبع کا مائل ہونا ثابت کر رہا ہے کہ مومن مبتدیوں کے اُستاد بن چکے تھے اور رموز فن سے با خبر ہو کر شعرا میں طاق ہو گئے تھے، شاہ نصیر کو پیچھے چھوڑ کر مومن انفرادی مقام پیدا کر چکے تھے۔

شاعری ۱۲۳۶ھ | تیسری مثنوی ''قولِ غمیں'' (۱۲۳۶ھ) میں جب کہ مومن کی عمر اکیس سال کی تھی، شاعری سے ربط بتاتے ہیں:—

یاروں میں ہنسنے کا غل آٹھ پہر وقفِ لب، خندۂ گل آٹھ پہر
زمزمہ ساز، برنگِ بلبل نغمہ پرداز، برنگِ بلبل

نغمہ سنجی و خوش الحانی و بس　　شعر گوئی و غزل خوانی و بس
رات دن ہنسنے ہنسانے کی بات　　یاروں سے ملنے میں صرفِ اوقات

اس مثنوی میں امۃالفاطمہ تخلص صاحب سے جی لگتا ہے ، ان کی ہمت سے صاحب بھی شاعرہ بن گئی ، مومن امۃ الفاطمہ کی نبض دیکھتے ہیں اور یہ غزل حسب حال سناتے ہیں :-

پھر محبت میں مزا آتا ہے　　کیوں نہ کھائیں ہمیں غم بھاتا ہے
کیا لگا دستِ دل آرام سے ہاتھ　　دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ

تیسری غزل اس مثنوی کی بھی تشریحِ حال ہے ، مطلع ہے :-

کاکل آشفتہ و پیچاں کیوں ہے　　زلف کا حال پریشاں کیوں ہے

چوتھی غزل کے ایک شعر سے امۃ الفاطمہ کے مذہب کا بھی پتا چلتا ہے کہ وہ اثنا عشری تھی :-

مُنہ کو مومن سے چھپانا کافر　　یہ تقیّہ نہ بھایا ، مجھ کو

پانچویں غزل کا مقطع بے ساختہ اور دل کش ہے :-

مومن اس بت سے بگڑنا ہی نہ تھا　　بن چکی بات خدا سے تیری

اس مثنوی میں پانچ غزلیں داخل کی گئی ہیں ، مومن کا اندازِ بیان ان میں رچا ہوا ہے - ۱۲۳۶ھ میں وہ اکیس برس کے تھے لیکن غزلوں سے مشاقی ظاہر ہے - شاہ نصیر کا رنگِ کلام ان غزلوں سے عیاں نہیں ، اس سے ظاہر ہے کہ بہت جلد مومن اپنا مقام شاعری متعیّن کر چکے تھے اور ترقی کی طرف گامزن تھے - صاحب نے بھی مومن سے فیض پایا اس لیے تذکرہ نویسوں نے فیض یافتگانِ مومن میں نام درج کیا ہے -

۱۲۴۱ھ یا ۱۲۴۲ھ | چوتھی مثنوی ''تفِ آتشیں'' میں شعر و سخن کا اس طرح بیان کرتے ہیں :-

جی کو سنبھالا ، حیلہ و فن سے دل بہلایا ، شعر و سخن سے

۱۲۴۳ھ | مومن خاں انتیسویں سال میں تھے کہ نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ کو تدوین و ترتیب کلام کا خیال پیدا ہوا ۔ مومن کی آزادہ روی سے یہ امید نہ تھی کہ وہ اپنے کلام کو یکجا کرنے کی زحمت اٹھائیں گے اسی لیے مومن کے شاگرد رشید نے کمر ہمت باندھی اور متفرق کلام کو بہم کر کے ، مومن کی نظر ثانی کے بعد ۱۲۴۳ھ میں "دیوان بے نظیر" پیش کر دیا[1] ۔ مومن نے کچھ کلام حذف کر دیا اور کچھ اضافہ کیا ۔ شیفتہ کی نظر میں کلامِ مومن قران مجید کی طرح بے نظیر ہے اور دوسرے شعرا کا کلام اس کے مقابلے میں مسیلمۂ کذّاب کے ہذیانات ہیں ، وغیرہ وغیرہ ۔

۱۲۴۴ھ | مثنوی "حنینِ مغموم" سے بھی مومن کی کاملیت کا اندازہ ہوتا ہے ، درجۂ استادی پر پہنچ چکے تھے ، مومن نے اس مثنوی میں اپنے آٹھ شاگردوں کے تخلص درج کیے ہیں ، یہ شاگرد مومن سے خصوصیت رکھنے والے شاگرد تھے :—

کون سے شاگرد وہ استادِ فن	بے سخن ہے دل رُبا جن کا سخن
وحشت و مضطر، کرم، تسکین و یاس	بے خودی میں بھی ہیں جن کے بدحواس
اکبر و عظمت ، سرفرازِ سخن	پایہ بالاتر ، بر افرازِ سخن
شیفتہ ، سر دفترِ اہلِ قلم	نکتۂ خاطر نشان جس کا رقم

اس میں شیفتہ اور تسکین آج بھی اساتذۂ سخن میں شمار ہوتے ہیں اور مومن نے بھی ان کی استادی کی نشان دہی کی ہے ۔ مومن کی عمر ۱۲۴۴ھ میں تخمیناً تیس سال تھی اور وہ دہلی کے مشاہیر شعرا میں شمار ہوتے تھے ۔ مولوی عبدالقادر خاں رام پوری اپنے "روزنامچے" (۱۲۴۰ھ مطابق ۱۸۲۵ء) میں لکھتے ہیں :—

---

[1] ۔ مشکل پسند خاطرش پارہ حذف فرمود و لختے افزود (دیباچہ کلیات مومن صفحہ ۶ طبع ششم ، ۱۹۳۰ء ، مطبع نولکشور لکھنؤ) ۔

(و در شاعرانِ نوجوان مومن خان است)، نوجوان شعرا میں مومن ھے جس کا یہ مطلع مشہور ھے :—

نہ جاؤں گا کبھی جنّت میں، میں نہ جاؤں گا   اگر نہ هووے گا نقشہ تمھارے گھر کا سا

مومن کی شاعری کے عروج کا دور قریباً ۱۲۳۵ھ سے شروع هوتا ھے اور ۱۲۵۰ھ میں نصف النہار پر تھا، اس زمانے میں مختلف حسینوں سے اُس کی وابستگی رھی۔ مومن اپنی نجی زندگی کو بھی منظر عام پر لے آئے، مثنویات میں اُنھوں نے حیات معاشقہ کا بیان بڑی بےباکی سے کیا ھے۔ اس عشق و عاشقی کا گہرا اثر اُن کے کلام پر ھوا اور جرأت کے انداز سخن کو دوآتشہ کر کے اُنھوں نے عوام و خواص سے خراجِ تحسین حاصل کیا۔ اس بحث کو یہیں چھوڑ کر ہم مومن کے مذھبی معتقدات کا ذکر ضروری سمجھتے ھیں۔

عقائد اور بیعت

پروفیسر ضیاء احمد صاحب مقدمہ دیوان مومن (صفحات ۳۰ و ۳۱، مطبوعہ شانتی پریس الہ آباد ۱۹۴۷ء) میں لکھتے ھیں :—

مومن متشدد اور متقشف نہ تھے۔۔۔۔وہ ھمیشہ عمل بالحدیث کے قائل اور کتاب و سنت پر عامل رھے، اب اختیار ھے کہ جو چاھو کہو، مقلدین اور شیعہ پر اکثر اشعار میں چوٹ کر گئے ھیں۔۔۔سید صاحب سے بیعت جہاد کی تھی اور ''مثنوی جہادیہ'' لکھی تھی اگرچہ عملی شرکت کا موقع نہ ملا۔ مولانا فضل حق خیر آبادی سے مراسم تھے تاهم اختلافِ عقائد کی بنا پر بحث هو جاتی تھی۔ ایک بار دونوں میں مناظرہ هوا، مومن غالب رھے، چونکہ مزاج مکدر هو گیا تھا، اس لیے یہ شعر کہ کر چل دیے :—

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں   مومن نہ هوں، جو ربط رکھیں بدعتی سے هم

(مولانا فرقتی اور آرزو تخلص کرتے تھے) پھر مولانا خود منانے کو گئے اور بالآخر صلح ہوگئی جس پر مومن نے شعر پڑھا (ارواح ثلثه) :—

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

اس کے ساتھ یہ ملحوظ رہے کہ بزرگان دین کی عقیدت و محبت کو وہ همیشه جزو ایمان سمجھتے تھے ، اگر اُن کے والہانہ جوشِ مذهب کا نمونه دیکھنا ہو تو اُن کے قصائد نعت و منقبت ملاحظہ ہوں ۔

عرش گیاوی ''حیات مومن'' (صفحات ۵۸ و ۵۹) میں ڈاکٹر آیت اللہ بسمل عظیم آبادی کی زبانی روایت کرتے ہیں :—

آپ کے والد اور مومن کی دوستی تھی ، اُن کے ساتھ زمانۂ طفولیت میں آپ نے مومن کو دیکھا تھا ، آپ کے والد بھی مومن کی طرح حضرت سید احمد بریلوی کے مرید تھے ۔ ڈاکٹر صاحب فرماتے تھے کہ میں نے مومن کی زبانی یہ شعر سنا ہے جو حضرت صاحب کی طرف منسوب ہے ، مولانا سید احمد بریلوی ''حضرت صاحب'' کے نام سے مشہور تھے ۔ مومن اپنے پیر کی مدح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

رقعه بنام نامی تفضل حسین خاں بہنگام مرض الموت :

شہرہ در صدق و صفائیم تو ہم می دانی همه تن مہر و وفائیم تو هم می دانی

شفیق گرم از هر چه نویسیم برتر ، بے عدیل و انباز پیغمبر زادۂ مومن نواز، یا رب که پیوسته با من و از من باشی ورود دو پارۂ حریروالانامه طرفِ کلاه به چرخ اطلس سائید ، و فرق بر خاک مانده از اوجِ فرقدان درگذرانید ، دو پاره دلم را پیوند اخلاص از نو داد ، و دل بستگیٔ خاطرم را به حکم ''انّ مع العسر یسرا'' مکرر کشاد ، درستی اینست که اگر آزردگئی خاطرِ نازک دانستمے ، باهنگ گدیه گری ها کاغذ زر باز گردانیدن نتوانستمے ایدوں نیز بندۂ فرماں پذیرم و باز داده بطوع ورغبت پس می گیرم ، بر گردانند،

و با من رسانند افوس اینست که مضامین بے گانه بجواب نامهٔ اولیں گوش آشنائے دل بود و تقاضائے گہر باری با زبان خامه می نمود ، همچناں در دل خون گردید . . . . آرے در معاملهٔ احمد نصیر و جناب مرا چه جائے دم زدن است ، اما چوں عنوان سخن از سخن عنوان بیاد دهد . . . چه آزار خاطر نازنین نه پسندم ، و از بیم آنکه چوں در یابند ، که چه گذشت رنجه تر گردند ، زباں نمی بندم با مرده دلیها شب زنده دارم ، و با چندیں ضعف و ناتوانی که دم نتواں زد بیقرار ، دست از کار رفته هم چناں بار گردن است ، وپاے از رفتار مانده سر گرم سیر ملکِ عدم کردن ، تشنج اعصاب از کمند گرائے گیسو تاب فرساتر است ، و شدتِ اضطراب از شوخی اداهائے معشوقهٔ نازک هوش ربا تر ، از گرمی سختیٔ روز صد داغ بیش بر دل و جگر است ، و از سوادِ شام عذاب شبِ اولینِ گور در نظر ، هر چاره بے تا ثیر است ، وهر تدبیر بر طرف افتاده ، تقدیر ظاهرا ایامِ حیات بپایاں رسید و نصف ملاقات که عبادت از نامه و پیام است ، نیز تمام گردید ، خان والاشان چه انصاف است ، که اولاد من از خوانِ احسان شما بقدر نصیب بهره یابند ، و من محروم با شم ، ازیں دردِ نهانی چوں نخروشم ، و از ناخنِ رشک جگر چرا نخراشم ، خوش تر آنکه پنچ شش آثار شما کوکها چرودی که نیکو تحفه و هدیهٔ آں طرف است ـ برائے ایں شوریده بخت ارسال فرمایند ، و کام و زبان لذت دوست را شیریں کام دعا و ثنا نمایند که گروها گروه از دهلی باجمیر رسیده اند تواند رسید ، هاں وهاں چقدر خو کردهٔ تلخ کامی گردیده ام ـ بتقریب سخن شعرے از اشعارم بیا رآمد که ایں چنیں نه شنیده باشند می نگارم و چشم انصاف دارم و هوهذا است :ـ

هر تلخ تر به عشق مذاق آشنا نبود حسرت بزهر و زهر به خوناب شسته ایم
زمانه‌مهدیٔ موعود کاپایا اگر مومن توسب سے پہلے کہیوتو، سلامِ پاک حضرت کا

ڈاکٹر صاحب فرماتے هیں که الزامِ وهابیت مومن پر غلط ہے ، اب یه که اُن پر یه آوازه کیوں هوا ، اُس کا سبب وه یه فرماتے هیں که مومن کے قلم نے خرقه پوشانِ بے جوهر کی طرف اشاره کرتے هوئے یه رباعیاں لکھیں

تو اُس وقت کے مشایخ جو اپنے مریدوں سے سجدہ تک حلال ٹھہرائے ہوئے تھے ، بگڑ گئے اور دیکھا کہ یہ شخص ڈھولک ، ستار اور قوالی کو بند کرا دے گا اور مرید آباد سے اک ''ڈکا'' بھی نہ ملے گا ، اس لیے بہتر ہے کہ لوگوں کو اُس کی طرف سے برگشتہ کر دو ورنہ مومن اور اُن کا سارا ''خاندان حنفی مسلک'' تھا ۔

آزاد آب حیات میں لکھتے ھیں (۴۲۴صفحہ) :—

نیک خیالوں سے بھی اُن کا دل خالی نہ تھا ، نوجوانی ھی میں مولانا سید احمد صاحب بریلوی کے مرید ہوئے کہ مولوی اسمٰعیل صاحب کے پیر تھے ، خاں صاحب ان ھی کے عقائد کے بھی قائل رہے ۔

مولوی عبدالحی ''گل رعنا'' (صفحہ۲۹۸) میں رقم طراز ھیں :—

باایں ھمہ دینداری کے خیال سے بھی خالی نہ تھے ۔ جوانی میں حضرت سید احمد شہید سعیدؒ کے مرید ہوئے اور آخر عمر تک عقائد میں ان ھی کے پیرو و متبع رہے ۔ کلیات میں ایک مثنوی جہادیہ ہے جو اُس وقت لکھی تھی جب سید صاحب سکھوں سے جہاد کر رہے تھے ۔ علاوہ اس کے دو قطعۂ تاریخ اُن کی امامت کے ھیں ، ایک قصیدہ حمد و مناجات میں ھے ، ایک نعت میں ، ایک ایک خلفائے راشدین اور امام حسن اور امام حسین علیہماالسلام کی منقبت میں (گل رعنا صفحہ ۳۰۰) :—

اردو ادب کی تاریخ (۱۰۵) میں نسیم قریشی اظہار رائے کرتے ھیں :—

یوں عقائد میں وہ ابتدا ھی سے بڑے پختہ موحد تھے ، جوانی ھی میں سید احمد شہید کے مرید ہو گئے تھے اور تا دمِ مرگ یہ عقیدت باقی رھی بلکہ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا ، اس میں عملی پختگی آتی گئی ۔

اردو شاعری کی مختصر تاریخ (علیگڑھ میگزین ، اگست ۱۹۳۸ء) میں سید

اعجاز احمد سہسوانی نے لکھا ہے:— حمد و نعت و منقبت میں نہایت بلیغ قصیدے لکھے.... مولانا شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے خاندان کے فیض یافتہ اور مولانا شہید دہلوی کے انصار و رفقا سے تھے۔

سید اعجاز حسین۔ ایم۔ اے مختصر تاریخ ادب اردو (صفحہ ۱۰۰) میں تحریر فرماتے ہیں:— بزرگان دین کے متعدد قصیدے کہے۔

سر سید احمد خاں آثار الصنادید (صفحہ ۱۹۳ باب چہارم طبع اول) میں تعریف کرتے ہیں:— غازہ پرداز چہرۂ خلق محمدی، مظہر آثار سعادت ازلی۔

کریم الدین تذکرہ، شعرائے اردو (۳۴۴ طبع اول ۱۸۴۸ء) میں کردار پر روشنی ڈالتا ہے:— تمام مزے عیاشی کے اٹھا کر اب توبہ کی،... اب پابند نماز و روزہ کے بھی بہ نسبت سابق کے بہت ہیں۔

نواب سید علی حسن خان بزمِ سخن (صفحہ ۱۰۶) میں عقیدت کے متعلق وضاحت کرتے ہیں:— شعرائے آزاد مشرب کے خلاف عقیدۂ مقبول اپنا مذہب بنایا اور سنت کے سیدھے راستے پر پائے عقیدت جمائے ہیں۔

حسرت موہانی "تذکرۃ الشعرا (صفحہ ۱۷) (اردوئے معلیٰ جلد ۴ نمبر ۵ مئی ۱۹۰۴ء) میں بیان کرتے ہیں:—

مومن نوجوانی ہی میں مولانا اسمٰعیل شہید کے پیر یعنی مولوی سید احمد صاحب بریلوی کے مرید ہوئے تھے اور اس سے ان کے عقائد کے مطابق تقلید و بدعت سے سخت نفرت رکھتے تھے جیسا کہ اس رباعی اور دیگر مختلف اشعار سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔

ان تمام آرا کے جانچنے کا آسان طریقہ یہی ہے کہ مومن کے کلام سے مطابقت ہوتی ہے یا نہیں، فیصلہ کلام مومن ہی پر رہے گا۔ مومن عمر کی منازل سے جیسے جیسے گزرے، ویسے ہی ان کے عقائد میں تبدیلی ہوتی گئی۔ مومن کا خاندان شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے خاندان سے دلی عقیدت رکھتا تھا۔

شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کا مومن کے کان میں اذان دینا اور نام تجویز کرنا اُن کے اثر اور رسوخ کو واضح کرتا ہے ، مومن کا شاہ عبدالقادر صاحب سے تعلیم حاصل کرنا بھی اِس خصوصی تعلق کو ظاہر کرتا ہے جو خاندان ولی اللٰہی سے تھا ، مومن کے خاندان کے اور افراد بھی شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب وغیرہ ابنائے شاہ ولی اللہ صاحب سے نسبتِ شاگردی بھی رکھتے تھے چنانچہ حکیم غلام قادر خاں کے حالات آثارالصنادید (باب چہارم ۶۵) میں ملتے ہیں:—

حکیم غلام حیدر خاں ارشد تلامذۂ حکیم شریف خاں سے ہیں۔ مقامات کتب طب موافق زعم راقم کے جیسے ان کی خدمت میں حل ہوتے ہیں ، غالب تو یہ ہے کہ اس جز و زماں میں اور کہیں نہ ہوتے ہوں۔ خدمت اساتذۂ کرام مثل مولانا مخدومنا مولوی عبدالعزیز دہلوی اور مولوی رفیع الدّین اور مولوی عبدالقادر صاحب ارفع اللہ درجاتہم سے سالہا سال استفادہ کیا اور انواع فیوض حاصل کیے۔

مومن کے دوسرے چچا حکیم غلام حسن خاں کے مکان پر آخون شیر محمد محدث ہم‌درس مولانا محمد اسمٰعیل شہید اور شاگرد شاہ عبدالقادر صاحب رہتے تھے؛ آخون شیر محمد شاہ غلام علی صاحب کے خلیفہ تھے اور حج کے ارادے سے روانہ ہوئے تھے کہ ۲۹ صفر ۱۲۵۷ھ کو رھگیرائے ملک بقا ہوئے (آثارالصنادید صفحہ ۶۶)۔ حکیم عبدالحکیم خاں خلف حکیم غلام حسن خاں نے آخون شیرمحمد سے کتب درسیہ تمام کی تھیں (آثارالصنادید صفحہ ۶۸)۔

اس طرح شاہ عبدالعزیز صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب اور شاہ رفیع الدین صاحب سے مومن کے خاندانی تعلقات تھے اور عقیدت بھی تھی ، ”آب حیات“ کی یہ روایت درست معلوم ہوتی ہے کہ شاہ عبدالقادر صاحب سے مومن نے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں۔

شاہ عبدالعزیز صاحب | حنفی مسلک رکھتے تھے، اُن کے شاگردوں میں مفتی

صدرالدّین خاں آزردہ صدرالصدور دہلوی مشہور ہیں ۔ مولوی رشیدالدّین خاں مراد آبادی بقول سر سید احمد خاں (آثارالصنادیدصفحہ ۸۹) شاگرد رشید مولانا رفیع الدّین صاحب اور شاہ عبدالقادر صاحب تھے ، عقائد میں شاہ عبدالعزیز صاحب کے قدم بقدم تھے ۔ مولانا فضل حق خیرآبادی اپنے والد مولوی فضل امام صاحب کے شاگرد تھے اور حدیث کی سند شاہ عبدالقادر صاحب سے حاصل کی تھی اور شاہ دھومن سے بیعت تھی (تذکرۂ علمائے ہند فارسی صفحات ۱۶۴ و ۱۶۵) ۔ ان بزرگوں کا دعویٰ تھا کہ حنفی مسلک جس پر شاہ عبدالعزیز صاحب گامزن تھے ، مذہب حق ہے اور مولوی سید احمد شہید کے متبع اور خلفاء مولانا عبدالحی صاحب داماد شاہ عبدالعزیز صاحب اور مولانا محمداسمٰعیل شہید برادر زادۂ شاہ عبدالعزیز صاحب گمراہ ہیں۔ اختلافات اس قدر شدید ہو گئے کہ دہلی کی شاہی مسجد میں مولوی عبدالحی صاحب اور مولانا محمداسمٰعیل شہید کے ساتھ وعظ کے دوران مولوی رشیدالدّین خاں (متوفی ۱۲۰۱ھ) شاگرد رشید شاہ رفیع الدّین صاحب وغیرہ کا ایسا جھگڑا ہوا جو آن کی وضع شریف کے موزوں نہ تھا ، ”و از تلامذۂ رشید ایں بزرگواران رشیدالدّین خاں بود . . . . با مولوی محمداسمٰعیل و مولوی عبدالحی آں جہانی در مجلس و وعظ بہ مسجد جامع شاہ جہاں آباد بطورے کہ پیش آمد شایان وضعِ شریفش نہ بود و نہ زیبا . . . و مولوی فضل حق، یگانۂ روز گار دیدم ، [وقائع عبدالقادر خانی (روز نامچہ) مملوکہ کتب خانہ حبیب گنج علی گڑھ]“۔

سرسید احمد خاں کے بقول (آثارالصنادید باب چہارم صفحہ ۹۷) مولانا محمد اسمٰعیل . . . . . سید احمد صاحب سے بیعت کی ، حج سے مشرف ہوئے ، بدعات کی مخالفت میں کافی خطرات مول لیے اور آخر میں ان کے اثر سے جامع مسجد میں نماز جمعہ ، عید جیسی ہونے لگی ۔ روز جمعہ اور سہ شنبہ کو مسجد جامع میں وعظ کہتے ۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ دہلی کے عوام و خواص دو گروہوں میں تقسیم تھے ، ان میں دوستی اور دشمنی کا انحصار عقائد پر تھا لیکن اکثریت

حنفی مسلک کے افراد کی تھی ، مومن کا ابتدائی دور زندگی ان جھگڑوں سے خالی رہا ، چونکہ خاندان کے افراد شاہ عبدالعزیز صاحب کے مسلک کو صحیح سمجھتے تھے ۔ مومن کے شاگرد رشید نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ بھی اسی مسلک کے تھے ، شیفتہ نے پہلے شاہ محمد اسحاق صاحب نبیسۂ شاہ عبدالعزیز صاحب سے بیعت کی اور آن کی ہجرت حجاز (۱۲۵۶ھ) کے بعد شاہ ابو سعید صاحب اور شاہ احمد سعید صاحب مجددی خلفائے شاہ غلام علی صاحب سے استفادہ فیوض باطنی کیا ، آخر میں شاہ عبدالغنی صاحب دہلوی سے تجدید بیعت کی (مقدمہ کلیات شیفتہ و حسرتی مطبوعہ نظامی پریس بدایوں ۱۹۱۶ء از مولانا نظامی) ۔۔

شاہ احمد سعید صاحب مجددی کا مسلک سید احمد شہید کے خلاف تھا (متوفیٰ ۲ ربیع الاول ۱۲۷۷ھ)۔ صاحب تذکرۂ کاملان رام پور (صفحہ ۲۰) نے ان کی تصانیف میں "حق المبین فی ردعلی الوہابین" اور "الفوائدالضابطہ فی اثبات الرابطہ" "الذکر الشریف فی دلائل المولدالمنیف" وغیرہ درج کی ہیں ، ان تصانیف سے اختلاف عقائد کا اندازہ ہوتا ہے ۔ مولوی فضل حق خیر آبادی اور مفتی صدرالدّین آزردہ کے عقائد کا اندازہ اختلافی فتاویٰ سے ہو سکتا ہے :۔۔

غایۃالمرام فی تحقیق المولدوالقیام لتعظیم سیدالانام (مطبوعہ مطبع علوی لکھنوی ۱۲۷۱ھ ۲۹، ۳۰صفحہ) میں فتویٰ نسبت تعین یوم مولد شریف کے متعلق حسب ذیل مہریں ثبت ہیں :۔

مفتی صدرالدّین خاں، محمد بہادر شاہ ابو ظفر سراج الدّین سنہ احدیٰ ، مولانا سید محمد صاحب مدرس مدرسۂ عربی دہلی، مولوی محمد عمر صاحب ، شاہ احمد سعید صاحب ، مولوی محمد کریم اللہ صاحب ، مولوی محمد مظہر صاحب ، مولوی فریدالدین صاحب واعظ جامع ، حکیم احسن اللہ خاں صاحب ، مولوی عزیزالدّین صاحب ، قاضی احمد الدّین خاں صاحب ، قاضی محمد علی صاحب ، حکیم محمد امام الدّین خاں صاحب ، مولوی تفضل حسین خاں صاحب ، سید شیر علی صاحب ، مولوی حیدر علی صاحب مصنف منتہی الکلام.....

ایک آور استفتا ہے :- سوال نسبت عمل مولد شریف در ماہ ربیع الاول (صفحہ ۳۸) ، اس پر بھی شاہ احمد سعید صاحب اور مولوی صدرالدین خاں صاحب (مہر میں ربیع الآخر ۱۲۶۵ھ ہے) وغیرہ کی مہریں ہیں -

اسی سلسلے کا ایک فتویٰ ہے (صفحہ ۴۷) 'قیام وقت ذکرِ ولادت شریف'- الجواب :- 'مستحسن ہے' (صفحات ۴۸ و ۸۲ غایۃ المرام) ، مفتی شرف الدّین........فقیر احمد سعید مجددی........محمد فضل الحق ، مفتی شرف الدّین ، رفیع اللہ ، محمد حیات ، عبدالرب ، محمد عبدالعلی ، عبدالحق بن مولانا ملک العلماء محمد خلیل الرحمٰن ؟

مسلک کا اختلاف دہلی میں باعث ہنگامہ و فساد تھا لیکن مومن اور شیفتہ یک قالب اور دو جان تھے ، مفتی صدرالدین خاں اور مولوی فضل حق خیر آبادی نے مومن کو شہرت دے کر حق دوستی ادا کیا ، کیا ایسی حالت میں مومن ان دلی دوستوں کے خلاف اعلان جنگ اختلاف عقائد کی وجہ سے کر سکتے تھے ؟

اسی روشنی میں ہمیں مومن کے عقائد کو پرکھنا ہوگا ، رباعیات کا وہ حصہ جو اختلاف عقائد کو واضح کرتا ہے وہ بھی قابل غور ہے ، کیا یہی مسلک مومن کا تھا یا ایسا کلام الحاق ہے ؟

جیسا کہ ہم پہلے ظاہر کر چکے ہیں ، مومن کا خاندان شاہ عبدالعزیز صاحب وغیرہ کا معتقد تھا - مومن نے اسی ماحول میں آنکھیں کھولی تھیں اس لیے اُن کی مذہبی شاعری میں وہی جذبات نمایاں نظر آتے ہیں جو شاہ عبدالعزیز صاحب کا مسلک تھا - قصائد کے اشعار نمونۃً پیش کیے جاتے ہیں ، قصیدۂ نعتیہ کا یہ شعر پڑھیے اور مسلک کا اندازہ کیجیے :-

اگر کہے مددے یا محمدؐ عربی صفیرِ مرگ ہو دشمن کو نعرۂ لا کوس
(صفحہ ۱۴ ، کلیات مومن)

اسی قصیدے کا شعر ہے :-

وہ کون احمدِ مرسلؐ، شفیع ہر دو سرا   جو خلق کا سبب اور باعثِ معادِ نفوس

قدسی کی غزل کو مومن نے خمسہ بنایا ہے، اس تخمیس کا نعتیہ رنگ ملاحظہ ہو:—

مظہرِ نورِ خدا، شکل ہے محسودِ صنم   محو تیرے ملک و حور و پری و آدم
کیا یہی عالم ہے کہ تصویر ہی کا سا عالم   منِ بیدل بجمالِ تو عجب حیرانم
الله الله چه جمال است بدیں بوالعجبی

فارسی کی رباعیاں جوشِ عقیدت سے لبریز ہیں، سرکار دو جہاں کی نعت میں کہتے ہیں:—

امروز که خاکے زسرے برزده ایم   لرزاں لرزاں قدم به محشر زده ایم
بر سر زدنم روا نداری یا رب   دستے که به دامانِ پیمبر زده ایم

یا رب روزے که نیک و بد را طلبی   امیدِ نجات نیست از بوالعجبی
دانم که جہاں جہاں گناہم، چه بود   در پیشِ شفاعتِ رسولِ عربی

۱۰ ذی حجہ ۱۲۵۴ھ مطابق فروری ۱۸۳۹ء میں جب شیفتہ سفر حج کو چلے تو مومن نے منظوم رقعہ شیفتہ کو لکھا ہے، اس سے مومن کی مذہبی عقیدت واضح ہوتی ہے، مناجات میں جامی جیسا جوش پایا جاتا ہے:—

اے که به یثرب گذرے می کنی   رہبری و خوش سفرے می کنی
تا به در راہبرے ره بری   سجده ز درگاه شہنشاه بری
بوسه بزن سبزهٔ درگاه را   پایه فزا، نالهٔ جاں کاه را
پاس ادب دار به عرضِ پیام   گرد درش گرد و بگو السلام
اے بزمین تو فلک جبه سا   وے به جنابِ تو ملک خاک پا
سا من آفت زدگاں در گہت   راه برِ خضر، غبارِ رہت
مسکنِ دریا گہراں، کوئے تو   دیدهٔ صاحب نظراں سوئے تو

فارسی قصیدے میں مومن ہدیۂ عقیدت اس طرح پیش کرتے ہیں:—

محمدِؐ عربی جان حسن و روحِ جمال   دلِ محبت و دلدارِ ایزدِ دادار

زہے جمال کہ اعمیٰ شنید تا سخنش
ز گوش دید اثر، پائے مور، در شب تار

نبود سایہ اش آرے چساں بود سایہ
ز تاب حسن مساوی است، شش جہت انوار

بروز حشر تماشائیش بود حیراں
کہ بود از چہ، در امروز، وعدۂ دیدار

جمال و حسن ازو یافتہ است حسن و جمال
وقار و حلم ازو کسب کردہ حلم و وقار

محیط علم تو زد غوطۂ عقل کل در دے
فگند جوش تموّج، بابتدائے کنار

دوسرے قصیدے کے چند شعر پیش ہیں :—

اے جسمِ تو جانِ آفرینش
جانِ تو جہانِ آفرینش

اے خاتمِ انبیا بہ مہرت
منشور امان آفرینش

از خُلقِ تو عالم آفریں را
صد ناز بشانِ آفرینش

برخیز کہ شورِ کفر برخاست
اے فتنہ نشانِ آفرینش

اب خلیفۂ اول کی مدحت گستری ملاحظہ ہو :—

مسند آرائے محفلِ تقدیس
اولیں، جانشینِ پیغمبر

خاکساری پسند، عرش مقام
آدمی، صورت فرشتہ سیر

سینہ سرشارِ سِرِ یزدانی
چشم لبریز، جلوۂ محشر

جب 'اولی الفضل منکم' اے حاسد
اس کے حق میں کہے جہاں داور

افضلیت میں کیا سخن یہی بات
سب سے بہتر کہ سب سے ہے بہتر

امیر المومنین حضرت عمرؓ کی منقبت میں جذبات پر قابو نہیں رکھ سکے اور اختلافی باتیں دل کھول کر بیان کر جاتے ہیں :—

دل اب کی بار ہوا، ایسی بے جگہ مائل
کہ جان کو بھی ٹھکانے لگا رہے گا دل

وہ شوخ بے سبب آزار و بے گنہ خوں ریز
کہ جرمِ قاتلِ عثمانؓ کا نہ ہو قائل

وہ نکتہ داں کہ تقیّہ کو اصلِ دین کہے
دمِ شکایتِ عاشق نہ ہو جفا سے خجل

وہ دوربیں کہ خدا پر "بدا" کرے ثابت
نہیں ہے غیر زبس اعتماد کے قابل

وہ فتنہ گر، بتِ ناحق شناس، ناانصاف
جو فرضِ عین گنے، کینِ داورِ عادل

امامِ اہلِ یقیں، شہر یارِ کشورِ عدل
امیرِ لشکرِ دیں و مبارز مقتل

بلند پایہ عمرؓ جس کے قصر رفعت کا — گدائے خاک نشیں ، شاہ آسماں منزل
معاندو جو کہا خاتم رسالت نے — کہ میرے بعد نبوت کا تھا عمرؓ قابل
یہی خلافتِ راشد کی اس کو بس ہے دلیل — یہی امامتِ برحق کی اس کو بس ہے سجل

حضرت عثمانؓ ذی النورین کی منقبت میں اس طرح نکتہ سنجی کرتے ہیں :—

سیو میں زیب دہ صدرِ خلافت عثمانؓ — جس کی مسند کے حسد سے فلکِ اطلس خوار
بیر روحہ کی حکایت میں کہا رضوان نے — سلسبیل اس کے ہے دریائے سخاوت کا کنار
شرط ایمان ہے پیمان خلافت اس کا — وہ مسلمان ہے کیا، جس کو ہو اس میں انکار
قصۂ بیعت رضوان میں اشارہ ہے یہی — ورنہ کوئی نہیں ، ہمدست رسول مختارؐ

حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ کی شان اعلیٰ میں فصاحت و بلاغت کے جوہر دکھاتے ہیں :—

آئی ہے لب پہ مدح خداوند ذوالفقار — لے جاؤ ، منکروں کے لیے ارمغان تیغ
شیر خدا علیؓ کہ شجاعت سے جس کی ہے — سر پنجۂ اسد پہ زنخ زن بنان تیغ
منکر تری امامت حق کے ہیں گرم جنگ — درکار ہے وضو کو جو آب روان تیغ
کیا بات تیرے پنجۂ آہن فشار کی — ورد زباں ہے غلغلۂ الامان تیغ
وہ دست زور ، مظہر سر پنجۂ خدا — وہ تیغ باعث شرف دودمان تیغ

اب حضرت حسن رضی اللہ عنہ کی شان گرامی میں نغمہ سنجی ملاحظہ ہو :—

سبزہ رنگی نے تری قتل کیا ہے ظالم — یاد آتا ہے مجھے حال امام مسموم
افضل الناس، حسنؓ ابن علیؓ سبطِ نبیؐ — سید و سرور و مولا و مطاع و مخدوم
مظہرِ شان الٰہی ہے یہاں تک کہ حکیم — متزلزل ہے دم بحث و جواب اور لزوم
علم اعجاز آسے ، معجزۂ علم آسے — جس میں اندیشہ ہو عاجز وہ سب اسکو معلوم
شبہ کیا عصمت لخت جگر احمد میں — جب مسلم ہو کہ معصوم ہے جزو معصوم
السلام اے روش آموز طریق السلام — السلام اے خضر جادۂ جنت ملزوم
وہ ترا پایہ ہے اے شاہ جوانان بہشت — کہ ہوئی حرمت پیری کی تمنا محروم

واقعۂ کربلا ایسا سانحہ نہیں کہ اُسے نظر انداز کر دیا جائے؛ مومن نے حضرت حسینؓ شہید حریت کی منقبت میں علاحدہ قصیدہ تو نہیں لکھا، اُنھوں نے عقیدۂ اہل سنت و الجماعت کے موافق صرف خلفائے راشدین کی منقبت میں قصیدے کہے ہیں۔ حضرت حسنؓ کی خلافت بھی خلافت راشدہ شمار ہوتی ہے اس لیے اُن کا منقبتی قصیدہ کہا ہے لیکن شہید اعظم رہنمائے حُریت کے سلسلے میں چند رباعیاں لکھی ہیں جن سے دلی عقیدت کا پتا چلتا ہے :—

ہنگامۂ حشر جب کہ برپا ہوگا
یوں روئے سوال سوئے اعدا ہوگا
اولادِ نبیؐ پہ ظلم کیا کیا نہ کیے
سمجھے نہ یہ تم کہ ہم پہ کیا کیا ہوگا

روشن ہے جو ہے آلِ عبا کا پایا
ہاں مرتبہ تسلیم و رضا کا پایا
قندیل ہے عرش کی جوہر جانِ شہید
کیا ہوئے گا شاہِ شہدا کا پایا

امواج فرات دیکھ روئے شبیرؓ
حسرت سے یہ خونابہ فشاں کی تقریر
ہیں اپنے ہی اُمتی، لہو کے پیاسے
کیا تشنگی آلِ نبیؐ کی تدبیر

روتا ہوں حسینؓ بن علیؓ کے غم میں
ہیں عیشِ جناں کے آز، اس ماتم میں
حیف آل نبیؐ میں کوئی باقی نہ رہا
لازم ہے کہ باقی نہ رہے کچھ ہم میں

درد شہدائے کربلا تو دیکھو
خوں ریزیٔ چشم ماجرا تو دیکھو
ایسوں سے نہ کیوں ہو حق تعالیٰ راضی
کیا صبر کیا، اُن کی رضا تو دیکھو

تابندگیٔ عذار سے فرق امام
تھا جلوہ نما سناں پہ جوں ماہ تمام
یہ حجت ساطع کرامات حسینؓ
افزوں ہوئی تیرہ روزیٔ لشکر شام

ان اشعار سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مومن کا مسلک ابتداء میں حنفی تھا اور عقائد میں شدت نہ تھی ۔ شیعہ ، سُنّی مسائل کی جھلک بھی قصائد سے ظاہر ہوتی ہے ، وہ شاہ عبدالعزیز صاحب[1] کی مانند یزید کو مستحق مذمت سمجھتے تھے :—

تا کجا اے یزید شمر خصال فتنہ ہائے فریب مروانی

مومن نے اپنی شیعہ محبوبہ کو خطاب کر کے جا بجا مذہبی نوک جھوک کی ہے ، دوسرے افراد کو انھوں نے خطاب نہیں کیا ہے ۔ اس سے اُن کی رندانہ شوخی ظاہر ہوتی ہے نہ کہ مذہبی خدمت ، چنانچہ مومن کی مشہور غزل کا آخر مقطع ہے :—

دل ایسے شوخ کو مومن نے دے دیا کہ وہ ہے محب حسینؓ کا اور دل رکھے شمر کا سا

چھٹی مثنوی ''آہ و زاری مظلوم'' ۱۲۴۰ھ میں بھی یہی رونا رویا ہے :—

نرالا سب سے اُس کا کیش و آئیں رقیبِ اہل بیت و دشمن دیں
طلسمِ شیعگی جادو کلامی صفت میری جو ہو تو نیک نامی
میری الفت چھپائے مجھ سے بے دیں تقیہ فرض جانے ، مستحب کیں

---

۱ - و اطلاق لفظ پلید و خبیث کہ بر یزید در تحفۂ اثنا عشریہ واقع شدہ بنا بر حدیث است کہ فردوس دیلمی و دیگر کتب و صاحب صواعق رقہ ہم اہل حدیث نقل کردہ بلکہ براویت حاکم ہم ثابت شدہ کہ ''اول من یبدل سنتی رجل من بنی امیہ یسمی بیزید'' و بروایتے : ''اول من یثلم فی امر امتی'' و ہر کہ تبدیل سنت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کند یا سوراخ یعنی خلل در امر امت آں جناب اندازد البتہ خبیث و پلید است—و تعریضات در باب معاویہ رضی اللہ عنہ ازیں فقیر واقع نشدہ ۔ خط شاہ عبدالعزیز محدث بنام مولوی عبدالرحمان رام پوری ۔ (تذکرۂ کاملان رام پور ۔ از حافظ احمد علی خاں شوق ، صفحہ ۲۰۶) ۔

ایک منظوم خط مومن محبوبہ کو لکھتے ہیں اور خطاب کرتے ہیں :—

یعنی از بس محرم آیا ہنگامِ وفورِ ماتم آیا
ہر چند غمِ امام ہووے پر تجھ کو نہ غم سے کام ہووے
ہر شب تجھے عشرتِ دل افروز ہر روز ہو تیرے گھرمیں نوروز

مومن ایک طرف تو حضرت حسنؓ کو امام مسموم اور معصوم جزو معصوم سے موسوم کرتے ہیں، دوسری طرف خلفائے ثلاثہ کے منکرین پر سب و شتم کرتے ہیں؛ اس سے واضح ہے کہ آن کا عقیدہ ابتداء میں تحقیقی نہ تھا تقلیدی تھا لیکن سید احمد شہید سے مئی ۱۸۱۸ء اور مئی ۱۸۱۹ء کے درمیان آنھوں نے دھلی میں بیعت کر کے اپنے آپ کو ایک خاص جماعت سے وابستہ کر لیا جس کو وھابی جماعت سے مخالفین نے موسوم کیا ہے۔ اس سلسلے میں آن کے قلم سے کچھ ایسے اشعار بھی نکلے ہیں جو درجۂ متانت سے فروتر ہیں اور بعض ایسے اشعار بھی منسوب کیے گئے ہیں جن میں مخالفین کو معیوب اور مکروہ خطابات سے موسوم کیا ہے :—

یہ چند منافقِ سراپا بدعت ہے کفر و ضلال و فسق، جن کی طینت
بتلاتے ہیں بدعتی، امام حق کو گویا کہ جہاد ہے، خلافِ سنت

ایک قطعے میں سید احمد شہید کے خروج کی تاریخ کہی ہے، اس میں مخالفین کو مشرک اور ضلال کیا ہے :—

وہ برق خرمن اربابِ شرک و اھلِ ضلال کہ شعلہ خوشۂ حاصل، تو دانہ اخگر ہے

اب چند الحاق رباعیوں کا معاندانہ رنگ دیکھیے :—

کیا سخت تھے ابن سعد اور ابن زیاد اولاد نبیؐ پہ ہے ستم پہ بیداد
فریاد امام کی کسی نے نہ سنی اللہ سنے، مقلدوں کی فریاد

یہ کچھ رہ سنت، نہ طریق توحید پھر کیا ہے ضرور، سب کو یکساں فہمید
ہم سمجھے ہیں معنئ حقیقی، یعنی حیواں ہیں حقیقت میں، یہ اھل تقلید

خالص ہوں محمدی ، مرا دین اسلام　　گو رائے ثواب (صواب) ہو نہیں مجھکو کام
تقلید کی ٹھہری ، تو بنوں گا شیعہ　　کس واسطے، چھوڑ دیجے ، افضل ترامام

مردک نے شہنشاہ سے بیعت چاہی　　گمراہ نے ، کس راہ سے بیعت چاہی
مصداق ہوا ، معنیٔ تبت کا یزید　　فرزند ید اللہ سے بیعت چاہی

رباعی فارسی :—

گویند بروں ز کفر و عصیاں نشدم　　تا تابع یک تن ز فقیہاں نشدم
مومن شدم و محمدی و سُنی　　آخر چہ شدم ، اگر مسلماں نشدم

اگر ان اشعار کی روشنی میں مومن کے عقائد کا تجزیہ کیا جائے تو مومن کبھی یا محمدؐ عربی اور مظہر نور خدا کہتے ہوئے نظر آتے ہیں اور کبھی حنفی مسلک والوں پر برستے ہیں ، تقلید سے اتنے بیزار ہیں کہ مقلدین کو حیوان قرار دیتے ہیں ، اہل حدیث کے مسلک کو بہتر قرار دیتے ہیں اور حضرت حسنؓ کو معصوم ٹھہرا کر مائل بہ تشیع نظر آتے ہیں ، شیعوں کے خلاف بھی صف آرائی کلام سے ظاہر ہوتی ہے ؛ اب فیصلہ اس کا کس طرح ہو ؟ اس کے لیے ہمیں مومن کے پورے حالات زندگی پر نظر ڈالنی ہوگی ، اُن کے خاندان کا مسلک اور حلقۂ احباب کا مذہبی عقیدہ بھی اس سلسلے میں رہنمائی کرے گا ۔ مومن تذکرہ نگاروں کی نظر میں چونکہ سید احمد شہید کے مرید تھے اس لیے تقلید سے بیزار تھے اور بڑے متقی تھے ۔

اب ۱۲۴۶ھ کا تصور کیجیے ، جس سال سید احمد شہید نے جہاد میں رتبۂ شہادت حاصل کیا ، مومن نے اسی سال ایک حسینہ سے محبت کی اور مثنوی ”آہ و زاری مظلوم“ (۱۲۴۶ھ) عالم وجود میں آئی ۔ مومن کی داستانہائے محبت [”شکایت ستم“ (۱۲۳۱ھ) ، ”قصۂ غم“ (۱۲۳۵ھ) ، ”قول غمیں“ (۱۲۳۶ھ) ”تف آتشیں“ (۱۲۴۱ھ)، ”حنین مغموم“ (۱۲۴۴ھ)، ”آہ و زاری مظلوم“ (۱۲۴۶ھ)] شروع ہوکر ۱۲۴۶ھ پر ختم ہوتی ہیں یا بقول

مومن نو سال کی عمر سے کوچۂ عاشقی میں قدم رکھا اور اکتیس سال کی عمر تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ سید احمد شہید کی وفات سے بظاہر مثنویوں کا سلسلہ ختم ہو گیا لیکن حسرت گناہ باقی رہی، ۱۲۵۰ھ میں شیفتہ نے "گلشن بیخار" میں حسینوں سے وابستگی کا ذکر کیا ہے، نواب وزیرالدولہ والیٔ ٹونک کے ایما سے مدارالمہام ریاست نے مومن کو ٹونک آنے کی دعوت دی اور اشارہ کیا کہ زاد راہ حج بھی مہیا ہو جائے گا لیکن وہی مومن جس نے اپنے پیر کی زندگی میں شوق شہادت کا اظہار کیا تھا اور مثنوی جہادیہ لکھ کر دوسروں کو ترغیب جہاد دی تھی، وہ اپنی پاک دامنی کی غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے تردامنی کا اظہار کر کے جان بچاتا ہے اور کہتا ہے:-

حاملِ دفترِ مدیح سے یوں مجھے پہنچا تھا علمِ اذعانی
کہ نہیں کیوں خیالِ طوفِ حرم مومن اور اتنی نا مسلمانی
تجھے معلوم کیا نہیں ناداں فرض ہے حج بہ نصِ قرآنی

اول اس در پہ سجدہ ریزی کر تا ملے مفت جاہ کیوانی
پھر طواف حرم میں ہو مشغول تیرے صدقے شروط ایمانی

ہے مجھے بھی خیال طوف حرم خضر رہ گر ہو، فضل رحمانی
تا کہ صحن منا میں کر ڈالوں نفس امّارہ کو بھی قربانی
پر کروں کیا کہ بن نہیں آتی ورنہ میں اور تیہ مہانی
سوچ سوچ اپنے دل میں ڈرتا ہوں گو ہوں، وسواس یائے شیطانی
ہے ابھی آرزوئے وصل صنم ہے ابھی حسرت ہوس رانی
فکر انجام سدّ راہ ہوئی سن چکا ہوں، حدیث صنعانی
بعد یک چند گر خدا چاہے میں ہوں اور ترے در کی دربانی

وزیر محمد خاں وزیرالدولہ نواب ٹونک ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۴ء میں تخت نشین ہوئے اور انھوں نے جون ۱۸۶۴ء میں انتقال کیا۔

(قاموس المشاہیر ج-۲ و مختصر تاریخ اسلام صفحہ ۱۱۴) -

مجھے جوہر ہو سرتا سر صفائے مہر پیغمبرؐ
مرا حیرت زدہ دل، آئینہ خانہ ہو سنت کا
مجھے وہ تیغ جوہر کر کہ میرے نام سے خوں ہو
دل صد پارہ، اصحاب نفاق و اہل بدعت کا
خدایا لشکرِ اسلام تک پہنچا کہ آ پہنچا
لبوں پر دم، بلا ہے جوشِ خوں شوقِ شہادت کا

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب   یہ افضل سے افضل، عبادت نصیب
تو اپنی عنایت سے توفیق دے   عروجِ شہید اور صدیق دے
کرم کر نکال اب یہاں سے مجھے   ملا دے امامِ زماں سے مجھے

مومن ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۸۳۴ء کے بعد بھی دعوائے اتقا نہیں کرتے اور حدیث صنعاں کے پیش نظر ارادۂ حج ہی سے باز رہتے ہیں۔ آخر کیوں؟ اُن کی داستان عشق مختصراً اُن کی پیش کردہ درج کی جا رہی ہے، اس سے مومن کی ہوسناکی کا اندازہ ہو سکے گا، جس کی عمر کا بیشتر حصہ رندی اور بے باکی میں گزرا ہو اُس کو مصلح اور متقی بنانا حیرت انگیز امر ہے :-

حیات معاشقہ

داستان محبت ۱۱۶۳ھ تا ۱۲۳۱ھ

تھے برس ہم شمارۂ افلاک   کہ ہوئے پائمال صورت
شغل طفلانہ دل کے پاس گئے   ہوش کے آتے ہی حواس گئے
پہنچے سن وقوف کو بھی نہ ہم   کہ ہوئے واقف رموز الم
آہ ورد زبان ولولہ تھی   نیم بسمل ہوئے یہ بسملہ تھی
بسکہ تھا دل میں شکوۂ بیداد   سبق الحمد کا نہ رہتا یاد

حفظِ قرآن و یادِ مصحف رو   فرصت اک دم نہ روز و شب میں کبھو
دن کو وردِ زبانِ سبق ناچار   رات بھر، درسِ شوق کی تکرار
گھر سے عیش و طرب کے جوش گئے   میری نیند، اقربا کے ہوش گئے
شہرۂ عاشقانہ ہونے لگا   حال میرا فسانہ ہونے لگا
گہ، گہے، جو وصال ہوتا تھا   وہ بھی جی کا وبال ہوتا تھا
آفتِ جان و دل، فراق و وصال   الغرض یوں ہی کٹ گئے دو سال
جب پڑی دونوں کی، قلق کی دھوم   اتنے ملنے سے بھی ہوئے محروم
اُس نے ناچار، پھر چھپایا، مُنہ   اس وفا پر نہ پھر دکھایا مُنہ
ہوئی شادی، ہمارے یاں یکبار   آئی مہماں، وہ دولتِ بیدار
ایک خالی مکان میں آ کر   مل گئی چپکے چپکے ڈھب پا کر
کیا ملاقات، رشک تنہائی   دمبدم تازہ حسرت افزائی
دونوں جانب سے نالۂ و فریاد   شکوۂ جور و طعنۂ بیداد
آگیا دو ہی دن میں روزِ نشور   منتشر ہو گئی، وہ بزم سرور
وہ ملاقاتِ آخری، ہے ہے   کیسی دلداریاں مری، ہے ہے
بہرِ تسکینِ شدتِ خفقان   ٹھہری گلگشت روضۂ رضوان
گئی جنّت میں بسکہ ایسی حور   ہوئی بیتاب، کیسی کیسی حور
مجکو جس وقت یہ خبر آئی   بیہشی مرگ کی، خبر لائی
پاس بد نامی اک ذرا نہ رہا   ہوش ناموس و ننگ کا نہ رہا
دم اٹکتے اٹکتے ٹوٹ گیا   سر پٹکتے پٹکتے پھوٹ گیا
نالہ آخر فسوں ہوا دل کو   رکتے رکتے، جنوں ہوا دل کو
چارہ سازوں سے نفرتیں کیا کیا   حرف تسکین سے وحشتیں کیا کیا
ذکر درماں سے اور درد بڑھے   نام تبرید سے بخار چڑھے
خفقان الفتوں سے ہمدم کی   طوق گردن کنار آب و عم کی
ایک مدت تلک یہ حال رہا   ملک‌الموت کا خیال رہا
دور بینی ستم فریبوں کی   چارہ سازی، ستم ان طبیبوں کی

دل سے کی مشورت کہ کیا کیجیے — کیوں کر اس درد کی دوا کیجیے
یوں کہا دل نے ، اے زبوں تقدیر — نہیں اس کے سوائے کچھ تدبیر
کہ ذرا جان کو سنبھالو تم — بات جب ہے کہ بات ٹالو تم
نفس تیز تیز کو روکا — نالۂ شعلہ ریز کو روکا
ظاہر آزار ، کچھ غرض نہ رہا — لاغری کے سوا ، مرض نہ رہا

بار دوم گرفتاری ، ۱۲۲۶ھ

ایک دن مجکو جوش بے ہوشی — خواب ناز جہاں فراموشی
اس میں اک بوئے جانفزا آئی — جان پر غش کے ، کیا بلا آئی
دیکھتا کیا ہوں ایک زہرہ جبیں — جلوہ افروز ہے ، سر بالیں
سال عمر اب تھے ہم شمار بروج — کہ ہوا ، اختر بلا کا عروج
چرخ نے داغ نو دیا مجکو — والہ اس ماہ کا کیا مجکو
دیکھ زانوں پر اُس کے سر اپنا — تھا دماغ آسماں پر اپنا
حال پوچھا جو ناتوانی کا — بڑھ گیا زور سخت جانی کا
واہ اُس لب کی چارہ فرمائی — بات میں آ گئی توانائی
پوچھنا اب مزاج کیسا ہے — غش یہ پھر تم کو آج کیسا ہے
دیکھو کس کس کا ہے برا احوال — یہ بنایا ہے تم نے کیا احوال
جان سے یوں گزر نہیں جاتے — موے کے پیچھے مر نہیں جاتے
حظ اُٹھاؤ ، ذرا "جوانی" کے — کچھ مزے دیکھو ، زندگانی کے
متصل کی ، جو اُس نے دلداری — نہ رہی زندگی سے بیزاری
کیسی دونوں طرف سے یک روئی — دونوں جاں باز ، محو دل جوئی
دائما ساغر سبو بے کار — مستی اشتیاق بوس و کنار
کوئی آیا تو ہٹ گئے ناچار — ورنہ ہر لحظہ شغل بوس و کنار
اک برس تک یہی رہا عالم — زندگی کے مزے اُٹھائے بہم
ایک دن ہم موافق معمول — تھے نشاط و سرور میں مشغول

نیند دونوں کو آ گئی ناگاہ بخت بھی اپنے ساتھ سو گئے آہ
ایک حیالہ واں چلی آئی اپنے سر پر نئی بلا لائی
آن کر سب میں کر دیا بد نام اس تبہ کار نے، کیا کیا کام
بات عصمت میں، بے سخن آئی حرف گیروں کی بات بن آئی
ہم بھی سوتے اٹھے جو بعد زوال ہو گئی خواب آرزوئے وصال
دیکھتے کیا ہیں ایک قیامت ہے شور محشر، دم ملامت ہے
کوئی کہتا تھا آپ کی، کیا بات اتنی سی عمر اور یہ حرکات

جھوٹی اک آدھ جب قسم کھائی سمجھے سچ ہے یہ سن و شیدائی
کی وھاں جانے کی مگر بندی مجھ سا دل بند اور نظر بندی
کئی دن بعد، ایک شب تنہا اتفاقاً ملی، وہ مہ سیما
بس مجھے دیکھتے ہی رونے لگی سلک گوہر نثار ہونے لگی

ڈھب انھیں کے خیال میں آیا سوچتے سوچتے یہ فرمایا
جب کہ اک ایک گھر میں سو جائے بیخود اپنی طرح سے ہو جائے
آؤ تم یاں پر ہوشیاری سے پختگی سے نہ خام کاری سے
کیا کہوں کہ سنتے ہی یہ نوید ہو گئی کیسی اپنے گھر میں عید
سر کو پانؤں پہ دھر دیا میں نے سجدۂ شکر یوں کیا میں نے
نیم شب جب ہوئی عناں کشِ دل جانبِ منزلِ مہِ کامل
ہوے آنکھوں سے ڈرتے ڈرتے رواں لغزشِ پا تھی، جنبشِ مژگاں
فکرِ رفت و نشست و گشت ستم بارے، پھونچے، ملے پھر آئے ہم
دوسری رات بھی وصال ہوا روز فرقت کا انتقال ہوا

صحن میں تھا کہ بولی اک زن پیر ہیں یہ دونوں جوان کیسے شریر
ہم تو بے خوابیوں سے مرتے ہیں آپ ہر رات چین کرتے ہیں

تو سہی صبح دھوم اٹھاؤں میں	فتنۂ خفتہ کو جگاؤں میں
اٹھتے ہی یہ صدا، کھڑے ہوئے کان	اڑ گیا واں سے بس میں جوں اوسان

سو سر شام اُدھر ہوا جو گزار	ملی تنہا وہ شمع شعلہ عذار
چشم نم سے پڑی نظر مجکو	ہو گئی آگ دیکھ کر مجکو
لگی کہنے کہ چل ہوا کھا بس	جی بھرا آئے ہے چلا جا بس
بات بگڑی زیادہ اقغاں سے	منہہ بنا کر وہ اٹھ گئی واں سے
روز افزوں تباہئ احوال	الغرض یوں ہی کٹ گئے دو سال

دو سال بعد ایک دن وہ کوٹھے پر نظر آئی، مومن نے جا کر اپنی فسوں سازی دکھائی اور پھر ملاقاتیں جاری ہو گئیں لیکن ایک دن محبوبہ نے بلایا، پیامبر عورت نے بند کمرے میں پایا، پیام سنایا، مومن بولے 'دو چار شعر کہ کر آتا ہوں'، اُس نے جا کہا 'کسی سے ملاقات میں مصروف تھا'، اس پر محبوبہ برھم ہوگئی اور دوسری محبت کا سلسلہ ختم ہوا ''۔

اول مثنوی کا اقتباس تفصیلی پیش کیا گیا ھے تا کہ مومن کی رندانہ زندگی کا آغاز واضح ہو جائے۔ تیرہ برس کی عمر میں وہ مجنوں اور فرہاد کو مات دے چکے تھے؛ وہ دونوں عاشق ناکام رھے اور یہ چھوٹی سی عمر میں ماھر شمار ہونے لگے۔ مومن ۱۲۳۱ھ کے بعد محبت سے دست بردار نہیں ہوئے، اُنھوں نے مثنوی قصۂ غم ۱۲۳۵ھ میں ایک اور حسینہ پر دل آ جانے کا حال لکھا ھے۔ اس میں چوری چھپے ملاقات کا ذکر نہیں، دونوں طرف جوش جوانی تھا اور آزادی، کھل کر ملاقاتیں ہوئیں، محبوبہ اپنی محبت جتانے کی قسمیں کھاتی ھے، اس سے پتا چلتا ھے کہ وہ اثنا عشری تھی :—

شام غربائے سر بسر غم	صبح دھم مہ محرم
لب تشنگئ حسین رضؓ و عباس رضؓ	امواج فرات و شرم الیاس
ان سب کی مجھے ھزار سوگند	سوگند ھزار بار سوگند
ھے تجھ سے مجھے دلی محبت	گو تجھ کو نہ ہو مری محبت

کہتا میں اگر کہ جھوٹ ہے سب — تم لوگ کسی کے ہوتے ہو کب
جس روز کہ بگڑیں مری جاں تم — بس خیر کہاں میں اور کہاں تم
کیا کیا نہ کرو گی پھر جفا تم — دیتی یہ جواب ہو خفا تم
تو آپ ز بسکہ بے وفا ہے — اپنا ہی سا سب کو جانتا ہے

مومن کہتے ہیں کہ اب مجھ سے کیوں ناراض ہو، پھر خلوت خاص میں بلا لو؛ یہیں اپنی تیسری محبوبہ کی داستاں ختم کرتے ہیں۔

تیسری مثنوی 'قول غمیں' (۱۲۳۶ھ) امۃ الفاطمہ متخلص بہ صاحب کی داستاں ہے؛ صاحب لکھنؤ کی طوائف تھی، اپنی رشتہ داری میں دھلی آئی، مومن کی وھاں پہلے سے آمد و رفت تھی، وھاں شطرنج کی بازی بھی جمتی اور بذلہ سنجی اور ظرافت کی گرم بازاری ہوتی، مومن کا آنا جانا روزانہ تھا کہ صاحب کی طبیعت خراب ہو گئی، مومن کو صاحب نے نبض دکھائی اور انھوں نے ہاتھ دیکھ کر ہی دل دے دیا، آخرکار چھیڑ چھاڑ چلتی رہی، شیفتہ نے بھی صاحب کی محبت کی داستاں کا حوالہ گلشن بے خار میں دیا ہے؛ آخر صاحب لکھنؤ گئی اور مومن کی محبت بھی ٹھنڈی پڑ گئی۔

چوتھی مثنوی ''تف آتشین'' (۱۲۴۱ھ) ہے :- مومن ایک شادی کی تقریب میں مہتمم تھے اور زنان خانے تک بار بار آجا رہے تھے کہ ایک مہ جبیں کو پس پردہ دیکھا، وہ بھی دو چار مرتبہ سامنے آ گئی، آخر یہاں پیام سلام ہوئے پھر ملاقات ہوئی اور یہ سلسلہ جاری رہا۔

پانچویں مثنوی ''حنین مغموم'' (۱۲۴۴ھ) میں ان ملاقاتوں کا حال لکھا ہے، اس سے اتنا اندازہ ہوتا ہے کہ اس داستان چہارم کا آغاز ۱۲۴۱ھ و ۱۲۴۲ھ سے ہوتا ہے اور ۱۲۴۴ھ میں ایک اور مہ جبیں سے دل لگا بیٹھتے ہیں، مومن کو اس محبوبہ نے کافی انتظار دکھایا اور ایک بار تنہائی کی ملاقات میسر آئی، وعدہ وعید ہوئے لیکن پانچویں محبوبہ (جس کی مذمت میں اپنی قادر الکلامی کا زور دکھایا ہے اور ''حنیں مغموم'' میں چڑیل سے زیادہ

بد قوارہ ظاہر کیا ہے) نے اس نئی محبوبہ سے ملاقات کر کے مومن کی کچھ ایسی تصویر کھینچی کہ وہ بیزار ہو گئی اور پھر ملاقات نہ کی ۔

چھٹی مثنوی ''آہ و زاری مظلوم'' (١٢٣٦ھ) میں ناکامیٔ محبت کی داستان رقم ہے ۔ مومن نے اس محبوبہ کے مذہب کا تفصیلی بیان کیا ہے ، وہ اثنا عشری تھی ، مومن نے اس کی محبت پر بھی لطیف طنز کیا ہے :۔

مری الفت چھپائے مجھ سے بے دیں تقیّہ فرض جانے ، مستحب کیں

ہماری رائے میں وہی محبوبہ جس کی ملاقات کا ذکر ''حنینِ مغموم'' میں اس طرح کیا ہے :۔

کہ دیا سب سے کہ اک رازِ نہاں آج پوچھوں گی کہ ہے بیتاب جان
وہ زبوں طالع کہ ہے اختر شناس آئے تو تم بھیج دینا میرے پاس
جونہیں اس گھر میں ہوا ، اپنا گزر آئی کچھ تثلیث زہرہ کی نظر
کر کے استقبال وہ ماہِ تمام لے گئی ، بارے مجھے بالائے بام
ہے نئی یہ گردشِ چرخِ کبود اخترِ عاشق کو ہو اتنا صعود
آخر مہ میں کئے ہم نے یہ چین تھا مبارک ، اجتماعِ نیّرین

مثنوی ششم

کہاں اے بدر سیما وہ ترحم کہ ہوں میں رازدارِ سیر انجم
نہیں کیا تم نے احکام آزمائے انہیں باتوں نے تو یہ دن دکھائے
مجھے جب زائچہ تم نے دکھایا قراں ہی اول و ہفتم میں پایا

نہ زہرہ سب سعادت پر تو انجم رہیں رونق فزائے برجِ پنجم
سدا ساعت دبیر آسماں کی ضمیر الفت ، حکیم نکتہ داں کی
ہمیشہ اختر ید ، طالع غیر شرف بخشِ ہبوط و راجع السیر
نہیں کچھ اعتبارِ دور افلاک کہ اک گردش میں مجھ کو کر دیا خاک

اردو شعراء میں کون ایسا ہے جس نے وادیٔ محبت کی سیر نہ کی ہو ،

بعض نے شہرت پائی اور بعض گم نام رہے ، ایسے بھی بے باک تھے جنھوں نے اپنی داستانِ محبت قلم بند کر کے دعوتِ نظارہ دی اور ملک والوں کے لیے اپنی داستان حیات آئینہ کی مانند پیش کر دی ؛ جعفر علی خاں زکی کی داستانِ عشق راجه سوائی رام اور میر کی مثنوی معاملاتِ عشق اسی طرف رهبری کر رهی هیں ، جرأت نے خواجه حسن ، حسن اور بخشی کی کہانی قلم بند کر کے حق دوستی ادا کیا ۔ مومن اس میدان مین کسی سے پیچھے نه رهے ، انھوں نے اپنی زندگی کے چھ پوشیده واقعات نظم کر کے شعراء میں بلند مقام حاصل کیا ۔ ان مثنویوں کا تجزیه کیا جائے تو یه بات ثابت هوتی هے که مومن کی فطرت میں عشق رچا هوا تھا ؛ نو برس کی عمر سے اس دشت میں قدم رکھا اور ۳۱ برس کی عمر تک دشت نوردی کرتے رهے ۔ ان کی مثنویوں کی تاریخ اختتام حسب ذیل هے :—

شکائت ستم (۱۲۳۱ھ) ، قصۀ غم (۱۲۳۵ھ) ، قول غمیں (۱۲۳۶ھ)، تف آتشیں (۱۲۴۱ھ)، حنین مغموم (۱۲۴۴ھ)، آه و زاری مظلوم (۱۲۴۶ھ)، مومن کی اول شادی سردهنه میں ۱۲۴۲ھ میں هوئی اور دوسری شادی خواجه محمد نصیر رنج کی دختر سے ۱۲۴۵ھ میں — ع

مرغ بے بال و پر اندر قفس آمد فریاد

لیکن آخرالذکر تینوں مثنویوں کا سلسله ۱۲۴۱ھ سے ۱۲۴۶ھ تک چلتا هے ، اس سے ظاهر هوتا هے که مومن شادی کے بعد بھی تائب نه هوئے تھے ۔ مثنویٔ اول شکایتِ ستم میں جن دو حسینوں کا بیان هے ، ان میں سے سب سے پہلی محبوبه سے ۱۲۲۳ھ میں وابستگی هوئی اور ۱۲۲۶ھ میں اس کی موت پر مومن کی جان کے لالے پڑ گئے تھے ، خود کہتے هیں : ع

خفقان الفتوں سے همدم کی طوق گردن کنار آب و عم کی

پہلی محبوبه سے جو لگاؤ تھا اس کا ثبوت ترکیب بند به مضمون مرثیه معشوقه حور طلعت سے ملتا هے جس کے وصال کی جنّت میں تمنّا کی هے ۔ یه ترکیب بند

دل شکستہ کی آواز ہے اس لیے درد و الم سے لبریز ہے۔ مثنوی شکایتِ ستم میں محبوبۂ اول کو خود کہا ہے: (صفحہ ۲۶۵ شکایتِ ستم)

گئی جنّت میں بسکہ ایسی حور ہوئی بیتاب کیسی کیسی حور

ترکیب بند کے بند ۵ میں صفحہ ۲۵۵ میں بھی اسے حور سے خطاب کیا ہے:

اس حوروش سے ہائے کیا ہے جدا ہمیں اس زندگی کے ہاتھ سے مرنا پڑا ہمیں

دوسری حسینہ سے تعلق ۱۲۲۶ھ میں پیدا ہوا اور مختلف مدارج سے گزر کر ۱۲۳۱ھ میں محبوبہ کی بدگمانی پر ختم ہو گیا۔ آخر میں کہتے ہیں (شکایت ستم صفحہ ۲۸۷):

اس کو پروا نہیں میں مرتا ہوں چندے اور انتظار کرتا ہوں
بن ملے، انتقام لوں گا میں سچ کسی اور سے ملوں گا میں

مثنوی قصۂ غم (صفحہ۲) میں مومن کی آوارگی اور دشت پیمائی کا بیان ہے اور گزشتہ واقعات کی عریاں حکایت نواب امداد اثر کاشف الحقائق میں لکھتے ہیں (جلد دوم صفحہ ۲۳۸ طبع دوم):—

دیکھا تو وہی شخص مومن ہے جو ہمارا دوست تھا اور جس کی ہم کو تلاش تھی۔ قصہ اس مثنوی کا اس قدر ہے مگر اس کا شاعرانہ بیان طولانی ہے اور بلا شبہ مومن خاں کے زورِ طبیعت اور خلاقیٔ سخن سے خبر دیتا ہے لیکن اسی کے لطیف تناسب سے سارا بیان معرا ہے اور زیادہ قابل افسوس امر یہ ہے کہ عدم تناسب کے ساتھ عدم تہذیب کی قباحت اسی میں لاحق ہے۔

قولِ غمیں (صفحہ ۳) لکھنوی طوائف امۃالفاطمہ بیگم صاحب تخلص کی داستانِ عشق ہے، مثنوی تف آتشیں (صفحہ۶) ایک پردہ نشیں کی داستانِ محبت ہے جس سے بزم شادی میں اتفاقاً آنکھ لڑ جاتی ہے اور پھر سلسلہ چلتا ہے۔

یہ مثنوی واقعاتِ فراق پر مبنی ہے اور حنین مغموم (صفحہ٥) میں کامیابی کے بعد اسی محبوبہ کی مذمت کا بیان ہے اور ایک آور پردہ نشین سے ایک مجلس میں پس چلمن نظر بازی ہونا اور پھر بہزار دقّت ملاقات ہونے کا بیان ہے۔ جب بد سیرت محبوبہ کو نئی محبوبہ سے ربط ضبط کا پتا چلتا ہے، وہ آ کر نئی محبوبہ سے مل جاتی ہے اور ان کی سیرت کا نقشہ کچھ اس طرح سے پیش کرتی ہے کہ نئی محبوبہ متنفر ہو جاتی ہے؛ یہ ہاشمی النسل محبوبہ پاک دامن تھی اور مومن کی ترغیب ناکام رہی۔

آہ و زاری مظلوم (صفحہ٦) نئی محبوبہ کی داستانِ فراق ہے۔ یہ ہے مثنویوں کا خلاصہ، قطع نظر دوسری داستانوں کے ہم صرف صاحب اور مومن کے عشق سے بحث کریں گے۔

قولِ غمیں جسے مومن نے افسانہ شیریں بھی کہا ہے، اس کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

ساقیا زہر پلا دے مجھ کو — شربت مرگ چکھا دے مجھ کو
کوئی اتنا نہیں جو چارہ کرے — چارۂ مومنِ آوارہ کرے
بات کچھ میری زبانی سن لے — غور سے ساری کہانی سن لے
ایک دن جاتے تھے یار کے پاس — یارِ غم خوار و وفادار کے پاس
راہ میں طرفہ تماشا دیکھا — غرفہ و بام دلِ آراء دیکھا
آگے اس غرفے کے چلون ہے پڑی — پسِ چلون کوئی عورت ہے کھڑی
محو نظارۂ رنگِ بازار — ناگہاں ہو گئی مجھ سے دو چار
دیے آپس میں نظارے کیا کیا — کیے ابرو سے اشارے کیا کیا
جی میں آیا کہ تجسّس کیجیے — کسی ڈھب بھید یہاں کا لیجیے
سو فریبوں سے وہاں تک پہنچے — پہنچے اور کہاں تک پہنچے
ہم نشیں ہمدم و غم خوار ہوئے — ہم بھی ایک محرم اسرار ہوئے
گرچہ تھا اور طرح کا نہ مزاج — ایک شدت سے ظریفانہ مزاج

زیر لب مضحکہ ایجاد کلام — رات دن ہنسنے ہنسانے سے کام
دیکھی یہ گرمیٔ صحبت جو وہاں — دل افسردہ لگا بہلنے وہاں
ایک چندے یہی اوقات رہی — روز پہروں کی ملاقات رہی
وہاں ہر اک طرح بہلتا تھا دل — کہ ہوئی اس میں بلا ایک نازل
کہیں باہر سے کوئی واں آیا — میرے بیٹھے ہی وہ مہمان آیا
سنتے ہی اس کے میں آنے کی خبر — پردہ کے واسطے آیا باہر
اک ذرا آن کے باہر ٹھہرا — دم کے دم جان کے باہر ٹھہرا
اتنے میں دل جو مرا گھبرایا — جی میں سوچ کے میں گھر آیا
دوسرے دن جو ہوا گھر سے رواں — جانب کوچۂ رشک بستان
صاحب خانہ نے بعد از اکرام — بے قرارانہ کیا مجھ سے کلام
کہ یہاں عید و محرم ہیں بہم — کل سے کیا کیا طرب وغم ہیں بہم
یعنی وارد ہے وہ مہمانِ عزیز — جس کے قربان مری جانِ عزیز
ایک بیمار و پریشان احوال — نہ وہ جلوہ، نہ وہ رونق، نہ جمال
آپ کچھ چارہ کیجیے غرض — نبض دیکھو کہ ہو تشخیص مرض
میں نے اس نبض پہ جو ہاتھ دھرا — ہاتھ سے میرے، میرا دل ہی چلا
صاف صندل سے زیادہ وہ ہاتھ — نرم مخمل سے زیادہ وہ ہاتھ
سخت تازہ جو جان پر آئی — یہ غزل اپنی زبان پر آئی
کیا لگا دست دل آرام سے ہاتھ — دل گیا ہاتھ سے اور کام سے ہاتھ
اس غزل نے اسے آگاہ کیا — ہاتھ کو ہاتھ جھٹک کھینچ لیا
ہنس کے یوں صاحب خانہ سے کہا — کہ یہ درمانِ مرض جانے کیا
ہے یہ بے چارہ تو آپ ہی بیمار — زردیٔ رخ سے عیاں ہے آزار
کوئی ناداں ہی کہے اس کو طبیب — درد میں خود ہے گرفتار غریب
پہلے وہ آپ ہنسے یہ کہ کر — پھر تو سب لوٹ گئے قہقہ لگا کر

مومن کچھ ایسے گم سم ہوئے کہ چھیڑنے والوں کا جواب نہ دے سکے ، گھبرا کر گھر چلے ، وہاں اور بھی بے قراری بڑھی ۔ دوسرے دن

صاحب خانہ کے یہاں پہنچے ، خلاف معمول آتا دیکھ کر انھیں چھیڑنا شروع کیا ، یہ گھسیانے ہو گئے ۔ صاحب خانہ نے ان کی حمایت کی کہ ان کا اپنا گھر ہے جب چاہا آگئے ! اس چھیڑ چھاڑ کا الٹا سیدھا جواب مومن نے دیا لیکن دل کے ھاتھوں مجبور تھے ، کچھ ایسے تنگ آئے کہ رو دیے ، انھیں اور بنا گیا ۔ شام کو گھر آئے تو صاحب جی کی طرف سے مکان پر نامہ بر نامہ لایا ، اس نے سمجھایا کہ ان باتوں سے بدنامی کے سوا کچھ نہ ہوگا : ع

پاس رسوائی کا گر اپنی نہ ہو   دیکھو تم مجھ کو تو رسوا نہ کرو

مومن نے معذرت نامہ لکھ دیا کہ دل سے مجبور ہو کر رو دیا ورنہ میں بھی ایسا نادان نہ تھا ۔ آخر اب جاتے تو دو تین پہر بیٹھ کر آ جاتے ، اوروں سے صرف دل آویزانہ باتیں کرتے ۔ آخر شاعر ھی تو تھے لیکن جب موقع ملتا چھپ چھپ کر روتے ، اسے خبر ہوتی ، وہ روتی ؛ آخر ایک دن اس نے ایک جگہ موقع پا کر بلوایا ، خوب جی کھول کر باتیں ہوئیں ، روئے بھی اور رولایا بھی ، وعدے وعید ہوئے ۔ اسی طرح ملاقات صاحب خانہ کے مکان پر ہوتی رہی ، گردش فلک ! اسے سفر در پیش آیا ، اس نے پیام بھیجا کہ مجھ سے فوراً مل جاؤ ، گئے اور ملاقات ہوئی لیکن کیسی :

کیا نئے ڈھب سے ملاقات ہوئی   کہ نہ کچھ بولے نہ کچھ بات ہوئی
مل کے حیرت زدگاں بے کس   دور بیٹھے ہوئے روتے رہے بس
خوں فشاں لب پہ وہ آھیں باھم   حسرت آلودہ نگاھیں باھم
گرچہ ھرگز بھی نہ تھی تاب کلام   پر وہ بولی یہ ذرا جی کو تھام
کہ یہ کیا حال ہے کیوں روتے ہو   مفت کس واسطے جی کھوتے ہو
اب تم اوروں سے لگا لیجو جی   نہ ہوئے ہم تو کوئی اور سہی
ھاں مگر فکر ہو تو ہم کو ہو   رنج و اندوہ ہو تو ہم کو ہو
کہ بری آہ ھماری خو ہے   ہم میں ایک مہر و وفا کی بو ہے

خیر رہنا ہوا اب تک اپنا | اب وطن تم کو مبارک اپنا
تم رہو خوش کسی جاناں کے ساتھ | ہم چلے حسرت و حرماں کے ساتھ
کام دل رنج و بلا کو سونپا | تم کو لو ہم نے خدا کو سونپا
کہ کے یہ اٹھ گئی جی کھوتی ہوئی | ہچکیاں لیتی ہوئی ، روتی ہوئی
ہم بھی روتے ہوئے اپنے گھر آئے | با دلِ مضطرب و مضطر آئے

آگے مومن نے ایک تمثیلیہ حکایت بیان کی ہے کہ عاشق نے فراق میں جان دی ، جب جنازہ معشوقہ کے مکان کے نیچے سے نکلا ، اس نے بھی گر کر جان دی ، آخر میں مومن اس کی واپسی کی امید کرتے ہیں ۔

مومن پر اثر تو صاحب کی جدائی کا رہا لیکن مومن کی بے وفائی کا صاحب کو بھی یقین تھا ۔ یہ واقعہ ۱۲۳۶ھ (۲۰،۱۸۲۱ء) کا ہے ، مومن اکیسویں سال میں تھے ۔ بقول شیفتہ چند ماہ درد و دوا کا سلسلہ چلا ، کریم الدّین سے مدت تک آشنائی رہی مگر انھوں نے مبہم فقرہ استعمال کیا ، فصیح الدّین رنج میرٹھی صاحب تذکرہ بہارستان ناز (۱۸۶۴ء) نے ایک سال تک کلیم صاحب کے ہم پہلو رہنے کا ذکر کیا ہے ۔ شیفتہ کی روایت مستند ہے ، صاحب بطور مہمان لکھنؤ سے دہلی آئی تھی ، چند ماہ رہ کر چلی گئی ، جو چند سال تک اس واقعے کا سلسلہ ظاہر کرتے ہیں ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے ۔ کریم الدّین (تذکرہ شعراء اردو ۱۸۴۷ء)، فصیح الدّین رنج ، (تذکرہ بہارستان ناز ۱۸۶۴ء) ، کلیم قطب الدّین باطن (تذکرہ نغمہ عندلیب ۱۸۷۵ء) صاحب کو خانگی کی حیثیت سے متعارف کراتے ہیں ۔ جس مکان میں صاحب سے مومن کی ملاقات ہوئی وہ بھی ایسا ہی مکان تھا جہاں مومن آزادنہ مستورات میں نشست و برخاست رکھتے تھے اس لیے خانگی یا طوائف کہنا صحیح ہے ۔ قطعہ سیہوان میں لفظ صاحب سے اشتباہ ضرور ہوتا ہے لیکن خود مثنوی میں مومن نے کہا ہے کہ صاحب کے پیچھے جانے میں پاس رسوائی مانع ہوا ۔ ایک رباعی مومن نے اس سلسلے میں کہی :

وان ہم کو سفر ہوا جو مجبوری سے   یاں ناک میں دم ھے درد مہجوری سے
تم تو وھاں پہنچے اور میں یہاں پہنچا   مرنے کے قریب آپ کی دوری سے

دوسری مثنویاں بھی وضاحت طلب ھیں لیکن ھر مثنوی کا علاحدہ تجزیہ ضروری ھے۔ تمام مثنویوں کے واقعات کا سلسلہ ایک مثنوی سے ملا دینا مغالطہ ھے اور اس طرح مومن کے حالات زندگی الجھ کر رہ جائیں گے۔ ترکیب بند بہ مضمون مرثیہ اور دو قطعے جو مومن نے اپنے بزرگ کی صداقت اور اپنی علالت کے سلسلے میں لکھے ھیں، قولِ غمیں سے متعلق نہیں۔

مثنوی پنجم کی انتہا اور چھٹی مثنوی کا آغاز و انجام داستانِ حسرت و یاس ھے؛ اس طرح چھ مثنویاں ھیں اور ان میں چھ حسینوں سے عشق بازی کا حال لکھا ھے۔ مومن نے سید احمد شہید سے مئی ۱۸۱۸ء مطابق رجب ۱۲۳۳ ھجری اور ۲۹ مئی ۱۸۱۹ء مطابق ۴ شعبان ۱۲۳۴ھ کے درمیان بیعت کی اور بیعت بھی طریقۂ محمدیہ میں جس کا نمونہ سید احمد شہید اور اُن کے رفقا نے بھی پیش کیا اور آخر میں حیات ابدی پائی لیکن مومن اسی زمانے میں داد عیش دیتے رھے، اسی پر اکتفا نہیں کیا کہ چھپ کر گناہ کرتے اور ظاھر میں پاک باز بنے رھتے بلکہ اپنی عصیاں کاری کو نظم کر کے تحسینِ خراج کے لیے خواص اور عوام کے رو برو پیش کر دیا۔ اس سے مومن کے کردار کی پختگی نمایاں ھو جاتی ھے، اس نے گناہ کیا اور اعتراف گناہ بھی کیا، عشق اس کی رگ و پے میں ساری تھا، جس حسین پر نظر پڑی دل دے بیٹھے۔ اس کا عقیدہ صلح کل تھا، اس کا جائزہ اس کے حلقۂ احباب سے کیا جا سکتا ھے، شیعہ، سنی، مقلد، غیر مقلد، ھندو سبھی اس کے دوست تھے۔ اس کی علم نجوم و رمل اور شاعری سے دل بستگی ظاھر کرتی ھے کہ وہ مذھب کے نمائندوں میں نہ تھا، اس کے احباب بھی آزاد مزاج اور رند مشرب تھے جو عشق و محبت کو جرم نہ سمجھتے تھے۔ اس کی رندانہ مشربی کا اندازہ ایک خاص واقعے سے لگایا جاسکتا ھے؛ کسی

محبوبہ نے ہنسی میں مومن پر پانی ڈالا ، مومن نے اس واقعہ کا اظہار فخریہ طور پر کیا ہے ، کہتے ہیں :-

رباعی

آتش دل زار میں لگائی اس نے برسوں جان حزیں جلائی اس نے
پھینکا مجھ پر ، کل اختلاطاً پانی بھڑکی ہوئی آگ کیا بجھائی اس نے

مومن ہے امید وصل بے جا تجھ کو کم فہمیٔ شوق نے ڈبویا تجھ کو
پانی پھینکا تو گرم جوشی نہ سمجھ ناداں دیا ہے اس نے یہ چھینٹا تجھ کو

پانی اس بت نے تجھ پہ پھینکا مومن احسان میں سر بسر ڈبویا مومن
ہے کشتِ امید ، سبز و خرم بارے ابر رحمت ، کچھ آج برسا مومن

کرتا ہے لگاوٹیں وہ رشکِ مہِ عید بے وجہ نہیں ہے جوشِ دریائے امید
پانی اس نے جو تجھ پہ پھینکا مومن تر دامنی وصال کی ہے یہ نوید

اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ مومن ستائش اور ملامت سے بے نیاز تھا ، وہ اپنے باپ کی زندگی میں بے باکانہ داد عیش دیتا رہا ، والدین اس کی رند مشربی سے با خبر تھے اسی لیے مومن کی شادی حکیم غلام نبی خاں نے اپنی حیات (وفات ۱۲۴۱ھ مطابق ۲۵ ، ۱۸۲۶ء) میں نہ کی۔ ایسے آزاد مشرب کو عقائد کی زنجیروں میں پابند کرنا صحیح نہیں ، ہاں ذاتی رجحان اور میلان طبع کا نام عقیدہ رکھ دیا جائے تو اور بات ہے۔ مومن کی زندگی میں جو دیوان طبع ہوا ، اس میں وہ رباعیاں نہیں ہیں جن میں مخالف نظریات کے اصحاب کو سخت اور سست کہا گیا ہے اور اسی وجہ سے ہماری نظر میں وہ رباعیاں الحاقی ہیں (یہ بحث تفصیل طلب ہے علاحدہ اس کی وضاحت ہوگی)۔

شراب نوشی

مثنوی چہارم ''تف آتشیں (۱۲۴۱ھ یا ۱۲۴۲ھ) میں اپنی خوشی اور نشاط کی حالت میں لکھتے ہیں :

سیرِ چمن میں روز گزاری ہم نفس دم باد بہاری
رود و شراب و صحبتِ یاراں رات کہ عیدِ بادہ گساراں

مومن کو کسی تذکرہ نگار نے مے خوار نہیں لکھا ہے لیکن جب کہ مومن خود ہی شراب اور رندی اور یارانِ بزم کا ذکر کرتے ہیں اور رات کو عید بادہ گساراں کہتے ہیں تو یہ مسئلہ قابل غور ہو جاتا ہے - کہا جاتا ہے کہ شاگرد رشید اور محب دلی شیفتہ بھی ابتدا میں مے خوار تھے تو یہ بات اور بھی اہمیت اختیار کر جاتی ہے - بہر حال یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ مے خوار تھے البتہ شعر مذکورہ بالا ضرور بیّن ثبوت فراہم کرتا ہے کہ انہوں نے بادہ گساری میں حصہ لیا ہے - آخر شاہ حاتم[1] بھی تو شراب خوار تھے اور بعد میں تائب ہوئے تھے ، سراج الدین علی خان آرزو[2] کی نسبت شراب نوشی کا الزام ہے ، عبدالحی تاباں تو دائم الخمری کی وجہ سے مشہور ہو گئے ، غالب نے بھی چونکہ ''بادہ خواری'' کا اقرار کیا اورعلانیہ پیتے تھے اور کہتے تھے -

ہوئی اس دور میں منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ جو جہاں میں جام جم نکلے

---

۱ - تذکرہ شعرائے اردو - از کریم الدین -

۲ - ترجمہ مخزن ازنکات محسن مخطوطہ رضا لائبریری رام پور — طرفہ یہ ہے کہ اس فضل و کمال پر ایسے شراب خور اور عیاش تھے کہ حضرت مرزا مظہر جان جاناں مظہر علیہ‌الرحمۃ فرماتے تھے کہ خون آرزو کو شب و روز عیاشی سے تو فرصت نہیں ، جائے حیرت یہ ہے کہ تصانیف کثیر کون سے وقت کرتا تھا - آخری عمر میں آرزو نے شراب خواری سے توبہ کی -

اسی بنا پر شراب خواری میں نام پیدا کیا؛ ممکن ہے کہ آئندہ کوئی کھلا ثبوت بھی مومن کی مے خواری کا مل جائے۔ ہاں دیوانِ فارسی میں ایک شراب خانے کی تاریخ مومن سے ملتی ہے جس سے تقویت ہوتی ہے کہ مومن اس میفروش سے روابط خصوصی رکھتے تھے ورنہ کہاں مومن اور کہاں شراب خانہ :-

تاریخ بنائے مے کدہ

خوش وقت رائے میکدۂ نو بنا نہاد   خوش وقت مے کشانِ بزندانِ شوق اسیر
من از خمار حسرت تاریخ پا بہ گلِ   اندیشہ رقصہا زدۂ مستانہ در ضمیر

مومن کے سفر

آب حیات (صفحہ ۴۱۶ طبع پانزدہم) میں ہے :

خان صاحب پانچ چار دفعہ دہلی سے باہر گئے، اول رام پور اور وہاں جا کر کہا :-

دلی سے رام پور میں لایا جنوں کا جوش   ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ویرانہ‌تر میں ہم

دوسری دفعہ سہسواں گئے وہاں فرماتے ہیں :-

چھوڑ دلی کو سہسواں آیا   ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں

جہانگیر آباد میں نواب مصطفیٰ خاں کے ساتھ کئی دفعہ گئے۔

ایک دفعہ نواب شائستہ خاں کے ساتھ سہارنپور گئے۔

حیات مومن میں (صفحہ ۵۷ و ۵۸) عرش کا بیان ہے :-

سفر۔ خان صاحب کا کوئی سفر تحصیل زر کے لیے نہیں ہوا بلکہ وہی جذبات عشق جب شدت پر تھے اور محرومیوں سے دل گھبرا گیا تھا تو گھر چھوڑ کے چند روز کے لیے نکلے تھے یہاں تک کہ رام پور، سہسواں،

بدایوں ، جہانگیر آباد ، ٹونک ، سہارنپور تک گئے ، مگر جی نہ بہلا تو بیرنگ واپس ہو گئے ۔ کسی کسی سفر کا ذکر کلیات میں بھی کیا ہے . . . سہسواں کا سفر صاحب جی کی تلاش میں تھا جس کا ثبوت دوسرے شعر سے ہوتا ہے :

چھوڑ دلی کو سہسواں آیا ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں
مجھے پہنچا دو میرے صاحب تک کہ غلام گریز پا ہوں میں

بدایوں میں مجھے جوش جنوں لایا ہے دلی سے
یہ کیوں کر چارہ پند خردمنداں ہوش آیا

ہاں آج یہ بتانا دشوار ہے کہ ان شہروں میں کس کس کے یہاں ٹھہرے، پھر بھی بعض مقامات کا پتا چلتا ہے جو درج کرتا ہوں :— رام پور میں نواب سعید احمد خاں (نواب محمد سعید خاں) کی مسند نشینی کے موقع پر بلائے گئے تھے، جہانگیر آباد میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کہ یہاں کہ ہم راز بھی تھے ، اکثر گئے ، سہسواں میں اپنے همراز دوست حکیم مظہر علی کے یہاں کہ وهاں کے رئیس تھے، تشریف لے گئے تھے، ان حکیم صاحب کے صاحبزادے حکیم منظر علی صاحب لشکر گوالیار میں وکیل ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ خان صاحب نے چند دن کے قیام میں اک تصنیف بھی کی تھی چنانچہ ذکر آگے آئے گا بقیہ راز سے وہ بے خبر ہیں ۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ گلشن بیخار (صفحہ ۱۹٦) میں عدم سفر کی شہادت دیتے ہیں :—

روز ولادت سے اب تک دلی اور دلّی والوں کی محبت کی وجہ سے کسی طرف حرکت نہ کی ۔ آب حیات کی روایت کو مدار ٹھہرا کر تذکرہ نویسوں نے مومن کے چار پانچ بار دهلی سے باهر جانا ظاهر کیا ہے ، عرش صاحب کی یہ روایت کہ صاحب جی کی تلاش میں سہسواں گئے ، صحیح نہیں ۔ مومن کی روایت ہے (صفحہ ۳۳۱) :—

وان چلی وہ تو یہاں جان چلی | ہاں چلی جاں کہ ہاں جان چلی
پاس رسوائی سے پھر جا نہ سکے | ہم رہ اہل سفر جا نہ سکے
گو نہ کی مرحلہ گردی ہم نے | لیک کی دشت نوردی ہم نے
پاس کا کوئی نہ چھوڑا صحرا | سیر کرتے رہے ، صحرا صحرا

عرش نے صاحب کی داستان میں کچھ ایسی رنگ آمیزی کی ہے جو لطیفے سے کم نہیں ۔ اسی سلسلے میں سنیے (صفحہ ۵۲ ، ۵۳ حیات مومن) :

کہ کے یہ اٹھ گئی جی کھوتی ہوئی | ہچکیاں لیتی ہوئی روتی ہوئی

ادھر صاحب جی کا ہٹنا تھا کہ مومن بھی روتے ہوئے گھر چلے آتے ہیں اور تھوڑی دیر بعد ان کو اپنے علم نجوم سے پتا لگتا ہے کہ وہ دلی سے روانہ ہوگئیں ، اب کدھر گئیں ، کیا ہوئیں ، اس راز کو مقدر کھلنے نہیں دیتا ، دل یہ تقاضہ (کذا) کر رہا ہے کہ بی بی لڑکوں کو چھوڑ اور گھر سے نکل ، ننگ و ناموس کا غم نہ کر، زمانہ جو چاہے کہے :-

بندۂ عشق شدی ترک نسب کن جامی
کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست

چنانچہ خاں صاحب نے شہر و بیابان کی خاک بھی چھانی اور ناکام ہو کے واپس بھی ہوگئے ۔ یہاں تک تو مثنوی سے پتا چلتا ہے مگر یہیں پر دو سوال بھی پیدا ہوتے ہیں :— (۱) صاحب جی اگر دہلی واپس نہ ہوئیں تو مومن نے ان کی غزلوں پر اصلاح کب دی جس کا ذکر شیفتہ نے کیا ہے ۔ (۲) اگر ان کا انتقال کرنا تسلیم نہیں کیا جاتا تو کلیات مومن میں یہ نوحے کیسے ہیں ، اس لیے کہ مومن کی بی بی کا انتقال مومن کے بہت بعد ہوا ۔ اب یہ کہ مومن کسی اور پر عاشق ہوئے اور اس کی موت کے یہ نوحے ہیں ، یہ محض تطویل لاطائل ہے ۔ عشق ہمیشہ آدمی کو ایک کا ہوا ہے اور ہوتا آیا ہے اس لیے اگرچہ مثنوی سے میں اس کا ثبوت نہیں دے سکتا مگر جیسا کہ سنا گیا قرین قیاس ہے کہ صاحب جی

دلی واپس آئیں اور یہیں ان کا انتقال ہوا - بہر حال جو کچھ بھی ہوا اس قصے نے میرے دیرینہ زخم کو تازہ کردیا ، میں خود اس زخم کی تکلیف سے آشنا ہوں. . . . .

عرش نے مومن کے بیان کو جھٹلا کر خود ساختہ روایت کر دی ہے ، ۱۲۳۶ھ میں صاحب سے محبت ہوئی اور ”قول غمین“ اس مثنوی کا تاریخی نام ہے ، اسی سال جدا ہوگئی، مومن کی دوسری شادی ۱۲۴۵ھ میں ہوئی جس سے احمد نصیر خاں ۱۲۴۷ھ میں پیدا ہوئے - اسی ایک لڑکے کا نام ہمیں معلوم ہے لیکن عرش نے بیوی لڑکوں کو چھوڑنے کی داستان تراش لی- مومن نے ترکیب بند بطور مرثیہ جو اپنی محبوبہ کے مرنے پر قلم بند کیا ، وہ صاحب کا نہیں- نسخہ دیوان مومن مخطوطہ نمبر ۵۶۴ میں شاہ عبدالعزیز صاحب کا قطعہ تاریخ وفات اور مومن کی دادی (۱۲۳۷ھ) اور والد (۱۲۴۱ھ) کے قطعات وفات اس نسخے کے متن میں نہیں حاشیے پر ہیں اور سید احمد شہید ۱۲۳۹ھ کا قطعۂ تعریف (۱۲۴۲ھ) نہ سہسواں والا قطعہ ہے اور نہ ترکیب بند بطور مرثیہ ہی اس نسخے میں ہے- دوسرے قلمی نسخے نمبر ۵۷۴ میں سہسواں والا قطعہ اور قطعۂ تاریخ شادی عباس علی خاں بےتاب (۱۲۴۴ھ) اور اول ، دوسری، تیسری اور چوتھی مثنوی تف آتشیں (۱۲۴۱ھ) شامل ہے، ترکیب بند شامل ہے ، قطعۂ تاریخ مسند نشینی نواب محمد سعید خاں بھی ہے لیکن سفر رام پور والی غزل دونوں نسخوں میں نہیں - اس سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ۱۲۴۲ھ تک کا کلام نسخہ نمبر ۵۶۴ میں شامل کر دیا گیا تھا اور نسخہ نمبر ۵۷۴ میں ۱۲۴۴ھ تک کا کلام شامل ہے یعنی قطعۂ تاریخ شادی عباس علی خاں بے تاب اور سہسواں سے متعلق قطعہ بھی اس میں شامل ہے اور مسند نشینی نواب محمد سعید خاں کا قطعہ ظاہر کرتا ہے کہ اس میں ۱۲۵۶ھ کا کلام بھی شامل کر لیا گیا ہے مگر سفر رام پور سے متعلق غزل شامل نہیں کی گئی اس لیے سفر بدایوں اور رام پور اول سفر نہیں کہا جا سکتا اس لیے انشائے فارسی کی روشنی میں پہلا سفر سردھنہ کا رہے گا - غالباً سفر تنہا سہسواں کا سفر نہ ہوگا

بلکہ راستے میں اور اہم مقامات پر بھی ٹھہرے ہوں گے لیکن کلام مومن سے ثبوت نہیں ملتا ۔

سفر سردھنہ ۱۲۴۲ھ

(۱) ۱۲۴۱ھ میں حکیم غلام نبی خاں کی حیات تک مومن کی شادی نہ ہو سکی تھی ، حکیم غلام نبی خاں اپنے بیٹے کے اطوار سے مطمئن نہ ہوں گے ، مومن نے اپنی آوارگی کی داستان فخریہ بیان کی ہے؛ ظاہر ہے کہ ایسے رند مشرب بیٹے کی ذمہ داری ایک خود دار اور باحمیت باپ نہیں لے سکتا تھا ۔ جب مومن کے والد دنیا سے چل بسے تو ماں کی محبت رنگ لائی اور سر دھنہ میں عظیم اللہ بیگ کمیدان (بیگم شمرو) کی دختر خوش اختر سے شادی کی سلسلۂ جنبانی ہوئی ۔ شیخ غلام ضامن کرم تخلص شاگرد مومن نے اس نسبت کی استواری میں اہم حصہ لیا ، شادی تو ہو گئی لیکں جلد ہی جدائی کی نوبت آ گئی ۔ مومن نے اپنے ایک فارسی خط میں سردھنہ کے سفر کا حال بڑے دلچسپ پیرایے میں قلمبند کیا ہے ، وہ لکھتے ہیں :

اتوار کی صبح کو میں دوست احباب کو چھوڑ با دل غمگیں اس طرح روانہ ہوا :

غزل

هر قدم همرهِ صد حسرت و حرماں رفتم
از وطن رفتم و افسوس که زیں ساں رفتم

یہاں تک کہ لب دریا پہنچے ، ٹوٹی پھوٹی کشتی آئی اور چند ہم جنسوں کے ساتھ دریا (غالباً جمنا) عبور کیا ، ایک ماہ جبین نظر آئی ، اس نے بھی آنکھ ملائی لیکن سنیچر سوار تھا اس لیے صحرا کی صورت دیکھنی پڑی ۔ کشتی سے اتر گھوڑے پر سوار ہو کر چلے لیکن گھوڑا چلنے کا نام نہ لیتا

تھا ، اس وقت کی حالت یہ تھی :

زہے سوار و زہے توسن و زہے رفتار
کہ یک دو گام ، نہ در سالہا تواں رفتن
سوار آنکہ بہر نیم گام می پرسد
ز ہمرہش کہ بگو تا کجا رفتن

مومن کہتے ہیں کہ میرے بار غم کی تاب نہیں رکھتا تھا اور قدم نہیں اٹھاتا تھا ، میں اپنی بہادری سے لیے جا رہا تھا ، بڑی عجلت کی تب کہیں غروب آفتاب تک تین فرسنگ کا فاصلہ طے کیا ، ایسی جگہ قیام کرنا پڑا جو وادیٔ مجنوں سے زیادہ ویران ، دوزخ سے زیادہ عذاب ناک، وہ مکان انتہائی تکلیف دہ ، دوزخی بھی اسے دیکھ کر گھبرا جائیں اور دوزخ کو جنت سمجھ لیں :

فتادم در بیابانِ بلا تا از وطن رفتم
اجل ہم کسے تواند آمدن آں جا کہ من رفتم

بہزار دشواری جب تاریکی دور ہوئی اور صبح نمودار ہوئی ، میں بھی اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر اس منحوس جگہ سے روانہ ہوا ، راستے میں سوائے کتوں اور سوروں کے اور کوئی نہ ملا ۔ صبح سے شام تک چلتا رہا ، آخر کہیں سورج غروب ہوتے وقت منزل مقصود کے قریب پہنچا ؛ عمارتیں نہایت کمزور اور شکستہ ، کتے حد سے زیادہ ۔ اب امیر کی بلند ایوانی کا حال سنیے اور اسی سے غربا کی سکونتی عمارات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر عمارت امیر کے برابر کوئی تیزی سے سخت لفظ ادا کرے تو عمارت کے کنگرے دھماکے کی آواز سے گر پڑیں اور ایسی سست بنیاد ہے کہ اگر دیوار پر انگلی سے لفظ گراں لکھو تو صفحۂ ہستی سے مٹ جائے ۔ عمارت نئی ہونے کے باوجود شکستہ ، اس کے دروازے عبرت ریز ، دیواروں کی سپیدی اور نقش و نگار کا بیان کیا ہو ، حجرے مسکن وحوش و طیور ،

اسی سے میری حالت کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ میرے رات اور دن کیسے گذرے ہوں گے۔ . . میں نے ترک سکونت دھلی نہ کی ہے، سردھنہ کی سکونت کا کیا سوال، کہیں شہری بھی دیہاتی زندگی کو پسند کر سکتا ہے، کہیں مرغ چمن بھی چمن کو چھوڑ کر خزاں زدہ بیابان میں آشیانہ بنا سکتا ہے۔ دو تین مہینے میں نے جو نالائقوں کے ساتھ گذارے، سوا مذمت اور نفرین بات نہ سنی۔

کرم کے اسمی رقعات سے اندزہ یہی ہوتا ہے کہ آخر ۱۲۴۱ھ میں یا آغاز ۱۲۴۲ھ میں مومن بسلسلۂ نکاح سردھنہ گئے اور دو تین ماہ قیام اور پھر خفا ہو کر چلے آئے اور کرم کے بلانے پر تفصیلی شکایتی خطوط لکھے۔

۲۔ سفر فیروز پور جھرکا اور ملازمت اسی سلسلے کا ایک خط آور ہے جس سے ختم ملازمت کا حال معلوم ہوتا ہے، ملاحظہ ہو:—

از سہ ماہ بے التفاتی و سرگردانی و کمی عنایات و فزونی نامہربانی با ایں سادہ دل بہ منصۂ ظہور رسید، چندے بہ تقاضائے صاف دلی و آئینہ باطنی غبار اوہام بے جا بباد دادم، و اغماض و اعراض را بے تکلفی و معاملت خاص نام نہادہ۔ رفتہ رفتہ گماں بہ ظن و ظن بپایۂ یقین رسید، آں زماں از خواب غفلت بیدار شدم——ترکِ وطن و اختیار سکونتِ غربت دلیلِ قاطع و دویمی سپاس داری و شکر گزاری علیل نہاداں حجتِ ساطع، آمدیم بر حرف طمع، یجائے ایں جا بے جا، عالم الغیب و دانائے اسرار گواہ است ''و کفیٰ باللہ شہیدا'' کہ ایں چنیں خیالِ خام در خواب ہم بخلوت خانۂ دلم راہ نیافتہ، تابزبان چہ رسد و اگر طینتِ اھل زمانہ کہ بالکلیہ مگس طینت اند بودمے رفاقتِ آقائے قدیم را بہ پاسِ نعمتِ صحبت سراسر تعلیم کہ یارِ خطیر عنایت می فرمود، خیرباد نگفتمے، و اگر گمانِ عدم ازالۂ مرض کنم، نسبت سودائے سرشار بخویشتن کردہ باشم، و تقلید آخر حالِ فاریابی واجب دانستہ، زیرا کہ فنائے ہر شیٔ باختیار

واجب الوجود حکیم مطلق است و معنئی حذاقت آں کہ خطا در رائے کمتر افتد نہ ایں کہ خونِ ملک الموت بر گردن باشد و تلف کارخانہ بحیطۂ تصرفش بود ، اگر کسے بالفرض لقمانِ روزگار است بہ ادائے (کذا) وہمِ مفرط ناچار است و اگر ہمہ افلاطونِ زمانہ بہ تدبیرِ جہلِ مرکب بیکار ، بہ دعوئے عیسیٰ نفسی لب کشادہ ام و کجا لافِ جان بخشی دادہ ، فی الجملہ موجب ملالِ خاطر صفا جو ، و بے تمیزی و نالایقی ایں ، ہیچ مداں است ، و دریں صورت خدمت گزاری و پاسداریٔ ہر گونہ رائگاں ۔

رقعہ مندرجہ بالا کا سلسلہ اول خط سے مل جاتا ہے ، اس پر گمان غالب یہ ہے کہ یہ خط بھی نواب شمس الدین کے نام لکھا گیا ہے اور قرائن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ مومن کا یہ خط اپنے بارے میں ہے اس لیے مومن کا دوسرا سفر ۱۲۴۳ھ اور ۱۲۵۱ھ کے مابین جھجر کا ہوا اور قرینہ یہی چاہتا ہے کہ حکیم احسن اللہ خاں کے ترک ملازمت ۱۸۲۷ء مطابق ۱۲۴۲ھ کے بعد مومن کا سلسلۂ ملازمت ۱۲۴۳ھ میں قائم ہوا ہو اور دو تین ماہ بعد اختلاف کے باعث مومن نے ملازمت چھوڑ دی ہو اس لیے فیروز پور جھرکا کا سفر دوسرا قرار پائے گا ۔

سفرسوم مومن کے فارسی رقعات میں ایک رقعہ بنام نواب ملتا ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خط فیروز پور سے جھجر آیا اور وہاں سے دھلی ۔ فیروز پور جھرکا کی نسبت مولانا بشیر الدین احمد دھلوی مصنف واقعات دارالحکومت دھلی (حصہ دوم صفحہ ۲۳۹) کا بیان ہے :۔نواب احمد بخش خان کمانڈر انچیف موصوف (لارڈ لیک) کے ساتھ اکثر معرکوں میں شریک رہے اور آن کی شجاعانہ کارروائی اور اعلیٰ خدمات خصوصاً معاملۂ عہد نامۂ الور کے صلے میں ضلع فیروز پور میں پانچ محال کی جاگیر مع سند عطا ہوئی ۔ مرزا احمد بخش خان کو خطاب فخرالدولہ دلاورالملک رستم جنگ بھی عطا ہوا تھا ۔ انھوں نے ۱۸۲۷ء میں انتقال کیا اور قطب مینار دھلی

کے قریب مدفون ہوئے۔ اُن کے بعد اُن کے بیٹے نواب شمس الدین احمد خان اُن کے جانشین ہوئے مگر بد قسمتی سے فیروز پور والی جاگیر ضبط ہو گئی، صرف لوہارو جو راجہ صاحب الور کی طرف سے ملا تھا، اس خاندان کے قبضے میں رہ گیا، وہ لاولد فوت ہوئے (صفحہ ۹۳ح، نواب صاحب بے طور دھر لیے گئے، ان پر مقدمہ قائم ہوا، تحقیقات ہوئی، ان کی اشتعالک سے فریزر صاحب کا مارا جانا ثابت ہوا اور ۱۰ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو ان کو کشمیری دروازہ کے باہر پھانسی دی گئی)۔

نواب احمد بخش خاں کے طبیب خاص حکیم احسن اللہ خاں اوائل میں تھے، ان کے مرنے پر ملازمت چھوڑ دی تو نواب فیض احمد خاں والیٔ جھجر نے بلا کر طبیب خاص بنا لیا اور جھجر میں ۱۲۵۱ھ تک یعنی حیات نواب فیض محمد خاں تک طبیب خاص رہے، پھر حکیم احسن اللہ خاں اکبر ثانی اور آخر میں بہادر شاہ ظفر کے شاہی طبیب تھے۔

قیاساً مومن کے نام یہ خط نواب شمس الدین صاحب والیٔ فیروز پور کی طرف سے آیا تھا اور اس میں مومن سے تیتروں کی فراہمی کی فرمائش کی گئی ہے، ساتھ ہی دس روپے رقم خرید بھی ارسال کیے ہیں۔ مومن شکایت کے طور پر لکھتے ہیں:—

رقعہ به موقف عرض عاکفانِ آستانِ جاه و جلال نواب فلک جناب قبله و کعبۂ نیاز کیشاں عقیدت است، مہر سپہر حشمت و نام آوری، اختر برج عنایت و ذره پروری دام حشمته می رساند نامه که نگاشتۂ قلم نوازش رقم و مکتوبے که ریختۂ خامۂ گوهر باربود، از فیروز پور به جهجر و از جهجر به جهاں آباد ورود نمود، سرفرازنه در اماثل و اقران بل از امرائے بلند مکان فرمودند۔ حیرت تاب سوز است که صفت خوش اسلوبی نظر نواز سر کنم، یا مدیح متانت عبارت پروری مضمون طراز رقم زنم . . . فرمان رفته که مشت پر دراج جنگی ارسالِ محفلِ گرامی نمایم و ازیں نسبت به پرواز

خویشتن ستائی در آیم هم مبلغ زر ده پول سفید بہائے آں ارسال فرمودند و صد گونه از بے سرمایگی محو انفعال ، المنة للہ که از عوارض و علل به وطن رسیده بودم و به بستر واماندگی دراز کشیده ورنه اگر زر مرسوله بدست فتاد سے ، چه داغہا که بر سینه نه نہادسے ، اگرچه اکنوں هم چہره از تغیر رنگ سینه باز است و چشم از مژگاں منفعل ،... فی‌الجمله دام جستجو ها انداختم صید مطلب بدست نیفتاده و به کمین تگاپو پرداختم - طائر مقصد رو بدام و دانه ننہاده و به جهجر و کانونڈ نگاشته ام دانم زودتر می رسد و می رسانم لا جرم تا فرستادن و منت بر خود نہادن گوهر دعا می فشانم ، یا رب طائر هر گونه مدعا اسیر دام حشمت و اقبال باد - رقعه ۳ صفحات ۱۳۱، ۱۳۲ ، انشائے مومن مطبوعه مطبع سلطانی ۱۲۷۱ھ -

تیسرا سفر رام پور (۱) بدایوں (۲) سہسواں قبل ۱۲۵۰ھ

نواب محمد سعید خاں ، عبدالعلی خاں ، عبداللہ خاں، حفیظ‌اللہ خاں، عبدالرحمٰن خاں اخلاف نواب غلام محمد خاں جنگ دو جوڑہ (۱۲۰۹ھ) کے بعد کچھ دنوں بنارس رہے اور پھر دھلی آ گئے اور محلہ روشن پورہ[1] میں مقیم ہوئے- یہیں ۱۸۱۶ء میں نواب یوسف علی خاں خلف محمد سعید خاں پیدا ہوئے ، نواب عبداللہ خاں[2] مین‌پوری اور میرٹھ میں صدر الصدور رہے اور نواب عبدالرحمٰن خاں[3] گوڑ گانوہ میں ڈپٹی کلکٹر ہو گئے تھے - نواب محمد سعید خاں وغیرہ کی نسبت سیر کریمی میں ہے کہ ۱۴ ربیع الاول ۱۲۴۰ھ عبداللہ خاں ، حفیظ اللہ خاں ، عبدالرحمٰن صاحب اخلاف نواب غلام محمد خاں بنارس سے دھلی روانہ ہوئے ، اسی میں ہے کہ ۵ ربیع‌الاول ۱۲۴۲ھ کو محمد سعید خاں بنارس آئے اور دو تین دن رہ کر کانپور گئے، وہاں سے اپنے گھر لکھنؤ کو جائیں گے اور دو تین روز لکھنؤ ٹھہر کر بریلی روانہ ہو کر نادون جائیں گے -

---

۱ - رام پور اور داغ - (محمد علی خاں، اثر)، داغ نمبر نگار ۵۳ء- ۲- آب حیات -
۳ - مقدمہ دیوان حسرتی از مولانا احیدالدین نظامی بدایونی -

اس سے واضح ہے کہ ۱۲۴۰ھ میں محمد سعید خاں دھلی تھے اور ۱۲۴۲ھ میں لکھنؤ آ گئے تھے اور بقول محمد علی خاں اثر (صفحہ ۴۴ نگار جنوری فروری ۱۹۵۳ء داغ نمبر) نصیر الدین حیدر کے کسی کام سے لکھنؤ سے کلکتے گئے اور گورنر جنرل سے اپنی پریشانی ظاھر کی ، انھوں نے بدایوں میں ڈپٹی کلکٹر کر دیا - عہد نصیر الدین حیدر از ۲۷ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ (۱۹ اکتوبر ۱۸۲۷ء) یعنی ۲۷ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ کے بعد نواب محمد سعید خاں نے ڈپٹی کلکٹری قبول کی لیکن دیگر اعزا بدستور آزاد رہے اور ۱۲۵۶ھ کے وسط تک وھاں مقیم رہے- اس سے یہ ھم نتیجہ نکالتے ھیں کہ بدایوں اور سہسواں کا سفر نواب محمد سعید خاں کی ڈپٹی کلکٹری کے عہد میں ھوا - نسخہ دیوان مومن نمبر ۴۵۷ میں سہسوں کا قطعہ شامل ھے اس لیے ھم ۱۲۴۳ھ اور ۱۲۵۶ھ کے درمیان اس سفر کو متعین کر سکتے ھیں - نواب محمد سعید خاں کے فرزند یوسف علی خاں ناظم شاعری میں موسن کے شاگرد تھے ، عباس علی خاں بیتاب نواب کے حقیقی بھتیجے تھے اور موسن کے خصوصی شاگرد اس لیے خود نواب محمد سعید خاں کے موسن سے تعلقات ھونا ظاھر ھیں ، اس لیے شاگردوں کے اصرار پر بدایوں کا سفر ھوا[1] ، اس سفر کا حصر ۱۲۵۰ھ اور ۱۲۵۶ھ کے درمیان کیا جا سکتا ھے ، اگر شیفتہ کی یہ روایت (گلشن بے خار) تسلیم کر لیں کہ اب تک دلی سے باھر کا سفر نہیں کیا ھے - گلشن بے خار کا سال آغاز ۱۲۴۸ھ ھے ، اگر موسن کا حال ۱۲۴۸ھ میں شامل کیا گیا ھے تو ھم ۱۲۴۸ء اور ۱۲۵۶ھ کے

۱- حکیم غلام نجف خاں ابن حافظ محمد مسیح الدین ساکن شیخوپور مضاف بدایوں کے بارے میں سرسید آثارالصنادید (صفحہ ۶۱) میں لکھتے ھیں :- پانچ برس کی عمر میں دھلی آئے، طب حکیم صادق علی خاں سے تحصیل کی اور مشق نسخہ نویسی اور معالجۂ مرض کی حاذق الملک حکیم احسن اللہ خان کی خدمت میں بہم پہنچائی- حاذق الملک سے قرابت قریبہ ہے، اس سے ظاھر ھے کہ حکیم غلام نجف خاں بدایونی موسن کے بھی رشتہ دار تھے اس لیے ضلع بدایوں میں ان کا سفر قرابت کی وجہ سے بھی ھو سکتا ھے -

درمیان اس سفر کو محدود کر سکتے ہیں ، یہ شعر اسی سفر کا ہے :—

بدایوں میں مجھے جوشِ جنوں لایا ہے دلی سے
یہ کیوں کر چارۂ پندِ خردمندانِ ہوش آیا

سہسواں بدایوں کا علاقہ ہے اس کا قطعہ یہ ہے :—

صاحبو میرا حال مت پوچھو | بندۂ سخت بے وفا ہوں میں
چھوڑ دلی کو سہسواں آیا | ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں
اک خداوندِ شوخ کے غم میں | قابلِ رحم ہو گیا ہوں میں
مجھے پہنچا دو میرے صاحب تک | کہ غلام گریزپا ہوں میں
عذر بے جا ہے سرکشی کے لیے | شاکیٔ بے سبب جفا ہو میں

اس سے شبہ ہوتا ہے کہ صاحب سے مراد امۃ الفاطمہ نہ ہو اور مومن نے اُس کی روانگی لکھنؤ پر ۱۲۳۶ھ میں یہ سفر کیا ہو لیکن اس وقت مومن کے والد زندہ تھے اور محبوبہ کی جستجو میں یہ سفر خطرناک جسارت تھی ، پھر سفر بدایوں کا نہ ہوتا بلکہ وہ لکھنؤ کا سفر ہوتا۔ سفر بدایوں کے بعد رام پور کے نواب احمد علی خاں کا انتقال ہوا اور اُن کی ایک لڑکی یاد گار رہی ، نواب محمد سعید خاں بدایوں میں ڈپٹی کلکٹر تھے ، کوشش سے ریاست محمد سعید خاں کو مل گئی ، تخت نشینی ۲۱ جمادی الآخر ۱۲۵۶ھ (۲۰ اگست ۱۸۴۰ء) کو عمل میں آئی ، نواب محمد سعید خاں نے اپنے احباب اور شناسا حضرات کو ریاست میں دعوت دی ، غالباً مبارک باد کے سلسلے میں مومن بھی رام پور آئے ، مومن کا قطعۂ مبارک بادی شامل کلیات اردو ہے :

رام پور اک زمانِ ممتد سے | تیرے مقدم کا تھا تمنائی
جب پذیرا ہوئی دعائے دیار | اے سراپا قبول والائی
یعنی اس ملک کے نصیب کھلے | تیرے قدموں پہ کی جبیں سائی
میں ہوا گرم فکر سال جلوس | ناگہاں غیب سے صدا آئی

که محمد سعید خاں کو ملی ورثۃً صدر کار آبائی
اس وسادہ پہ تجھ کو بٹھلا کر میں نے تاریخ کی روش پائی

مومن نے سفر رام پور سے متعلق جو غزل لکھی ہے، اس غزل کا ایک شعر گلشن بے خار میں موجود ہے :-

وصل بتاں کے دن تو نہیں یہ کہ ہو وبال
مومن نماز قصر کریں کیوں سفر میں ہم

اگر یہ شعر ۱۲۵۰ھ تالیف تذکرہ کے بعد شامل نہیں کیا گیا ہے جس کا بظاہر ثبوت نہیں تو سفر رام پور ۱۲۵۰ھ میں یا اس سے قبل ثابت ہوتا ہے اور یہ اہم ترین ثبوت اس امر کا ہے کہ سہسوان، بدایوں اور رام پور کا پہلا سفر ۱۲۵۰ھ سے قبل ہوا البتہ دوسرا سفر رام پور کا شیفتہ کے ہمراہ ۱۲۵۶ھ میں ہو سکتا ہے۔ نواب محمد سعید خاں کی تخت نشینی پر تہنیت کے لیے شیفتہ کا رام پور جانا محقق ہے، مومن کا قطعہ اس پر دال ہے۔

دوسرے سفر اہم نہیں، دھلی کے نواحی علاقے میں مومن نے ضرور گشت کی، چنانچہ جھجر کے سفر کا ذکر فارسی رقعات میں ہے۔ غالباً والئ جھجر سے بھی مومن کو توسل ہو، اُن کی جاگیر نارنول میں تھی اور نارنول کا علاقہ کمپنی نے بصلۂ حسن خدمات نجابت علی خاں کو دے دیا، (۱۸۰۴ء) مومن کی خاندانی جاگیر کے دیہات ضبط ہو گئے اور اس کے عوض میں پنشن سالانہ طے پائی۔ یہ پنشن جھجر کے خزانے سے مومن کے والد اور چچا پاتے رہے، مومن نے بھی حصہ پایا۔ نواب فیض محمد خاں دریا دل رئیس تھے، جب مولوی فضل حق خیر آبادی نے کمپنی کی ملازمت چھوڑی تو نواب فیض محمد خاں نے پانسو روپیہ ماہانہ پر جھجر میں بلا لیا۔ حکیم احسن اللہ خاں طبیب خاص تھے اس لیے جھجر کا سفر چنداں اہمیت نہیں رکھتا۔ بلند شہر میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی ریاست جہانگیر آباد تھی، وہاں آمد و رفت ضرور ہوگی اسی لیے

مومن کے کلام میں اس کا ذکر نہیں ملتا ۔ ایسے سہارنپور کے سفر کا ہے ، یہ مقامات مومن نے دیکھے لیکن ان سفروں سے متعلق کوئی علمی و شعری سرگذشت وابستہ نہیں ۔

سیاسیات

مومن وسیع النظر تھے ، غیر ملکی اقتدار کو کبھی بھی پسند نہیں کیا [۱] ، دھلی میں انگریزی حکومت کا تسلط مومن کی ولادت کے تین سال بعد ہوا لیکن انھیں انگریزی اقتدار مطلقاً گوارا نہ تھا ، چنانچہ ۱۲۳۹ھ کے متصل وہ اپنے چچا کے نام خط لکھتے ہیں ، اس میں حکیم غلام حسن کے تہیۂ ہجرت حرمین الشریفین کا عزم و التوا کا ذکر کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں :-

چوں دریں دیار خراب کہ بدست کفرۂ ، جاھل ، بے قدر افتادہ ، قدرشریف و نجیب حکم کیمیاگرفت ، دولت و اقبال ترجمہ عنقا شد ۔ صواب دید خاطراست اگر دراں جامطلب گرہ کشود نیکوتر ، ورنہ عزم آں دیارھم بہ دل می خلد کہ بسیار کس قدر دانیٔ راجہ چندو لال بہادر ، بہ ارباب کمال سیما شعرا ، وانمودہ‌اند ، و ایں ھیچمداں را بوئے ازیں گلزار بہ دماغ اندیشہ رسیدہ بالجملہ اگر خواستہ باری تعالیٰ است بہ دولت قدم بوس سرمایہ اندوز ، می شوم ۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ مومن انگریزوں کے اقتدار سے نفرت کرتے تھے چنانچہ افغانستان پر قبضے کے سلسلے میں جو انگریزوں نے قدم اٹھایا ،

---

۱ - حکومت انگلستان انھیں بالکل پسند نہ تھی اور ان کی وارستگیٔ مزاج کا مقتضا بھی یہی تھا - چنانچہ عرفی کے قصیدے پر ایک قصیدہ اسی مضمون کا لکھا ہے جس کے چند اشعار نقل ہیں :-

ایں عیسویاں بلب رساندند جان من و جان آفرینش

(حسرت موھانی صفحات ۱۳، ۱۴ آردوئے معلیٰ جلد ۵ ، ۴ مئی ۱۹۰۵ء)

اور شاہ شجاع کو بر سر اقتدار لانے میں کافی امداد دی لیکن یہ تمام کارروائیاں افغان مجاھدوں نے باطل کر دیں اور ۶ جنوری ۱۸۴۲ء (کمپنی کی حکومت از باری صفحہ ۳۲۵ و مختصر تاریخ اسلام نمبر ۱ صفحہ ۹۱ - از ذاکرحسن) (مطابق ذی‌القعدہ ۱۲۵۷ھ) کو انگریزی قافلہ کابل سے جلال آباد چلا اور راستے میں یہ قافلہ تباہ کر دیا گیا ، مومن ایسٹ انڈیا کمپنی کی رعایا ہونے کے باوجود مجاھدین کے اس فعل سے مسرور ہو کر قطعۂ تاریخ کہتے ھیں :-

زبس کافرانِ ھزیمت نصیب[1]   بہ ارباب ایماں ، در آویختند
کہ نصر[6] من اللہ فتح[6] قریب   بر آورد، سر، مومنِ ما و گفت

۳۰—   ۱۶۹۶ھ   =۱۲۵۶ھ

مولانا محمد اسحاق صاحب نے ھندوستان کو دارالحرب سمجھ کر حرم کعبہ کا عزم کیا تو مومن نے اس اھم واقعے کی صحیح تاریخ لکھ کر تائید کی ، قطعے میں انگریزوں کو کافروں سے خطاب کیا ھے ، اس سے اُن کی دلی نفرت کا اندازہ ھو سکتا ھے (از دیوان مومن فارسی مخطوطہ رضا لائبریری ، رام پور) :-

آں منبئ دین و جان اسلام   عرفان مصور و مجسم
از کشورِ ھند رخت بربست   بیزار ز کافرانِ اظلم
اندیشۂ سالِ ھجرت او   بر چرخ مہاجر و مکرم
ھم چشم مقربانِ حق بیں   ھمراز فرشتگانِ محرم

---

۱ - بخواری ز کابل ، بروں آمدند   چوں کفار ملعون ، ذلت قریں
ز روئے یورش ، سال تاریخ فتح   ملک گفت فضل علی المومنین

+۱۶   ۱۲۳۸=۱۲۵۴ھ

نوٹ :- قطعہ اول سے ۱۲۵۶ھ اور قطعہ ثانی سے ۱۲۵۴ھ بر آمد ھوتے ھیں ، بظاھر دونوں قطعے ایک ھی واقعے سے متعلق ھیں جو ذی‌قعدہ ۱۲۵۷ھ (۶ جنوری ۱۸۴۲ء) کو پیش آیا -

فرمود ، وحید عصر ، اسحاق بر حکمِ شہنشہِ دو عالم
بگذاشتہ دارِ حرب امسال جا کردہ ، بہ مکۂ معظمم

اسی طرح وہ سید احمد شہید کی تحریک جہاد کے حامی تھے جو غیر اسلامی قوتوں کو ملک سے بے دخل کرنے کے سلسلے میں چلائی گئی تھی ، آغاز میں وہ سید احمد شہید کو امیرالمومنین سے مخاطب کرتے ہیں اور انھیں مہدی قرار دیتے ہیں ، قطعۂ تاریخ (صفحہ ۱۸۳ کلیات مومن) یہ ہے :-

جو سید احمد امام و اھل زماں کرے ملاحد بے دین سے ارادۂ جنگ
تو کیوں نہ صفحۂ عالم پہ لکھے سال وغا خروج مہدی کفارسوز، کلک تفنگ

اسی سلسلے کا دوسرا قطعہ ہے جس میں سید احمد شہید (صفحہ ۱۸۴ کلیات مومن) کی تعریف کی گئی ہے اور آخر شعر سے تاریخ ۱۲۴۲ھ برآمد ہوتی ہے :-

وہ شاہِ مملکتِ ایماں کہ جس کا سال خروج امام برحقِ مہدی نشاں ، علی فرہے
۱۲۴۲ھ

ایک رباعی سے شوق جہاد کا اظہار ہوتا ہے :-

مومن تمھیں کچھ بھی ہے جو پاسِ ایماں ہے معرکۂ جہاد ، چل دیجے وہاں
انصاف کرو ، خدا سے رکھتے ہو عزیز وہ جان جسے کرتے تھے بتوں پر قرباں

مثنوی جہادیہ میں تمام مسلمانوں کو سکھوں کے خلاف جہاد میں حصہ لینے کی دعوت دیتے ہیں ، خود بھی تمنائے شہادت کرتے ہیں :-

الٰہی مجھے بھی شہادت نصیب یہ افضل سے افضل ، عبادت نصیب
میں گنجِ شہیداں میں مسرور ہوں اسی فوج کے ساتھ محشور ہوں
(صفحہ ۳۱۹ کلیات مومن)

مقامی سیاسیات سے بھی ان کو دلچسپی تھی : بہادر شاہ ۳۰ دسمبر ۱۸۳۷ء (۲۹ جمادی الثانی ۱۲۵۳ھ) کو سنیچر کے دن تخت نشیں ہوئے ، (صفحات ۴۸ و ۶۳ بہادر شاہ ظفر ، از امیر احمد علوی) اس عرصے میں میرزا مغل بیگ نے جو علاوہ کم علم اور کم شعور ہونے کے خائن بھی تھے ،

بعض بیش قیمت جواہرات شاہی میں تغلب کیا ، راز فاش ہو گیا اور قلعے سے نکالے گئے - اس میرزا مغل بیگ کی نسبت مومن اس طرح اظہار کرتے ہیں :

تاریخ وزارت مرزا مغل بیگ

بو ظفر نام میرزا امسال کارش افتادہ ، با کلاہ و سریر
بود از از خان مانش نمباحی تار و پودش ز خطۂ کشمیر
بہر آزار مردمِ قلعہ با چنیں نا کسیش کرد وزیر
سالِ تاریخِ او ہمی جستم روح سعدی نمود خوش تقریر

———

بوریا باف ، گرچہ بافندہ است کے برندش بہ کارگاہِ حریر
(۱۲۵۳ھ)

اسی طرح قلعے کی اندرونی سیاست کا ایک قطعے میں بیان کرتے ہیں :

شہ خواست پائمال کند قوم خویش را
تف ، بر صواب دید وزیرانِ بد گہر
برخاست تازہ فتنہ ، ز خیلِ ستم کشاں
یاری نکرد چشم ستم گار فتنہ گر
ناگہ یکے شدند و رسیدند فوج فوج
شہزادگان پاک نہاد و نکو سیر
زاری اثر نہ داشت ، بہ دلہائے ہمچو سنگ
بردند ، از خزانۂ شاہی ، بزور ، زر
بر رو طپانچہ خوردہ ، چو دینارِ سکہ زن
ہمچوں ، درم خزیدہ بہ صندوق گنجور
تاریخ ایں معاملہ ، خود گفتہ اند ، شاں
بے کس - دریں زماں شدہ ، سلطان ابو ظفر

۸۰ ۱۳۳۹ھ = ۱۲۵۹ھ

اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ لال قلعے کی عظمت کا بت توڑ چکے تھے ، بہادر شاہ ظفر ان کی نظر میں ایک بے حقیقت مجبور انسان تھا جس میں کوئی خوبی نہ تھی - مفتی صدر الدین آزردہ کی نسبت جس طرح روایت ہے کہ انھوں نے بہادر شاہ ظفر کو سلام کرنا چھوڑ دیا تھا اسی طرح مومن کی نظر میں بھی ظفر کی نام نہاد شاہی صرف ڈھونگ ہی ڈھونگ تھا ، مومن نے ایک قطعہ ظفر کی طرف سے مدحیہ اشعار کی تمنا پر کیا -

بادشاہا ، بایں متاعِ قلیل مدح از چوں منے چرا خواہی

— — — — —

صلۂ شعر نیست تشریفے کہ نیرزد ، بہر کجا خواہی
بے ثنا چوں گرفتہ ام ، صد بار ہمچو گویم ، اگر ثنا خواہی
دیگراں دیگر اند و من دیگر ہرچہ از بوم ، از ہما خواہی

شادی

پہلی شادی | مومن آوارۂ کوئے محبت تھے ، آخر رفتہ رفتہ محبوباؤں کی بے وفائی سے کچھ تنگ آ گئے - شیخ غلام ضامن جو عمر میں مومن سے بڑے تھے لیکن فن شاعری میں زانوئے تلمذ تہ کرتے تھے ، انھوں نے سردھنہ کے مغل خاندان کی کسی حسینہ کا ذکر کیا ، یہ وہ زمانہ تھا جب مومن کے والد حکیم غلام نبی خان ۱۲۴۱ھ میں مر چکے تھے اور مومن کو کامل آزادی مل گئی تھی ؛ چنانچہ سردھنہ ضلع میرٹھ میں مومن پہنچے ، ابتدائی مراحل نکاح کے طے ہوئے اور شادی کی رسم ادا ہوگئی- اس سفر کی روئیداد غلام ضامن کرم کے نام ایک خط میں ملتی ہے ، آغاز اس طرح ہے- (صفحہ ۴۲ تا ۵۰ انشائے فارسی - مطبوعہ مطبع سلطانی ۱۲۷۱ھ پنجاب یونیورسٹی)-

ہر قدم ہم رہ صد حسرت و حرماں رفتم
از وطن رفتم و افسوس کہ زی ساں رفتم

القصہ سفینہ شکستہ تر از دلم آوردند ، و باہم جنسے چند ہم مجلسم کردند ، چوں رخت بساحل کشیدم ، زہرہ جبینے ، در برج ثور طالع دیدم (صفحہ ۴۷) او ہم بہ نظر تثلیثم دید، اما کیواں کہ بہ طالعم بود ، نظر مقابلہ نہ دزدید ، طوعاً و کرھاً بصحرا فتادم و زبان یاس بہ ورد ایں شعر کشادم ، بیت :

خواہم کہ رخ زہرہ جبیں باز بہ بینم
امّا چہ کنم ، او بہ فلک ، من بزمینم

اسپم از بس تاب بارِ غمہائے نداشت ، ہر قدم کہ می نہاد ، نمی توانست برداشت ، بپامردیٔ خویش می بردم ، و بجائے طعم ، غم مرگ مفاجاتش می خوردم ، بہر گاہے می ایستاد، تافرود نمی آمدم، گاہے دیگر نمی نہاد، بخار زارے کہ راہ سر کردم قدمے سوار و قدمے پیادہ گذر کردم ، المنۃللہ کہ ہیچ کسم دو چار نشد، آوازۂ خرابیم کوئے و بازار ... (صفحہ ۴۸) از بس بدرنگ رفتم ، تا اوہم سوار فلکِ چارم بمنزل مغرب رسید ، سہ فرسنگ بہ قصبہ خراب تر از وادیٔ مجنوں رسیدم و دراں مکان بہ دکانے وا کشیدم اعوذباللہ مسکنے کہ اگر دوزخیاں معائنہ نمایند بہ تکذیبِ وعید خدا زبان صدق بیان بر کشایند... (صفحہ ۴۹) و ازاں وادیٔ ناپاک در گذشتم ... و پس از قطع منازل فرسنگے منزل مقصود یافتم ، سست بنیادے کہ پامالش برفتارپشۂصورت پذیرد، وحشت آبادے کہ باثرخیالش خرام مور، برم (صفحہ ۵۰) آہو آہو گرد سیاحانِ جہان بطریق مکافات ناصواب ہم دراں پا نگزارند ، و کرم سران آسماں از فرط کلاب تمنائے تماشایش ہم چناں در دل دارند، بر زمیں کہ قدمم فتاد پیک جنوں بپایم بوسہ داد ، اگر بخت بر گشتہ بدیں خراب آبادم نیاوردے سوگند پایم مجنوں ورد نکردے ۔ مثنوی (نسخہ مخطوطہ رضا لائبریری انشائے فارسی) ۔

حدیث مشکوئے امیر باید شنید و حال اماکن غربا را ازیں جا تواں فہمید ، حباب اساس مکانے کہ اگر بتقریبے حرف سنگیں در قرب و جوارش

مبہم زنند، کنگرہ پائش از صدمۂ ہوائے آواز بریزد ، ... ابوابش چوں ابواب تحفۂ اثنا عشریہ بہ عبرت ریز ، و ارکانش مانند ارکان ابیاتم ہمہ جنوں خیز ، سپیدیٔ دیوار پایش سپیدۂ صبح شب وصال . . . .

رقعۂ مذکورہ بالا سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مومن نے ایک زہرہ جبین کو دیکھا ، یہ مقام دو رے رقعے سے واضح ہو جاتا ہے۔ قصبہ سردھنہ کمشنری میرٹھ ، صوبۂ ممالک متحدہ آگرہ و اودھ میں ہے - مومن نے دھلی سے سفر آغاز کیا ، پہلے کشتی میں سوار ہوئے اور پھر گھوڑے کی سواری ملی لیکن گھوڑا ، سودا کے شہر آشوب والا گھوڑا تھا ، جس پر سوار ہونا ممکن نہ تھا بلکہ اسے بغل میں دبانے کی ضرورت تھی - قصبۂ سردھنہ کی ویرانی کا جو نقشہ مومن نے کھینچا ہے، وہ قابل ملاحظہ ہے حقیقتاً سردھنہ دھلی کے ہم پلہ تو نہیں اس لیے شکایت بے جا ہے ، کتوں کی کثرت کچھ سردھنہ ھی سے مخصوص نہیں، دیہات میں کتوں کی ریل پیل ہوتی ہے اور محافظ کتے ہی قرار پاتے ھیں - اس کے بعد امیر کے مکان یا محل کی تعریف پر اتر آتے ھیں ، اس کی سست بنیادی کا یہ حال بیان کرتے ھیں کہ سخت بات اگر قریب میں کہی جائے تو مکان گر پڑے ؛ غرض یہ حالات خسرال کے تھے پھر بھی مومن پھسل پڑے اور یہ شادی کسی نہ کسی طرح ہو گئی لیکن دونوں کی معاشرت میں زمین آسمان کا فرق تھا، آخر ناچاقی ہوئی، اس کا بیان دوسرے رقعے سے ہوتا ہے جو شیخ غلام ضامن کرم کے نام ہے۔ اس کا عنوان یہ ہے :-

(انشائے فارسی مخطوطہ رضا لائبریری رامپور کاتب عبدالرحمٰن آھی مکتوبہ ۱۶۸۹ھ)

رقعہ بنام ہمیں بزرگوار در جواب اندرز نامہ بخبر خانہ رسیدن و از شکایت زن و پدرش بر گردیدن :

بناز می گذرد تا حکایتے نہ کنم　　　کند ز من گلہ ، تا من شکایتے نہ کنم

لکھتے ھیں کہ آپ کا مہربانی نامہ عتاب آمیز ملا ، حیرت اور تعجب کا باعث ہوا ، کسی آزردہ دل کو چھیڑنا برا منے کے سوا کیا ہے اور

شکوہ گزار سے الٹی شکایت کیا معنی ؟ تم نے جو جاہلانہ طرز نگارش اختیار کیا ہے ، اس کا جواب سوائے خاموشی کے کیا ہو سکتا ہے لیکن جوش ناکامی سے مجبور ہو کر جن باتوں کا زبان پر لانا موجب عار ہو، انھیں تحریر کرنے پر مجبور ہوں - تم نے جو یہ لکھا ہے کہ اپنے کو (مومن) اس جگہ پہنچائیں ، اس کا مطلب نہ سمجھا لیکن کس لیے آؤں ، وہاں میرا کیا کام ہے ، وہاں سوائے تمھارے میزبان کون ہے اور تمھارے یہاں تو میں بغیر بلائے بھی حاضر ہوں گا - بہر حال یہ تو لکھنا چاہیے کہ توقف اور تاسل سے منع کیوں ہے اور مجھ ناکارہ سے کیا ضرورت ہے ؟ اگر اس خانہ فراموش سے ربط رکھتا ہے تو ظاہر ہے کہ میں نے دہلی کو نہیں چھوڑ دیا ہے ، اگر مراد خرابۂ سردھنہ سے ہے تو تمھیں معلوم ہے کہ میں نے جنگل میں پرورش نہیں پائی ہے ، شہری آدمی صحرا میں گھر نہ بنائے گا اور چمن کا پرند اوجاڑ جنگل میں آشیانے کی بنیاد نہ رکھے گا؛ لالچ خدا کی خوشنودی اور دنیا کی نیک نامی کا ہمیں دھوکا دینے کے لیے ہے ، مجھے اپنا ایک شعر حسب حال یاد آیا :

حذر کنم ، دم ناصح ، فسونِ پرویز است
خطا شنیدنِ حرف صواب آمیز است

خدائے تعالیٰ کو مومن کا دوزخ میں ڈالنا خوشی کا باعث نہ تھا ، کوئی گاؤں اور قصبے میں ذلت سہ کر دنیا میں مشہور نہیں ہوا ، دو تین ماہ جو نادانی اور سادہ دلی سے نالائقوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا جرم کیا ، کسی سے سوائے ملامت اور نفرین کے کوئی بات نہ سنی - اب کے فارغ البال اور خوش حال ہوں ، خدا نہ کرے کہ مصیبت میں اپنے آپ کو پھنساؤں اور حماقت کا ارتکاب کروں : مصرع

آزمائے کو آزمائے اسے خدا شرمائے

آیہ مثنیٰ و ثلاث و رُباع میں نے پڑھی ہے اور اساتذہ سے اس کے معنی

تحقیق کیے ہیں ، میں نے اگرچہ حرام سے توبہ کی ہے تو حلال سے درگذر تو نہیں کی ہے ہاں آوارہ گردی سے باز نہیں آیا ہوں ۔

چونکہ نالائق جاہلوں سے میں نے مصیبتیں برداشت کی ہیں اور بے ہودہ گنواروں سے تکلیفیں اُٹھائی ہیں ، اب یہ خیال کرتا ہوں کہ کسی اونچے گھرانے میں شادی کروں اور کسی حور شمائل کے نظارۂ جمال سے ذوقِ دید حاصل کروں ورنہ دو تین جگہوں سے نسبتوں کے پیام آ رہے ہیں اور وہ ہاں کہنے کے منتظر ہیں ۔

اگر چشمِ انصاف سے دیکھو تو اس نسبت سے کہ میں اس کی بیٹی کو اپنے عقد میں لایا ہوں ، قیامت تک فخر و مباہات کے سوا کوئی جملہ زبان پر نہ لائے اور یہ بکواس اور فضول گوئی ترک کرے، ہائے ہائے! ہم نے اس شرافت خاندانی کے ہوتے ہوئے ایسے ادنیٰ لوگوں سے رشتہ کر لیا اور اپنی عالی مرتبی کے باوجود ایسے گھٹیا لوگوں سے سلسلہ قائم کیا :

نکوئی با بداں کردن چناں است   کہ بد کردن بجائے نیک مرداں

اس مقصد کے پیش نظر جو تمہارے سامنے ہے، حق سے چشم پوشی نہ کرو اور آن حق ناشناسوں کے ہمراہ اس قدر جوش میں نہ آؤ ۔ قیامت کے دن کیا جواب ہے اور بے گناہ مومن کے قتل کا شفیع کون ہے ؟ نادانی کا طعنہ والدہ مکرمہ معظمہ کے حق میں کہنا زبان حضرت مریم علیہاالسلام کی خدمت میں کھولنا ہے۔ عظیم اللہ بیگ کہ اُس کا افتخار سوائے کمیدانی کے منصب کے اور کچھ نہیں ہے، ہم اگرچہ بہت تباہ حال ہو چکے ہیں لیکن ہمارے وقار اور ہماری شان کا حال یہ ہے کہ آسمان کے سامنے بھی سر نہ جھکائیں اور ہم اگرچہ مفلس اور تہی دست ہیں لیکن ہم کمینہ، ذلیل لوگوں کی خوشامد نہیں کرسکتے۔ سعد قلی خان بہادر ہمارے خاندان کے غلاموں میں سے ایک غلام ہے جو بیگم شمرو کی دولت کی وجہ سے نام پا گیا اور اپنا نام صحیفہ عالم شاہی اور سیرالمتاخرین میں نجیب خاں اور نجف خاں کی مصاحبت میں پیدا کیا :۔

گر یک یک از آبا شمرم تا بہ کیومرث
کس نیست کہ تا چرخ نیفراشت علم را
آں پایۂ اکلیل فزایاں کہ نمودند
مسجود شہاں ، نقشِ کف پائے خدم را

آپ کی عنایت سے یہ امید کرتا ہوں کہ دوبارہ ایسی غیر مناسب باتیں تحریر نہ کریں اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں اور سر دھنہ بلانے کی زحمت نہ دیں اور یہ ناشائستہ گفتگو نہ چھیڑیں - میرا پہنچنا کہاں ؟ کلام اس میں ہے کہ میں آنے کی اجازت دوں یا نہ دوں ، اس قدر بے ادبی اور گستاخی کے بعد غلام رسول بیگ کے نام خط لکھنا مناسب نہ سمجھا اس لیے کہ پہنچنے کی صورت ہی نہ تھی ، مجبوراً اگر تمہارے خادم نے پہلے خط کی مانند اسے چاک نہ کیا یا نذرِ طاق نسیاں نہ کیا . . . اس بے شرمی اور بے حیائی کے سلسلے میں خامۂ تحریر مانع آیا -

اس خط سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ عظیم اللہ بیگ کے خاندان میں یہ شادی ہوئی تھی اور غالباً عظیم اللہ بیگ مومن کے خسر تھے - عظیم اللہ بیگ کی تاریخ وفات کا ایک قطعہ فارسی دیوان میں موجود ہے ، جس سے ۱۲۴۶ھ برآمد ہوتے ہیں ، آخری شعر ہے :-

افسوس عظیم سال تاریخ مومن بنوشت برسرِ گور

۱۰۲۰ + ۲۲۶ = ۱۲۴۶ھ

اس سلسلے میں انشائے فارسی میں ایک تعزیتی رقعہ ملتا ہے :-

رقعہ بہ تعزیت مادر مرزا کریم بیگ - اکنوں کہ خبر توقف بہ تحقیق

رسید و افسونِ منہیان بے اعتبار چوں لافِ ہاروت باطل گردید ، خامہ صریر نوا ، شیون شیون نالید و نامہ تظلم مدعا جامہ در نیل خم دوات کشید ، داد خواہم کہ مُخبران محروم اند و من بے گناہ . . . . مضمون تعزیت محتمل است کہ واقعہ جاں کاہ انتقال والدہ معظمہ تازہ بیدادِ اجل رسیدگاں دانند کہ

لب به شکوه نیالودن چه نا گوار است و جفا کشید گاں شناسند که زبان تظلم نه کشودن چه دشوار ، به نوید ان‌الله مع‌الصابرین -

کریم‌الله بیگ ہو سکتا ہے کہ مومن کے سالے ہوں اور مومن نے اپنی ساس کی تعزیت کی ہو -

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مومن کی پہلی بیوی سے کوئی اولاد ہوئی یا نہیں - انشائے فارسی میں احمد نصیر کے نام چند رقعات ہیں ، ایک رقعہ میں احمد نصیر کو لکھتے ہیں کہ تمھاری بہنیں بندگی اور دعا کہتی ہیں ، دوسرے میں تحریر کرتے ہیں کہ تمھاری گرامی بہن کو لے جاؤں گا ، تیسرے خط کے آخر میں ہے کہ تمھارے آنے کی خبر سن کر تمھاری بہنیں بہت مسرور ہیں -

(۱) خواهران شما پس از بندگی و دعا بسے به پرسش می کشایند - (انشائے فارسی مخطوطہ رضا لائبریری رام پور)

(۲) آن روز هم چوں دی روز می روم و گرامی خواهر شما را می برم - (انشائے فارسی مخطوطہ رضا لائبریری رام پور)

(۳) والدعا خوهران شما تا ازین مژده آگاهی یافته اند دیگر خود را درخود نیافته - (انشائے فارسی مخطوطہ رضا لائبریری رام پور)

(۴) لختِ جگر سلمها .... از درر پنهانی بجانم که از دخترانم خود اکثر ایام مهجورم - (انشائے فارسی مخطوطہ رضا لائبریری رام پور)-

ان رقعوں میں یہ حوالہ ملتا ہے کہ مومن کی ایک سے زیادہ لڑکیاں تھیں ، ان سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ احمد نصیر جو بڑی اولاد ہے ، اس سے بھی بڑی ایک لڑکی تھی جو احمد نصیر کو دعا کہتی ہے ، دوسرے خط میں گرامی خواہر کی حیثیت سے ذکر کیا ہے ، قیاساً یہ لڑکی مومن کی بڑی لڑکی پہلی بیوی سے ہوگی؛ یہ بیوی غالباً مومن سے کشیدگی کے باعث زیادہ

دنوں زندہ نہ رہی اور جلد داغ مفارقت دے گئی - چوتھے خط سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ مومن کی ایک سے زیادہ بیٹیاں تھیں -

مومن کی دوسری شادی دختر خواجہ محمد نصیر ۱۲۴۵ھ

خواجہ محمد نصیر خواجہ میر درد کے نواسے تھے، مومن پہلی شادی محبت میں کر چکے تھے لیکن انقلاب پسند طبیعت نے پلٹا کھایا اور خسرال کی یہ فرمائش کہ سردھنہ میں قیام کریں ، خلاف گزری - پھر مومن کی والدہ بھی غالباً اس شادی سے خوش نہ تھیں اس لیے کرم کے نام خط میں دھمکی دی ہے کہ دو تین جگہ سے شادی کے پیام آئے ہوئے ہیں اور کسی اونچے گھرانے میں شادی کرنے کا ارادہ ہے، خسرال والوں کو کھلا چیلنج تھا۔ آخر یہ مراد پوری ہوئی اور خواجہ محمد نصیر جو مشہور صوفی ہونے کے علاوہ شاعر اور موسیقی کے ماہر بھی تھے ، ان کی نظر انتخاب اس گوہر نایاب پر پڑی اور آزادہ روی کے باوجود فرزندی میں قبول کر لیا اور اپنی دختر انجمن النسا[1] (انجم النسا) منسوب کر دی (مقدمۂ دیوان مومن مرتبہ ضیاء احمد صفحہ ۲۷) - مومن نے اس واقعے کو اپنی اسیری سے تعبیر کیا ہے اور اس شادی کے بعد ان کی زندگی میں یک رنگی پیدا ہو گئی اگرچہ آزادی ختم ہوگئی - بڑے پر درد لہجے میں کہتے ہیں :-

حیف صد حیف کہ در فصلِ بہاراں بلبل
ناگہاں گشت گرفتار ، بہ دام صیاد
آہ صد آہ کہ آزادگیٔ نکہتِ گل
باہمہ رنگِ تجرد ، ہمگی شد برباد

---

۱ - ناظر حسن صاحب لیکچرار فارسی ڈگری کالج شیخوپورہ اپنے مکتوب یکم جون ۱۹۶۰ء میں لکھتے ہیں کہ مومن کی بیوی کا نام اشرف النسا بیگم تھا اور انجمن النساء بیگم مومن کی سالی تھیں - ناصر نذیر فراق مؤلف میخانہ درد کو تسامح ہوا ہے -

یعنی آں مومنِ آوارہ کہ در آزادی
بہ جہاں ضربِ مثل بود ، چو سروِ آزاد
ایں زماں ، پائے بہ زنجیرِ تعلق گشتہ
یوسفے بود ، سروکار بہ زنداں افتاد
چہ خوش ایں واقعہ را گفت ، اسیرے تاریخ
مرغِ بے بال و پر اندر قفس آمد فریاد
۱۲۴۰ — ۳۳ + ۲۰۲ + ۲۴۰ = ۱۲۴۵ھ

یہ بات سچ ہے کہ اس شادی کے بعد مومن کی آزادہ روی جاتی ہے ، صرف ۱۲۴۶ھ میں کسی حسینہ سے وابستگی ہوئی اور ناکامی پر خاتمہ ہوا ، اب دنیاوی تعلقات میں ایسے پھنسے کہ چھٹکارا مشکل ہو گیا - احمد نصیرخاں مومن کا بڑا لڑکا ہے لیکن اس کی تاریخ ولادت کا کوئی قطعہ مومن نے بظاہر نہیں لکھا ، اگر کہا ہوتا تو اردو یا فارسی دیوان میں ملتا البتہ مومن کے عزیز شاگرد صاحبزادہ اصغر علی خاں اصغر خلف نواب عبداللہ صاحب کے دیوان میں ایک قطعہ ہے جس سے ۱۲۴۷ھ سال برآمد ہوتا ہے :-

دوست میرے جناب مومن خاں — جن کی ادنیٰ صفت سخن دانی
جانے تو اس سے شاعری کوئی — کہ وہ مضمونِ نو کا ہے بانی
س کو خالق نے اک دیا فرزند — صاحبِ بخت و جاہ کیوانی
وئے الہام سے کہا کہ بڑھا — ابنِ شاعر پہ لفظ لاثانی
۳۱ ۶۲۴ + ۵۹۲ = ۱۲۴۷ھ

اولاد

۱ - جیسا کے پہلے لکھا جا چکا ہے ، پہلی بیوی سے کوئی دختر یادگار رہی - انشائے فارسی میں ایک خط ہے جس سے قیاس ہوتا ہے کہ یہ خط غالباً اسی بیٹی کے نام ہو (انشائے فارسی مخطوطہ رضا لائبریری) :-

لختِ جگر سلمہا ، عریضۂ ایشاں حرز جاں کردم ، .... از درد

پنہانی بجانم کہ از دخترانم خود اکثر ایام مہجورم ، دل بہ صحبتِ شما تسلی می شد اکنوں کہ آں ہم از دست رفت می دانم کہ دردِ بے کسی نمی گذارد۔ بعد برشگال ارادۂ آمدن دارید اگر عمر وفا کر دے، مقیم ؟ ورنہ شاد باشند کہ اہم مطلب خوشنودیٔ شما است ۔

یہ لڑکی اگر مومن کی حقیقی لڑکی ہے تو قیاس چاہتا ہے کہ مومن کی زندگی میں اس کی شادی ہو چکی تھی اور ۱۲۶۸ھ سے پہلے وہ اپنے شوہر کے یہاں مقیم تھی اور برسات بعد آنے کا ارادہ تھا ۔ ہاں اس کا امکان ہے کہ یہ خط مومن کی بھانجی کے نام ہو جو عبدالرحمٰن آہی سے منسوب تھیں اور مومن اسے بھی اپنی بیٹی کی طرح عزیز رکھتے تھے۔ مومن کی دوسری بیٹی مومن کی وفات کے وقت گیارہ سال کی تھی اور یہ خط اس کے نام نہیں ہو سکتا ۔

۲ ۔ احمد نصیر خاں | مومن کے یہاں انجمن النسا بیگم[1] (اشرف النسا بیگم) دختر خواجہ محمد نصیر سے ۱۲۴۷ھ میں ایک لڑکا ہوا ، اس کا نام غالباً خواجہ محمد نصیر نے احمد نصیر اپنے نام کی مناسبت سے رکھا ؛ ان کی ولادت کا قطعہ مومن نے ضرور کہا ہوگا لیکن غیر مطبوعہ کلام میں نہیں ملتا البتہ اصغر شاگرد مومن نے قطعہ ولادت کہا ہے ۔ احمد نصیر خاں بڑے بیٹے تھے ، مومن ان سے بے حد محبت کرتے تھے اور ان کے دوست بھی انتہائی محبت سے پیش آتے ۔ میر تفضل حسین خاں نے جو مومن کے جگری دوست تھے ، انھوں نے احمد نصیر کو اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ مومن جس وقت مرض موت میں مبتلا تھے ، اس وقت بھی احمد نصیر ، میر تفضل حسین خاں کے پاس تھا ۔ احمد نصیر کے نام متعدد خط انشائے فارسی میں ملتے ہیں، ایک خط میں لکھتے ہیں :-

راحت جان من ، از ریختۂ خامۂ ارادت نگار دریافتم، کہ دردگردہ، بآں جانِ نازنین آزارہا دادہ و بے دردیہا بکار بردہ ، و ہنوز صحت کامل ، حاصل نیست ، از درد دلِ خویشتن

چه شرح دهم شرم جاں فدا نه کردن و با نیم جانی زیستن دستوری نمی دهد ۔ بهمه حال اگر دستوری باشد ، زود تر رسیده ، درمانِ دل آزارِ کشیدۂ خویشتن نمایم ، اے جانِ مادر فدائے تو ، اجازتےِ تا جان داروئے دیدار ، چارۂ دردم نماید شعلۂ اشتیاق جگرم می سوزد ۔

دوسرے رقعے میں یوں رقم طراز ھیں :—

فرزند سعادت مند ، رضا جوئے من سلامت ، ازاں دم که حرف زود رسیدن گوش خورد ، و تاج محمد نوید صحت مزاج آورد هزار گونه مسرت دارم ، و لقائے دل فروز را از درگاه کریم کارساز امیدوارم ، یا رب بمرادم زود رسانی که تاب انتظارے نمانده ۔

ایک اور خط ہے :۔ اقبال نشانِ من سه روز بیش است که تپ غریب (کذا) دل گرمیها دارد ۔

ایک اور خط میں احمد نصیر خاں کی ماں کا حواله ملتا ہے، لکھتے ھیں :—

باعثِ زندگانی مادر جاں نثار سلامت .... مضمون زود رسیدن به عریضۂ که بنام والد بزرگوار خود ثبت کرده اید ۔ ازیں شادی در پیراهن نمی گنجم .... اگر پیشتر از وعده آئند زیاده از اندازه مسرور نمایند که انتظار جاں گداز است ، و صبر طاقت گسل ، یا رب توفیق سعادت رفیق باد ۔

ایک رقعه تفضل حسین خاں کے نام لکھا ہے ، یه زمانه آغاز ۱۲۶۸ھ کا ہے جب که وه مرضِ موت میں مبتلا تھے :—

”در معاملۂ احمد نصیر و جناب مرا چه جائے دم است ، اما چوں عنوان سخن از سخن عنوان بیاد دهد ، جائے سخن بجواب استفسار هماں مصرعه ”گویم مشکل ، و گر نه گویم مشکل“

ظاہرا ایام حیات بپایان رسید و نصف ملاقات کہ عبارت از نامہ و پیام است نیز تمام گر دید ، خان والا شان چہ انصاف است کہ اولاد من از خوانِ احسان شما بقدر نصیب خوش بہر یابند و من محروم باشم ازیں درد نہاں چوں نخروشم۔

حیات مومن کے مؤلف ضمیرالدّین احمد عرش گیاوی لکھتے ہیں کہ مومن کا جب انتقال ہوا تو ان کے صاحبزادے احمد نصیر خاں چھ سات سال کے تھے، بعد مومن ان کی تعلیم نانہالی رشتہ داروں کے طفیل میں ہوئی (صفحہ ۸۷)۔ یہ بیان غلط ہے : جیسا کہ ہم لکھ چکے ہیں ، احمد نصیر خاں کی ولادت ۱۲۴۷ھ میں ہوئی تھی اور اس حساب سے وہ مومن کے انتقال کے وقت اکیس سالہ نوجوان تھے : مذکورہ بالا رقعات سے بھی یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ اس وقت تک وہ جوانی کی منزل میں داخل ہو چکے تھے، مومن نے خطوط میں جس طور سے خطاب کیا ہے، وہ ایک بچے سے نہیں کیا جاتا ہے۔ بقول عرش (صفحہ ۸۷) احمد نصیر خاں دو لڑکے اور ایک لڑکی چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہوئے۔ ایک لڑکے کا نام عبدالوہاب تھا جو فقر کی طرف رجوع ہوئے اور عالم جذب میں دنیا سے چلے گئے ، دوسرے صاحبزادے کا نام محمد نصیر ہے، علمی ذکاوت اور محنت کے سبب تین سال میں انھوں نے فرسٹ ڈویژن میں انٹرنس پاس کیا، عربی فارسی سے بھی با خبر ہوئے ، شعر بھی کچھ کہتے ہیں مگر مزاج وارستہ ہے اور بیٹی کا نام عزیز بیگم ہے۔

۳ - ۱۲۴۷ھ سے ۱۲۵۷ھ تک کسی اولاد کا حوالہ نہیں ملتا ، ہو سکتا ہے کہ اس عرصے میں جو اولاد ہوئی ہو وہ چند دن بعد مر گئی ہو اور اس لیے مومن نے آن کا خود ذکر ضروری نہ سمجھا البتہ ۱۲۵۸ھ میں ایک لڑکا پیدا ہوا اور اس کی پیدائش کے انھوں نے دو قطعے کہے ہیں۔

خلفے دادہ اند مومن را کہ سزا وارِ دولت و رشد است
گر تو سال ولادتش پرسی گل و گلزارِ دولت و رشد است

تا گل آورد شاخ امیدم روزِ نوروز آخر سال است
دے برائے من است فروردیں عید جوش بہار آمال است
پسرم دادہ اند سال وجود نو گلِ باغِ جاہ و اقبال است
(دیوانِ فارسی)

۴ - محمدی بیگم مرحومہ اہلیہ مولوی عبدالغنی وکیل سیتاپور

ولادت ۱۲۵۹ھ، وفات ۱۲۹۲ھ | ۱۲۵۹ھ میں ایک اور لڑکی پیدا ہوئی اور مومن نے اس کی تاریخ یوں کہی :-

دختِ روشن رواں ہوئی پیدا کیا ہی چمکا ہے اخترِ مومن
نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے کہی تاریخ دخترِ مومن (۱۲۵۹ھ)
(صفحہ ۱۸۹ دیوانِ مومن طبع ششم)

محمدی بیگم—ان کا عقد مولوی عبدالغنی غنی وکیل سیتاپور سے ہوا اور انتقال ۱۲۹۲ھ میں ہوا، غنی نے خود تاریخ رحلت لکھی ہے :-

اے غنی مصرع تاریخ سرِ قبر نویس
بسوئے ملکِ عدم ہم نفس و ہمدم رفت

(حیات مومن صفحہ ۸۸)

ناصر حبیب وکیل ان کی یادگار ہیں (حیاتِ مومن صفحہ ۸۹)، ۱۹۲۸ء میں چھیاسٹھ برس کی عمر تھی اور ان کی دو صاحبزادیاں ہیں - کنیز فاطمہ نے عرش صاحب مؤلف حیاتِ مومن اور پروفیسر ضیاء احمد صاحب کو حالاتِ مومن سے باخبر کیا ہے (مقدمۂ دیوانِ مومن صفحہ ۲۷) -

۵- پسر، نام نامعلوم، ولادت ۱۲۶۱ھ، وفات ۱۲۶۳ھ | مومن کے تیسرا لڑکا ۱۲۶۱ھ میں پیدا ہوا اور دو سال زندہ رہ کر داغِ مفارقت

دے گیا ۔ اس کی موت سے مومن کافی متاثر معلوم ہوتے ہیں، قطعۂ تاریخ وفات اس طرح کہا ہے :۔

جگر گوشۂ ما بہ کنجِ لحد اماں از جہانِ پر آفات یافت
دو سال اندر آغوشِ مام و پدر ستم دید، و یاسِ مکافات یافت
چہ ماتم ، کہ پیرِ خرد ، سالِ فوت ز ہیہات ، ہیہات ، ہیہات یافت

۴۲۱ + ۴۲۱ + ۴۲۱ = ۱۲۶۳ھ
(دیوانِ فارسی مخطوطہ مومن)

یہ اسی لڑکے کی فوت کی تاریخ ہے جو آزاد نے آب حیات (صفحہ ۴۲۶) میں لڑکی کے نام سے منسوب کی ہے، اس کی تائید نسخہ مخطوطہ دیوان مومن سے ہوتی ہے جو آہی نے نقل کیا ہے، عنوان یہ ہے : تاریخ وفات پسر مصنف ۔ اس لیے آزاد کی تقلید میں جنھوں نے یہ قطعہ دختر مومن سے منسوب کیا ہے ، اس میں غلطی کی ہے :

خاک بر فرقِ دولت و دنیا من فشاندم ، خزانہ بر سر خاک ۱۲۶۳ھ

۶۔ فاطمہ سلطان بیگم، وفات ۱۲۶۵ھ فاطمہ سلطان بیگم کی ولادت کے سن متعین نہیں کیے جا سکتے ، یہ بھی ممکن ہے کہ تیسرے لڑکے کی ولادت کے بعد آغاز ۱۲۶۳ھ میں اس کی ولادت ہوئی ہو یا اس سے پہلے ، اس قدر کہ سکتے ہیں کہ اس کے مرنے کا صدمہ شدید ہوا ۔ قطعہ تاریخ وفات سے دلی تاثرات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ، ۱۲۶۵ھ میں ماں باپ کو تڑپتا چھوڑ کر چل بسی :۔

رفت لختِ جگرم زیر زمیں | چرخ بر خاک نشاندم امروز
در غم فاطمہ سلطان بیگم | جستِ فاطمہ خواندم امروز
تا بجانش نہ رواں شد وی شب | جاں بتاریخ فشاندم امروز

۵۴ ۱۲۱۱ ۱۲۶۵ھ
(دیونِ مومن فارسی ، مخطوطہ رضا لائبریری)

وفات

وفات مومن ۱۲۶۸ھ مومن کی صحت وفات سے پیشتر بہت اچھی تھی، معاصرین اُن کی عمر کا اندازہ کرنے میں دھوکا کھا گئے؛ چنانچہ کریم الدّین تذکرۂ شعرائے اردو میں لکھتے ہیں ''اُن کی عمر قریب چالیس برس کے ہوگی''۔ یہ بیان ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء کا ہے، اُس وقت اُن کی عمر قریباً ۴۷ سال تھی، اس طرح سات سال عمر کا دھوکا کھا گئے؛ اُن کے قوأ مضبوط تھے اور صحت اچھی تھی اس لیے بعض تذکرہ نویسوں نے وفات جوانی میں لکھی ہے۔

آزاد نے آخری عمر میں مومن کو دیکھا تھا، اُن کی تصویر الفاظ میں اس طرح کھینچی ہے:—

خوش وضع، خوش لباس، کشیدہ قامت، سبزہ رنگ، سر پر لمبے لمبے گھونگر والے بال اور ہر وقت انگلیوں سے اُن میں کنگھی کرتے رہتے تھے، ململ کا انگرکھا، ڈھیلے ڈھیلے پائنچے، اس میں لال نیفہ بھی ہوتا تھا۔ (مرزا فرحت اللہ بیگ نے اس تصویر میں اور زیادہ رنگ آمیزی کی)، اس تصویر سے اُن کی رنگین مزاجی کا اظہار ہوتا ہے۔ باون سال کے ہو چکے تھے کہ ایک مکان کی چھت کی مرمت ہو رہی تھی، کڑیاں دوبارہ ڈالی جا رہی تھیں، یہ چھت کی منڈیر پر کھڑے ہو کر مزدوروں کا کام دیکھ رہے تھے، اتفاقاً دھیان بٹا اور پاؤں پھسلا تو چھت سے نیچے آ پڑے؛ چھت نیچی تھی لیکن اتفاق کہ شدید ضرب آئی اور ہاتھ اور بازو کی ہڈیاں ٹوٹ گئیں، علاج کیا گیا لیکن کوئی نتیجہ نہ نکلا، زائچہ دیکھا گیا تو بتایا کہ پانچ ماہ سے زیادہ زندہ نہ رہوں گا اور خود ہی اس حادثے کا قطعہ تاریخ کہا:—

مومن فتاد از بام گفتم چہ رفت گفتا
خود با خروش گفتم، بشکست دست و بازو
گفتم کہ با مدتِ گفت، تاریخ ایں مصیبت
گفتا خموش، گفتم، بشکست دست و بازو

صاحب گلستان سخن کی روایت ہے :- اتفاقات قضا و قدر سے ایک روز ایک مکان کے بام بلند پر عروج معنی کے تصور میں تھا کہ ناگاہ لعزشِ پائے اوج سخن سے پستیٔ زمین کی طرف مائل اور اس مضمون پیش پا افتادہ کی جانب متوجہ کیا ، ہر چند اُس بام کی بلندی چنداں پایہ نہ رکھتی تھی لیکن کچھ آسمان کی کجروی اور کچھ زمین کی ناہمواری سے دست و بازو میں ضرب شدید پہنچی (گلستان سخن صفحات ۳۴۳ ، ۳۴۴) -
حیات مومن کے مؤلف عرش (صفحات ۸۰ ، ۸۱) لکھتے ہیں :- حکیم مومن خاں بالکل بھلے چنگے تھے ، کسی بل اُن کے دم خم میں کوئی فرق نہ آیا تھا ، ایک بال بھی سر کا پکا نہ تھا ، یہ محض ترےپن کی عمر رکھتے تھے کہ انتقال کیا ، دیکھنے میں چالیس پینتالیس برس کے معلوم ہوتے تھے ؛ صورت یہ ہوئی کہ وہ مکان جس کا نقشہ ابھی دکھلا چکا ہوں ، اُس کی چھت مرمت ہو رہی تھی اور کھولی گئی تھی صفحہ (۸۱) ، نیچے سے مزدور اوپر کو کڑیاں دے رہے تھے ، یہ اُس مونڈیر سے لگے ہوئے کھڑے تھے ، چھت کی اونچائی کم تھی ، یکایک جھجکے اور ٹھوکر کھا کے کوٹھے سے نیچے آ پڑے ، گرتے ہی بیہوش ہو گئے ، گھر میں کہرام اور محلے میں ہنگامہ ہو گیا ، بی بی بچوں نے سر پیٹنا شروع کر دیا ، ناصر نذیر صاحب فراق کہ مومن کے عزیز اور شاگرد تھے ، دوڑ پڑے اور خاں صاحب کو اُٹھا کے نیچے کے کمرے میں لٹایا ، عزیزوں ، شاگردوں اور دوستوں کی آمد شروع ہوئی جن میں آہی بھی تھے ، اُن کی طرف دیکھ کے جب ہوش میں آئے تو فرمایا "میاں جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہوا مگر میرا علم یہ کہتا ہے کہ میں صرف پانچ مہینے بچوں گا ، لو میرے مرنے کی تاریخ لکھ رکھو 'دست و بازو بشکست' "- . . . آخر جمعہ کے روز صبح کا وقت تھا کہ دنیا سے کوچ فرمایا اور ہوش حواس میں ہنستے بولتے چلے گئے . . . حسب ہدایت ان کا جنازہ مہندیوں میں کہ مشہور اور پرانا گورستان دھلی کا ہے ، لایا گیا اور یہیں دفن ہوئے ، نماز مسجد جامع میں ہوئی . . . مزار آپ کا زیر احاطہ

دیوار مقبرہ مولانا شاہ عبدالعزیزؒ باہر کی سمت بجانب شرق واقع ہے۔

مومن نے ایک رقعہ تفضل حسین خاں کے نام لکھا ہے، عنوان رقعہ یہ ہے :- بنام نامی تفضل حسین خاں بہ ہنگام مرض الموت۔ ۔ بامردہ ولیہا شب زندہ دارم وبا چندیں ضعف و ناتوانائی کہ دم نتواں زد بیقرار، دست از کار رفتہ، ہمچناں بار گردن است و پائے از رفتار ماندہ سرگرم سیر ملک عدم کردن، تشنج اعصاب از کمند گرائے گیسو تاب فرساتر است و شدتِ اضطراب از شوخیِ ادا پائے معشوقۂ نازک ہوش ربا تر، از گرمی سختی روز، صد داغ بیش بر دل و جگر است، و از سوادِ شام عذاب شبِ اولینِ گور در نظر، ہر چارہ بے تاثیر است و ہر تدبیر بر طرف افتادہ، تقدیر ظاہرا، ایام حیاتِ بپایاں رسید و نصف ملاقات کہ عبارت از نامہ و پیام است نیز تمام گردید۔ (انشائے فارسی مخطوطہ)

ایک اور رقعہ احمد نصیر خاں کے نام ایام مرض میں لکھا گیا ہے :-

پارۂ خوں شدہ جگرم سلامت ــــ لحظہ لحظہ و ساعت ساعت کالشمس فی الزوال رو از اوج صحت بہ حفیض کسل و اضمحلال می نمود۔ بے گماں یقین می شد کہ ایام زندگانی بسر آمدہ، المنة للہ کہ ایں زماں آفتاب امید از کسوف و حرماں برآمدہ، چنداں تردد و تشویش بے صرفہ نباید برد۔ ۔ من خود ہر چہ می توانم بل نمی توانم عرق سعی می افشانم وعدۂ زر کہ بآخر ماہ محرم توثیق نما بود، اکنوں بآخر صفر انجامید یا رب وفائے زندگانیم تا وفائے ایام وعدہ مستدام و جاوید ساز۔ ۔ ۔

صابر (گلفامِ سخن صفحہ ۱۷۴) نے تسکین کی وفات کے ذیل میں لکھا ہے کہ اس سے پہلے مومن اور عارف نے رحلت کی (حیات مومن صفحہ ۶۲ میں عرش لکھتے ہیں کہ تسکین مومن سے چند ماہ قبل مر گئے، غلط ہے) تسکین کا انتقال ۱۷ شوال ۱۲۶۸ھ کو ہوا (انتخاب یاد گار)، عارف کا انتقال اپریل ۱۸۵۲ء (مطابق جمادی الثانی ۱۲۶۸ھ) میں ہوا (غالب نمبر۔ علی گڑھ میگزین صفحہ ۸۷)۔ عارف کے بعد مومن کا انتقال ہوا، اس طرح جمادی الثانی

کے کچھ دنوں بعد شوال سے پہلے مومن جہان فانی سے عالم جاودانی کو سدھارے۔

نادرات غالب مرتبہ آفاق حسین صاحب آفاق مطبوعہ ادارۂ نادارات کراچی (صفحہ ۴۱) خطوط غالب بنام منشی نبی بخش حقیر (صفحہ ۲۴):-

سنا ہوگا تم نے کہ مومن خاں مر گئے، آج اُن کو مرے ہوئے دسواں دن ہے۔ دیکھو بھائی! ہمارے بچے مرے جاتے ہیں، ہمارے ہم عمر مرے جاتے ہیں، قافلہ چلا جاتا ہے اور ہم پا در رکاب بیٹھے ہیں۔ مومن خاں میرا ہم عصر تھا اور یار بھی تھا۔ بیتالیس تینتالیس برس ہوئے یعنی چودہ چودہ پندرہ پندرہ برس کی میری اور اُس مرحوم کی عمر تھی، مجھ میں اُس میں ربط پیدا ہوا، اس عرصے میں کبھی کسی طرح کا رنج و ملال درمیان نہ آیا۔ حضرت! چالیس چالیس برس کا دشمن بھی نہیں پیدا ہوتا دوست تو کہاں ہاتھ آتا ہے! یہ شخص بھی اپنی وضع کا اچھا کہنے والا تھا، طبیعت اُس کی معنی آفریں تھی (صفحہ ۲۵، یکم شعبان ۱۲۶۸ھ مطابق ۲۱ مئی ۱۸۵۲ھ بروز جمعہ)۔

تیسرا باب

تصانیف

۱۔ کلیات اردو | کلیات اردو مومن۔ مومن کا اردو کلام سب سے پہلے شیفتہ نے ۱۲۴۳ھ میں جمع کیا اور اس کا دیباچہ لکھ کر اربابِ نظر کے سامنے پیش کر دیا۔ یہ کلام مومن کے حذف و اضافے کے بعد پیش کیا گیا تھا اور شیفتہ نے دعویٰ کیا کہ سوائے اس کلام کے جو مومن کے نام پر دیکھیں، وہ اس کا نہ جانیں (دیباچہ کلیات مومن صفحہ ۶ نولکشور پریس ۱۹۳۰ء)۔ یہ دیوان مطبع رفاہ عام دہلی میں ۱۲۶۲ھ مطابق ۱۸۴۶ء میں (۳ صفر ۱۲۶۲ھ مطابق ۳۱ جنوری ۱۸۴۶ء) باہتمام مولوی کریم الدین شائع ہوا، یہ مومن کا پہلا مطبوعہ دیوان ہے [تذکرۂ شوق صفحہ ۲۵۷ میں عطاء اللہ صاحب پالوی (مکتبہ جدید) میں فٹ نوٹ نمبر ۲ میں لکھتے ہیں کہ اس دیوان کا ذکر فرانسیسی مستشرق گارسان دی تاسی نے لکھا ہے مگر اردو زبان کے نامور محقق قاضی عبدالودود بار ایٹ لا، مجھ سے فرماتے تھے کہ ۱۲۶۱ھ مطابق ۱۸۴۶ء (۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۶ء صحیح ہے) سے پہلے مومن کا دیوان شائع ہو چکا تھا جو ان کی نگاہ سے گزرا ہے۔ قاضی صاحب نے حوالہ مطبع کا نہیں دیا ہے اس لیے بغیر دلائل ماننے کا سوال پیدا نہیں ہوتا]۔

دوبارہ یہی نسخہ انڈین پنچ میں باہتمام منشی دیبی سہائے شائع ہوا، اس وقت یہ نسخہ پیش نظر نہیں لیکن جہاں تک یاد ہوتا ہے، یہ

نسخہ ۱۸۵۵ء کا ہے اور اسی مطبع میں کلیات انشا بھی ۱۸۵۵ء میں شائع ہوا تھا۔

اس سے مختلف نسخہ عبدالرحمٰن آھی نے ترتیب دیا اور اُنھوں نے خاتمہ کلیات مومن لکھا اور اس کے مدعی ہوئے کہ پہلے محمد مصطفیٰ خاں نے دیوان ترتیب دیا تھا لیکن چونکہ اس کے بعد بھی مومن کی مشقِ سخن جاری تھی اور کافی کلام بڑھ گیا تھا اور یہ سلسلہ اضافے کا جاری تھا کہ مومن خاں کو مرض موت نے گھیر لیا اور آثار مرگ اُن کے چہرے سے ظاہر ہونے لگے۔ میں بچپن سے آخری عمر تک اُن کی شفقتوں کا مرکز رہا؛ بھتیجا ہونے کے علاوہ منہ بولا بیٹا ہونے کا بھی شرف رکھتا تھا، میں نے نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے جمع کردہ کلام کے علاوہ وقتاً فوقتاً بہت سا کلام غزلیات، رباعیات، مخمسات اور مثنویات اور دیگر اشعار، اپنے پاس لکھ رکھا تھا، اسے اول سے آخر تک بنظر تصحیح اپنے قبلہ گاہ (مومن) کے رو برو پیش کیا۔ چنانچہ کچھ پر اصلاح کی اور کچھ بجنسہ بحال رکھا، تین روز وفات میں رہ گئے تھے کہ دیوان مکمل ہوا... اس کے بعد جو کلام مومن کے نام سے اس کے سوا پایا جائے وہ اس کا کلام شمار نہ کیا جائے (صفحہ ۳۲۱ طبع ششم مطبع نولکشور)۔ اس خاتمے پر انوار حسین تسلیم سہسوانی کی تقریظ ہے اور اس میں دعویٰ بھی ہے کہ اس دیوان کا حق تالیف بھی انھوں نے خرید لیا ہے۔ یہ نسخہ ۱۸۷۳ء میں پہلی بار اس مطبع میں چھپا۔

اس نسخے کی اہمیت مسلم ہے، اس کے علاوہ جو خاص نسخے دیوانِ مومن کے پائے جاتے ہیں، اُن میں چند قابل ذکر ہیں:—

الف۔ دیوان مومن محبس پریس دھلی مملوکہ میونسپل لائبریری گوجرانوالہ۔ یہ نسخہ متن اور حاشیے پر ۷۸ صفحات پر ختم ہوتا ہے، آخر میں درج ہے:—

الحمدللہ علیٰ احسانہ کہ دیوان مومن خاں صاحب در محبس پریس

باہتمام داروغہ کنہیا لعل بانصرام اموجان طبع شد۔

یہ نسخہ بد خط اور غلط ہے، متن میں ۲۳ شعر اور حاشیے میں ۲۹ شعر ہیں۔ اس کی غلطیوں کا اندازہ حسب ذیل اشعار سے کیا جا سکتا ہے:—

جو اُس کے زلف کو دوں اپنی عقدہ مشکل
نا بلہوس کا بھی ہرگز نہ چھوٹے دل
تم اور حسرت آہ کیا علاج کروں
میں نیم جاں نرھا امتحان کے قابل

اس دیوان کی تاریخ طباعت نہیں معلوم ہوتی البتہ دوسری کتاب جو اس دیوان کے ساتھ مجلد ہے، وہ انجمن مفید عام قصور ضلع لاہور کی رپوٹ سال تمام جلد ۴ نمبر ۱ بابت ماہ جنوری ۱۸۷۷ء ہے، یہ دیوان کریم الدّین کے نسخے کی نقل معلوم ہوتا ہے، صفحہ ۷۸ پر آخری شعو ہے:—

اے مرگ اس عذاب سے آ کر چھڑا مجھے
مومن ہوں قید خانہ ہے دارالفنا مجھے

بظاہر یہ نسخہ ۱۸۷۰ء سے پہلے کا مطبوعہ ہے۔

ب۔ دیوان مومن مرتبہ پروفیسر ضیاء احمد صاحب بدایونی کا نسخہ مطبوعہ شانتی پریس الہ آباد ۱۹۴۳ء۔

ج۔ کلیاتِ مومن مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔

اس دیوان کے آغاز میں ڈاکٹر عبادت صاحب کا مقدمہ بھی شامل ہے، یہ نسخہ طباعت کی غلطیوں سے خالی نہیں، نولکشوری نسخے میں ایسی غلطیاں نہیں، اس کے علاوہ مقدمے میں بھی فروگذاشتیں ہیں جن کی تصحیح ضروری ہے مثلاً کلیات مومن مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی پر ایک نظر از محمد زکریا مائل۔ رسالہ قومی زبان یکم اگست ۱۹۶۰ء:—

کلیات مومن مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی سے ہماری توقعات پوری نہیں

ہوتیں ، بلکہ کچھ اور غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں ۔ ان غلطیوں کی اگر نشان دہی نہ کی گئی تو یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا اس لیے چند غلطیوں کی نشان دہی کی جا رہی ہے، اُمید ہے کہ ڈاکٹر صاحب آئندہ ایسی غلطیوں سے اجتناب کریں گے :۔

(۱) ولادت مومن ۱۳۱۵ھ میں ظاہر کی گئی ہے : اول تو ۱۸۰۰ء مطابق ۱۲۱۵ھ کے مطابق ہے، ۱۳۱۵ھ سہو کاتب ہو سکتا ہے لیکن ۱۲۱۵ھ کو مطابق ۱۸۰۰ء کاملاً نہیں کہا جا سکتا۔ یکم محرم ۱۲۱۵ھ مطابق ۲۵ مئی ۱۸۰۰ء کے ہے اور ۱۵ شعبان ۱۲۱۵ھ کو یکم جنوری کا آغاز ہوتا ہے اور اُنیسویں صدی شروع ہو جاتی ہے اور ۱۳ مئی ۱۸۰۱ء کو ۱۲۱۵ھ ختم ہو جاتا ہے۔ جب تک مومن کی ولادت کا مہینہ متعین نہ ہو، اُس وقت تک ۱۸۰۰ء کا تعیّن دشوار ہے۔ اگر ۱۲۱۵ھ کے آخر میں مومن کی ولادت واقع ہوئی ہو تو سنہ عیسوی ۱۸۰۱ء ولادت کا سال قرار پائے گا اور احتیاط کا اقتضا بھی یہی ہے کہ بارہ سو پندرہ ھجری کے آخر میں ولادتِ مومن تصور کی جائے ، تاکہ اشتباہ دور ہو سکے۔

(۲) ڈاکٹر صاحب کی رائے یہ ہے کہ حکیم غلام نبی خاں اپنے زمانے کے مشہور طبیبوں میں سے تھے: یہ رائے بھی غلط ہے، سر سید احمد خاں نے آثارالصنادید میں دھلی کے مشہور اطباء کے حالات زندگی درج کیے ہیں ، اس میں مومن کے چچا حکیم غلام حسن صاحب اورحکیم غلام حیدرخاں (صفحات ۶۵ تا ۶۸) کا ذکر کیا ہے ۔ مومن کے والد حکیم غلام نبی خاں حکیم ضرور تھے لیکن مشہور اطباء میں سے نہ تھے ورنہ اُن کا ذکر آثارالصنادید میں ضرور آتا ۔ خود مومن خاں نے اپنے مرضِ عشق کے سلسلے میں اپنے چچا کے علاج کا بیان کیا ہے اور اُن کی تشخیص کا ذکر ملتا ہے اس لیے یہ لکھنا کہ حکیم غلام نبی خاں اپنے زمانے کے مشہور طبیبوں میں سے تھے ، درست نہیں۔

(۳) ڈاکٹر عبادت صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ امارت اور ریاست

مومن کو ورثے میں ملے۔

''مومن کے گھرانے میں فارغ البالی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔''

ڈاکٹر صاحب نے دوسروں کی رائے بغیر تنقیح نقل کر دی ہے کہ مومن کو وراثتاً امارت اور ریاست ملی تھی۔ اب ذرا مومن کی مالی حیثیت کا اندازہ کیجیے جو انشائے مومن سے واضح ہوتی ہے۔ متعدد خطوط حکیم احسن اللہ خاں کے نام ملتے ہیں جن میں والیٔ ریاست جھجر و نارنول وغیرہ کے خزانے سے زرِ وظیفہ سالانہ کا بار بار تقاضا کیا گیا ہے، ایک ہزار روپیہ سالانہ رقم خزانۂ ریاست سے قابلِ وصول تھی لیکن کبھی رقم پوری نہیں ملی۔ ایک خط میں حکیم احسن اللہ خاں کو لکھتے ہیں۔ ''خزانچیوں کی بد معاملگی سے متعلق خط ملا، آٹھ سو روپے کی قرارداد معلوم ہو کر حیرت ہوئی۔ گذشتہ سال ایک سو بیس جو یہاں کے نو سو آٹھ روپے اور سکۂ کل دار نو سو بیس روپے ہوتے ہیں، ہم نے حاصل کیے تھے۔ اس سال کس قصور میں ساٹھ روپے کا نقصان اٹھائیں۔ اگر خزانچیوں کی زیادتی اسی طرح جاری رہی تو تسلیم نہیں کی جائے گی''۔

ایک خط میں حکیم احسن اللہ خاں کو لکھتے ہیں۔ ''زر سالانہ کی تحصیل کا یہ طریقہ تھا کہ حکیم نصراللہ خاں یاد دہانی کراتے تھے اور ہم پر احسان رکھتے تھے، پھر حیات خاں توشک بیگی پر یہ معاملہ آ پڑا، اب آپ ہی پر انحصار ہے۔ لالہ شوقی رام کو اجازت نامہ دلا دیا جائے یا جو صورت مناسب ہو۔ ۔ ۔ ۔ ۔''۔

ایک خط جو نواب فیض محمد خاں (متوفی ۱۲۵۱ھ) کی حیات میں لکھا گیا ہے۔ ''فرمان قبض الوصول زر سالانہ جاری ہو، چچا صاحبان فرماتے ہیں کہ ایک مہینے کا سود ادا کرنا تو اس قدر نقصان دہ نہیں لیکن اگر ایک ماہ

بعد رقم مل جائے تو پھر یہ سود بیکار برداشت کیا جائے''۔ معاملہ یہیں تک نہیں رہتا بلکہ مومن اس معمولی رقم پر جو سالانہ بقدر دو سو پچیس روپے ہوتی ہے، اپنے اخراجات کا انحصار رکھتے تھے؛ چنانچہ تحریر کرتے ہیں (صفحہ ۱۲۸ انشائے مومن مطبوعہ مطبع سلطانی ۱۲۷۱ھ) کہ ایک بقال جس سے نان و نمک زر سالانہ کے وعدے پر لیا جاتا تھا، اس سے وعدہ پختہ تھا کہ زر سالانہ وصول ہونے والا ہے رقم ادا ہو جائے گی، اس کے تقاضے پر میں نے سختی سے ڈانٹا اور گالیاں دیں، وہ بھی لپٹ پڑا اور عزت آبرو پر ہاتھ ڈالا، چیخ پکار بلند ہوئی اور بال بھی کھینچا تانی میں آئے، لوگ تماشا دیکھنے لگے، یہاں تک کہ چچا صاحب نے میری آواز پہچان لی اور غضب ناک ہو کر انتقام کے لیے نکلے، پہلے واقعہ پوچھا، جب انھوں نے سنا کہ مجھ پر قرضے کا تقاضا تھا اور وقت گزرنے پر یہ جھگڑا ہوا ہے اس لیے قصوروار مجھے ٹھہرایا . . . دو سو پچیس روپے کے لیے جس قدر انکسار اور خوشامد سے مومن نے کام لیا ہے، وہ ایک مفلس آدمی سے ہی ممکن ہے۔

مومن کی زندگی عیش و عشرت کی نہ تھی بلکہ سادہ وضع رکھتے تھے، غالب کی حالت کا اگر موازنہ مومن سے کیا جائے تو زمین آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ غالب کو پہلے اپنی نانہیال سے امداد ملتی تھی، شادی کے بعد نواب الٰہی بخش خاں معروف اُن کی امداد کرتے تھے، انگریزی خزانے سے اُن کو اُنہتر روپے آٹھ آنے ماہانہ ملتے تھے، بہادر شاہ ظفر کے خزانے سے پچاس روپے ماہانہ کچھ مدت پاتے رہے، پھر ریاست رام پور سے ایک سو روپے ماہانہ ملتے رہے؛ اس طرح بیک وقت انھیں سو سوا سو روپیہ ملا اور یہی وجہ تھی کہ وہ شراب نوشی میں بھی مصروف رہے۔ مومن کی آمدنی قلیل تھی اسی وجہ سے احمد نصیر خاں اپنے بیٹے کو انھوں نے میر تفضل حسین خاں پر چھوڑ رکھا تھا، نواب مصطفیٰ خان شیفتہ اُن کی امداد کرتے رہے اور اسی وجہ سے مومن اُن کا ذکر نہایت احترام سے کرتے ہیں، وہ مومن کی وفات کے بعد بھی نصیر احمد خاں کی مدد کرتے رہے۔ پھر دلی کالج کی فارسی کی

صدر مدرسی کے لیے مومن ایک سو روپے پر تیار تھے اور غالب نے بے اعتنائی ملازمت سے برتی ، صہبائی نے چالیس روپے ماہانہ پر یہ سودا کر لیا ۔ مومن کی حالت کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے ، بہادر شاہ ظفر کی ملازمت اگر معقول مشاہرہ کی آنھیں ملتی تو ضرور قبول کر لیتے ، مومن کو ظفر کی طرف سے کچھ پیش کش ضروری ہوئی اگرچہ تھوڑی تھی جیسا کہ اس قطعے سے ثابت ہے :—

پادشاہا بایں متاعِ قلیل مدح چوں از منے چرا خواہی
دیگراں ، دیگرند من دیگر ہرچہ از بوم ، از ہما خواہی

جہاں تک مومن کے گھرانے کی فارغ البالی کا ذکر ہے وہ متوسط الحال خاندان سے ضرور تھے لیکن امرا میں شمار نہ تھا اور خاندانی پنشن کے حصول کے سلسلے میں حکیم غلام حیدر خاں اور حکیم غلام حسن خاں بھی مومن کی طرح ضرورت مند نظر آتے ہیں جیسا کہ رقعات مومن سے ظاہر ہوتا ہے اس لیے روایتاً مومن اور مومن کی خاندانی امارت کا ذکر تذکروں میں آتا ہے اور ڈاکٹر صاحب نے بھی انھیں روایتوں کا سہارا لیا ہے اور تحقیق سے کنارہ کشی منزل سے دور کر دیتی ہے۔ یہی حال مذکورہ بالا روایت کا ہے ۔

ڈاکٹر صاحب نام کے ذیل میں رقمطراز ہیں (صفحہ ۱۰ کلیات مومن)
''ان کا نام مومن خاں رکھا . . .''

مومن خاں نام آبِ حیات میں پایا جاتا ہے اور ڈاکٹر صاحب نے اسی کو معتبر سمجھا لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے ۔ انشائے مومن میں حکیم احسن اللہ خاں نے محمد مومن خاں نام نقل کیا ہے ، شیفتہ نے گلشن بے خار میں (صفحہ ۱۹۹)، سرسید احمد خاں نے آثار الصنادید میں (صفحہ ۱۹۲) ، صابر نے گلستانِ سخن (صفحہ ۴۴۳) میں اور نساخ نے سخن شعرا (صفحہ ۴۶۷) میں میر محمد مومن خاں نام نقل کیا ہے ؛ حقیقت میں نام ''محمد مومن'' اور خاں خطاب ہے اس لیے مومن خاں نام نہیں ۔ عرش نے مومن علی نام (حیاتِ مومن

صفحہ ۳۷) شاہ عبدالعزیز صاحب کا مجوزہ ظاہر کیا ہے جو غلط ہے۔ فاضل مرتب یہ بھی ظاہر کرتے ہیں :۔

شاہ عبدالقادر جیسے اُستادوں سے درسیات کی تکمیل کی اور اس کے بعد طب کی طرف متوجہ ہوئے اور اس فن کو کمال تک پہنچایا۔

متفقہ طور پر تمام تذکرہ نویس یہی لکھتے ہیں کہ مومن نے تکمیل درسیات نہیں کی تھی البتہ شاہ عبدالقادر صاحب سے کچھ کتابیں ضرور پڑھی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ دعویٰ کر کے نئی تحقیقات کا اظہار کیا ہے لیکن اس دعوے کا ثبوت مہیّا نہیں کیا۔ مومن نے خود پہلی مثنوی "شکایتِ ستم" میں یہ واضح کیا ہے کہ اس نے علومِ درسیہ کی طرف توجہ نہ کی اور وہ کم عمری ہی سے کوچۂ عاشقی میں گردش کرنے لگا۔ جب اس کی محبت کا پردہ فاش ہوا تو اسے دوبارہ مکتب بھیجنے کی تجویز ہوئی۔ مومن کی استعداد علمی معقول ضرور ہے لیکن وہ درسیات میں تکمیل نہ کر سکا تھا:

تو سہی ہم بھی ناک میں دم لائیں بھیجیں مکتب میں پھر بزور پڑھائیں

طب میں کمال بہم پہنچانا بھی محتاجِ ثبوت ہے، آثارالصنادید میں سرسید احمد خاں نے مشہور اطباء دھلی کا تذکرہ کیا ہے :۔

حکیم احسن اللہ خاں، حکیم غلام نجف خاں، حکیم صادق علی خاں، حکیم غلام حیدر خاں، حکیم نصراللہ خاں، حکیم فتح اللہ خاں، حکیم پیر بخش فاروقی، حکیم حسن بخش خاں، حکیم غلام حسن خاں، حکیم محمد یوسف خاں، حکیم عبدالحکیم معروف بہ ابو خاں۔

مومن کا ذکر زمرۂ شعرا میں آتا ہے، مومن حکیم ضرور تھے لیکن اس فن میں چنداں شہرت نہ تھی۔ ان کی شہرت شاعری میں تھی نہ کہ طب میں، ہاں طب میں دست رس ضرور تھی لیکن وہ اپنے چچا حکیم غلام حسن خاں کی طرح کامل نہ تھے نہ حکیم احسن اللہ خاں کی مثل ماہر، وہ حکیم نصراللہ خاں جیسے بھی نہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا بیان ہے کہ

طب کے بعد نجوم کی طرف متوجہ ہوئے، شطرنج کی طرف راغب ہوئے اور اس فن پر بھی تھوڑے عرصے میں حاوی ہوئے۔

ابھی تک یہ بات ثابت نہیں کی جا سکی ہے کہ مومن نے کس عمر تک تحصیل علوم درسیہ کی اور طب کی طرف کس عمر میں توجہ کی اور شطرنج کا شغل کب ہوا۔ اگر ڈاکٹر صاحب اس ذیل میں کوئی ثبوت مہیا کر دیتے تو یہ مسئلہ طے ہو جاتا لیکن موجودہ صورت میں ہم اس رائے کو تسلیم نہیں کر سکتے کہ طب کے بعد نجوم کی طرف متوجہ ہوئے، شطرنج پر تھوڑے عرصے میں حاوی ہونا بھی وضاحت طلب ہے، تھوڑے عرصے کا اندازہ کس طرح ہوا؟

ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ.... مومن کو.... اپنی شرافت اور نجابت کا ہمیشہ احساس رہا۔

اس کے کلام سے یہ بات ثابت نہیں ہوتی، مثنویات میں مومن نے اعتراف کیا ہے کہ والد اور چچا ان کے رویے سے برہم تھے۔ چنانچہ مثنوی ''شکایتِ ستم'' میں واقعات نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:-

ہم کو بدنام کر دیا تونے اے زبوں کار کیا، کیا تو نے
عزت و شانِ خاندان کو دیکھ جا ہم اوجِ آسماں کو دیکھ

مومن نے بار بار کوچۂ عاشقی میں قدم رکھا اور خاندان کو بد نام کیا، مومن کے فارسی رقعات میں ایک رقعہ یہ بھی ہے:-

چوں معاملہ با کنیزان گرامی نسبت از ہمہ بیش تر دارم، حیرانم تہمت بدمعاملگی بخویشتن بر زبانِ قلم چرا رفت . . . الحمد للہ کہ در قبائل خود ممتازم و سرفراز . . . امید دارم کہ دیگر بار بکدام کار ساسور نہ گردم . . . .

آخر کنیزوں سے مومن کو کیوں متہم کیا گیا اور مومن نے اپنی

صفائی میں شرافت خاندانی کا کیوں حوالہ دیا ، وہ خود مثنوی ''تفِ آتشیں'' میں کہتے ھیں کہ میں ایک شادی کی مجلس کا مہتمم تھا ، دروازے تک جانا تھا وھاں ایک نظر لڑ گئی :—

چلمن اُٹھا کر وھیں گرا دی ایک جھلک سی اپنی دکھا دی

شیفتہ اُس کی داستانِ محبت فخریہ بیان کرتے ھیں ۔ صاحب امۃالفاطمہ طوائف ھے اور مومن اس سلسلے کی اسیری بھی فخریہ بیان کرتے ھیں ۔ شرافتِ خاندانی کا احساس اگر غالب رھتا تو مومن کی زندگی پاکبازانہ رھتی ، ھاں اور تو اور مومن کے پھوپھا حکیم عزیزاللہ صدیقی مومن سے ناراض تھے ۔ وجہ معلوم نہیں ھو سکی ، ممکن ھے کہ مومن کے رویے سے بیزار ھوں !

''ایں ماہ ھفت نوبت بعیادت جناب ممدوح بخانہ رسیدم و محروم دیدار باز گشتم''۔

ایک ماہ میں سات بار عیادت کو جانا اور حکیم عزیزاللہ کا ملاقات نہ کرنا ، ان کی برھمی کو ظاھر کرتا ھے ، حکیم احسن‌اللہ خاں ان ھی حکیم عزیزاللہ کے بیٹے تھے ، بہر حال مومن معزز اور محترم خاندان سے تھے لیکن اپنی شرافت کا احساس اُنھیں ھو یہ امر مشتبہ ھے ۔

ڈاکٹر صاحب کی رائے ھے کہ اس سلسلے میں غالب کو جو پریشانیاں اٹھانی پڑیں ، اُس سے مومن کو دو چار نہیں ھونا پڑا ۔

مومن کی مالی حالت خراب تھی جیسا کہ ھم اُوپر لکھ چکے ھیں ، غالب کی مالی حالت بہتر تھی ، اس لیے یہ تقابل درست نہیں ۔ فاضل مقدمہ نگار نے لکھا ھے :—

ساری زندگی حُسن سے صحت مندانہ دلچسپی لیتے رھے ۔

یہ رائے غلط ھے ، معاصرین یہی لکھتے ھیں کہ آخر میں پاکبازانہ

زندگی گذارنے لگے تھے - کریم الدّین طبقات شعراء ہند (۱۸۴۷ء) میں لکھتے ہیں :-

اب پابند نماز ، روزہ کے بھی بہ نسبت سابق کے بہت ہیں - ۱۲۴۶ھ تک وہ عاشقانہ زندگی کے حالات مثنویوں میں لکھتے رہے - شیفتہ نے ۱۲۵۰ھ میں اُن کی عشق پسند طبع کا حوالہ دیا ہے ، اسی زمانے میں اُن کا رحجانِ طبع تبدیل ہوا اور وہ عشق بازی سے کنارہ کش ہو گئے - ڈاکٹر صاحب مذہب کے بارے میں (صفحہ ۱۲) لکھتے ہیں :-

کبھی بھی مذہب سے بیگانہ نہ ہو سکے بلکہ اُن کی اس مذہبیت نے اس حد تک ترقی کی کہ وہ مولانا سید احمد بریلوی کے مرید ہوئے اور بلوجود رندی کے ساری زندگی جہاد کا دم بھرتے اور شہادت کی آرزو کرتے رہے -

کبھی بھی مذہب سے بیگانہ نہ ہوسکنا کیا معنی رکھتا ہے ؟ اردو کے قدیم شعرأ میں سے کسی کی نسبت یہ دعویٰ نہیں کیا گیا کہ وہ مذہب سے بیگانہ رہا ، پھر اس فقرے کے لکھنے کا کیا مقصد تھا - مذہبیت کا ترقی کر کے مریدی کا درجہ حاصل کرنا ، عجیب نظریہ ہے - مومن رندی میں انفرادیت نہیں رکھتے تھے بلکہ اس عہد کے قریباً بیشتر شعراء اسی زمرے میں داخل ہیں - پیری مریدی مذہبیت کا آخری درجہ تو نہیں ، جہاد کی آرزو تو عمومیّت رکھتی ہے، ہاں اس جذبے کا عملی اظہار مذہب سے شیفتگی ظاہر کرتا ہے - مومن رندی کی طرف مائل رہے ، وہ مرید ہو کر بھی عشق بازی سے باز نہ آئے - مومن نے نوجوانی میں بیعت کی تھی اور سید احمد شہید کے ہمراہ جہاد کو بھی نہ جا سکے ، صرف جہادیہ مثنوی کہ کر فریضۂ جہاد سے سبکدوش ہوگئے - ''مومن علم سے دلچسپی رکھنے کے باوجود عالم نہ ہو سکے'' (صفحہ ۱۳) ، یہ رائے فاضل ڈاکٹر صاحب کی عجیب ہے ، اس سے پہلے شاہ عبدالقادر صاحب سے درسیات کی تکمیل کرنا لکھ

کر پھر یہ لکھنا کہ عالم نہ ہو سکے ، تضاد پیدا کرتا ہے ۔ درسیات کے کامل کو ہم عالم کے نام سے موسوم کرتے رہے ہیں ، پھر مومن کو درسیات کی تکمیل کے بعد بھی عالم کا درجہ حاصل نہ ہوا ، کیوں ؟ حقیقت یہ ہے کہ مومن نے کچھ درسی کتب ضرور پڑھی تھیں ، قوت حافظہ بدرجۂ کمال تھی اس لیے کچھ نہ کچھ معلومات علمی ضرور رکھتے تھے جیسا کہ فارسی رقعات اور قصائد سے ظاہر ہوتا ہے لیکن وہ علوم درسیہ کی تکمیل نہ کر سکے تھے اور عالم نہ تھے ۔ ڈاکٹر صاحب یہ بھی لکھتے ہیں کہ :۔
مومن نے اپنی زندگی میں ایک خاص سطح سے کبھی بھی اپنے آپ کو نیچے نہیں گرایا ، وہ کسی کے دربار میں نہیں گئے اور قصیدے کو ہمیشہ کارِ ہوس پیشگاں سمجھا ، انھوں نے کسی کے ماتحت رہنا پسند نہیں کیا کیونکہ اس سے انفرادیت مجروح ہوتی تھی ۔

یہ دعویٰ کہ وہ کسی دربار میں نہیں گئے ، صحیح نہیں ۔ ایک رقعہ فارسی جس میں عنوان نامہ معیّن نہیں ہے مصاحبت کا حال ملتا ہے ، یہ خط غالباً نواب فیض محمد خاں (متوفی ۱۲۵۱ھ) یا ان کے بیٹے نواب فیض علی خاں (متوفی ۱۲۶۰ھ) والیٔ جھجر ، (بادلی ، کانوڈہ ، نارنول ، کانٹی) کے نام ہے جس میں دربار سے علاحدگی کے اسباب کی تشریح کی ہے ۔

از سہ ماہ بے التفاتی و سر گردانی و کمی عنایات و فزونی نامہربانی ، با ایں سادہ دل بہ منصۂ ظہور رسید ، چندے بہ تقاضائے صاف دلی ، آئینہ باطنی غبار اوہام بے جا بیاد ، دادم و اغماض و اعراض را بے تکلفی و معاملت خاص نام نہادہ ، رفتہ رفتہ ، گماں بہ ظن و ظن بہ پایۂ یقین رسید ، آں زماں از خوابِ غفلت بیدار شدم ... ترک وطن و اختیار سکونتِ غربت دلیل قاطع و دویمی سپاس داری و شکر گزاری علیل نہاداں ، حجتِ ساطع آمدیم بر حرف طمع بجائے ایں جا ، بے جا ، عالم الغیب و دانائے اسرار گواہ است ، ''وکفیٰ باللہ شہیدا'' کہ ایں چنیں خیالِ خام در خواب ہم بخلوت خانۂ دلم راہ

نیافته ، تا بزبان چه رسد و اگر طینت اہلِ زمانه که بالکلّیه مگس طینت اند بودے، رفاقتِ آقائے قدیم را به پاسِ نعمت ، صحبت سراسر تعلیم که بارِ خاطرِ عنایت می فرمودند خیر باد نگفتمے و اگر گمانِ عدم ازالهٔ مرض کنم بست سودائے شر شار بخویشتن کرده باشم و تقلید آخر حال فاریابی واجب دانسته زیرا که فنائے ہر شیٔ باختیار واجب الوجود حکم مطلق است ، و معنیٔ حذاقت آں ، که خطا در رائے کمتر افتد ، نه ایں که خون ملک‌الموت بر گردن باشد و تلف کارخانه بحیطهٔ تصرفش بود اگر کسے بالفرض لقمان روزگار است به ادائے (کذا) دهم مفرط ناچار و اگر همه افلاطونِ زمانه به تدبیر جہل مرکب ، بیکار به دعویٔ عیسیٰ نفسی لب کشاده ام ، و کجا لافِ جاں بخشی دادهٔ فی‌الجمله موجب ملال خاطر صفاجو و بے تمیزی و نالائقی ایں ہیچ مداں است و دریں صورت خدمت گذاری و پاسداریٔ ہر گونه رائیگاں ۔

اس خط میں مومن نے ملازمت کے تین ماہ کا تذکرہ کیا ہے جن میں اغماض اور اعراض سے کام لیا گیا ہے اور مومن اسے بےتکلفی پر محمول کرتے رہتے ۔ جب انہیں بے اعتنائی کا صحیح اندازہ ہوا تو آخرالامر ترک ملازمت کر کے وطن آگئے ۔ ان کے آنے کے بعد نواب صاحب نے اسباب ترک ملازمت معلوم کیے اور یہ خیال ظاہر کیا کہ شاید علاج میں ناکامی ترک ملازمت کا باعث ہوا یا مشاہرے کی کمی وغیرہ ۔ مومن نے اس خط کے جواب میں ترک ملازمت کا سبب بے اعتنائی قرار دیا ۔ اس ملازمت کے علاوہ اور کوئی ملازمت ثابت نہیں ہوتی لیکن دربار سے دلچسپی انہیں ضرور رہی ۔ وہ دربار تک کیوں نہ پہنچے ؟ اس کے خاص وجوہ تھے ۔ ہم یہاں صرف اس قدر کہ سکتے ہیں کہ لکھنؤ اور ریاست حیدر آباد کے درباروں کی کشش نے انہیں ترک وطن پر آمادہ کر دیا تھا ؛ چنانچہ تقریباً ۱۲۳۹ھ کے آغاز میں انھوں نے اپنے چچا غلام حسن صاحب کو ایک خط لکھا ہے :—

وچوں دریں دیار خراب که بدست کفره جاہل بے قدر افتاده ،

قدر شریف و نجیب حکم کیمیا گرفت و دولت و اقبال ترجمہ عنقا شد ۔ لا جرم سفر لکھنؤ صواب دید خاطر اگر دراں جا رشتۂ مطلب گرہ کشود نیکوتر ورنہ عزم آں دیار ہم بدل می خواھد کہ بسیار کس قدر دانی راجہ چندو لال بہادر نسبت باریابِ کمال سیما شعرأ وا نمودہ اند و ایں ہیچ مداں را بوئے ازیں گلزار بہ دماغ اندیشہ رسیدہ ۔

قصیدہ گوئی کو مومن عیب جانتے تھے؟ یہ مسئلہ تصفیہ طلب ہے ۔ راجہ اجیت سنگھ کی تعریف میں ادائے شکر گذاری میں قصیدہ لکھنا اہم نہ سہی لیکن نواب وزیر الدولہ کی مدح میں قصیدہ لکھنا کیا معنی رکھتا ہے؟ کلیات مومن کی ورق گردانی سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ دوستوں اور شاگردوں کی تعریف میں بھی مبالغے سے کام لیتے تھے ۔ اگر کسی علمی دربار تک اُن کی رسائی ہو جاتی تو وہ ذلت نہ سمجھتے تھے، اُن کے احباب شیفتہ اور مفتی صدر الدّین خاں آزردہ نے انھیں دھلی سے نہ نکلنے دیا اور اس علمی مجلس کی کشش انھیں دھلی سے باھر جانے سے روکتی رھی اس لیے ڈاکٹر صاحب کا یہ فیصلہ درست نہیں کہ انھیں درباداری اور قصیدہ گوئی سے نفرت رھی ۔ نواب وزیر محمد خاں والیٔ ٹونک کی مدح کے اشعار سے اندازہ کیجیے کہ اس میدان میں دوسرے مدح نگار شاعروں سے ممتاز نہیں تھے :— (صفحہ ۳۸ کلیات مومن)

مدح خوانِ شہ وزیر لقب — ختم جس پر ہوئی سخن دانی
کیا کہوں اس کے دست کی ھمت — میں گھر باری و زر افشانی
مور کو وہ جواد دے ڈالے — شوکت و حشمتِ سلیمانی
بخشش بے شمار سے مشکل — ہے دبیرِ فلک کو دیوانی
اس کے ھے روزگار میں یکساں — ابر کو بہمنی و نیسانی
گرگ نے دورِ عدل میں اس کے — سیکھ لی راہ و رسم چوپانی
اس نے شمشیر جب علم کی ھے — گاؤ گردوں ہوئی ھے قربانی

(۲) دیوان مومن فارسی | دیوان مومن (فارسی) - فارسی کلام مومن حکیم محمد احسن اللہ خاں نے فراہم کیا ، وہ دیباچۂ دیوان میں لکھتے ھیں :-

در ایام حیات بہ حکم استغنا کہ لازمۂ کمال است بگفتن شعر بزبان دری و ھرچہ گفت ، آں را بہ فراھم آوری کمتر پرداخت مع ھذا ایں ھم از آثار قوت طبع رواں و اسرار سرعت رسائی آں ھمہ داں است کہ در عالم مرض الموت کہ بہ عارضۂ افتادن از بام و صدمۂ شکستن استخواں ساعد رنجور بود و از تحریر معذور ، چوں از جانب ایں بے دست گاہ خاکسار نامہ سیاہ احسن اللہ در باب صیقل گریٔ مرات ردیفہائے باقی حروف تہجی ابرام رفت در چنیں ضیق فرصت کہ ازاں وقت تاحین وقوع فشار قبر یک دو ھفتہ مدت بیش نبود در قبول التماس مضائقہ نہ فرمودہ ، دست بہ پیوند شکستگی حائل گردن و زبان دراں خستگی غزل سرا ، او می گفت و دیگراں نوشتند، دانش منداں کار آگاہ دانند کہ بدیں ساں گفتن نہ کار ھر کس است (اردوئے معلی،جلد نمبر ۴ و ۵ مئی ۱۹۰۵ء حسرت موھانی و نسخہ دیوان مومن فارسی دیباچہ صفحہ ۳ مطبوعہ و مملوکہ یونیورسٹی لائبریری پنجاب مطبوعہ مطبع سلطانی) -

(۳) انشائے مومن خاں (فارسی) | مومن کی فارسی نثر کا مجموعہ بھی حکیم محمد احسن اللہ خاں نے ترتیب دیا ھے، لال قلعہ دھلی کے بادشاھی مطبع سلطانی میں ماہ رمضان المبارک ۱۲۷۱ ھجری میں چھپا ، صفحات ۲۵۶ ھیں ، مملوکہ یونیورسٹی لائبریری لاھور -

(دیوان فارسی اور انشائے فارسی عبدالرحمٰن آھی کے مکتوبہ نسخے رضا لائبریری رام پور میں موجود ھیں) -

غیرمطبوعہ تصانیف (۴) جان عروض | فن عروض میں ایک رسالہ مومن خاں نے تالیف کیا تھا جس کی نسبت منشی امیر اللہ تسلیم (شاگرد اصغر علی خاں نسیم دھلوی شاگرد مومن) کا بیان ھے کہ میں نے نسیم کے پاس دیکھی تھی ، ابھی تک یہ رسالہ دستیاب نہیں ھوا ھے -

(۵) شرح سدیدی و نفیسی - حکیم مظہر علی سہسوانی کی تحریک پر سدیدی اور نفیسی کی شرح لکھی تھی ، یہ کتاب حکیم مظہر علی مرحوم کے خاندان میں موجود تھی ، اب پتا نہیں کہاں ہے - (صفحات ۶۴ و ۶۵ حیات مومن)

(۶) خواص پان - یہ رسالہ پان کے خواص کے بارے میں لکھا تھا ، طباعت کی نوبت نہ آئی ، مومن کے خاندان میں یہ رسالہ موجود تھا - (صفحہ ۶۵ حیات مومن مؤلفہ عرش) -

(۷) کلام غیر مطبوعہ مومن - حکیم منور علی آشفتہ شاگرد مومن الور میں مقیم تھے، ان کے نام کچھ خطوط اور سو ڈیڑھ سو غزلیں الور کے کتاب خانے میں موجود تھیں، اب پتا نہں یہ مجموعہ کہاں گیا (بیان حامد حسین نبیرۂ آشفتہ صفحہ ۶۵ حیات مومن مؤلفہ عرش) -

چوتھا باب

شاگردانِ مومن

۱ - آشفتہ حکیم سید منور علی، سید علی نواز رضوی کے بیٹے تھے، دھلی میں پیدا ہوئے، فن طب حکیم غلام حیدر خاں سے حاصل کیا اور طب میں اچھی مہارت پیدا کی۔ بقول شیفتہ آشفتہ تخلص کی تاثیر سے آشفتہ مزاج اور شوریدہ طبع تھے اور ان کے خمیر میں شورِ عشق کا نمک پڑا تھا (گلشن بے خار صفحات ۱۳ و ۱۴)۔ کریم الدین (تذکرۂ شعرائے اردو صفحہ ۳۵۸) کا بیان ھے کہ سادات بارہ سے ھے، مؤلف سے ماہ مارچ ۱۸۴۶ء میں درمیان میرٹھ کے ملاقات ہوئی تھی، ڈگری نویسی عدالت محکمۂ صدرالصدوری کی اس کو مفوض ھے، بہت ذی ہوش اور عقلمند اور ذہین آدمی ھے، نواب مصطفیٰ خاں کے شاگردوں میں سے ھے، اب عمر اس کی قریب چالیس برس کے ھے۔

مؤلف حیات مومن (صفحات ۶۶، ۶۷) لکھتے ھیں کہ آشفتہ کے پوتے حامد حسین بونڈری آفیسر ریاست دتیا ضلع بندھیل کھنڈ کا بیان ھے کہ آشفتہ مومن کے شاگرد تھے، تجارہ علاقہ الور کے رھنے والے تھے اور شیفتہ کے مصاحب تھے اور ان کے نام مومن کے خطوط غیر مطبوعہ بھی ھیں۔

صاحب گلستان سخن کا کہنا ھے کہ فن طب میں حکیم غلام حیدرخاں کے شاگرد اور فن سخن میں مومن خاں مومن سے تلمذ رکھتے ھیں (صفحہ ۱۲۴)۔ تاریخ وفات معلوم نہ ہو سکی، نمونہ کلام یہ ھے:

پرسش حال نے پھر یاد دلائی اس کی
گور میں بھی پس مردن نہ کچھ آرام آیا

۲۔ آہی میر عبدالرحمٰن۔ ان کے والد مومن کے شاگرد رشید میر حسین تسکین تھے، صاحب گلستان سخن (صفحہ ۱۳) کا بیان ہے ''جوان متین، صاحب اخلاق حمیدہ و اطوار پسندیدہ، وجاہت ظاہری کا بیان کروں، یا خوبی ہائے معنوی کا ذکر زبان پر لاؤں، کمال ذہانت سے ہر فن کے ساتھ ایک مناسبت تام ہے۔ کتب درسیہ جناب اوستادی مولانا و مخدومنا مولوی امام بخش صہبائی سلمہ اللہ تعالیٰ سے تمام و کمال پڑھیں اور فن معما کو نہایت تحقیق و تدقیق کے ساتھ جناب موصوف سے حاصل کیا، فہم اس فن کا جیسا اس صاحب ذکا کو دیکھا گیا، کم کسی کو ہوگا۔ گاہ گاہ فکر شعر بھی کرتا ہے...'' آگے مومن کے حالات میں صابر لکھتے ہیں (صفحہ ۳۴۴) کہ مومن کے فارسی دیوان کی تبئیض آہی کے سپرد ہے اور حکیم احسن اللہ خاں کے اہتمام سے چھپنے والا ہے۔

نساخ سخن شعرا (صفحہ ۵۸) میں لکھتے ہیں ''شاگرد مومن فن معما میں اچھا دخل رکھتے ہیں''۔

مؤلف خمخانۂ جاوید کا بیان ہے ''شاگرد و برادر زادہ حکیم مومن خاں سرکار رام پور سے وظیفہ پاتے تھے، عربی فارسی کی تحصیل عالمانہ درجہ تک پہنچی ہوئی تھی، صاحب مذاق سلیم، سخن فہم بے نظیر، بڑے طباع، خلیق، ملنسار اور زندہ دل لوگوں میں تھے، مومن مرحوم نے انھیں متبنیٰ کر لیا تھا، عزیز آبادی بیگم کی حویلی میں جو مشاعرے غدر بعد ہوتے تھے، ان میں آپ میر مشاعرہ تھے، وہیں یہ مصرع طرح ہوا تھا:

گر شوق بڑھ گیا تو گھٹایا نہ جائے گا

اکثر سخن سنجان گرامی کے زعم میں ان جیسا سخن فہم کوئی کم ہوا ہوگا، ۱۸۷۹ء کے قریب انتقال فرمایا۔

عرش گیاوی صاحب حیات مومن لکھتے ہیں (صفحہ ۶۲) ناصر صاحب نبیسہ مومن کا بیان ہے کہ آپا میمونہ بیگم مرحومہ تسکین کی پوتی، آہی کی دختر تھیں، ان کے پاس اصل دیوان مومن تھا، پھر عبدالصمد صاحب کے ہاں پہنچ گیا جو کالے صاحب کے گھرانے سے ہیں۔ آہی کو مومن صاحب کی حقیقی بہن کی لڑکی بیاہی تھی، آہی نے کلیات مومن کا جو خاتمہ لکھا ہے اس میں برادر زادگی کے علاوہ متبنیٰ ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور مومن کی بہن کی لڑکی آہی کو منسوب تھیں، چنانچہ دیوان فارسی میں مومن کا قطعۂ تاریخ اس شادی کا کا ملتا ہے:

پور و دخت برادر و آختم ہر دو نیکو خصال، نیکو طور
داد شاں را وصال قاضیٔ چرخ رقص کرد آسماں بخوبی دور
زد رقم بر فلک، دبیرِ فلک قمر و زہرہ جا گرفتہ بہ ثور
۳۴۰ + ۲۱۷ + ۷۰۶ = ۱۲۶۳ھ

نمونۂ کلام ملاحظہ ہو:

ہے غلط دھوم کہ نکلا تھا وہ گھر سے باہر
شہر میں چاک کسی کا تو گریباں ہوتا
اٹھ کہیں، ہے آمد، آمد اس ستم گر کی وہاں
اہل محشر مجھ کو یہ مژدہ سنا کر لے گئے

(متوفی ۷ محرم ۱۲۷۱ھ)

۳۔ اصغر | "اصغرعلی خاں ابن عبداللہ خاں ظریف شاعر خوش مذاق ہیں، آفرینش مضامین عاشقانہ میں طاق ہیں، مومن خانصاحب مرحوم دہلوی کے شاگرد رشید، اڑتیس برس کی عمر پائی، بارھویں رجب کو بارہ سو تہتر ہجری میں عارضۂ خناق سے انتقال ہوا"۔ یہ بیان امیر مینائی کا ہے (انتخاب یادگار صفحہ ۲۵)۔ نبیرۂ اصغر صاحبزادہ محمود علی خاں مرتب دیوان اصغر کا بیان ہے:—

جد امجد صاحبزادہ اصغر علی خاں بہادر اصغر، مرحوم و مغفور (نواب محمد عبداللہ خاں ظریف) کے فرزند اکبر تھے، آپ کا قیام زیادہ تر دھلی میں رہا اورحضرت جلال الدین محمد بہادر شاہ کی حضوری اور شاگردی کا فخر حاصل ھوا، فن شعر میں حکیم مومن خاں مومن دھلوی سے مشورہ فرماتے تھے، اپنے والد ماجد کی حیات میں بحالت سفر دھلی مرض خناق سے رجب۱۲۶۶ھ مطابق ۱۸۵۰ء میں بہ عمر ۳۸ سال قصبہ دلدار نگر میں جو میرٹھ اور دھلی کے درمیان واقع ھے، انتقال فرمایا، انتقال سے دو گھنٹے قبل یہ شعر اپنے حسب حال لکھا:

دم آ رھا گلو میں مرے انتقال کر
جھگڑا گلے پڑا ھے تو آ، انفصال کر

جنازہ دلدار نگر سے دھلی لایا گیا اور حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کے مزار کے احاطے میں دفن کیے گئے۔ (دیباچہ دیوان اصغر مع دیوان عاقل، خلف اصغر شاگرد سالک و غالب مطبوعہ نظامی پریس بدایوں)۔

آزاد نے نواب عبداللہ خاں صدر الصدور والد اصغر کا حال حاشیۂ صفحہ ۳۶۸ (آب حیات طبع پانزدھم ۱۹۵۰ء) پر ذوق کے سلسلے میں کیا ھے کہ شہیدی نے ناسخ کے بعد ذوق کا درجہ رکھا تھا اور عبداللہ خاں نے یہ بیان استاد ذوق سے کیا کہ ناسخ کی اس چمن کی شاخ میں کہنا مشکل ھے اور ذوق نے جواب میں غزل لا جواب کہی (صفحہ ۳۶۸) اور حاشیۂ صفحہ ۲۶۸ (آب حیات) پر لکھتے ھیں کہ نواب اصغر علی خاں اصغر شاگرد مومن جنھوں نے پھر نسیم تخلص کیا.....

یہ آزاد کو دھوکا ھوا ھے، نواب اصغر علی خاں اصغر شاگرد مومن خلف نواب عبداللہ خاں ظریف خلف نواب غلام محمد خاں ابن نواب فیض الدین صاحب والئ رام پور ھیں۔ شیفتہ کے تذکرے میں ان کا بھی حال نہیں ملتا، غالباً

مشق سخن انھوں نے بعد میں کی ، ھاں مومن کے کلیات میں ان کا تذکرہ دو جگہ آیا ھے ، کلیات مومن صفحہ ۲۰۱ (اردو طبع پنجم نولکشور پریس ۱۹۲۳ء) میں ایک قطعہ صحت ھے :

گیا رنج نواب اصغر علی خاں مبارک سلامت ، سلامت مبارک
ھوئی محو اب سستی و ناتواقی رجوع قوا ، عودِ صحت مبارک
معالج ھوا فکر درماں سے فارغ مجھے فکر تاریخ صحت مبارک
حساب اس سخن کا تو کرلیں، جو لب نے کہا اعتدالِ طبیعت مبارک

دوسرا قطعہ دیوان فارسی (مخطوطہ رضا لائبریری رام پور) میں اس عنوان سے ملتا ھے :-

تاریخ نجات یافتن کشتی اصغر علی خاں

خاں اصغر علی سحاب کرم آب از شرمِ جود او نیساں
برد از کینہ ، کشتیش گرداب بحر در شکِ کف گہر افشاں
آخر از کردہ اش ، پشیماں شد خوبروں داد ، از حیا طوفاں
بر گذارش رساند بادِ مراد خوش بر آمد مراد اھل جہاں
حاسد نا خدائے شد غواص آں قدر داد گوھر غلطاں
شدم اندر خیال سال نجات قطرہ زن بر کنارِ آبِ رواں
دل دھی کرد موج و گفت شمار جوش دریائے رحمتِ یزداں

آزاد کو اصغرعلی‌خاں اصغر اور اصغر علی خاں نسیم کے ناموں میں مشارکت کی وجہ سے دھوکا ھوا ، آزاد کی اس روایت کو صاحب گل رعنا نے (صفحہ ۳۸۹ طبع سوم) بھی نقل کیا ھے :- پہلے اصغر تخلص کرتے تھے ، بعد میں نسیم اختیار کیا ۔

مذکورہ بالا دونوں قطعات سے یہ واضح ھوتا ھے کہ یہ اصغر علی‌خاں بہادر خلف نواب عبداللہ خاں صدرالصدور سے متعلق ھیں چونکہ دیوان فارسی

میں نواب عبداللہ خاں سے متعلق بھی ایک قطعہ صحت پایا جاتا ہے جو درج کیا جاتا ہے (مخطوطہ دیوانِ مومن فارسی رضا لائبریری)

تاریخ صحت نواب عبداللہ خاں صاحب صدرالصدور

هرچه از تپ رفت بر یار عزیز — بر دلم از آہِ آتش یار رفت
چند روزے ناتوانی کرد زور — قوت از جسم نزاکت بار رفت
تازه تاثیر دعا پائے سحر — گرمی ازتن، زردی ازرخسار رفت
بهر سال اعتدالِ طبع او — بر فلک اندیشه ام صد بار رفت
گفت دل نواب عَبداللہ خاں — یافت راحت ها ، دگر آزار رفت

نواب عبداللہ خاں کے خاندان سے مومن کے ذاتی تعلقات کافی تھے، اصغر علی خاں اصغر شیفتہ کے بہنوئی تھے - مرتب کلیات شفیتہ و حسرتی (نظامی پریس بدایوں صفحات ۲۷ و ۲۸) لکھتے ہیں :-

نواب شیفتہ مرحوم کی چھوٹی همشیرہ صاحبزادہ اصغر علی خاں صاحب برادرزادۂ نواب جنت آرام گاہ (محمد سعید خاں) سے منسوب ہوئی تھیں، اس وقت سے نواب شیفتہ مرحوم اور ریاست رام پور میں باهم خاندانی مراسم قائم ہوگئے جو اب تک قائم ہیں - (قطعہ تاریخ فرزند مومن ملاحظہ ہو)

شیفتہ کے اس قریبی رشتے کی وجہ سے اصغر کو مومن سےاور بھی قربت حاصل تھی، اصغر کی جواں مرگی سے اس کا کلام معراج کمال پر نہ پہنچ سکا - موجودہ دیوان جس کو نبیرۂ اصغر نے طبع کرا دیا ہے، مسودے کی حالت میں تھا، اصغر کا کچھ کلام تلف بھی ہو گیا ہے، اصغر کے ذکر سے تذکرے خالی ہیں، چونکہ موت کے ہاتھوں جلد ہی دنیا سے جانا پڑا اور متعلقین نے توجہ نہ کی اسی لیے طویل مدت کے بعد کلام اشاعت پا سکا - اصغر کے کلام میں مومن کا رنگ جھلکتا ہے، نمونہ کلام پیش کیا جاتا ہے :-

کیا ہی بگڑیں گے وہ جب اور بھی ان سا ہوگا
آئینہ دیکھنے بیٹھے ہیں تماشا ہوگا
اصغر ہے جذب عشق مگر کیا اسے بلاؤں
گھر اژدہام شوق سے بازار ہو گیا
میں خوگر ستم ، وہ دل آزار ہو گیا
مرنا زیادہ جینے سے دشوار ہوگیا
تم تو کہتے ہو پھر ملیں گے کبھی
یاں بھروسہ نہیں ہے دم بھر کا
مظروف کو گھٹا نہ سکی ظرف کی کمی
کاہش سے دل کی شوق مرا کم نہ ہوسکا
تھیں جو قسمت میں ٹھوکریں کھانی
کیوں ترا سنگِ رہ گزر نہ ہوا
احوال کچھ نہ پوچھ دم جاں خراش کا
کرتا ہوں بات بھی تو کلیجہ سنبھال کر
ہے شرم انفعال لبِ جاں فزائے یار
فرقت میں بھی مجھے نہیں بنتی جیے بغیر

۴ ۔ اکبر | محمد اکبر خاں شیفتہ کے چھوٹے بھائی تھے، ان کی شاعری ۱۲۴۴ھ کے قریب شروع ہوئی ہوگی چونکہ شیفتہ گلشن بے خار (صفحہ ۲۴ نولکشور ۱۸۷۴ء) میں لکھتے ہیں کہ کچھ دنوں سے شعر سے رغبت ہوئی ہے، تمام اچھی صفات سے متصف اور حضرت مومن سے استفادہ کیا ہے ، مثنوی حنین مغموم ۱۲۴۴ھ میں مومن نے اپنے شاگردوں میں اکبر کو بھی شمار کیا ہے ۔ اکبر سے بھی مومن کے خصوصی تعلقات تھے۔ (اکبر و عظمت سرافراز سخن صفحہ ۳۵۴ کلیات مومن طبع ششم) ۔

کریم الدین (تذکرہ شعرائے اردو صفحہ ۴۵۲) کا یہ بیان ہے

که اکبر خاں کے برادر کلاں مؤلف گلشن بے خار نواب مصطفی خاں اکثر صفات حسنہ سے متصف ہیں، مدت سے فکر شعر و سخن کرتے ہیں۔

آزاد آب حیات میں شاگردان مومن کے ذیل میں لکھتے ہیں، ''شیفتہ کے چھوٹے بھائی نواب اکبر خاں کہ ۴ برس ہوئے، راولپنڈی میں انتقال کیا، شیفتہ نے چند شعر درج کیے ہیں، ان کا انتخاب یہ ہے:

سوچئے حضرت ناصح کوئی تدبیر وصال
حیف چارہ نہ کرے آپ سا دانا دل کا
عدو کے ذکر سے وہاں ہوش جائیں یا موت آئے
مزاج ان سے بھی نازک ہے اس قدر اپنا
قتل کر لاشۂ اکبر کو چھپایا گھر میں
بارے اس نے مجھے جانے نہ دیا اور کہیں''

۵- برق | قاضی نجم الدّین ولد قاضی سراج الدّین باشندہ سکندرآباد مقیم اکبرآباد، شاگرد مومن (صفحہ ۴۶ سخن شعرا) کریم الدّین تذکرہ شعرائے اردو صفحات ۴۲۹ و ۴۳۰ میں لکھتے ہیں، ''قاضی نجم الدّین نام، مولد اس کا سکندر آباد، نیک بنیاد، بہ فاصلہ بیس کوس جانب مشرق دھلی کے واقع ہے۔ عمر قریب بیس بائیس برس کی ۱۸۴۷ء میں رکھتا ہے—چند سال سے وارد شاہ جہاں آباد ہے۔ حلیہ اس کا یہ ہے تمام سر پر بڑے بال، سانولی رنگت مائل بہ سبزی، بلند قد، اکثر غرارہ دار پائجامہ پہننے سے شوق ہے، ایک لکڑی بھی گاھے گاھے ھاتھ میں رکھتا ہے، تفرج کناں بازار اور کوچوں میں اکثر پھرتا ہے گاھے گاھے اس عاجز سے بھی ملاقات ہوتی ہے، میر حسن تسکین کے شاگردوں میں جو کہ نامور شاگرد حکیم محمد مومن خاں صاحب کے ہیں، منسلک ہے، خیال صحیح رکھتا ہے اور نیک فکر ہے، بہت اچھا کہتا ہے، خوش طبع، شیریں کلام، ھنس مکھ، وارستہ مزاج، رندانہ مشرب ہے (حیاتِ مومن صفحہ ۷۵)۔ ان کے اشعار ہیں:

وحشی نے تیرے خاک اڑائی یہاں تلک
ملتا نہیں زمیں کا پتہ آسماں تلک
بزم اغیار ہے، ڈر ہے نہ خفا تو ہو جائے
ورنہ اک آہ میں کھینچوں تو ابھی ہو، ہو جائے

٦ - بیتاب | عباس علی خاں ابن نواب عبدالعلی خاں بن نواب غلام محمد خاں والیٔ رام پور (۱۲۰۹ھ) خوب صورت اور مہذب جوان ہے، ظاہر اور باطن یکساں ہے، ایک زمانے تک لکھنؤ میں رہا، اب چند سال سے دہلی میں قیام ہے، خان والا شان مومن خاں کے شاگردوں میں سے ہیں (گلشن بےخار صفحہ ۴۳)۔ انھوں نے آخر میں دیوان پر غالب سے نظر ثانی کرا لی، ٦ جون ۱۸۸۳ء (۲۹ رجب ۱۳۰۰ھ) کو انتقال ہوا۔ ریاست رام پور کے محکمۂ مرافعہ کے حاکم تھے، نواب کلب علی خاں خلد آشیاں کے حقیقی ماموں تھے، مومن کے خاص شاگرد شمار ہوتے تھے، بیتاب کی شادی کے قطعات تاریخ اردو اور فارسی میں کہے ہیں، اس سے خصوصی تعلق کا اندازہ ہوتا ہے اور غالباً بیتاب وغیرہ شاگردانِ مومن کے اصرار پر مومن نے رام پور کا سفر اختیار کیا ہو۔ قطعات تاریخ حسب ذیل ہیں:—

(مثنوی) عقد عبارت معانی باظہار سال نکاح یار جانی۔ (کلیات مومن اردو صفحات ۱۹۷ و ۱۹۸)۔

کہاں تک تغافل بس اے، بے خبر — خبر بھی ہے کچھ ساقیٔ بے خبر
شرابِ تمنا، پلا آج تو — ہوس پائے مردہ، جلا آج تو
وہ خاک فلک رتبہ، عباس نام — خجل جس کے جلوے سے ماہ تمام
نہ کیونکر ہو مہ اس کے جلوے سے داغ — ہے کس مہر تاباں کا چشم و چراغ
وہ عبدالعلی خانِ گردوں مکاں — جھکے جس کے آگے، سر آسماں
وصال دو مہ طالع و مہر اثر — قران دو نجم سعادت ہنر (۱۲۴۴ھ)

(بیتاب کے والد عبدالعلی خاں اور آسی کے چچا بہت پہلے دہلی میں

مقیم ہوئے تھے۔ چنانچہ کریم اللہ خان اپنے سفر نامہ (سیر کریمی مخطوطہ صولت پبلک لائبریری رام پور) میں لکھتے ہیں :— چہاردہم ربیع الاول ۱۲۴۰ھ این ماہ برخورداران راہی شاہ جہاں آباد شدند ، (مظفر علی خاں و جعفر علی خاں ابنائے نواب نظام علی خاں ، عبدالعلی خاں و حفیظ اللہ خاں و عبدالرحمٰن خاں اخلاف نواب غلام محمد خاں و عنایت اللہ خاں فرزند نواب فتح علی خاں) ۔ مرزا صابر بخش گلستان سخن میں رقم طراز ہیں :— "نواب عباس علی خاں خلف نواب عبدالعلی خاں، کہیں برادر نواب محمد سعید خاں رئیس رام پور ، رفعت شان کو پستی تواضع کی جمع اور سر بلندی مرتبت کو اخلاق کے ساتھ فراہم کیا ہے ، قلم حیران ہے کہ کس کس خوبی کا بیان کرے ، حسنِ خلق کو لکھے یا جمال صورت کا ذکر کرے ، خلق تو محمدی ہے اور جمال یوسفی ، رسائی فکر سے کنگرۂ عرش فرسودہ اور بلندیٔ طبع سے رفعتِ چرخ پست ، مضامین شوقیہ سے بلبل نو آموز اور کیفیت سخن سے ہوشیار مغزانِ پارسا طینت سرمست ، جب تک شہر کرامت بہر شاہ جہاں آباد کی سر زمیں اُس بلند مرتبت کے نقش قدم سے رشکِ گلشن تھی ، مومن خاں مرحوم مومن تخلص سے مشورہ کا اتفاق ہوتا تھا ، جب ریاست رام پور مسند نشینی نواب محمد سعید خاں سے نامی اور حکومت اُس سرور اقبال مسند کی ذات سے گرامی ہوئی، اُس نونہال گلشن اقبال نے اُس گل زمین کو اپنے قدم بہار توام سے سرسبز و شاداب کیا ۔ اُس وقت سے اس زمانے تک سخن گوئی کی بنا کو اپنے ہی زور طبیعت کی اساس پر بلند کیا ہے"۔ صاحب حیاتِ مومن کا یہ بیان غلط ہے (صفحہ ۴۷) کہ بیتاب اُسی زمانے میں مومن کے شاگرد بھی ہوئے ، جب وہ رام پور تشریف لے گئے تھے ، دیوان کا معدوم ہونا بھی غلط تحریر کیا ہے ۔

۱۲۵۰ھ سے بہت پہلے بیتاب دھلی میں بقول شیفتہ مقیم تھا ، ۱۲۴۴ھ میں بیتاب کی شادی ہوئی اور مومن نے قطعہ تاریخ کہا ، بیتاب کی شاگردی ۱۲۴۴ھ سے پہلے شروع ہو گئی تھی ، نواب محمد سعید خاں کی مسند نشینی

۱۲۵۶ھ مطابق ۱۸۴۰ء میں ہوئی، اس کے بعد شاگردی کا آغاز قطعاً غلط ہے۔ (بزم سخن میں سید علی حسن صاحب ۱۲۹۸ھ میں قیام دھلی غلط بتاتے ھیں) بیتاب کا مطبوعہ دیوان موجود ہے، اس صورت میں دیوان کا معدوم لکھنا قطعاً غلط ہے۔ نمونہ کلام یہ ہے:-

میں نے کہا تھا تم سے اٹھائیں گے مر کے ھاتھ
آخر فریب کھا کے کیا اس نے مجکو قتل

بیتاب غم بھی کھانے میں، اب کچھ مزا نہیں
پیدا ھوا رقیب کا غم دل میں ان دنوں

شبِ وصال بھی، اپنی یہی دعا ھوگی
سحر نہ دیکھنی ھم کو نصیب ھو یارب

۷۔ بیمار | شیخ علی بخش ابن شیخ غلام علی متوطن شہر باس بریلی، شاگرد میاں مصحفی، مرد خوش فکر و خوش مذاق، حسن کلام سے مشہور آفاق تھے۔ جب اس دارالریاست میں آکر سرکار کے ملازموں میں داخل ہوئے، یہاں احمد خاں غفلت کا دور دور تھا، مصلحتاً اُن کے شاگردوں میں شامل ہوئے۔ سرسٹھ برس کی عمر ھوئی، چوبیسویں ربیع الاول کو بارہ سو اکہتر ھجری میں رحلت کی، اس دارفانی سے دار باقی کی طرف نہضت کی، کلام بہت تھا مگر تلف ھو گیا، (انتخاب یاد گار صفحات ۸۱، ۸۲ امیر مینائی)۔ نیز ملاحظہ ھو تذکرۂ شعرائے رام پور مؤلفہ صاحب (قلمی مملوکہ رضا لائبریری رام پور) ”بیمار، شیخ علی بخش متوطن قدیم بریلی مگر در رام پور وطن گزید۔ از علم بہرۂ وافی نداشت ھر آئینہ مشق بجائے رسانیدہ شعرھا می گفت“۔

معاصر تذکرہ نویس مرزا قادر بخش صابر نے بھی گلستانِ سخن میں مومن کی شاگردی کا ذکر نہیں کیا، وہ صرف یہ لکھتے ھیں:- بیمار تخلص ہے، شیخ علی بخش ساکن سنبھل کا، فارسی میں استعداد کامل ہے اور ریختہ گوئی میں مہارت تام، الفاظ کی شستگی اور زبان کی پاکی احاطۂ بیان سے خارج ہے۔ سرکار محمد سعید خاں والیٔ رام پور مس ناخن بندی وسیلۂ تحصیل معاش ہے اور رئیس مذکور کی فرمائش سے کوئی جلد بوستان خیال کی کہ افسانہ ہے عجیب اور داستان ہے غریب، اردو میں نظم کرتا تھا، معلوم نہیں اختتام کو پہنچایا

یا نہیں، یہ اشعار اُس کے نتائج ذہن وقار سے ہیں (صفحہ ۱۶۴ گلستان سخن)۔ [بیمار نے طلسم بیضا (بوستان خیال) کا ترجمہ ۱۲۵۸ھ میں کیا تھا، نظم شدہ بوستان خیال کا حوالہ نہ اور کسی نے دیا ہے نہ کوئی شعر ملتا ہے البتہ رضا لائبریری رام پور میں نثری ترجمہ قلمی موجود ہے]۔

البتہ نگار، مومن نمبر (۱۹۲۸ء) میں مومن کی شاگردی کا ذکر ہے اور حیاتِ مومن کے مؤلف عرش بھی (صفحہ ۴۷) یہ لکھتے ہیں کہ

نظام شاہ رام پوری کے تذکرۂ شعرا سے صرف اتنا پتہ چلا کہ یہ مومن خاں کے شاگرد تھے۔

نظام شاہ رام پوری کا کوئی تذکرۂ شعرأ دستیاب نہیں ہوا، البتہ نیاز صاحب (مدیر نگار) نظام رام پوری سے متعلقہ مخطوطہ ذخیرہ رام پور سے لے گئے تھے، اُن میں شاید کہیں حوالہ شاگردی مومن کا ہو۔ نظام، بیمار کے شاگرد رشید تھے اس لیے وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ مومن کی شاگردی صحیح ہے یا غلط۔ امیر مینائی نے لکھا ہے کہ مصحفی کے شاگرد تھے اور رام پور میں آئے تو مصلحتاً غفلت (متوفی یکم ذی‌الحجہ ۱۲۵۹ھ) کے شاگرد ہو گئے، مصحفی کی شاگردی کا بھی کلام بیمار سے کوئی ثبوت نہیں ملتا البتہ غفلت کی شاگردی کا بیمار نے اقرار کیا ہے اور اُس کی تائید بیمار کے اشعار سے ہوتی ہے:—

جانتا ہے معجزہ بیمار غفلت کا سخن
کون ہے دنیا میں ایسا معتقد استاد کا
نہ اصلاح جناب غفلت اے بیمار گر ہوتی
تو معنی بھی نہ رکھتا شعر کوئی مجھ سے نادان کا

(دیوان مخطوطہ بیمار رضا لائبریری رام پور)

نساخ نے (سخن شعرأ صفحہ ۷۷) نام الٰہی بخش لکھ کر علی بخش کو غلط بتایا ہے اور غفلت کی شاگردی ظاہر کی ہے۔

طور کلیم (صفحات ۱۹ ، ۲۰) میں سید نورالحسن خاں نام شیخ علی بخش وطن آنولہ متعلقہ کمشنری بریلی لکھتے ھیں کہ اوائل عمر سے شاعری کا خیال رکھتا تھا ، جوانی میں لکھنؤ میں پہنچا اور مصحفی کی شاگردی میں داخل ھوا ، نواب محمد سعید خاں نے اُس کی شہرت سن کر حکیم سعادت علی خاں جنرل فوج کی معرفت بلوایا ، نواب محمد سعید خاں کے اصرار سے اخوں زادہ احمد خاں غفلت کی شاگردی اختیار کی ، پر مغز کلام ھے اور بہترین اُستاد ھے، کتنے دیوان غزلوں کے اور قصیدے جمع کیے اور برباد کر دیے۔

مؤلف تذکرہ بزم سخن (صفحہ ۲۵) لکھتے ھیں کہ شیخ علی بخش بیمار سنبھل (مراد آباد) کے مشہور شاعروں میں سے تھا ، مصحفی کا شاگرد تھا ، رام پور افغانوں میں ملازم تھا، اُس کی قوت متخیلہ کی پرواز بیان سے باھر ھے، قوت بیان اور لطفِ بیان میں بیمار مصحفی اور میر سے اگر زیادہ نہیں ھے تو کم بھی نہیں، ھاں تقدم زمانی اور شے ھے۔

معاصر اور قریب العہد تذکرہ نویسوں کے بیانات کی عدم موجودگی میں مومن کی شاگردی کی نسبت ضعیف اور کمزور ھے (بجز تذکرۂ نظام شاہ نایاب) لیکن بیمار کا رنگِ کلام مومن سے مشابہ ضرور ھے - غالباً مومن کا سفر رام پور جس وقت ھوا ، بیمار بھی رام پور میں آ چکا تھا ، ممکن ھے بیمار نے اور کچھ غزلیں دکھائیں ھوں، اس طرح تلامذۂ مومن میں اُس کا شمار کرنا بے جا نہ ھوگا۔ پھر غفلت کا انتقال ذی حجہ ۱۲۵۹ھ میں ھو چکا تھا، اُس کے مرنے کے بعد مومن سے اصلاح ممکن ھے - چند اشعار پیش کیے جاتے ھیں جن سے اس کا رتبہ متعین ھو سکتا ھے :-

کون پرساں ھے حال بسمل کا — خلق منہ دیکھتی ھے قاتل کا
جانکنی عاشقی سے آساں ھے — کام مشکل ھے کاوشِ دل کا
مردنی پھر گئی مرے منہ پر — رنگ بدلا نہ اُن کی محفل کا
لبِ جو ، کون سیر کو آیا — موج منہ چومتی ھے ساحل کا

قحط شاید دردِ الفت کی دوا کا ہو گیا
زہر جو دینا مجھے ، اُن کو گوارا ہو گیا
کیا ہی چوکا ہوں نہ رازِ عشق کہنا تھا مجھے
بت پرستی کا کس و ناکس میں چرچا ہو گیا
امتحاں اُن کو لب جاں بخش کا منظور ہے
اب مجھے بھی اپنے جینے کا سہارا ہو گیا
جس کسی نے دل دیا اُن کو چھپے چوری دیا
ایک میں کمبخت ناداں تھا کہ رسوا ہو گیا
کھا گئے تھے وہ تو مجھ سے بے نقابی کی قسم
کیوں خداوندا قمر کا رنگ پھیکا ہو گیا
یار سے سوزِ جگر کا گلا کرنے کو تھے
رہ گئی عزت کہ دل میں درد پیدا ہو گیا
شک ہمیں اپنے صنم کی بے نیازی میں نہیں
دل کے لینے کا خدا جانے سبب کیا ہو گیا
ہائے رے شوخی کہ آ پہنچا جو وہ گھر تک مرے
پھر گیا درباں سے یہ کہ کر کہ دھوکا ہو گیا

(مکمل غزل از دیوان بیمار مخطوطہ رضا لائبریری رام پور)

سانس آہستہ لیجیو بیمار
ٹوٹ جائے نہ آبلہ دل کا

دل دھڑکتا ہے یہ کہتے ہوئے اُس محفل میں
یہاں کسی کو خفقاں کی بھی دوا آتی ہے

جنّت میں حیات ابدی خاک ملے گی
دنیا میں تو مانگے نہ ملی ، موت خدا سے

کہیں سنی ہیں یہ نازک مزاجیاں بیمار
کہ اُٹھ سکی نہ حسینوں کی التجا مجھ سے

کمند عشق میں جس پر یہاں اسیر کیا
عدم میں کیا وہ خدایا ہوئی خطا مجھ سے
نہ رہنے دے گی ، وحشت بتکدے میں
اٹھو بیمار جو مرضی خدا کی
اب اور آرزو نہ رہی ، اے خدا مجھے
کیا دردِ دل دیا ، کہ سبھی کچھ دیا مجھے
بیمار لے چکے ہیں ابھی تو وہ امتحاں
کم‌بخت پھر وفا کا تجھے حوصلا ہوا
مسجد میں پی شراب ، پڑھی دیر میں نماز
بیمار کو شعور کسی بات کا نہ تھا

۸ ۔ تسکین | میر حسین والد کا نام میر حسن عرف میرن ، آن کا سلسلۂ نسب میر حیدر خاں کاشغری قاتل حسین علی خان (امیرالامرا ۶ ذی حجہ ۱۱۳۲ھ) تک پہنچتا ہے ۔ میر حیدر کو مؤلف بزم سخن (صفحہ ۲۹) اور طور کلیم (صفحات ۳۱ ، ۲۲) فرخ سیر کا قاتل لکھتے ہیں اور شیفتہ (گلشن بےخار صفحہ ۱۴)، نساخ (سخن شعرأ صفحہ ۸۵) اور امیر مینائی (انتخاب یادگار صفحہ ۹۰) قاتل وزیر فرخ سیر لکھتے ہیں۔ حسین علی‌خاں فرخ سیر کے عہد میں بھی امیرالامرا تھا لیکن محمد شاہ کے عہد میں مارا گیا (تاریخ ہندوستان جلد نہم مولوی ذکاءاللہ صفحہ ۱۸۳)، مصنف گلِ رعنا بھی اس کی تائید کرتے ہیں (صفحہ ۳۲۲)۔

شیفتہ لکھتے ہیں ”صاحب فکر بلند اور اسلوب گفتار دلپسند ہے ، حضرت مومن سے اصلاح لیتا ہے اور میرے احباب میں سے ہے“ (صفحہ ۴۲)۔ مرزا قادر بخش صابر (گلستانِ سخن صفحہ ۱۷۴) زیادہ وضاحت سے کام لیتے ہیں ، وہ لکھتے ہیں :—

تسکین تخلص زبدۂ خاندانِ سیادت ، اسوۂ دودمان سعادت ، میر حسن ،

نسب اس زبدۂ سادات کرام کا میر حیدر قاتل وزیر فرخ سیر تک پہنچتا ہے۔ کتب فارسی کو جناب استادی مولوی امام بخش صہبائی سے پڑھا ہے اور چونکہ طبیعت نہایت موزوں تھی، شعر گوئی نے غلبہ کیا، اول اپنے کلام کو شاہ نصیر مرحوم کی نظر اصلاح میں گذارتا، جب کچھ سلیقہ اس فن میں بڑھ گیا، سررشتہ اصلاح کا چندے منقطع رہا لیکن پھر اپنے سخن کی تکمیل کے واسطے مومن خاں سے اصلاح لینی شروع کی، رفتہ رفتہ مشقِ کمال کو پہنچی اور طرۂ ایوان سخن کنگرۂ عرش تک۔ جو کج رفتاری فلک اہل ہنر کی دشمن اور کملائے فن کی عدو ہے، تلاش معاش کے ذریعے سے سفر رام پور کا اتفاق ہوا اور وہاں یا تو یہ آسان نہیں یا اس وقت یہ بخل سرشت کسی اور امر خطیر کی طرف متوجہ تھا، رئیس رام پور کی قدر شناسی سے سلسلہ نوکری کا بقدر رفاہِ حال منتظم ہو گیا۔ اس گل زمین کے شعرأ نے پاکیٔ زبان اور خوش فکری کو مقبول رکھا، بارہ سو ارسٹھ ہجری میں عالمِ شباب میں پیرزال دنیا کی صحبت سے بیزار ہو کر حورانِ بہشتی کی طلب میں روضۂ خلد کی طرف راہی ہوا، اسی سال میں چند روز پہلے مومن و عارف کے سانحۂ ناگزیر سے قدردانانِ سخن کا سینہ داغدار اور ہنر شناسوں کا دل افگار ہو چکا تھا کہ یہ واقعۂ جان کاہ و ملال و رنج اور مزید اندوہ کمال ہوا۔ قربان علی سالک نے تاریخ وفات اس طرح پائی کہ بطریق معما کے ان دونوں سانحۂ جاں گداز پر بھی اشتمال رکھتی ہے، مصرع :—

ارم میں، مومن و تسکین و عارف (۱۲۶۸ھ)

یعنی ان تینوں نام کے اعداد ارم کے اعداد میں شامل ہیں۔

نساخ (سخنِ شعرأ صفحہ ۸۵)۔ شاگرد نصیر و مومن اور کلام کی نسبت لکھتے ہیں کہ اشعار نمکین ہوتے ہیں۔

انتخاب یادگار میں (صفحہ ۹۰) امیر مینائی رقم طراز ہیں :— تسکین میر حسین ابن میر حسن عرف میرن صاحب . . . شعر گوئی کا جو شوق ہوا

ابتدا میں شاہ نصیر مغفور سے اصلاح لی ، انتہا میں مومن خاں صاحب مرحوم کے فیض سے مشق سخن آفرینی کمال کو پہنچی۔ وطن اُن کا دہلی ہے مگر اس دارالریاست میں سالہائے دراز نوکر رہے ، قدر افزائی رئیس قدردان سے نامور رہے ، پچاس برس کی عمر ہوئی ، شوال کی سترہویں تاریخ بارہ سو ارسٹھ ہجری میں قضا کی اور نواب احمد علی خاں بہادر مرحوم کے مقبرے کے قریب دفن ہوئے۔

صاحب گل رعنا کی رائے ہے (صفحہ ۳۲۲) ''کلام کا رنگ گواہی دیتا ہے کہ خاں صاحب کے شاگردوں میں یہ خاص مرتبہ رکھتے تھے ، اُستاد کی طرز ادا ، معاملہ نگاری اور شوخی کو روزمرہ کی صفائی اور سادگی کے ساتھ اس طرح سے ملا جلا دیا ہے کہ اُن کے کلام میں دل آویزی کی شان بڑھ گئی ہے اور مومن خاں کے ساتھ اس قدر ہم‌رنگی پیدا ہو گئی ہے کہ اگر ان دونوں کے کلام کو مخلوط کر دیا جائے تو ایک کے کلام (صفحہ ۳۲۳) کو دوسرے کے کلام سے تمیز کرنا دشوار ہو جائے گا''۔

جب دلّی میں گذر اوقات کا کوئی ذریعہ نہ رہا تو رام پور چلے آئے۔ نواب یوسف علی خاں ناظم تخلص نے قدردانی فرمائی (صاحب گل رعنا کا یہ خیال غلط ہے۔ نواب محمد سعید خاں کا دور حکومت ۱۲۵۶ھ تا ۱۲۷۲ھ ہے اور تسکین اُن کے زمانے میں آیا اور ۱۲۶۸ھ میں اُن ہی کے عہد میں قضا کی) ۔ میر عبدالرحمٰن آہی ان کے سعادت مند بیٹے تھے جنھوں نے شاہ نصیر کا دیوان مرتب کیا تھا، وہ نواب کلب علی خاں کے زمانے تک رام پور میں رہے ، حکیم مومن خاں مرحوم کے یہ بھی شاگرد تھے اور اُن کے دیوان کی تکمیل ان ہی کے ہاتھوں ہوئی ۔

صاحب حیاتِ مومن (صفحہ ۲۷) کا بیان ہے ، ''یہ دلّی کے ایک سپاہی زادے تھے اور مومن کے اُن سعادت مند تلامذہ میں سے ہیں جنھوں نے اول اول مومن کا دیوان صاف کیا تھا اور وہ نسخہ ہنوز موجود ہے جس کا ذکر کر چکا ہوں ۔ آہی انھیں کے صاحبزادے تھے ۔

''تسکین کی شاعری کی نسبت میرا یہ فیصلہ ہے کہ اگر ان کی زندگی وفا کرتی تو یہ میر مہدی مجروح کے برابر ہوتے، آج بھی اپنی شیرینیٔ زبان کے سبب ان کی شہرت ان سے کم نہیں - چند ابتدائی غزلیں علامہ صہبائی کو بھی دکھلائیں تھیں مگر جب مومن کے یہاں آئے تو انھیں کے نام پر خاتمہ ہوا، جوان ہی مرے، ایسے ایسے زبردست تلامذہ میں اگر کوئی بھی زندہ رہتا تو مومن دنیا سے ناکام نہ جاتے (عرش صاحب کا میر مہدی مجروح کے برابر ٹھہرانے کی کوشش تسکین کے درجے کو بلند نہیں کرتی - تسکین کا درجہ مجروح سے ہر صورت میں بلند ہے - مومن کا ناکام دنیا سے اٹھنا عجیب بات ہے حالانکہ مومن کے نام کی شہرت آج بھی غالب کے ساتھ مل رہی ہے، فائق) - صاحب تذکرہٗ کاملان رام پور لکھتے ہیں (صفحہ ۴۰۶) ''ولادت دھلی میں ۱۲۱۸ھ میں ہوئی اور مومن خاں سے نظم میں استفادہ کیا، طبیعت بہت پاکیزہ اور ذہن رسا تھا - تلاش معاش میں لکھنؤ گئے ناکام آئے - کئی سال میرٹھ میں رہے، رام پور میں آئے تو ریاست نے قدردانی کی، زمرہٗ ملازمین میں داخل ہوئے، سیکڑوں شاگردوں نے فائدہ حاصل کیا . . . . . آپ کے بیٹے میر عبدالرحمٰن کو مومن خاں نے فرزندی میں لیا تھا اور میر عبدالرحمٰن آہی نے مومن کا دیوان مرتب کیا تھا - آپ کا مختصر دیوان اردو ۲۷ صفحات کا کتب خانۂ ریاست میں موجود ہے . . . . . ان کے بیٹے میر عبداللہ غمگین نہایت حسین و خوبرو تھے، باپ کے ساتھ رام پور میں آ کر عملۂ عدالت میں نوکر ہو گئے تھے، تیس برس کی عمر میں ۱۲۶۶ھ میں ذی الحجہ کی ساتویں تاریخ انتقال ہوا، باپ بیٹوں کی قبریں برابر ہیں''- اب تسکین کے کچھ اشعار ملاحظہ کیجیے :—

کچھ نمک، کچھ مشک، کچھ الماس ہو اے چارہ گر
پھر خدا چاہے بھرے دو دن میں منہ ناسور کا

وحشت اب لاش کو لے بھاگے گی
تنگیٔ گور سے گھر یاد آیا

کوچۂ یار میں ہم نے تسکیں
پاؤں رکھا تھا کہ سر یاد آیا
اس سے بہتر تھا جو دوزخ میں ٹھکانا ہوتا
بزمِ دشمن میں ترے ساتھ نہ جانا ہوتا
جس وقت نظر پڑتی ہے اُس شوخ پہ تسکین
کیا کہیے کہ جی میں مرے کیا کیا نہیں آتا
بیٹھے تسکین تھے روٹھ کر ، وہ شوخ
دے کے دو جھڑکیاں اُٹھا لایا

تذکرۂ کاملان (صفحہ ۴۰۶) رام پور میں شوق لکھتے ہیں :—

میر حسین تخلص تسکین ولد میر حسن عرف میرن صاحب شاہجہان آباد کے رہنے والے ، آپ کا نسبی سلسلہ فرخ سیر بادشاہ کے وزیر حسین علی خاں کے قاتل میر حیدر سے ملتا ہے ، آپ کی ولادت دھلی میں ۱۲۱۸ھ میں ہوئی، فارسی کی تکمیل مولوی امام بخش صہبائی سے کی ، شاہ نصیر اور مومن خاں سے نظم میں استفادہ کیا ، طبیعت بہت پاکیزہ اور ذہن رسا تھا ، تلاشِ معاش میں لکھنؤ گئے ، ناکام آئے ، کئی سال میرٹھ میں رہے ، رام پور میں آئے تو ریاست نے قدردانی کی ، زمرۂ ملازمین میں داخل ہوے ، سیکڑوں شاگردوں نے فائدہ حاصل کیا ، شوال کی سترھویں تاریخ بارہ سو اڑسٹھ ھجری (۱۲۶۸ھ) میں رام پور میں انتقال کیا، جناب نواب سید احمد علی خاں صاحب بہادر کے مقبرے کے متصل دفن ہوئے ، پچاس برس کی عمر ہوئی، آپ کے بیٹے میر عبدالرحمٰن کو مومن خاں نے فرزندی میں لیا تھا اور میر عبدالرحمٰن آھی نے مومن خاں کا دیوان مرتب کیا تھا ، آپ کا مختصر دیوان اردو ۷۲ صفحہ کا کتب خانۂ ریاست میں موجود ہے ۔ قربان علی سالک نے تاریخ لکھی ہے ، مصرع :—

ارم میں مومن و تسکین و عارف

یہ تینوں شاعر ایک ہی سال میں مرے ہیں ، ان کے بیٹے میر عبداللہ غمگین نہایت حسین و خوبرو تھے، باپ کے ساتھ رام پور میں آ کر عملۂ عدالت میں نوکر ہو گئے تھے ، تیئیس (۲۳) برس کی عمر میں ۱۲۶۶ھ میں ذی الحجہ کی ساتویں تاریخ انتقال ہوا ، باپ بیٹوں کی قبریں برابر ہیں - کلام کا نمونہ انتخاب یادگار اور گلستانِ سخن قادر بخش صابر میں ملاحظہ ہو -

انتخاب از دیوان مخطوطہ مملوکہ رضا لائبریری رام پور :—

نام لو گے جو یہاں سے جانے کا — آپ میں پھر نہیں میں آنے کا
ہم کو طوفِ حرم میں یاد آیا — لڑکھڑانا شراب خانے کا
دم لے اے چشمِ تر کہ دیکھوں میں — عالم اس گل کے مسکرانے کا
دیکھ سکتے نہیں وہ حال مرا — کیا سبب کہیے مسکرانے کا
دلِ صد چاک کی بنا صورت — زلف پر دل گیا ہے شانے کا
اب کے چھوٹوں قفس سے گلشن میں — آشیاں میں نہیں بنانے کا
جلوہ اس ضد سے وہ دکھا دیں گے — ہم کو دعویٰ ہے تاب لانے کا
سن کے وہ حال کہتے ہیں تسکیں — نام بھی کچھ ہے اس فسانے کا

میں دم کو سنبھل جاتا ، قاصد کا بھلا ہوتا
گر تم کو نہ آنا تھا ، وعدہ ہی کیا ہوتا
کرتے ہیں سفارش سب ، ناصح بھی گیا ہوتا
یوں وعظ جو کرتا ہے کچھ ان سے کہا ہوتا
ہم یاد میں اس قد کی ، نالے ہیں کیا کرتے
محشر کا سا ہنگامہ ، ہر شب ہے بپا ہوتا
سنتے ہیں موا دشمن ، کیوں کر مجھے باور ہو
تم مجھ سے نہ یہ کہتے ، کچھ تم نے سنا ہوتا
جو چاہو سو کر گزرو ، پر اتنی خبر رکھو
کیا کرتے ہو تم بیٹھے ، عالم میں ہے کیا ہوتا

تھوڑا سا کہیں اپنا ہم حال دکھا لیتے
اک دم بھی اگر تم سے آئینہ جدا ہوتا
بے تابی سے دل اک دم، تھمتا ہی نہیں ہے ہے
کمبخت ابھی ان کی نظروں سے گرا ہوتا
اب وہم سے مرتا ہوں، رستہ نہ کہیں بھولے
پہنچانے کو قاصد کے، میں آپ گیا ہوتا
کرتے ہیں سفارش سب، ناصح مری وھاں جا کر
تم نے بھی ذرا ان سے کچھ منہ سے کہا ہوتا
تم صبر کرو تسکین کرنے دو ستم ان کو
دو دن کے تامل میں، دیکھو تو ہے کیا ہوتا

قسمت تو دیکھ جتنے کیے شکوے ھجر کے
اُن کو گماں رھا، گلۂ روزگار کا
ہم کو طوافِ حرم میں یاد آیا
لڑکھڑانا ، شراب خانے کا
دیکھوں تو لے ہے جان ملک‌الموت کس طرح
تم وقتِ مرگ، پاس سے اُٹھنا ذرا نہیں
تسکیں مجھے اُس سر کی قسم، کچھ نہیں معلوم
کیا کرتے ہیں الفت کے لیے کیا نہیں کرتے
اب یہ حالت ہے کہ ان سا بیدرد
میرے بچنے کی دعا مانگے ہے
فتنۂ محشر کا سب کو تھا گماں
تجھ کو پہچانا تیری رفتار سے
ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے
کہے دیتی ہے شوخی، نقش پا کی

ہجر میں پاس نہ ہے زہر، نہ خنجر افسوس
نہ دیے موت کے بھی، چرخ نے اسباب مجھے
مزے یہ دیکھے ہیں آغازِ عشق میں تسکین
کہ سوجھتا نہیں اپنا مآلِ کار مجھے

۹۔ تہور | مرزا غلام فخرالدین، یہ مرزا قادر بخش صابر کے بھائی تھے، گلستان سخن (صفحہ ۱۸۴) میں صابر لکھتے ہیں :—

برادر حقیقی راقم، جوانِ متین اور نیک نہاد تھا۔ مضامین شستہ اس طرح حاضر رہتے تھے کہ ادھر زبان خامہ متحرک ہوئی اور آدھر زہرہ جبینانِ معانی شبستان کاغذ میں خیل خیل جلوہ گر ہو کر تماشائیان معنی دوست کی دلربائی میں آمادہ ہوئے، اکثر جناب احسان علیہ‌الرحمۃ سے اصلاح لی ہے اور گاہ گاہ مومن خاں مرحوم سے عین عنفوان جوانی میں اس تنگنائے فانی سے عازمِ ملکِ جاودانی ہو کر دلِ سوزاں پر مانندِ لالہ داغ رکھا، خدا مغفرت نصیب کرے۔ یہ چند شعر اس سے یادگار ہیں :—

سنتے ہی نام غیر ، تہور بھی ہے غضب
اس جنگ جو سے لڑنے کو تیار ہو گیا
ناصحا پند و نصیحت، تو نہ کر محفل میں
کہ مرے ساتھ، کوئی اور بھی رسوار ہوگا
اب ہے کیا باقی، جو ہے کاوش تری دستِ جنوں
چاک داماں ہو گیا، ٹکڑے گریباں ہو گیا

بزم سخن (صفحہ ۳۲)، حیاتِ مومن (صفحہ ۴۷) صرف ایک شعر سنا، سخن شعراً (صفحہ ۹۴) عین شباب میں انتقال کیا۔

۱۰۔ ثروت | محمد بخش ولد شیخ بخش، باشندۂ بریلی مقیم موضع سہنے، شاگرد حکیم مومن خاں مرحوم (سخن شعراً صفحہ ۹۸)، نساخ نے یہ شعر دیا ہے :—

بھولی صورت پر نہ جا ثروت بتانِ ہند کی
نرم گو ظاہر میں ہیں ، لیکن دل ان کا سنگ ہے

۱۱ - خورشید خورشید احمد خلف میاں شکور احمد مجددی ، امیر مینائی انتخاب یادگار (صفحہ ۱۲۶) میں تحریر کرتے ہیں :-

پچپن برس کی عمر ہے ، یہ بزرگ حضرت امام ربانی شیخ مجدد الف ثانی رحمۃاللہعلیہ کی اولاد امجاد سے ہیں ، مرزا اسداللہ خان غالب ان کے اُستاد ہیں اور شاہ رؤف احمد صاحب رافت بھی صاحب ارشاد ہیں - گلستانِ سخن (صفحہ ۲۰۸) میں صابر لکھتے ہیں :- خورشید احمد مجددی دہلوی مسکن، شاگرد شاہ رؤف احمد رافت و مومن و غالب ، اشعار ریختہ و فارسی طرزِ دلکش میں کہتا ہے ، سیاح ایران ، ترکستان ، افغانستان - نساخ (سخن شعرأ میں صفحہ ۱۰۴ و ۱۰۵) رقم طراز ہیں :- شاگرد و برادر عمزاد شاہ رؤف احمد رافت ، مومن خاں اور مرزا غالب سے بھی اصلاح لی تھی ، ماوراءالنہر اور خراساں کی سیر بھی کی تھی ، ان کا مولد لکھنؤ و مسکن دہلی ، حضرت مجدد الف ثانیؒ کی اولاد میں تھے (۱۲۸۶ھ میں سخن شعرأ مکمل ہو گئی تھی اور کہیں کہیں ۱۲۸۸ھ میں بھی اضافہ کیا ہے ، نساخ کا جملے کے آخر میں فعل 'تھے' لانا یہ دلالت کرتا ہے کہ ۱۲۸۸ھ میں فوت ہو چکے تھے حالانکہ امیر مینائی نے انتخاب یادگار ۱۲۹۰ھ میں لکھی اور وہ اس وقت زندہ لکھتے ہیں) :-

بالک رام ایم - اے بسلسلۂ تلامذۂ غالب (صفحہ ۹۹ ادب اردو جنوری ۱۹۵۱ء علیگڑھ) لکھتے ہیں :-

خورشید احمد دہلوی ثم لکھنوی، شاہ شکور احمد کے بیٹے ۱۸۴۹ء مطابق ۱۲۶۵ھ میں لکھنؤ میں پیدا ہوئے ، بہت سیلانی آدمی تھے . . . اپنے عمزاد بھائی شاہ رؤف احمد رافت سے بیعت تھے ، شاہ سعداللہ حیدرآبادی سے بھی کسب فیض کیا ، غالب و مومن سے بھی مشورہ کیا -

اگر ۱۲۶۰ھ خورشید کی ولادت فرض کر لیں، تو مومن کی وفات کے وقت تین سالہ ہوتے، شاہ رؤف احمد رافت سے بیعت تھے جن کا انتقال ۱۲۴۹ھ (تذکرۂ کاملان رام پور صفحہ ۱۴۷ تاریخ نساخ مصرع۔شد رقم قدوۂ جنت رافت) میں ہوا، امیر مینائی نے تاریخ وفات رافت ۱۲۴۰ھ (انتخاب یادگار صفحہ۱۴۴) لکھی ہے جو غلط ہے چونکہ تفسیر رؤفی ۱۲۴۸ھ میں مکمل کی تھی اس طرح ۱۲۴۹ھ بیعت کے وقت عمر اٹھارہ سال تو ہونا ضروری تھی، خورشید کا سال ولادت ۱۲۳۵ھ ہے، اب دو شعر ملاحظہ کیجیے :—

پھاڑنے کو اور کیا باقی رہا، دستِ جنوں
چاک دامن ہو گیا، پرزے گریباں ہو گیا
نویدِ وصل یہ مانا کہ جھوٹ ہے خورشید
کسی طرح کوئی تسکینِ اضطراب تو دے

۱۲ - راحت | مرزا محمود بیگ دھلوی ولد احمد بیگ شاگرد مومن خاں، وطن ان کا روم، مسکن دھلی (سخن شعرا صفحہ ۱۷۵) - سید نورالحسن خاں نے طور کلیم (صفحہ ۴۴) میں اور سید علی حسن خاں نے بزمِ سخن (صفحہ ۵۳) میں رومی‌الاصل اور مسکن دھلی ہونا بیان کیا ہے، استفادۂ سخن مومن سے ظاہر کیا ہے، رومی‌الاصل ہونا یہ واضح کرتا ہے کہ وطن آبائی روم تھا، نورالحسن صاحب نے سپاہ گری پیشہ بتایا ہے- ۱۲۹۸ھ تالیف تذکرہ طور کلیم سے پہلے انتقال کر گئے تھے- گلستانِ سخن میں بھی ان کے حالات تحریر ہیں (صفحہ ۲۴۳) - مؤلف حیاتِ مومن (صفحہ ۷۵) لکھتے ہیں، کہ یہ محلہ فراشخانہ دھلی میں رہتے تھے، اشعار یہ ہیں :—

ہم سے وہ بھی چھوٹے اور یہ دلِ شیدا چھوٹا
یاد کس کس کو کریں، خیر جو چھوٹا چھوٹا
صبر و قرار، تاب و تواں، رفتہ رفتہ سب
آ جائیں گے کہیں سے، دلِ رفتہ گر ملا

اجل پہلے آوے کہ وہ پہلے آویں
یہی راہ مدت سے ہم دیکھتے ہیں

۱۳ - راسخ | سعادت علی خاں صاحب بزمِ سخن (صفحہ ۵۳) ''متوطن دہلی، تربیت یافتہ خدمت مومن خاں دہلوی''۔ یہی صاحب گلستانِ سخن (صفحہ ۲۴۴) اور سخن شعرأ (صفحہ ۱۷۶) کے بیانات ہیں - کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاعری میں کوئی رتبہ پیدا نہ کیا - مؤلف حیاتِ مومن (صفحہ ۷۶) لکھتے ہیں ''بے نام و نشان اُٹھے'' حالانکہ نام اُن کا چل رہا ہے - نمونۂ اشعار :-

ہوں تو آنکھوں میں، پر نہیں یہ خبر
سرمہ ہوں یا غبار ہوں کیا ہوں
میں بنائے جہاں سہی، لیکن
جب کہ نا پائدار ہوں کیا ہوں

۱۴ - سالک | مرزا قربان علی نام، صاحب سخن شعرأ (صفحہ ۲۰۳) لکھتے ہیں ''وکیل راجہ الور، خلف نواب مرزا عالم بیگ خاں مرحوم، شاگرد مومن خاں و اسداللہ خاں غالب، مولد ان کا حیدر آباد و مسکن دہلی، راقم کے دوستوں میں ہیں، اشعار ان کے نہایت با مزہ ہوتے ہیں''۔ طور کلیم (صفحہ ۴۸) میں سید نورالحسن صاحب تحریر کرتے ہیں، ''تھوڑی مدت، مومن خاں کی خدمت میں استفادہ کیا اور زیادہ فیض غالب سے اُٹھایا، حیدر آبادی مولد دہلوی مسکن ہے، آج کل حیدر آباد (زمانہ ۱۲۹۸ھ) میں ہے - اسی زمانے میں دو قصیدے فارسی میں والا گرامی (نواب صدیق حسن خاں) اور والیۂ ریاست (نواب شاہجہان بیگم والیۂ بھوپال) کی مدح میں کہ کر بھیجے، میں نے بھی دیکھے، اچھے ہیں، اس کے دیوان کا نام ہنجار سالک ہے، نیز صاحب بزمِ سخن (صفحہ ۵۶) کا بیان ہے کہ اس کا کلام سادہ پرکار ہے، دو دیوان ہیں''۔

صاحب گل رعنا (صفحات ۴۲۸ و ۴۲۹) لکھتے ہیں، ''قربان علی نام، سالک تخلص، نواب مرزا عالم بیگ کے بیٹے تھے، حیدر آباد میں پیدا ہوئے اور دلّی میں نشو و نما پائی اور فارسی کی کتابیں وہیں کے ارباب فضل و کمال سے پڑھیں، مومن و غالب بقید حیات تھے، اس زمانے میں شعر و سخن کا گھر گھر چرچا تھا، ان کو بھی شوق ہوا، پہلے بطورِ خود کہتے رہے، اس کے بعد حکیم مومن خاں کی خدمت میں پہنچے، اس وقت قربان تخلص کرتے تھے، غالباً خاں صاحب کے مرنے پر مرزا غالب کے یہاں رسائی پیدا کی اور سالک تخلص اختیار کیا...چند روز کی مشق میں سخن سنجی اور سخن فہمی میں یہ اپنے معاصرین سے بہت بڑھ گئے''۔ [ظہیر دہلوی داستانِ غدر (صفحات ۷ و ۸) میں لکھتے ہیں ''ان بزرگوں کے بعد چند نوجوان نوخیز نو عمر شوخ طبع، با مذاق، جدت پسند، نازک خیال ہم عصر تھے کہ زمانہ حال کے موافق اگر غور کیا جائے تو ہر ایک یگانہ روزگار تھا: نواب مرزا خاں صاحب داغ، میر مہدی حسن صاحب مجروح، سید شجاع الدّین عرف امراؤ، مرزا انور، مرزا قربان بیگ صاحب سالک، مولوی عبدالکریم صاحب سوز (خلف مولوی امام بخش صاحب صہبائی)، حکیم غلام مولیٰ قلق، شہزادہ صاحب اشکی، مرزا پیارے صاحب شہرت، مرزا قادر بخش صاحب صابر، میاں خدا بخش صاحب تنویر، غلام احمد صاحب تصویر، عبدالقادر صاحب توقیر، یوسف علی خاں صاحب عزیز، مولوی امیر مرزا خورشید، میاں تشنہ صاحب، آغا مرزا صاحب برادرخورد داغ تخلص شاغل، اس قدر احباب ایک مکان پر وقتِ شام بلا ناغہ ہم جلیس ہوتے تھے اور باہم دادِ سخن دیتے تھے۔ زمانۂ غدر تک یہ گلزارِ سخن شاداب و سیراب تھا]۔

۱۸۵۷ء کے عالم آشوب ہنگامہ کے بعد الور میں جا کر پناہ لی اور خوش قسمتی سے وکالت کے عہدے پر سرفراز ہو گئے، پھر حیدر آباد چلے گئے، وہاں محکمۂ تعلیمات میں سررشتہ داری کے عہدے پر تقرر ہو گیا،

اسی خدمت پر زندگی بسر کر دی ۔ حیدر آباد میں مخزن الفوائد کے نام سے رسالہ نکالا . . ساڑھ پینسٹھ برس کی عمر تھی کہ ۱۲۹۱ھ میں سفر آخرت اختیار کیا اور حیدر آباد میں مدفون ہوئے ۔ مالک رام ایم ۔ اے ، بسلسلۂ تلامذۂ غالب (صفحہ ۱۰۷ ادب اردو جولائی ۱۹۵۱ء علیگڑھ) لکھتے ہیں : ۵۷ برس کی عمر میں ۱۸۸۱ء مطابق ۱۲۹۷ھ میں فوت ہوئے ۔ حیاتِ مومن (صفحہ ۷۰) کے مؤلف لکھتے ہیں کہ سالک مومن کے قدیم اور اچھے تلامذہ میں تھے ، یہ غلط ہے ، جدید شاگرد ہیں ۔ صابر گلستانِ سخن میں سالک تخلص کے تحت حالات (صفحہ ۲۶۸) لکھتے ہیں کہ کلام سے رتبۂ سخن ظاہر ہوتا ہے :—

کھیل ہر بات میں ہے فتنۂ محشر ہونا
اور ابھی سیکھتے ہیں آپ ستمگر ہونا
کیا کیا سزا ملی ہے مجھے وصل کے عوض
میں نے شبِ فراق کو روزِ جزا کہا
کاش اے سپہر تجھ سے رکھتے تو سہل تھیں
وہ خواہشیں کہ رکھتے ہیں اُس بے وفا سے ہم
ترے کوچے کی مجھ پر راہ ہے تنگ
کہ آنا ہے ، نگاہِ پاسباں میں
ہوتی ہے رحم و نزاکت میں لڑائی کیا کیا
سرِ بیمار جو زانو پہ وہ دھر لیتے ہیں
پھرتے ہیں داد خواہ ترے حشر میں خراب
تو پوچھتا نہیں ، تو کوئی پوچھتا نہیں
اعتبار نگہِ ناز ہے کیا کیا اُن کو
قتل کو آتے ہیں اور ہاتھ میں شمشیر نہیں
اے خضر اتنے دن ترے کیوں کر بسر ہوئے
ہم سے تو رات کٹ نہ سکی انتظار کی

کوئی تو بات ہنسی کی نکالے
خندۂ صبح قیامت ہی سہی
جان ہی دے کے عشق میں ہوئی خیر
آ گیا، کچھ لیا، دیا، آگے
تم آگئے تو ہوش کہاں میزبان ہو کون
آج آپ اپنے گھر میں ہیں کچھ مہماں سے ہم

۱۵- سروش | صاحبزادہ عبدالوہاب خاں ابن صاحبزادہ عبدالرحمٰن خاں بہادر ابن نواب غلام محمد خاں طاب ثراہ، طباع و طلیق ہیں، متواضع و خلیق ہیں، باون برس کی عمر ہے، ابتدا میں مومن خاں مرحوم دہلوی اور مرزا اسد اللہ خاں غالب عرف مرزا نوشہ دہلوی سے تلمذ ہوا، پھر خوش وقت علی خاں خورشید شاگرد مرزا محمد رضا برق لکھنوی سے استفادہ رہا (انتخاب یاد گار صفحہ ۱۷۲) - معمولی کلام ہے، کوئی خاص رنگ پیدا نہ کر سکے، چند شعر یہ ہیں :-

مجھ سے وہ آج بھی وعدہ اگر ایفا کرتا
ملک‌الموت سے میں وعدۂ فردا کرتا
تھامتا دل کو کہ آنکھوں کو نہ رونے دیتا
ایک میں جھگڑے ہزاروں، کہو کیا کیا کرتا
قتل عالم کو کیا، ایک نظر میں تو نے
کون باقی ہے ستم گار، جو پرساں ہوگا

۱۶- سکندر | (گلستان سخن صفحہ ۲۷۵) تخلص سکندر خاں نام، باشندۂ شاہجہاں پور، نساخ ان کے متعلق لکھتے ہیں (سخن شعرا صفحہ ۲۱۸) ''مومن سے کسب سخن کرتے تھے، ایک دن ایک شعر کی اصلاح پر بہت مباحثہ کر کے ترک مشورہ کیا''۔ ایک شعر نقل کیا ہے :-

کس کا نام اس کے لبوں پر تھا کہ اس نفرت پر
حرفِ ناصح سے دماغ اپنا پریشاں نہ ہوا

۱۷۔ شورش غلام احمد فرزند محمد اکبر قبالہ نویس — شیفتہ ۱۲۵۰ھ میں شورش کو جوان لکھتے ہیں، اس کے معنی یہ ہوئے کہ اگر حال درج کرتے وقت شورش کی عمر بیس سال تھی تو سال ولادت ۱۲۳۰ھ قرار پائے گا۔ شیفتہ "جوان شوریدہ مزاج" ظاہر کرتے ہیں "کبھی کبھی شعر کہتا ہے، مومن خاں سے استفادہ کرتا ہے، راقم تذکرہ سے بھی دوستانہ تعلقات ہیں"۔

کریم الدین اپنے تذکرہ (طبقات شعرا) میں تحریر کرتے ہیں "جوان شوریدہ مزاج، ابتدا میں... کتابت بہت دنوں یہاں کرتا رہا، اب درمیان الور کے پندرہ روپے کی تنخواہ پر ہے (صفحہ ۳۶۹)، کئی برس کا عرصہ ہوا کہ نوکر ہوگیا ہے، حکیم مومن کے شاگردوں میں سے ہے، مجھ سے بھی دوستی اور تعارف ہے" (طور کلیم صفحہ ۵۸) اور سخن شعرا (صفحہ ۲۵۴) میں بھی اسی قدر لکھا ہے، یہ کلام ہے:

کیا جانے عدو خون جگر پینے کی لذت
شورش سے مزا پوچھیے تلخاب الم کا
نامہ جو بنا لائے ہے قاصد تو صنم کا
ایمان نہ کھونا کسی مایوس کرم کا

۱۸۔ شیدا میر جھبو خاں نام — نساخ لکھتے ہیں، "شاگرد مومن خاں، گیارہ برس ہوئے کہ رحلت کی" (سخن شعرا صفحہ ۲۶۴)، صاحب طور کلیم (صفحہ ۶۰) تحریر کرتے ہیں کہ میر جھبو خاں شیدا جوانی ہی میں دنیا سے رخصت ہوا، مومن سے تلمذ تھا اور حضرت شیفتہ سے دوستی تھی۔ صاحب گلستان سخن ۱۲۷۰ھ سال وفات بتاتے ہیں (صفحہ ۲۰۸)۔ نمونہ کلام یہ ہے:

مگر عدو سے ہے وعدہ کہ خود بخود شیدا
کچھ اضطراب میں ہیں دل کے اضطراب سے ہم
کہتے ہیں اس کے کوچے میں مارا گیا کوئی
مجھکو یہ خوف ہے کہ میرا نامہ بر نہ ہو

۱۹ - شیفتہ | نواب محمد مصطفیٰ نواب محمد مرتضیٰ خاں مظفر جنگ رئیس جہانگیر آباد — شیفتہ نے اپنے حالات دیوان اور تذکرہ گلشن بے خار میں اس طرح قلمبند کیے ہیں کہ تذکرہ گلشن بے خار ۱۲۴۸ھ میں شروع کیا اور ۱۲۵۰ھ میں ختم کیا اور عمر چھبیس ۲۶ ہے! اس سے سال ولادت ۱۲۲۴ھ قرار پاتا ہے لیکن اپنے قلمی دیوان کے دیباچے میں ذرا اختلاف کیا ہے (قلمی دیوان شیفتہ مملوکہ رضا لائبریری رام پور)، لکھتے ہیں ''سولھویں سال میں شاعری فوق العادت بخشی اور تیئسویں (۲۳) میں کمال عطا کیا اور اس شغل سے رک گیا''۔ اس وقت ۱۲۴۰ھ تھی اور اب چالیس پر سات سال بڑھ چکے ہیں (۱۲۴۷ھ) اس لیے شیفتہ کا اپنا پہلا بیان جو ۱۲۴۷ھ کا ہے صحیح معلوم ہوتا ہے، اس طرح سال ولادت ۱۲۱۸ھ قرار پاتا ہے۔ ۱۲۲۱ھ مطابق ۱۸۰۶ء یا دیگر سنین ولادت بے دلیل نقل کیے گئے ہیں (گل رعنا صفحہ ۳۲۶ اور دلی کا دبستان شاعری صفحات ۲۵۶ و ۲۵۷)۔ گلشن بے خار (صفحہ ۱۱۶ طبع اول نولکشور ۱۸۷۴ھ) میں رقم طراز ہیں کہ بچپن سے شاعری سے وابستگی رہی اور بڑی قیمتی عمر کو اس شغل میں برباد کیا چونکہ شاعری کا شغل دوسرے اشغال عالیہ اور فنون شریفہ سے باز رکھتا ہے، اب مدت ہو گئی کہ مجھے تعلق نہیں رہا مگر مجلس والوں کی تحریک سے کوئی جدید غزل سالوں میں کہی جاتی ہے، مہینوں کا کیا سوال؟ جس طرح اردو کے مشتاقوں کی تحریک پر کوئی غزل کہی جاتی ہے اسی طرح فارسی میں بھی طبع آزمائی کرنی پڑتی ہے، مراتب شاعری میں میری ایک خاص طرز اور ہے لیکن طبع ہر روش میں کہنے پر قادر ہے کہ وہی طرز خاص سمجھی جائے اور میرے مجموعۂ

نظم و نثر سے یہ بات واضح ہے اور جو کچھ بھی شاعری ہے وہ مومن کے فیض سخن سے ہے - شیفتہ اور مفتی صدر الدین خاں آزردہ دہلی کے مشاعروں کے مہتمم تھے ، ہر وارد و صادر ان کی مجلسوں میں شرکت پر افتخار کرتا ، ہفتہ وار مشاعرہ باری باری دونوں کے یہاں ہوتا (گل رعنا صفحہ ۲۲۷ طبع سوم) - شیفتہ کے کمال کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ سخن فہمی میں شیفتہ مستند قرار پاتے تھے ، غالب جو شیفتہ کے استاد بھی ہیں ، ایک مقطع میں شیفتہ کی پسند کو سند قرار دیتے ہیں :

غالب بہ فنِ گفتگو نازد بایں زورش کہ او
بنوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نہ کرد

مومن نے قطعہ تاریخ گلشن بے خار میں کہا ہے :

کیا بات ہے منتخب کی تیرے
اے منتخبِ جہان مغنی ، (صفحہ ۲۴۵)

تقریظ کے اشعار ہیں :

ندیدم چنیں شاعرے نکتہ سنج
کہ ریزد ز کلکش گہر گنج گنج (صفحہ ۲۵۰)
بدقت اگر موشگافی کند
ز موئے میان شعر بافی کند
چوں رائے منیرش نداند صواب
افق خط کشد مطلعِ آفتاب
ز تحسینِ او حسنِ معنی نباز
ہزار آفریں بر چنیں امتیاز

رباعی

آں شیفتہ کر خرد گرامی باشد سر خیلِ سخنوران نامی باشد

اکنوں کہ حسد (ـ) الا بعدم
محسود تنائی و نظامی باشد (صفحہ ۲۴۹)

مومن، آزردہ، غالب ، صہبائی، عبداللہ خاں علوی اور سر سید احمد خاں شیفتہ کی تعریف میں رطب اللسان ہیں ۔ سرسید احمد خاں آثارلصنادید (طبع اول صفحہ ۱۹۷) میں لکھتے ہیں :ـ نبض شناس شخص سخن فہمی و وسخن دانی ، قانون دان پردۂ نکتہ سنجی و نکتہ رانی۔۔۔مشق سخن کو اس مرتبے پر پہنچایا ہے کہ قلم تردد سے آسودہ نہیں ہوتا اور فکر تلاش سے بلبل کی سجع خوانی اور قمری کی فصیح بیانی انہیں کی نستعلیق گوئی سے مستفاد ہے ۔

تمام معاصرین ان کی سخن گوئی اور سخن فہمی کے معترف ہیں ، حالی نے انہیں سے فن تنقید سیکھا اور ان ہی کی سخن فہمی کا حصہ پایا ، دلّی کی ادبی مجلس ان ہی کے دم سے قائم تھی اور خدا جانے کتنے ادیب ان کے خوان کرم سے فیض یاب ہو رہے تھے ؛ اگر اس عہد کی ادبی ترقی کا جائزہ لیا جائے تو شیفتہ کا نام سر ورق نظر آئے گا ، وہ ناظم بھی ہے اور ناشر بھی اور ادب کے مذاق کو سنوارنے میں اس نے مالی قربانی بھی پیش کی ، مومن اور غالب دونوں اس کے اُستاد بھی ہیں اور وہ دونوں کا دوست ہے ؛ اس ہم آہنگی نے دھلی کی بزم سخن کو معراج کمال تک پہنچا دیا ، مستقبل کا راستہ ایسا بنا دیا کہ حالی نے ان کے راستے پر چل کر جدت سے کام لیا اور شاعری میں ایک نیا موڑ پیدا کیا ۔ مولانا صلاح الدّین صاحب مقدمہ دیوان شیفتہ میں ایک حد تک یہ صحیح لکھتے ہیں :ـ

یہ اُردو شعر و ادب کی خوش قسمتی تھی کہ مومن اور غالب اور حالی کو شیفتہ جیسا صاحب فہم و ذکا ، رفیق اور مشیر میسر آیا ۔ ۔ ۔ اور حالی تو ان کے مصاحب اور ایک طرح اُن کے شاگرد تھے ۔

شیفتہ آزاد مزاج تھے لیکن جس طرح مومن کو اپنے عشق پر ناز تھا اور فخریہ اُس کا اظہار مثنویوں میں کیا ہے، شیفتہ نے کوچے عاشقی میں قدم رکھا اور ڈرتے ڈرتے اُن کو رمجو طوائف سے محبت ہوئی۔ غالباً ۱۲۴۴ھ سے یہ محبت شروع ہوتی ہے جب کہ رمجو اور اُس کی سہیلی ''جنگلو'' کی رسم مسی مالی ادا ہوئی اور شیفتہ نے اُس کی تاریخ کہی، پھر کے رمجو کے نام منظوم خطوط بھی ملتے ہیں (دیوان مخطوطہ شیفتہ رضا لائبریری)۔ ۱۲۵۰ ہجری میں تذکرہ گلشن بےخار لکھا اور رمجو کا حال نزاکت تخلص کے تحت لکھا ہے۔ یکایک ان کے مزاج میں انقلاب آیا اور ۱۲۵۴ھ میں وہ حج کو روانہ ہو گئے اور دو سال کے بعد حج سے واپس آئے تو زندگی میں کافی انقلاب ہو گیا تھا، جو شیفتہ یہ کہتا تھا، مصرع :—

شیفتہ حسرتِ صہبا و مزامیر نہ کھینچ

وہ یہ کہنے لگا :—

اے شیفتہ ہم جب سے کہ آئے ہیں حرم سے
شوقِ صنم و خواہش صہبا نہیں رکھتے

مومن سے وابستگی ۱۲۶۸ھ تک رہی، اس کے بعد غالب کا دامن پکڑا اور آخر تک یہ سلسلہ چلتا رہا، اُس زمانے میں بہت کم کہا ہے۔ ۱۸۵۷ء میں تحریک آزادی کا رخ کہیں ہندو مسلم فرقہ‌دارانہ فسادات میں تبدیل ہو گیا؛ چنانچہ جہاں گیر آباد کا قلعہ اُسی زمانے میں ٹھاکروں نے لوٹ لیا (تو ریاست رام پور کی فوج نے امداد کی اور قلعے پر شیفتہ کا قبضہ بحال کرایا)، خود بغاوت کا الزام شیفتہ پر بھی لگایا گیا اور مقدمہ چلتا رہا، آخر معافی ملی اور جاگیر واگذاشت ہوئی، غالب کو شیفتہ کی بربادی کا انتہائی رنج تھا۔ آخر ۱۲۸۶ھ[1]

---

۱ - حضرت محبوب الٰہی کی خانقاہ میں دفن ہوئے (صفحہ ۱۱۶ ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء)۔

میں اس دنیا سے رحلت کی ۔ تصانیف میں بے گلشن خار کے علاوہ سفر نامہ حج ''ترغیب المسالک الیٰ حسن المسالک'' اور فارسی دیوان حسرتی، اور اُردو دیوان شیفتہ ہیں ۔ شیفتہ کے اشعار سے اُس کا درجہ متعین ہو جاتا ہے ، شیفتہ[1] ، مومن اور غالب کے بعد بقول ظہیر دہلوی اُستاد تھا (داستان غدر صفحہ ۲) ، نازک خیالی اور جدت ادا ، نادر تراکیب میں وہ اپنے دونوں اُستادوں مومن اور غالب کا ہم پلہ ہے :—

نہ دیا پانے مجھے لذتِ آزار نے چین
دل ہوا ، رنج سے خالی بھی تو جی بھر آیا
یاس سے آنکھ بھی جھپکی تو توقع سے کھلی
صبح تک وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا
کیا جانے گذری غیر پہ کیا اُس کی بزم میں
آئے وہ اس طرح سے ، مجھے پیار آ گیا
جو بات ہے کدہ میں ہے اک اک زبان پر
افسوس مدرسہ میں ہے بالکل نہانِ ہنوز
اے تاب برق ، تھوڑی سی تکلیف اور بھی
کچھ رہ گئے ہیں خار و خسِ آشیاں ہنوز
آشفتہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ
طاعت میں کچھ مزا ہے ، نہ لذت گناہ میں
ناصح تری زباں ، ترے بس میں نہ ہو تو پھر
انصاف کر کہ دل پہ مرا زور کیا چلے
ایسی رغبت سے کرے قتل گماں کا ہے کو تھا
شیفتہ اُس کو تو لو ، تم سے محبت نکلی

---

۱ - شیفتہ، طور کلیم صفحات ۶۰ ، ۶۱ از تلامذہ حکیم مومن صاحب کسے ہم جاہ او بزم نہ بہ بر خاستہ ۔

تھی کب سے مرگ و حسرتِ دیدار میں نزاع
وہ ایک دم میں آن کے جھگڑا مٹا چلے

وہ شیفتہ کہ دھوم تھی، حضرت کے زھد کی
میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے

اے جان بیقرار، ذرا صبر چاھیے
بے شک اِدھر بھی آئے گا، جھونکا نسیم کا

حسرت سے اُس کے کوچے کو کیوں کر نہ دیکھیے
اپنا بھی اس چمن میں کبھی آشیانہ تھا

۲۰ ـ صاحب | امۃالفاطمہ، نام مشہور صاحب جی، کہ خوبصورتی کے آسماں کا چاند ھے، آفتابِ صفت مشرق کی طرف سے برآمد ھوا اور مغرب کی طرف بڑھ کر بسلسلۂ علاج مومن خاں سے اُس کا واسطہ پڑا، چند، مہینے درد و دوا کا سلسلہ رھا، برسوں ھوئے کہ لکھنؤ واپس گئی ـ ''قول غمیں نام مثنوی جو مومن خاں کی تصنیفات سے ھے، اسی حسینہ کے شرح حسن و جمال میں ھے ـ مومن خاں کے فیض صحبت کا اثر تھا کہ اس کو شعر و شاعری سے رغبت ھوئی اور موزونیٔ قد سے گزر کر موزونیٔ طبع اور زلفِ پریشاں کی آرائش سے بڑھ کر اشعار کی موشگافی میں مصروف ھوئی''۔ یہ بیان شیفتہ کا ھے جو مومن کے راز دار بھی ھیں ـ اس کے سوا نغمۂ عندلیب میں قطب‌الدین باطن شاگرد نظیر اکبر آبادی (مطبوعہ نولکشور جون ۱۸۷۵ء) لکھتے ھیں (صفحہ ۱۳۶، ۱۳۸) ''صاحب تخلص امۃالفاطمہ ایک عورت خانگی یا فاحشہ خواہ نخواہ مومن خاں صاحب جس کے مذبوح دشنۂ نگاہ اور قتیلِ خنجرِ مژگاں، ان کے خون کا پیاسا اُن کی نگہ کا پیکاں، اھاھا! کیا مقام آیا مگر افسوس کہ ایسا مودب نام پایا، صفحہ ۱۳۷...... کیا عجب اُن کے اُستاد جی مومن اور اُستاد بھائی میاں شیفتہ کو اتنا فخر کرنے کا کیا سبب، فی‌الحقیقت وہ ایسی تھیں یا حامد جوڑ توڑ کر رھا ھے ـ ان کی زلف

کا سودا اُن کے سر میں جوش کیا بلکہ سراسر توڑ پھوڑ کر رہا ہے - طرزِ تحریر صاحب گلشنِ بےخار سے معلوم ہوتا ہے کہ علم اور شعر کہنا خان موصوف نے اس اپنے شاگرد و معشوقہ کو گھول کر پلا دیا تو وہ ایسے اولیا بھی نہیں جو یہ کرامات رکھتے ہیں . . . .''
بہارستان ناز میں حکیم فصیح الدین رنج میرٹھی (صفحہ ۶۲) کا بیان ہے :—

صاحب تخلص امۃالفاطمہ بیگم نام مشہور بہ صاحب جی، ملکِ مشرق سے مثل خورشید انور و مہر منّور رونق افزائے خطۂ لطافت بنیاد شاہ جہاں آباد ہو کر کچھ بیمار ہوئی ، حکیم مومن تخلص نے کچھ علاج کیا ، صحت پا کر ایک سال تک حکیم صاحب کے ہم پہلو رہی ، پھر لکھنؤ کی طرف چلی گئی ، سبحان اللہ ایسی حسین ، نازک اندام، عنبریں مو تھی کہ ہر پیچ زلفِ پُر خم کا حلقۂ دامِ بلا تھا ، آئینہ روئے درخشاں مرآتِ حیرت افزا تھا ، مثنوی قولِ غمیں حکیم صاحب مغفور نے اُسی دل‌ربا کے خیال میں تصنیف کی ہے - یہ اشعار اُس کے لخلخہ ہائے بزم سخن سنجاں ہیں -

باقی تذکرہ نویس شیفتہ ہی سے ناقل ہیں (گلشن بے خار صفحہ ۱۲۳ ، طبع نولکشور اول ، سخن شعرا صفحہ ۵۷۶ ، حیات مومن صفحہ ۶) - یہ اشعار مومن کے متعلق ہیں اور ان ہی کے اصلاح شدہ ہو سکتے ہیں - چند شعر شیفتہ نے نقل کیے ہیں، یہ شعر حقیقت کی وضاحت کرتے ہیں ، مومن کی محبت کا جواب ان اشعار سے ملتا ہے :—

رقیبوں کا چلنا کہاں دیکھتا تو
سماں یہ مرے گھر میں آیا ، تو دیکھا
گنہ کیا صنم کے نظارے میں زاھد
یہ جلوہ خدا نے دکھایا تو دیکھا
کھولے ہیں اُس نے پیرہن یوسفی کے بند
تہ کر رکھے ، نسیم سے کہ دو قبائے گُل

نظر ہے جانب اغیار، دیکھیے کیا ہو
پھری ہے کچھ نگہِ یار، دیکھیے کیا ہو

جو خط جبیں کا مرے کاتب ہے اسی کو
دکھلا تو مرا نامۂ اعمال الٰہی

صاحب جو بنایا ہے، تو مانندِ زلیخا
یوسف سا غلام اک مجھے دے ڈال الٰہی

۲۱ - صبر | "اجودھیا پرشاد، قوم کایستھ، مقیم شاہ جہاں آباد، شاگرد منشی بسنت سنگھ نشاط و شاہ نصیر دہلوی و حکیم مومن خاں" یہ نساخ کی روایت ہے (صفحہ ۲۷۹ سخن شعرا)۔ صاحب بزم سخن (صفحہ ۷۵) مومن کی شاگردی کا بیان نہیں کرتے، نشاط اور شاہ نصیر کی شاگردی کا حوالہ دیتے ہیں۔ صابر شاہ نصیر اور مومن کی شاگردی بیان کرتے ہیں (گلستان سخن صفحہ ۳۲۷) اور یہی صحیح ہے، نمونہ کلام یہ ہے:—

خزاں کے روز تو رو رو کے باغ میں کاٹے
پھنسے قفس میں جو اب موسمِ بہار آیا

دل لگانے کو بتاتا ہے تو مشکل ناصح
ترے نزدیک چھڑانا مگر آساں ہوگا

۲۲ - صغیر | میاں جان دہلوی، نساخ (صفحہ ۲۸۳ سخن شعرا) اور سید نورالحسن خاں (طور کلیم صفحہ ۶۶) شاگرد مومن لکھتے ہیں لیکن صابر (شاگرد ممنون) بیان کرتے ہیں (صفحہ ۳۳۱ گلستان سخن) "شاید مومن سے بھی اصلاح لی ہو اور اسی بنا پر نساخ اور سید نورالحسن خاں نے شاگردان مومن میں شمار کیا ہو (حیات مومن صفحہ ۷۶)"۔ یہ شعر ہیں:—

کہتے ہو جان جائے تری اور تمھیں ہو جان
ہے ہے خدا نخواستہ، یہ تم نے کیا کیا

نہ تم سے ترک جفا اور نہ ہم سے ترک وفا
نہ اختیار تمہارا ، نہ اختیار اپنا

۲۳ - ظہور | (مولوی) ظہور علی خلف مولوی فتح علی (ولادت ۱۱۶۵ھ ، وفات ۱۲۴۴ھ) باشندۂ پریانہ مقیم دہلی ، شاگرد عبدالرحمٰن خاں احسان و شاہ نصیر و مومن خاں ، اولاد میں محمد بن ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہما کے تھے ، صاحب سخن شعرا (صفحہ ۳۱۱) و صاحب بزم سخن (صفحہ ۸۲) اور مرزا قادر بخش صابر صاحب گلستان سخن ، (رسالہ معاصر حصہ اول نمبر ۱ میں قاضی عبدالودود نے ۱۲۳۱ھ میں ولادت اور ۱۲۸۶ھ میں وفات لکھی ، ولادت ''ظہور علی'' سے اور وفات ''غفور'' سے نکلتی ہے) :—

گردش ہے مجھے چشم کی مانند ہمیشہ
آوارہ ، میں ، گھر میں ہوں ، مسافر ہوں وطن میں
سامنے اس کے نکلنے کی نہیں بات ظہور
گھر میں تم بیٹھ کے باتیں ہی بنا جانتے ہو

۲۴ - عظمت | میر عظمت اللہ خاں ، شیفتہ لکھتے ہیں (گلشن بے خار صفحات ۱۳۶ ، ۱۳۷) ''ان کے ولد کا نام میر عزت اللہ خاں اور تخلص جذب ہے - عظمت بریلی میں پیدا ہوئے اور بچپن میں اپنے والد کے ساتھ اکثر ممالک بلخ اور بخارا اور کشمیر وغیرہ کی سیر کی ، اب ۱۲۵۰ھ دہلی میں نہایت عزت و احترام سے زندگی گزار رہے ہیں ، نہایت ذہین اور خوش مزاج ہیں ، فکر شعر کم کرتے ہیں ، کبھی کبھی مشاعرے میں شرکت کرتے ہیں ، میرے ساتھ دوستی ہے اور شاعری میں مومن خاں سے فیض اٹھایا ہے''- کریم الدین ، تذکرہ شعرائے ہند (صفحہ ۳۷۶) میں لکھتے ہیں :— بریلی میں پیدا ہوا ، بچہ پن میں ہمراہ اپنے والد کے اکثر بلاد مثل بلخ اور بخارا اور کشمیر وغیرہ کی سیر کر کے اب شاہ جہاں آباد

میں حالات نویسی اور وقائع نگاری پر ہے ، نہایت صاحب فطرت ہے ، طبیعت اچھی ہے مگر فکر شعر نہیں کرتا ، کبھی کبھی بزم مشاعرہ میں شریک ہوتا ، شیفتہ سے بہت ملاقات رکھتا ہے ۔

عظمت اللہ خاں سے مومن کے خصوصی تعلقات تھے ، حنین مغموم جو اُن کی پانچویں مثنوی ہے اور جو ۱۲۴۴ھ کے واقعے سے متفق ہے ، اُس میں مومن عظمت کا بحیثیت دوست اور شاگرد ذکر کرتے ہیں :۔

اکبر و عظمت سر افراز سخن   پایہ بالا تر برافراز سخن
باعث ناز و غرور روزگار   میرے مشفق ، میرے مونس ، میرے یار
(کلیات مومن طبع ششم نولکشور صفحہ ۳۵۴)

انشائے فارسی میں ایک رقعہ عظمت کے نام کا بھی ہے جس میں عظمت سے بے تکلفی کا اظہار ہوتا ہے ، خط نہ لکھنے کی شکایت کرتے ہوئے لکھتے ہیں ”خدانخواستہ جو تیرا محبوب تھا وہ دوسرے کے پہلو میں بیٹھ گیا یا سید عظمت اللہ خاں اس شہر سے روانہ ہو گیا . . . تغافل کس وجہ سے پسند کیا جائے اور عاشق کش محبوبوں کی روش کس سبب سے منتخب ہو ، میں کہ یہ طرز روش اپنے کافر کیش محبوب کی پسند نہیں کرتا ہوں اور جب تک محبوب سے دلدھی اور دل دھی کی مضبوط قسمیں نہ کھلوا لوں ، دل نہیں لگاتا ہوں ، تمھارے معاملے میں کس طرح خاموشی اختیار کروں ۔ اختلاف روایت نے اُلجھن میں ڈال رکھا ہے ؛ نواب مصطفیٰ صاحب شیفتہ نے زبانی کہا کہ ہاتھرس کی تحصیل زر تم سے متعلق ہو گئی ہے اور علی حسین کہتا ہے کہ اُس نے آپ کی زبانی یہ خوش خبری نہیں سنی ہے ۔ اگر پہلا قول درست ہے تو محبوبوں کی دولت وصال مفت میں حاصل ہوگی ، خدا کرے کہ ایسا ہی ہو ، بہر حال تحریر وضاحتی تو لکھنا چاہیے ، والسلام“۔

صاحب بزم سخن (صفحہ ۸۷) اور نساخ (صفحہ ۳۳۳ سخن شعرأ)

اس سلسلے میں کچھ اضافہ نہیں کرتے ہیں (حیات مومن صفحہ ۷۶) - ایک شعر شیفتہ نے لکھا ہے :-

نام عظمت ہے نہ شوکت نہ شکوہ　　　کیا ہی اس نام سے گھبراتا ہوں

۲۵ - عنایت | ''صاحبزادہ عنایت علی خاں ، ابن صاحبزادہ محمد عبدالحی خاں بہادر ابن نواب رضوان مآب نواب غلام محمد خاں ، مرد کامل الوجود جوان خوشرو تھے ، زور طاقت کے بدولت پہلوانوں کی قوت بازو تھے ، خوش نویس بے بدل ، خط شکستہ و شفیعہ میں ضرب المثل ، منشی حسین علی سرور کے تلمیذ ، مولوی حیات علی مغفور کے شاگرد رشید ، الغرض ایسے کامل دید نہ شنید ، جناب نواب محمد سعید خاں کے عہد میں اپنے والد ماجد کی جگہ کار نیابت نظم و نسق ریاست میں مصروف رہتے تھے - اگرچہ سر انجام مہمات ملکی سے فرصت نہ ہوتی تھی مگر بہ حکم ذوق شعر بھی کہتے تھے ، آفرینش مضامین تازہ کی قوت ہر شعر سے پیدا ہے ، بذلہ سنجی اور نازک خیالی کی کیفیت ہر مضمون سے ہویدا ہے - مومن خاں دھلوی سے اس فن میں مشورہ تھا ، بمقتضائے نزاکت خیال انھیں کا دم بھرتے تھے ، پینتیس (۳۵) برس کی عمر میں زھر سے شہادت پائی (۱۴ رمضان ۱۲۶۴ھ) ، درگاہ حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہ میں جگہ پائی - کلام ان کا اگر سب ترتیب پاتا تو ایک دیوان ہو جاتا مگر اکثر ضائع ہوا ، کمتر ملا ، اسی کا انتخاب ہے جو درج کتاب ہے''- یہ بیان امیر مینائی کا ہے (انتخاب یادگار صفحات ۲۳۳ و ۲۳۴) - نساخ سخن شعرأ (صفحہ ۳۳۷) میں لکھتے ہیں ''عنایت برادر خورد عباس علی خاں بیتاب تخلص ، آپنے فارسی اشعار امام بخش صہبائی کو اور اردو شعر میر حسن تسکین کو دکھلاتے تھے'' لیکن امیر مینائی کا بیان زیادہ معتبر ہے - بیتاب انتخاب یادگار کی ترتیب کے وقت زندہ تھے اور طباعت کے بعد مرے ، آن کے بیان کردہ حالات داخل تذکرہ ہوئے

ہوں گے اس لیے نساخ کا اُردو شاعری میں تسکین کا شاگرد لکھنا غلط ہے۔ کلام سے مومن کا رنگ جھلکتا ہے۔ اگر زمانہ مہلت دیتا تو بلند مقام حاصل کرتے (عنایت کا مختصر دیوان رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے، یہ اُسی کا انتخاب ہے) :—

مجھ سے آنکھیں مری لے لو کہ یہ کام آئیں گی
میں نہ ہوں گا، تو بہت آپ کو رونا ہوگا
یار سے کس کی عنایت نہیں بگڑی ہوگی
تو نے کیا حال بنایا ہے یہ نادان اپنا
اُٹھائے رنجِ رخصت وہ جو کوئی
رہے بیٹھا ترے عزمِ سفر تک
عنایت شام سے اتنا تڑپنا
ترا احوال کیا ہوگا، سحر تک
ہوتی نہیں مقبول، کریں لاکھ دعا ہم
اللہ طلب کرتے ہیں کیا جانیے کیا ہم
زندگی بھر تو کسی کروٹ نہ پایا ہم نے چین
خاک میں کیا آسماں دے گا شکیبائی مجھے
چرخ نا انصاف وہ کرتا ہے جو لازم نہیں
حُسن کے جلوے اُسے دیتا ہے رسوائی مجھے
پند گو اتنا تو دیوانہ نہیں ہوں میں، مگر
کون سے دن بات میرے ڈھب کی سمجھائی مجھے
نکتہ داں ہیں شیفتہ، میں نکتہ داں کا شیفتہ
یہ غزل اُن کو پسند، اُن کی پسند آئی مجھے
جاتا ہوں اضطراب میں، دیکھوں تو جذبِ دل
آتا ہوا، اُدھر سے مرا نامہ بر ملے

مجھ سا تو سچ ہے کوئی نہیں خانماں خراب
پر مجھ کو آپ کون سے دن اپنے گھر ملے

(مکمل غزل)

جفا نہ ہو تو وفا کا مزا نہیں آتا
کرو جو قدر ہماری ، تو کیا نہیں آتا
شبِ وصال ہوں کیوں کر نہ ڈر سے کان کھڑے
اجل کے آنے میں آواز پا نہیں آتا
مرا ہی خط کہیں پھر نامہ بر نہ لایا ہو
جواب نامہ جو ہوتا تو واپس نہیں آتا
تمھارے ساتھ مرے پاس آئے صبر تو آئے
قسم قلق کی بہت کہ چکا نہیں آتا
بتوں کے شکوے میں پاتا ہوں لذتِ آزار
وگرنہ کیا مجھے شکرِ خدا نہیں آتا
علاج کرنے سے مانا کہ آپ کیا کام
مزاج کا بھی مگر پوچھنا نہیں آتا
عدو کی جائے ہو کیوں کر کہو ، مرے دل میں
خیال بھی تو تمھارے سوا نہیں آتا
مجھے ہے چشم کرم اس سے دیکھنا جس کو
نگاہِ ناز سے بھی دیکھنا نہیں آتا
تجھے نہ ہوں تو عنایت یہ ذلتیں ہوں کسے
تجھے تو روٹھ بھی رہنا ذرا نہیں آتا

٢٦ - غریب | تخلص غریب اللہ ، شاہ آباد کے رہنے والے تھے ، مومن خاں کے شاگرد اور انگریزی فوج میں منشی تھے - نساخ نے (سخن شعرأ صفحہ ٣٥٠) اسی قدر حالات لکھے ہیں ، نساخ کا ماخذ

تذکرۂ گلستانِ سخن (صفحہ ۳۸۶) ہے، دو شعر دیے ہیں :—

ان کو دل دے کے کوئی کیا خوش ہو
دلربا ، دلبری نہیں کرتے
خضر و عیسیٰ و جام آبِ حیات
لب سے کچھ ہمسری نہیں کرتے

۲۷ - قلق | صاحب گلستان سخن غلام مولیٰ نام اور عرف مولا بخش بتاتے ہیں ، شہر میرٹھ کے رہنے والے تھے (گلستان سخن صفحہ ۴۰۴) اور مومن سے استفادۂ سخن کرتے تھے ، سخن شعرأ (صفحہ ۳۸۷) - ظہیر دہلوی نے داستان غدر میں (صفحات ۷ تا ۹) اپنے ہم عصر نوجوان شاعروں میں غلام مولیٰ قلق کا بھی ذکر کیا ہے اور ان کے نام کے ساتھ حکیم کا لفظ بھی شامل کیا ہے (حیات مومن صفحہ ۳۷) جس سے پتا چلتا ہے کہ غلام مولیٰ نے علم حکمت طب بھی حاصل کیا تھا - وہ غدر سے پہلے دلّی کے مشاعروں میں حصہ لیتے رہے اور غدر کے زمانے میں دلّی چھوڑ دی ، ۱۲۹۷ ھ میں اُن کا انتقال ہو گیا[1] - اُن کا

---

۱ - صحیفہ ۶ ستمبر ۱۹۵۸ء ، از اختر منیر ، حکیم مولیٰ قلق صفحہ ۱۷ ، خلاصہ تفریظ حالی بر دیوان قلق - حکیم غلام مولا عرف مولا بخش قلق اُردو کے مشہور شعرا کی صف میں شامل ہیں اور حکیم مومن خاں مرحوم کے تلمذ کی سعادت انھیں حاصل رہی ہے ، ان کا وطن میرٹھ تھا ، بارہ سال کی عمر میں وہ جہاں آباد آ گئے اور تحصیل علم و کمال کی طرف متوجہ ہوگئے - جب سپاہیوں نے بغاوت کی اور غدر کا خوف ناک واقعہ رونما ہوا تو شہر دہلی کہ معمورۂ لطافت تھا ، مورد آفات ہوگیا ، ان دنوں قلق میرٹھ چلے گئے اور وہیں اقامت پذیر ہو گیا ، اُنھوں نے ۱۲۹۷ھ میں وفات پائی - میرٹھ کے بعض سرکاری مدرسوں میں وہ فارسی کی تعلیم دیتے تھے اور اسی تدریس کو اُنھوں نے

باقی صفحہ ۱۶۸ پر

دیوان بعد وفات مولانا حالی کی تقریظ کے ساتھ شائع ہوا ہے ، ان کے کلام کی خصوصیات یہ ہیں : ترکیب کی برجستگی ، مضمون آفرینی ، خیال بندی ، شوخی ، ندرت مومن کے رنگ میں شعر کہ کر کمال پیدا کیا ، انتخاب کلام یہ ہے :—

آسماں کو یاد کیا کیا ہیں ستم گاری کے ڈھنگ
ہم چلے کس شوق سے سوئے گلستاں دیکھنا

بقیہ حاشیہ صفحہ ١٦٧ :

ذریعہ معاش بنا لیا تھا - بہت قانع ، غیور اور درویش بزرگ تھے ، مال و دولت کے مقابلے میں فضل و ہنر پہ ناز تھا ، شعر و سخن میں اُستاد کہلاتے تھے ، طب میں بھی دخل رکھتے تھے اور اپنے وقت کا کچھ حصہ علاج معالجے میں صرف کرتے تھے . مرتے وقت وصیت کی کہ دیوان طبع کیا جائے (گلستان نازک خیال معروف بہ کلیات اُردو قلق مطبع انصاری دھلی ١٨٨٣ء) - طب حکیم غلام نقشبند خاں سے ، فارسی صہبائی سے ، اور عربی ملا انتظام علی سہارنپوری سے پڑھی (صفحہ ٧٣)- اُن دنوں دھلی میں یہ عالم تھا گویا کسی باغ میں آخری بہار آئے ، غالب ، ذوق اور مومن جیسے سخنور اور نکتہ پرور یہاں قیام پذیر تھے ، قلق موزوں طبع تھے ، ذھین تھے ، نازک خیال اور دقیق النظر تھے ، وہ شعر گوئی کی طرف مائل ہوئے اور مومن مرحوم کی شاگردی اختیار کی ، بتدریج مومن کو بہت پیارے ہوئے - مومن مرحوم کے دیوان کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ غزل اور دوسری اصناف سخن کے سلسلے میں اُن کی نگارش کے انداز دو ہیں ؛ ایک تو وھی عام انداز ہے جو میر و مرزا اور دوسرے مشہور اُردو شعرا کا طریقہ ہے اور دوسرا خاص ہے (صفحہ ٧٣) یہ خاص طریقہ جو گویا مومن کی ایجاد ہے ، شاھراہ عام سے بالکل ہٹا ہوا ہے لیکن یہی مخصوص انداز نگارش ان کی شہرت کا باعث ہوا ہے اور ہندوستان میں چاروں کھونٹ ان کی اُستادی ، نازک خیالی اور دقت آفرینی کا ڈنکہ بجتا ہے . . . تھوڑی مدت میں قلق اُستاد کے خاص رنگ میں کہنے لگے ، مشاعرہ ہوتا تھا اور قلق اُستاد کے مقابلے میں طرح کی غزل پڑھتے تھے تو سننے والے سخت متعجب ہو جاتے تھے -

اے چرخ تو نے کیا نہ کیا ، پر نہیں کیا
رسوائے بزم ناز ، کسی نازنین کے ساتھ
کون بہتر عدو سے ہو سچ ہے
کشتۂ دولتِ وفا نہ ہوا
قطع تقریبِ عیادت کی بھی امید ہوئی
ہو گیا اَور بھی بیمار میں اچھا ہو کر
اُڑتا نہ تھا ، خزاں میں کہ طاقت رہے درست
اور فصلِ گل جب آئی ، گرفتار ہو گیا
وہ ھی میں ، وہ ھی فلک ، وہ ھی عدو ، وہ ھی نصیب
جانے کیا حادثہ ہے ، کیوں وہ مرے گھر آیا
پھر آبادی ہے ہم خانہ خرابوں کی طلب
کوئی گھر ، خلق کی مانند نہ ویراں ہوگا
کیوں نہ ہم پہ کھل جاتا ، پہلے ھی مآل اپنا
شوق و ذوق میں لیکن کس کو تھا خیال اپنا
فریبِ وعدہ سے ظالم نے بے قرار کیا
غضب کیا کہ تصور کا انتظار کیا
ہر اک سے وہ کہتے ھیں کہ لو ہم پہ یہ مرتے ھیں
جئیں گے ، اس طرح کب تک کہ غیرت آ ھی جاتی ہے
کہتا ہے انجمن کو تری خُلد ، مدعی
اس بوالہوس کے دل میں تمنّا ہے حور کی
حیف دستِ دعا و دامنِ ناز
خیر گذری کہ تو خدا نہ ہوا
کیا آشیاں بتائیں ، کہاں تھا کہاں نہ تھا
تھا جلوہ گر ، فریب نظر ، گلستاں نہ تھا

محشر ہے اگر اور کوئی چیز تو غلط
اک نقشِ پا ہے ، فتنۂ رفتارِ یار کا
شامِ فراق موت ہے ، صبحِ وصال حشر
دل دے کے زندگی تو ہے مشکل سبھی طرح
وہ پھر رہے ہیں آنکھ میں ، لیکن نظر سے دور
شوخی تو دیکھیے کہ وہ گھر میں ہیں گھر سے دور
واعظ وہیں کٹے گی ، شبِ ہجر سچ بتا
جنت مقام امن ہے ، خوف و خطر سے دور
بتوں کا جو نہ ہو "ساجد" عبادت کو وہ کیا جانے
نہ ہو رحمت کا جو قائل ، مے و ساغر سے کیا واقف

۲۸۔ قیصر | مرزا خدا بخش ، نواسہ شاہ عالم بادشاہ ، شاگرد مومن خاں دہلوی (سخن شعرأ صفحہ ۳۹۴) ، تذکرہ نویس صرف اسی قدر لکھتے ہیں [(حیاتِ مومن صفحہ ۷۷) (طورِ حکیم صفحہ ۸۲) (گلستانِ سخن صفحہ ۳۱۱)]۔ آزاد آبِ حیات (صفحہ ۴۲۴) میں مومن کے حالات میں لکھتے ہیں کہ میں نے انھیں نواب اصغر علی خاں اور مرزا خدا بخش قیصر کے مشاعروں میں غزل پڑھتے ہوئے سنا تھا۔ یہ شعر ہیں :-

هوس غیر سے عشق اپنا اسے یاد آیا
کیا نئی طرح سے ہم دل میں گذر کرتے ہیں
تو لطف کرے یا نہ کرے ، خوش ہو کہ نا خوش
اس بات پہ مرتا ہوں کہ عاشق ہوں ترا میں

۲۹۔ کاظم | کاظم علی ، شاگرد نصیر اور مومن ، منڈاور علاقہ ضلع بجنور کے رہنے والے (سخن شعرأ صفحہ ۳۹۴) ، (بزمِ سخن صفحہ ۹۸) ، (حیاتِ مومن صفحہ ۷۷) ، (گلستانِ سخن صفحہ ۴۱۲)۔ یہ رنگ کلام ہے :-

شبنم رخِ گل پر نہیں کاظم یہ سحر کو
پھوٹا ہے کوئی پائے عنادل کا پھپھولا

اے طفلِ اشک ہم تجھے آنکھوں میں یوں رکھیں
اور تو ہمارے راز کو یوں برملا کرے

۳۰ - کرم | نام غلام ضامن ، قوم شیخ (انشائے فارسی مومن) - حکیم احسن اللہ خاں مرتب انشائے فارسی نے مومن کا جو رقعہ ان کے نام ہے ، اس کی سرخی دی ہے ''رقعہ بنام شیخ غلام ضامن کرم کہ از اجلّۂ شاگردان آن جناب است''۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مومن کے خاص شاگردوں میں سے ہیں ، عمر میں مومن سے بہت بڑے ہوں گے اس لیے کہ شیفتہ نے ان کا ذکر (گلشن بےخار صفحہ ۱۶۱) ۱۲۵۰ھ میں جب داخل تذکرہ کیا تو اس وقت مومن کی عمر تقریباً ۳۵ سال اور شیفتہ کی عمر ۳۲ سال کی تھی تو کرم کی بابت لکھا کہ بڑھاپے کے باوجود مزاج میں ظرافت اور شگفتی ہے ، وطن کوتانہ ، قیام دہلی ، حیدر آباد ، بھوپال میں رہا ، (گلشن بےخار صفحہ ۱۶۱ ، طورِ کلیم صفحہ ۸۲ ، بزمِ سخن صفحہ ۹۸ ، سخن شعرأ صفحہ ۳۹۷) - حیاتِ مومن میں (صفحہ ۷۷) پر دہلوی غلط لکھا ہے۔ تذکرہ آثارالشعرأ میں (صفحہ ۱۹۰) ''خلف الرشید منشی غلام سبحانی عرف عبدالسبحان خاں صاحب خالِ حقیقی مدارالمہام محمد جمال الدّین خاں صاحب بہادر مرحوم، ابتدائے آغازجوانی سے تابست و ھفت سال سرکار نظام الملک حیدر آباد دکن میں بہ ماہوار پانصد روپیہ ملازم رہے، بعدہٗ بھوپال میں آ کر عہدہ ہائے جلیلہ پر ممتاز رہے، دواوین ان کے زمانۂ غدر میں تباہ ہو گئے —— شعر و سخن میں مرزا لطف علی خاں لطف دہلوی کے شاگرد تھے ، تاریخ سیزدھم شہر شعبان المعظم کو ان کا انتقال ہوا (۱۳ شعبان ۱۲۶۵ ھجری)''۔ شیفتہ نے فارسی اور اردو میں مومن سے استفادہ بیان کیا ہے اور دوسرے تذکروں میں بھی یہی روایت ملتی ہے - بزمِ سخن اور طورِ کلیم اور سخن شعرأ کے مؤلف اسی کی تائید کرتے ہیں - مولوی کریم الدّین (تذکرہ شعرائے اردو صفحہ ۳۸۱) لکھتے ہیں ''کرم

تخلص شیخ غلام ضامن کا ہے ، اصل اس کی کوتانہ کی ، ۱۲۵۰ ھجری میں درمیان شاہجہان آباد کے رہتا تھا ، آب کا حال معلوم نہ ہوا ، حیدر آباد بھی گیا تھا، ریختہ اردو اور فارسی کی غزل دونوں کہتا ہے، شاگرد مومن خاں کا ہے"۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کرم کا قیام ۱۲۶۶ھ سے پہلے ہوگا چونکہ حنین مغموم میں (تالیف ۱۲۶۶ھ) کرم کا ذکر بحیثیت شاگرد اور دوست ملتا ہے، قیام حیدر آباد میں ہو سکتا ہے کہ لطف سے کرم نے اصلاح لی ہو لیکن مومن سے تلمذ کے بعد انھوں نے اس تلمذ کا ذکر نہ کیا ، وہ مومن کے خصوصی دوست بھی ہیں ، پہلی بیوی کے سلسلے میں مومن نے کرم کے رقعے کے جواب میں کافی شکایت کی ہے ۔ ولادت ان کی ۱۲۰۰ ھجری سے قبل ہوئی ہوگی، ۱۲۵۰ھ میں اگر ان کی عمر ساٹھ مان لیں اور اس عمر میں شیفتہ نے کہن سالی قیاس کی ہو تو ولادت کا سنہ ۱۱۹۰ھ قرار پائے اور وفات کے وقت ان کی عمر ۷۰ سال ہوگی ۔ کلام سے پختگی ظاہر ہوتی ہے :—

فرہاد و قیس عشق میں سر گرم لاف تھے
خاموش ہو گئے جو مرا نام آ گیا
ہاتھ ہووے گا مرا ، اور تیرا داماں ہوگا
چاک جب صبح قیامت کا گریباں ہوگا
سہویں گے ، جورِ طاقت و تاب و توان تلک
لیکن یہ پوچھتے ہیں تجھی سے کہاں تلک
چین جبیں ہے موجِ تبسم ، نگاہ میں
ڈر ہے مجھے فریب کا تیرے یہاں تلک
اسیری ـ کی پردہ پوشی جنوں کی
کیا طوق گردوں نے کار گریباں
اس کو شہرت کی تمنا مجھے رسوائی کی
ہر کوئی آرزوئے نشو و نما رکھتا ہے

۳۱ - موجد حشمت علی خاں——امیر مینائی کا بیان ہے (انتخاب یادگار صفحات ۳۶۷ و ۳۶۸، ۱۲۹۰ھ) "سب آبا و اجداد ان کے ہمیشہ عہدہ‌ہائے جلیلہ پرسرفراز رہے، عمدہ عمدہ خدمتیں پائیں، ہم‌چشموں میں ممتاز رہے، یہ خود بھی معزز و کامگار ہیں، مورد عنایات سرکار ہیں، چالیس برس کی عمر ہے، مرد خوش رو ہیں، جوان خوش خو ہیں، مذاق عاشقانہ ہے پر مضمون یگانہ ہے، مومن خاں مرحوم سے مشورا ہے، جو شعر ہے اپنے رنگ میں پورا ہے، ان کا دیوان طبع ہو گیا ہے، انتقال بیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں ہوا، عبداللہ خاں مؤلف یادگار ضیغم (صفحہ ۳۸۱ تالیف ۱۳۰۲ھ) لکھتے ہیں :—

موجد تخلص حشمت علی خاں ولد محمد سعادت علی خاں رام پوری ہیں، آبا و اجداد ان کے ہمیشہ سے عہدہ‌ہائے جلیلہ پر ریاست رام پور میں مقرر رہے، یہ خود بھی نواب صاحب کے پاس معزز عہدے پر ہیں، قریب پچاس برس کے عمر ہے، مومن خاں مومن دہلوی کے شاگرد ہیں، ۱۹۰۷ء تک زندہ تھے، کلام گلدستۂ تصور مشاعرہ میں طبع ہے :—

کل تو حیلہ حنا کا ہاتھ آیا
عذر آنے میں آج کیا ہوگا
ہائے تیرے مریض کا کہنا
اب وہ آئیں گے بھی تو کیا ہوگا
دونوں ہاتھوں سے جگر تھام کے رو دیتا ہوں
یاد آتا ہے کسی کا جو تبسم مجھ کو
اپنی الفت پہ ناز ہے ہم کو
کہ انھیں بھی وفا کیے ہی بنی
ہوا یہ حوصلہ موجد کو بھی خدا کی شان
گئے ہیں آج وہاں عرض مدعا کے لیے
کہاں میں اور کہاں ترک محبت
نصیحت کی بھی ناصح نے تو کیا کی

اتنی ہی دعا میں مری ، تاثیر ہو یا رب
جتنا کہ ہر اک بات میں دشمن کی اثر ہے

۳۲ ۔ مضطر | مرزا سنگین دہلوی ، شیفتہ لکھتے ہیں (صفحہ ۱۸۲ گلشن بے خار) کہ ذہین اور میل جول والا ہے، مجھ سے بھی تعارف ہے، ایک زمانے میں چند زمینوں میں طبع آزمائی کی تھی ۔ نساخ خاندان تیموریہ سے ہونا بیان کرتے ہیں (صفحہ ۴۴۶ سخنِ شعرا) ۔ تالیف تذکرۂ گلستانِ سخن (صفحہ ۴۳۴) ، ۱۲۷۱ھ سے پہلے وفات پا چکے تھے :۔

تھا خود وہ تڑپنے سے خجالت زدہ ہم تو
مضطر کے کبھی خون کا دعویٰ نہ کریں گے

۳۳ ۔ مسکین | سید عبدالواحد خاں ، شیفتہ تحریر کرتے ہیں (صفحہ ۱۷۶ گلشن بے خار) کہ سید عبدالواحد مسکین ، ہنس مکھ نوجوان ہے، دہلی میں جب آیا تھا تو قیام دہلی کے زمانے میں مومن خاں سے اصلاح لیتا تھا اور مجھ سے بھی تعلقات ہوگئے تھے، اب (۱۲۵۰ھ) اندور میں بسر کر رہا ہے۔(کریم الدین صفحہ ۳۸۵ تذکرۂ شعرائے اردو، تائید شیفتہ ہے)۔ مومن ایک رقعے میں منشی امیر علی کو لکھتے ہیں (انشائے فارسی مخطوطہ رضا لائبریری رام پور) ”اس زمانے میں سید عبدالواحد مسکین تخلص سے ملاقات ہوئی اور تفصیلی آپ کا ذکر سنا“۔

نساخ (سخن شعرا صفحہ ۴۳۳) خیر آباد وطن لکھتے ہیں اور مقیم تال بھوپال لیکن آثارالشعرا (صفحہ ۲۰۶) کے مصنف ان کا ذکر شیخ عبدالواحد خاں کے نام سے کرتے ہیں ، وطن اکبر آباد ، نواب دولہ جہانگیر محمد خاں کے مصاحب ، ۱۲۷۱ھ میں ان کا انتقال ہوا ، تکیہ دلاور شاہ واقع سواد بھوپال میں دفن ہوئے ، ان کے فرزند عبدالعلی خاں تونگر تخلص میر منشی ریاست ہو کر خارج کیے گئے ۔ نساخ کا بیان زیادہ قابل ترجیح

ہے ، چونکہ ان کا تذکرہ جس وقت تالیف ہو رہا تھا اس وقت مسکین کے انتقال کو تھوڑا عرصہ گزرا تھا ۔ مصنف آثارالشعرأ نے شیخ بھی غلط لکھا ہے ، صاحب دیوان ہیں ، ان کی مثنوی چشمۂ شیریں مشہور ہے ، نمونہ کلام یہ ہے :۔

کیوں نہ اٹھنا بیٹھنا مشکل ہو اس رنجور کا
جس کو از خود رفتگی بھی اک سفر ہو دور کا
لے گئی چھین کے دل ساقیٔ سرشار کی آنکھ
آگئی دیکھ جسے ، نرگس بیمار کی آنکھ

۳۴۔ ناظم | نواب یوسف علی خاں ، والیٔ ریاست رام پور ۔ ولادت ۵ ربیع الآخر ۱۲۳۱ھ مطابق مارچ ۱۸۱۶ء ، تخت نشینی ۱۳ رجب ۱۲۷۱ھ ، وفات ۲۴ ذی قعدہ ۱۲۸۱ھ مطابق ۲۱ اپریل ۱۸۶۵ء ۔ امیر مینائی انتخاب یادگار (صفحات ۷۰ و ۷۱) میں لکھتے ہیں ''پہلے مومن خاں صاحب دہلوی سے مشورہ رہا ہے ، پھر مرزا اسداللہ خاں غالب سے تلمذ ہوا ، آخر آخر بہ وضع استادان لکھنؤ موزوں فرمانے لگے ، منشی مظفر علی صاحب (اسیر) کو جو آج لکھنؤ میں سحبان عصر یکتائے دہر ہیں ، کلام دکھانے لگے ، پایۂ شاعری کو ایسا بلند کیا کہ روح القدس نے بھی پسند کیا ، دو بار آپ کے نتائج افکار مطبع حسنی لاہور میں طبع ہوئے ہیں ؛ اول مرتبہ دیوان مختصر جو صرف مرزا اسداللہ خاں غالب کا دیکھا ہوا تھا چھپا ہے اور دوسری مرتبہ وہ کلام جو منشی مظفر علی خاں صاحب اسیر کی نظر سے گزرا ہوا تھا ، کلام اولین میں شریک ہو کر طبع ہوا ہے ۔

صاحب طور کلیم (صفحہ ۱۰۹) اور مؤلف بزم سخن (صفحہ ۱۱۱) اور نساخ (سخن شعرأ صفحہ ۴۹۸) صرف غالب کی شاگردی کا بیان کرتے ہیں ، مولوی امتیاز علی خاں صاحب عرشی مرتب مکاتیب غالب ناظم کے ایک خط

سے استدلال[1] کرتے ہوئے ثابت کرتے ہیں کہ پہلی بار ناظم نے صرف غالب سے اصلاح لی؛ ایسی صورت میں امیر مینائی کی یہ بات غلط ہو جاتی ہے کہ ناظم شاگرد مومن بھی تھے لیکن ہم ناظم کے اس مکتوب کو اس لیے اہمیت نہیں دیتے کہ وہ کلام جو اصلاح کے لیے غالب کو بھیج دیا تھا وہ ایک نو آموز کا کلام نہ تھا، بلکہ ایک مشاق کا کلام تھا اور ناظم کا یہ بیان تعلّی سے خالی نہیں، وہ غالب کو یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ وہ مبتدی ہوتے ہوئے کس قدر مشاق ہے اور اُستاد سے داد طلب کرتا ہے۔

نواب یوسف علی خاں کے انتقال کے بعد امیر مینائی نے انتخاب یاد گار نواب کلب علی خاں کی فرمائش سے لکھی اور نواب کے ملاحظے سے پوری کتاب گزری اور حالات کا اندراج ان کے منشاء کے مطابق ہوا۔ نواب کلب علی خاں کی ولادت ۲۰ ذی الحجہ ۱۲۵۰ھ مطابق ۱۹ اپریل ۱۸۳۵ء کو دہلی میں ہوئی، نواب یوسف علی خاں نے دہلی میں تعلیم بھی حاصل کی[2] مومن کے خصوصی رام پوری شاگرد عباس علی خاں بیتاب، نواب یوسف علی خاں ناظم کے حقیقی سالے تھے، بیتاب کے بھائی عنایت علی خاں عنایت بھی

---

۱ - مکاتیب غالب (طبع اول صفحہ ۶۷ دیباچہ) مشفقا ہر چند کہ کاتب را اتفاق موزونیت یک مصرعہ ہم اتفاق نشدہ بود، لیکن بجہت سماعت کلام سامی زبانی مولوی صاحب (فضل حق خیرآبادی) صدرالوصف دلم خواست کہ طریق رسل ورسائل جاری شود چوں سبیلے بہ ازیں بہ نظرم نرسید للہذا چند ابیات واہیات موزوں نمودہ بترصد اصلاح پیش آں یگانۂ آفاق مرسل گشت۔ چشم داشت کہ بعد اصلاح غزلہائے مذکور مع کدام طرح جدید لطف فرمودہ شوند (مکتوب ۵ فروری ۱۸۵۷ء) نیز ملاحظہ ہو۔ انتخاب کلام ناظم رام پوری۔ از محمد مختار آزاد صدیقی پدبوانی صفحہ ۱۶۱ تا صفحہ ۱۷۵۔

۲ - علی گڑھ میگزین مکاتیب غالب (طبع اول صفحہ ۲ و حاشیہ صفحہ ۴۰) فارسی میں غالب اور علوم عربیہ و حکمیہ میں مفتی صدرالدین آزردہ اور مولانا فضل حق خیر آبادی سے تلمذ تھا ... اپنے والد ماجد کی تخت نشینی سے پہلے دہلی میں قیام پذیر ہوئے تھے۔ جلد ۱۶ نمبر ۳ - اگست ۱۹۳۸ء

شاگرد مومن تھے ، اصغر علی خاں اصغر خلف نواب عبداللہ خاں ظریف ناظم کے چچا زاد بھائی شاگرد مومن تھے ، اس سے پتا چلتا ہے کہ مومن اس وقت دھلی کا مقبول اور محبوب شاعر تھا اور اسی وجہ سے یہ خاندان مومن کا شاگرد تھا ۔ مومن کا تعلق خاص یوسف علی خاں سے بھی تھا ؛ چنانچہ جب رام پور سے ۱۲۶۳ھ میں ناظم دھلی پہنچے تو وہ مومن جو ظفر کی مدح کو آمادہ نہ تھا ، وہ اس طرح زمزمہ سنج ہوتا ہے (دیوانِ فارسی مخطوطہ رضا لائبریری رام پور) :

تاریخ آمدن یوسف علی خاں بہادر بہ دھلی در زمانۂ ولی عہدی

بعمر خضر ، نیز رشکِ زلیخا جواں سال یوسف علی خاں بہادر
رسانْد گدا را بہ اوج عزیزی زر و مال یوسف علی خاں بہادر
برد گدیہ ، نقد حصول آرزو ھا ز آمال یوسف علی خاں بہادر
ظفر در رکاب و کرم گرد راھش خوشا حال یوسف علی خاں بہادر
تواں یافت سال ورودش بہ دھلی ز اقبال یوسف علی خاں بہادر ۱۲۶۳ھ

ایسی صورت میں امیر مینائی کا قول نہیں جھٹلایا جا سکتا ، جو بات ناظم نے مصلحتاً چھپائی تھی ، وہ بیٹے نے ظاھر کر دی ۔ منشی امیراللہ تسلیم لکھنوی تاریخ بدیع (جلد اول صفحات ۱۰۷ تا ۱۰۹) میں واقعات رام پور نظم کرتے ہوئے ، ناظم کے متعلق لکھتے ہیں :—

رھے راز آموز شعر و سخن بہت روزوں تک مومن سحر فن
پھر اندازِ نو کے جو طالب ہوئے اسی فن میں شاگرد غالب ہوئے
پس چند پھر لکھنؤ کی زبان پسند آئی نواب کو ناگہاں
جو کچھ کہتے فرصت میں موزوں کلام مظفر علی کو سناتے مدام

یہ منظوم تاریخ رام پور نواب کلب علی خاں کے لیے لکھی گئی ہے اور ان کو پیش کی گئی ۔ تسلیم نے وھی واقعات جو نواب سے سنے ، نظم کیے ھیں اس لیے مومن کی شاگردی کے مسئلے کو غلط نہیں کہا جا سکتا ۔ پھر

ناظم کا کلام اور غالب کی اصلاح آج موجود ہے ، ناظم کی مشاق ظاہر کرتی ہے کہ وہ مبتدی نہیں ، کہیں کہیں غالب نے اصلاح دی ہے ۔ ناظم کی شاعری کا درجہ بلند ہے ، جنگ آزادی کے تباہ حال شاعروں کو پناہ دے کر ناظم نے اردو ادب کی غیر فانی خدمت کی ، رام بابو سکسینہ (تاریخ ادب اردو صفحات ۳۱۴ تا ۳۱۵) کی رائے ہے ''نواب موصوف (ناظم) نے شعرائے دھلی و لکھنؤ کو اپنے دربار میں جمع کر کے اردو شاعری کو گنگا جمنا کر دیا تھا یعنی ان دونوں طرزوں کو ملا کر ایک نئے طرز کی بنیاد ڈالی تھی جس نے ان کے بلند اقبال صاحبزادے نواب کلب علی خاں کے زمانے میں بڑی ترقی کی (امیر ، اسیر ، جلال ، حیا ، داغ ، تسلیم ، ظہیر وغیرہ اسی عہد میں رام پور آئے ، تسلیم دس ماہ رہ کر چلے گئے تھے اور دوبارہ نواب کلب علی خاں کے بلانے پر آئے اور ظہیر دھلوی ۱۸۵۷ء میں آئے اور چار سال رہ کر چلے گئے)......ناظم تخلص پشت ورق صفحہ ۵۱ ب ـــــ در ایام غدر ۱۸۵۷ء ہزارها ستم رسیدگاں از مواطن خویش پریشان و آوارہ شدہ زیرسایہ ابدمایہ آں رسید مامن و مسکن یافتند ، قریب دہ سال است کہ آرام گزیں خلد بریں کردند''۔ اس کے کلام میں رنگ مومن اور غالب کی آمیزش پائی جاتی ہے :ـــ

طولِ شبِ ہجر جانتا ہوں
مرنا مجھے لاکھ بار ہوگا
ہونے دیا نہ شاد ، یہ دن پھر کہاں مجھے
ہے ہے تمھیں رقیب کے مرنے کا غم ہوا
ناظم وفائے وعدہ کی امید ہے کسے
مرنا بھی اس فریب میں دشوار ہو گیا
لڑ تو آیا اس سے لیکن ہم نشیں
دل میں کہتا ہوں کہ ناظم کیا کیا

اس سے یہ امید وفا واہ ، واہ
خیر ہے مومن تمھیں کیا ہو گیا
نے سبحہ ہاتھ میں ہے ، نہ زنار دوش پر
ناظم نہ تو ادھر نہ آدھر پھر کدھر ہوا
وہی تم ہو وہی خنجر ہے پر انصاف کرو
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہو کیا میرے بعد
مل جاتے ہیں تو کہتے ہیں اچھی طرح تو ہو
گویا ہمارے جی میں کچھ ارمان ہی نہیں
معشوق کس کے بس ہیں ناظم خدا سے ڈر
میرا ہی دل ہو کاش مرے اختیار میں
پردے میں کر رہے ہو یہ کیا لن ترانیاں
بیٹھو تو آ کے دیکھنے والوں کے سامنے
الفت بری بلا ہے کہ ناظم بایں تمیز
کرنی پڑی رقیب کی بھی التجا مجھے
معتقد ہوں کعبے کا ناظم مگر جا کر وہاں
عبرت آتی ہے کہ کیا بت خانہ ویراں ہو گیا
میں نے کہا کہ دعوائے الفت مگر غلط
کہنے لگے کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط
یہی سمجھ کہ نکالے ہوئے ہوں گے ورنہ
کیوں پھر اس بزم سے ہم خانہ خراب آتے ہیں
اک جہاں کشتۂ انداز خود آرائی ہے
آپ جو چاہیں کریں ، آپ کی بن آئی ہے

۳۵ - نسیم | مرزا اصغر علی خاں (دہلوی) نام ، بیٹے نواب آغا علی خاں۔ نساخ لکھتے ہیں (صفحہ ۵۱۹ سخن شعرأ) ''مقیم لکھنؤ ، شاگرد مومن خاں ،

اشعار ان کے اچھے ہوتے ہیں، لکھنؤ میں ان کی شاعری کا بڑا شہرہ ہے، دیوان ان کا نظر سے گزرا، بارہ سو بیاسی ہجری میں انتقال کیا''۔ صاحب طور کلیم (صفحہ ۱۱۶) تحریر کرتے ہیں ''مومن کے شاگرد اور مشہور شاعروں میں سے ہیں''۔ مؤلف بزم سخن (صفحہ ۱۱۲) بھی اس رائے سے متفق ہیں۔ آزاد آبِ حیات میں مومن کے نامی شاگردوں میں نسیم (آب حیات صفحہ ۴۲۴) کا ذکر کرتے ہیں اور پہلے تخلص اصغر اور پھر نسیم اختیار کرنا بیان کرتے ہیں اور ان کے مشاعروں میں مومن کی شرکت بھی ظاہر کرتے ہیں۔ اصغر تخلص کی روایت آزاد کی ہے اور کوئی ثبوت اس کا پیش نہیں کیا ہے؛ یا تو آزاد نے اصغر علی‌خاں اصغر خلف نواب عبداللہ خاں رام پوری الاصل اور دہلوی مسکن کے تخلص سے دھوکا کھایا ہے یا ہو سکتا ہے کہ ابتدا میں نسیم نے اصغر علی خاں نام کی رعایت سے اصغر تخلص رکھا ہو اور پھر تبدیل کر کے نسیم رکھ لیا ہو۔

جلوۂ داغ میں سید علی احسن احسن مارہروی داغ کا بیان لکھتے ہیں (صفحہ ۱۵ تا ۱۷) ''نواب اصغر علی‌خاں نسیم شاگرد رشید مومن کے ہاں دھوم دھام سے مشاعرے ہوتے تھے، وہاں بھی اکثر جاتے رہتے تھے، مگر مولوی امام بخش صاحب صہبائی اور مفتی صدرالدّین خاں صدرالصدور اور مرزا اسداللہ خاں غالب جیسے با کمال اساتذہ روپوش رہتے تھے (صفحہ ۱۷)۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ نواب اصغر علی خاں نسیم کے ہاں مشاعرے میں حضرت ذوق و غالب[1] و حضرت مومن وغیرہ اساتذہ شریک تھے

۱۔ آبحیات (صفحہ ۵۰۰) میں آزاد لکھتے ہیں:-

مزے یہ دل کے لیے تھے نہ تھے زباں کے لیے
سو ہم نے دل میں مزے سوزش نہاں کے لیے

نواب اصغر علی خاں نسیم کے مشاعرے میں غزل مذکورہ بالا طرح ہوتی تھی اور مومن خانصاحب کہ ان کے استاد تھے، استاد مرحوم (ذوق) کی خدمت میں آئے

باقی صفحہ ۱۸۱ پر،

اور ''آسمان کے لیے'' اس ردیف و قافیے میں مصرعہ طرح دیا گیا تھا، مرزا صاحب (داغ) نے سرسری غزل کہی تھی اور استاد سے اصلاح نہ لی تھی، اتفاقاً ذوق و مومن کے درمیان بیٹھنے کو جگہ ملی، یہ قاعدہ تھا کہ جس مشاعرے میں خاقانی سلطان‌الشعرأ حضرت ذوق شریک ہوتے تھے، اس مشاعرے میں سب کے بعد انھیں کا نمبر ہوتا تھا، جب سارا مشاعرہ غزلیں پڑھ چکا اور مرزا صاحب (داغ) کا نمبر آیا تو استاد ذوق نے پڑھنے کے لیے (صفحہ ۱۸) کہا - مرزا صاحب کہتے تھے کہ میں اچھی غزلیں سن چکا تھا، ان غزلوں کے بعد میری غزل کا رنگ جمتا ہوا نہیں معلوم ہوتا تھا اس لیے مصلحتاً طرحی غزل چھپائی اور استاد سے کہا کہ طرح میں تو نہیں کہا غیر طرح عرض کروں، استاد نے پڑھنے کی اجازت دی، میں نے یہ مطلع پڑھا :-

عجب اپنا حال ہوتا جو وصال یار ہوتا
کبھی جان صدقے ہوتی، کبھی دل نثار ہوتا

''یہ مطلع سنتے ہی تمام مشاعرے میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو گئی اور ہر طرف سے آفرین، مرحبا، کی صدائیں آنے لگیں، اول سے آخر تک غزل کی واہ واہ ہوئی - استاد ذوق علیہ‌الرحمۃ چپکے چپکے بار بار یہ فرماتے جاتے تھے کہ لاحول ولا قوۃ کیا فروگذاشت ہوئی ہے، کیا فروگذاشت ہوئی ہے (چونکہ غزل کا رنگ کا نہ جمنا) -

''اس سے نسیم کی شاعری کی وابستگی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اور

بقیہ حاشیہ ۱۸۰ :

اور بڑے اصرار سے لے گئے - یہ پہلا مشاعرہ تھا جو بندہ آزاد نے دیدۂ شوق سے دیکھا - غالب تشریف نہیں لائے مگر غزل لکھی تھی - اس سے داغ کا بیان غالب کی شرکت کا غلط ثابت ہوتا ہے، غالباً داغ کو سہو ہوا، آزاد کی زندگی کا پہلا واقعہ ہے اس لیے روایت صحیح معلوم ہوتی ہے -

اور اس کے ذاتی تعلقات اساتذہ فن سے معلوم ہوتے ہیں۔

"مشہور ادیب اور شاعر قاضی محمد صادق خاں اختر اپنے تذکرے (مہر جہاں تاب) میں رقم طراز ہیں (گل رعنا صفحہ ۳۸۹) کہ اس کا مولد و منشا دھلی ہے اور آخر عمر میں لکھنؤ تشریف لائے اور ایک مدت تک طالبان فن کو مرتبہ کمال تک پہنچایا۔

"ترکِ وطن کے اسباب بھائیوں سے مخالفت تھی، جنگِ آزادی (۱۸۵۷ء) سے کچھ پہلے لکھنؤ آگئے، نواب سالار جنگ کے خاندان کے بعض امراء شاگرد ہو گئے اور وہ سلوک کرتے تھے، غدر کے بعد منشی نولکشور مالک مطبع نے الف لیلیٰ نظم کرنے کی خدمت سپرد کی، ایک جلد اس کی تیار کر پائے تھے کہ خود ان کا قصہ تمام ہو گیا اور ۱۰ رمضان ۱۲۸۲ھ کو وفات پائی (گل رعنا صفحہ ۳۸۹)۔ مرنے کے بعد شاگردوں نے دیوان مرتب کیا، صاحب گل رعنا کی رائے ہے کہ نسیم نے تمام اصناف سخن میں قدرت کامل پائی تھی خصوصاً مثنوی میں ان کو ید بیضا حاصل تھا، ان کے کلام میں خیال کی دلفریبی اور بیان کی رنگینی کے ساتھ زبان کی صفائی اور پاکیزگی اس قدر نمایاں اور واضح ہے کہ اس کے ساتھ کسی دوسرے کا کلام لگاؤ نہیں کھاتا۔

"میری نظر میں وہ اپنے معاصرین میں اہل دھلی میں ایک ہی شخص ہیں جس نے اپنی طرز بیان کو محفوظ رکھتے ہوئے اہل لکھنؤ کی متروکات کو قبول کرنے میں پیش قدمی کی اور زبان کا ایسا اعلیٰ نمونہ پیش کیا کہ شعرائے لکھنؤ نے بھی اس کی داد دی اور یہاں رہ کر اپنے شاگردوں اور عقیدت مندوں کا ایک معقول گروہ پیدا کر دیا

"الف لیلہ منظوم کے ساقی نامے اگر ایک جگہ جمع کر دیے جائیں تو میرا خیال ہے ظہوری کا ساقی نامہ اس کے سامنے بے حقیقت ہو جائے گا"۔

نسیم کا کمال فن اس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ لکھنؤ کے مشہور اساتذہ

کی موجودگی میں اس نے شمع سخن روشن کی اور اس کی جادو بیانی نے لکھنؤ کے معتقدوں کو اپنی طرف کھینچ لیا اور دھلی کی شمع لکھنؤ میں بھی روشن ھو گئی - حسرت موھانی نے اردوئے معلی جلد ۸ ، نمبر ۱ جنوری ۱۹۲۷ء سلاسل شعرائے اردو میں نسیم کے چودہ شاگردوں کا (صفحہ ۱۴) ذکر کیا ھے - امیر اللہ تسلیم سے فیض سخن حسرت موھانی کو پہنچا ، تسلیم کہتے ھیں :-

میں ھوں اے تسلیم شاگرد نسیم دھلوی
مجھکو طرزِ شاعرانِ لکھنؤ سے کیا غرض

حیات مومن (صفحہ ٦۹ و ۷۰) کے مؤلف کا یہ بیان ان کے حق میں صحیح ھے :-

ان کا یہ کارنامہ تعجب کے لائق ھے کہ جس وقت لکھنؤ ، دھلی کے فیضان کا محتاج نہ تھا ، اپنی شاعری کا ڈنکا بجا دیا اور دلّی والوں کی طرف سے لکھنؤ والوں کو تنہا مخاطب کر کے کہا :

نسیم دھلوی ھم موجد بابِ فصاحت ھیں
کوئی اردو کو کیا سمجھے گا ، جیسا ھم سمجھتے ھیں

اسیر نے (حیات مومن صفحہ ۷۱) تاریخ فوت کہی ، مصرع

شد بحوران ارم از چمن دھر نسیم (۱۲۸۲ھ)

(ولادت ۱۲۱۴ھ) رام بابو سکسینہ نے بتائی ھے ؛ نواب محمد تقی اختر نے نسیم کی موت کے بعد خرچ راہ دے کران کی بی بی کو حج کے لیے بھیج دیا جہاں سے پھر نہ وہ پلٹیں ، اک اور منکوحہ تھی وہ بھی مر گئی ، حج سے بیٹا بھی نہ پلٹا - جدت تراکیب ، نازک خیالی ، بلند پروازیٔ تمثیل وغیرہ میں مومن کے دوش بدوش نظر آتے ھیں ، کلام کا نمونہ یہ ھے :

چپ دیکھیے قرار نہیں ایک حال پر
میرا سا اب تو حال ھوا روزگا کا

منہ میرا نہ کھلواؤ کہ ہو جائیں گے لب بند
دیکھو یہی اچھا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
محبت ہو کسی سے یا عداوت
مزا دے جائے گی جو دل سے ہوگی
نسیم دہلوی تو بھی مگر شاگرد مومن ہے
کہ ہر ہر شعر لطف بندش استاد دیتا ہے

تم تک مجھے لایا تھا جوش اس دل مضطر کا
اب جاؤں کہاں رستہ معلوم نہیں گھر کا
کسی صورت تو دل شاد کرنا
ہمیں دشمن سمجھ کر یاد کرنا
اشک دیدہ ہیں ہمیں کیا خانہ ویرانی کا فکر
گر پڑے جس جا وہیں اپنا وطن ہو جائے گا
نام مرا سنتے ہی شرما گئے
تم نے تو خود آپ کو رسوا کیا

ہوتی نہیں کم مری ویرانہ دوستی
جاتا نہیں ہے سر سے خیال وطن ہنوز
برق نے اک طرز بے تابی مرا سیکھا تو کیا
سینکڑوں باتیں ہیں ایسی خاطر ناشاد میں
قفس میں بند کرنا تھا جو تقدیر
ندامت کیوں مجھے دی بال و پر کی
حسرت دیدار میں کیا کیا نہ تڑپی عندلیب
تا قفس لائی صبا جس دم چمن میں بوئے دوست
محتسب نے آہ محفل کو نمازی کر دیا
جھک پڑے خم، گر پڑا، سجدے میں ہر پیمانہ آج

جب اور کسی پر کوئی بیداد کرو گے
یہ یاد رہے ہم کو بہت کو بہت یاد کرو گے
سفر ہے دشوار خواب کب تک بہت بڑی منزل عدم ہے
نسیم جاگو، کمر کو باندھو، اٹھاؤ بستر کہ رات کم ہے
حاجت شمع، نہ پروائے چراغ لحدی
پاک احساں سے مزار غربا ہوتا ہے
آ کہیں وعدہ فراموش کہ فرصت کم ہے
دم کوئی دم میں قدم بوس قضا ہوتا ہے

۳۶ - وحشت "غلام علی خاں نام، میر فرحت اللہ صاحب کے بیٹے تھے، ان کے والد مولانا محمد رشید الدّین خاں مراد آبادی (یہ شاگردرشید شاہ عبدالقادر و شاہ رفیع الدّین و شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کے داماد تھے)، (بزرگ خاندان سے ہے، مولد ان کا مراد آباد اور بنارس اور دہلی میں نشو و نما پائی ہے، اب انگریزی ملازمت کے سلسلے میں بلند شہر میں تعینات ہے، شاعری کا ماہ تاباں ہے اور آسمان مضامین اور معانی کا روشن سورج...اس کے کلام کی خوبی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حاسد بجائے طنز و تعریض کے مرحبا اور سبحان اللہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں۔۔۔انصاف یہ ہے کہ کوچۂ شاعری اس کے تصرف میں ہے، ان باتوں سے قطع نظر کم عمری اور آغاز جوانی کے باوجود اکثر کمالات میں اونچا مقام رکھتا ہے اور تقاضائے سن کی وجہ سے رموز عشق سے با خبر ہے اور آثار شیفتگی اس کے چہرے سے ظاہر ہوتے ہیں، مخلص اور خالص دوست ہیں، برسوں سے مجھ میں اور وحشت مین دوستی اور اخلاص ہے اور دوستی کا شہرہ پھیلا ہوا ہے۔ مومن خاں کے شاگردوں میں سے ہیں"۔ یہ رائے شیفتہ کی بحثیت دوست کے جذباتی کہی جا سکتی ہے (صفحہ ۲۳۵ گلشن بے خار) لیکن یادگار غالب میں حالی صفحہ ۹۱ و حاشیہ نمبر ۱ صفحہ ۹۱) لکھتے ہیں :-

نواب مصطفیٰ خاں مرحوم جنھوں نے مومن خاں مرحوم کی وفات کے بعد ہمیشہ اپنا کلام فارسی ہو یا اردو مرزا ہی کو دکھایا یا جیسے سید غلام علیخاں[1] وحشت جو مرزا کے حد سے زیادہ ماننے والے اور معتقد اور ان کی صحبت سے مستفید رہے تھے، مرزا نے انھیں دونوں صاحبوں کی طرف اپنی ایک اردو غزل کے مقطع میں اشارہ کیا ہے اور کہا ہے :

وحشت وشیفتہ اب مرثیہ لکھیں شاید مرگیا غالب آشفتہ نوا کہتے ہیں

یہ دونوں صاحب باہمدگر نہایت گہری دوستی رکھتے تھے، یہاں تک کہ ان کی دوستی عشق کے درجے تک پہنچ گئی تھی- ایک دفعہ جب کہ راقم بھی جہانگیر آباد میں موجود تھا، سید غلام علی خاں مرحوم نواب صاحب سے ملنے کو آئے ہوئے تھے اور مرزا صاحب نے بھی اُن کا یہاں آنا سن لیا تھا - اُنھیں دنوں میں مرزا صاحب کا خط نواب صاحب کے نام آیا، اس میں خاں صاحب کو بھی سلام لکھا تھا اور اخیر میں خواجہ حافظ کے مشہور شعر کا پہلا مصرع اس طرح بدل کر لکھا تھا - شعر :

چو با حبیب نشینی و چائے پیمائی بیاد آر حریفانِ بادہ پیما را

---

۱ - یہ صاحب دلی کے ممتاز لوگوں میں تھے، ان کے والد کا نام سید فرحت اللہ خاں تھا اور مولانا رشید علی خاں مرحوم کے داماد تھے، قطع نظر علم و فضل کے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں نہایت خوش بیان اور شعر کا مذاق اعلیٰ درجے کا رکھتے تھے- اول سرکار انگریزی میں ملازم رہے پھر الور میں فوجدار ہوگئے پھر لکھنؤ میں نواب سعیداللہ مرحوم نائب وزیر کے توسط سے کہ اُن سے قرابت قریبی رکھتے تھے، ایک معزز خدمت پر ممتاز ہوگئے، وہاں سے پھر الور چلے آئے اور غدر تک وہیں رہے، غدر کے بعد اخیر عمر تک سر رشتۂ تعلیم میں منسلک رہے اور نواب مصطفیٰ خاں مرحوم اُن کی ہرحال میں مدد کرتے رہے -

ایک عزیز نے یہ لطیفہ سن کر کہا کہ خواجہ حافظ کے اصل شعر میں اس قدر لطف نہ تھا ، جیسا کہ اس موقع پر مرزا صاحب کے اس تصرّف سے اُس میں لطف پیدا ہو گیا ۔

حالی (یادگارغالب صفحہ ۱۷۹) غالب کے معاصرین مولانا فضل حق خیرآبادی ثم الدهلوی، مولانا مفتی محمد صدرالدین متخلص بہ آزردہ ، مولوی عبداللہ خاں علوی مولوی امام بخش صہبائی ، حکیم مومن خاں مومن ، نواب مصطفیٰ خاں حسرتی ، نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر ، سید غلام علی خاں وحشت وغیرہم ہیں ۔ در حقیقت ان لوگوں کا (غالب) کے عصر میں موجود ہونا ان کی شاعری کے حق میں بعینہ ایسا تھا جیسا عرفی و نظیری کے حق میں خانِ خاناں ، ابوالفتح فیضی اور ابوالفضل کا ان کے زمانے میں ہونا...... سید غلام علی خاں وحشت مرزا کی نسبت کہتے تھے کہ اگر یہ شخص عربیہ کی طرف متوجہ ہو جاتا تو عربی شعر میں دوسرا متنبی یا ابوتمام ہوتا اور انگریزی زبان کی تکمیل کرتا تو انگلستان کے مشہور شاعروں کا مقابلہ کرتا ۔

مومن کے مخلص دوست اور شاگرد تھے ، مثنوی حنین مغموم (۱۲۴۴ھ) میں لکھتے ہیں :-

سوچتے شاگرد ہیں سالِ وفات
مرثیہ کی فکر ہے شیون کے سات
کون سے شاگرد وہ اُستاد فن
بے سخن ہے دلربا جن کا سخن
وحشت و مضطر ، کرم ، تسکین و یاس
بےخودی میں بھی ہیں جن کے بد حواس

کریم الدّین تذکرۂ شعرائے اردو (صفحہ ۴۵۰ و ۴۵۱) میں اس طرح رقم طراز ہیں :- وحشت کا خاندان کریم اور دودمان فخیم سے ہیں ، پیدائش

آنھوں نے مراد آباد میں پائی اور بنارس اور شاھجھان آباد میں نشو و نما پایا ، درمیان ۱۲۵۰ھ کے بلند شھر میں سرکار انگریزی میں نوکر تھے اور اب کہ ۱۸۴۷ء میں درمیان الور کے سرکار مہاراجہ الور میں ملازم ھیں ، شعر بہت اچھا کہتے ھیں ، عمر ان کی قریب چالیس برس کے ھے ، شاگرد مومن خاں کے ھیں۔

صاحب طورکلیم (صفحہ ۱۲۵)، مؤلف بزم سخن (صفحہ ۱۱۸) ، نساخ (سخن شعرأ صفحہ ۵۴۱ و ۵۴۲) اور ضابر (گلستان سخن صفحہ ۱۴۷۵ مذکورہ بالا آراء کی تائید میں ھیں ، حسرت موھانی (اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۳ ، جنوری ۱۹۲۷ء) ان کے قلمی دیوان کا حوالہ دیتے ھیں۔ ولادت کا سن ۱۲۲۳ھ کے قریب ھوگا چونکہ کریم الدّین نے ۱۲۶۳ھ میں ان کی عمر چالیس سال لکھی ھے ، غدر کے بعد وفات ھوئی ، اس طرح ساٹھ سال کی عمر کے بعد انتقال ھوا ھوگا۔ انتخاب اشعار یہ ھے :—

اللہ رے درازیٔ آغاز مدعا
نکلا جو حرف منہ سے داستاں بنا
بسکہ رنج افزائے طبعِ نازکِ جاناں نہیں
آسماں پر ھے دماغ اس آہ بے تاثیر کا
آیتیں حرمت صہبا کی سناتا ھوں اسے
ذکر سن سن کے رقیبوں کی مے آشامی کا
میرے مرنے کی خبر ، غیر کو یوں دیتے ھیں
مر گیا وحشتؔ جان باز ، تیری جان سے دور
جو نہ جاتا ھو کہیں ، کوچہ جاناں کے سوا
ایسے دیوانے کو کچھ حاجتِ زنجیر نہیں
ناصح یہی تو عین محبت کی بات ھے
اُن کو جو میرے مرنے کا ھجراں میں غم نہیں

پھری وحشت میری، دن، پھر کے جو دیکھا اس نے
گردش چشم ہوئی گردش دوراں مجھکو
گذرا اس اعتماد محبت سے میں، خدا
مجھ سے چھپائیں، کاش وہ الفت رقیب کی
بے تکلف آئے وہ بہر تماشا وقت نزع
کام آسان ہو گیا، یہاں مردنِ دشوار سے
حسرت فزا ہیں جذبِ محبت کے حوصلے
یاں اپنے نالہ ہائے سحر، بے اثر ہیں آپ
گر گوش حقیقت شنوا، ہے تو سمجھ لے
جو شور ہے اس دھر میں، افسانہ ہے اس کا
تیر پہ تیر ناز کا، دل پہ میرے گذار تھا
رخنۂ زخم ہر خدنگ دیدۂ انتظار تھا
سانس بھی سینے میں اب کھٹکے ہے میرے پھانس سی
کیا ہی زوروں پر چڑھی ہے ناتوانی ان دنوں
تھکا ہے منزلوں کا یا پیام یاس لاتا ہے
الٰہی خیر کیجو نامہ بر کچھ سست آتا ہے
اٹھا۔ کو کسی نے پھر نہ میری آستیں پکڑی
برنگ نقش پا، اس در پہ جب میں نے زمیں پکڑی

۳۷ - یاس حکیم خیرالدین - شیفتہ حالات کی وضاحت کرتے ہیں (صفحہ ۳۴۲ گلشن بے خار) کہ دھلی کا رھنے والا، شگفتہ مزاج ہے، اب (۱۲۵۰ھ) فکر شعر نہیں کرتا، مومن صاحب سے فیض سخن اٹھایا ہے، آج کل تحصیل طب میں مشغول ہے اور یہی وجہ ترک شاعری کی ہوئی ہے۔ کریم الدّین بھی (تذکرۂ شعرائے اردو صفحہ ۳۹۰) یہی حال لکھتے ہیں البتہ منشی فیض پارسا کے حالات میں صابر لکھتے ہیں (گلستان سخن صفحہ ۱۶۶) کہ

شاہ نصیر نے لکھنؤ سے واپسی کے بعد اپنی دو تازہ غزلیں مدرسۂ غازی الدین خاں کے مشاعرے میں پڑھیں (پارسا اس مشاعرے کے بانی تھے، آب حیات صفحہ ۴۷۹، دلّی کالج میں مدرس حساب تھے)، دوستوں نے تعریف کے پل باندھ دیے، بعض احباب نے حسد سے کام لیا اور اپنے بعض شاگردوں کو غزل کہنے کی تکلیف کی، خیر الدین یاس نے ''کفن پتھر کے'' کی ردیف میں ایک شعر خوب کہا:

مرہم سنگ جراحت نے بھرے اپنے گھاؤ
کب کے مشتاق تھے، زخموں کے دھن پتھر کے

یاس کا ذکر مومن نے مثنوی حنین مغموم میں بھی کیا ہے (۱۲۴۴ھ) ''مومن کے قدیم شاگردوں میں اور خاص دوستوں میں شمار تھا''۔

نساخ (سخن شعرأ صفحہ ۵۶۷)، سید نورالحسن خاں (طور کلیم صفحہ ۱۲۸)، سید علی حسن صاحب (بزم سخن صفحہ ۱۱۹) شاگرد مومن اور ذوق ظاہر کرتے ہیں، صابر نے بھی شاگرد مومن لکھا ہے۔ بغیر حوالے کے بات صحیح نہیں مانی جا سکتی جبکہ شیفتہ اور کریم الدین صابر مقامی معاصرین کے بیانات متفق ہیں۔ کلام جو شیفتہ نے پیش کیا ہے اس کا اقتباس یہ ہے:

اس طرف کو دیکھتا بھی ہے تو شرمایا ہوا
اب تلک ہے آنکھ میں شب کا سماں چھایا ہوا
زانوئے یاس کہاں اور سر دلدار کہاں
ہمنشیں بات وہ کر، جس کا ہو کچھ بھی سر پاؤں
دم تو لے، تیغ تلے اے تپشِ دل تھم جا
دیکھ قاتل کا میرے دھیان بٹا جاتا ہے
ربط غیروں سے بڑھا مجھ سے وفا چاہتے ہو
دل میں سمجھو کہ یہ کیا کرتے ہو کیا چاہتے ہو

کاش میں پردے کا شکوہ ہی نہ کرتا اُن سے
بے حجابی نے کیا اور بھی بے تاب مجھے

۳۸ ۔ غربت ۔ صاحبزادہ محمد ہدایت علی خاں ابن صاحبزادہ عبدالعلی خاں ابن نواب غلام محمد خاں والیٔ رام پور ۔ امیر مینائی انتخاب یادگار (صفحہ ۲۶۴) میں ان کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :—

یہ صاحبزادے بڑے خوش صفات ہیں ، جامع کمالات ہیں ، اکثر فنون کا شوق ہے ، صنائع میں ایجاد کا ذوق ہے ، پہلے حکیم مومن خاں صاحب دہلوی کو کلام دکھاتے تھے ، پھر شیخ مہدی علی ذکی مراد آبادی سے تلمذ ہوا ، تریسٹھ برس کی عمر ہے ، یہ ان کا کلام ہے :

شاید تیرے مریض کی ہاتھ آ گئی تھی نبض
عرشی بریں پہ آج دماغ حکیم تھا
کیں کاوشیں تو ناخن تدبیر نے بہت
عقدہ نہ ایک بھی مری مشکل کا حل ہوا
غرور حسن کا نشہ کبھی جو رخصت دے
تو اپنے بے خبروں کی بھی کچھ خبر لینا

پانچواں باب

احباب و معاصرین

احباب

مومن کے زیادہ احباب وہی ہیں جو اس کے شاعری میں شاگرد تھے لیکن بعض ایسے احباب بھی ہیں جو شاعر نہ تھے اور ذاتی تعلقات مخلصانہ مومن سے رکھتے تھے یا کسی نے صرف خاص فن کی دلچسپی کی وجہ سے روابط رکھے ، ان کی حیثیت مختلف ہے؛ کوئی رمل و نجوم میں، شاگرد ہے تو کوئی صرف زبان فارسی میں تلمذ کا فخر رکھتا ہے، یہ احباب صبح سے شام تک مومن کو گھیرے رہتے اور غریب کو فکر معاش کا موقع نہ دیتے۔ اس سے پہلے ہم اس خط کو پیش کر چکے ہیں جس میں اس کی صبح سے شام اور رات تک کی کیفیات درج ہے؛ ہم صرف چند احباب کا ذکر کریں گے چونکہ شاعروں کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔

۱- تفضل حسین خاں نام، محفوظ علی خاں کے بیٹے اور برکت علی خاں کا بھانجا ہے۔ شیفتہ گلشن بے خار (صفحہ ۳۱) میں تحریر کرتے ہیں:—
برکت تخلص برکت علی خاں از اهالیٔ خیر آباد است ، بسبب تقرب خدمت نصیرالدولہ جنرل اختر لونی ناظم دهلی مرجع اکابر دهلی بوده۔ یکچند به مختاری

راجہ پٹیالہ بوقعتے دل خواہ فلک نشین ماندہ ۔ الغرض تمام عمر ، ہم اختر کیوان زیستہ ، آخر از گردشِ گردونِ گرداں ہنگامے کہ در وطن روز را بشب می آورد ، نجم عمرش راجع السیر شد ، امروز سال وفاتش ہم شمارۂ سیارہ است چوں روتاب عطارد خداوند عقل و ہمت بودہ ، باسخن ذوق تمام داشتے ، و نیکو گفتے ، بسط بساط مشاعرہ کر دے ۔ نساخ سخن شعراء میں (صفحہ ۶۰) لکھتے ہیں :— منشی برکت علی خاں برکت تخلص ، باشندۂ خیر آباد ، راجہ پٹیالہ کے مختار تھے ، اشعار سے نہایت شوق رکھتے تھے اور خوب کہتے تھے ۔ مولوی عبدالقادر خاں صدرالصدور مراد آباد اپنے روزنامچے میں لکھتے ہیں (صفحہ ۳۱۸):-برکت علی خاں کہ بہ وکالت امیر خاں پیش جنرل صاحب می ماند (غالباً نساخ نے جس برکت علی خاں کا حوالہ دیا وہ یہی برکت علی خاں ہوں جن کا ذکر مولوی عبدالقادر نے اپنے 'روزنامچے' میں کیا ہو) مولوی عبدالقادر رامپوری اپنے روزنامچے (صفحہ۳۱۸) میں لکھتے ہیں کہ تفضل حسین خاں فرزند محفوظ علی خاں اور خواہر زادہ برکت علی خاں جو امیر خاں کی وکالت پر جنرل صاحب کے پاس رہتا تھا ، آیا ، نہایت طباع اور ذہین ہے اور ہر جگہ تعلقات سے کام نکال لیتا ہے ، تحریر ، تقریر اور سخن فہمی میں بہت اچھا ہے لیکن عافیت دشمن ہے اس لیے جو کچھ کماتا ہے ، اس سے زیادہ خرچ کر دیتا ہے ، دوسروں کے حق میں اچھا ہے اور اپنے حق میں بڑا ہے ، کینہ ، رشک اور دھوکا اور مردم آزادی سے بہت پرہیز کرتا ہے ، مدت سے پتا نہیں کہ کہاں ہے ، یہ واقعہ دہم ربیع الاول ۱۲۳۹ھ (مطابق ۱۴ نومبر ۱۸۲۳ء) کا ہے ۔

مومن کے فارسی رقعات اور نظم کے حصے میں بھی ان سے متعلق اشعار ملتے ہیں ۔ احمد نصیر خاں مومن کے بیٹے کو تفضل حسین خاں نے متبنیٰ بنایا تھا ؛ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مومن اپنے جس دوست سے ہر قسم کی مالی امداد لینا گوارا کرتے تھے ، وہ تفضل حسین خاں تھے

اور اپنے بیٹے کو فرزندی میں دینا اُن کے انتہائی خلوص کی دلیل ہے۔ ان سے کافی بے تکلفی ہونا مراسلات سے واضح ہے: خواجہ محمد نصیر رنج نبیسۂ خواجہ میر درد (مومن کے خسر) ایک خط میں تفضل حسین صاحب کو لکھواتے ہیں، ایک خط میں ان کی امرد پرستی پر فقرہ کسا ہے، رقعات اجمالاً اس طرح ہیں:۔

رقعہ۔لالہ پھول چند کہ پہلوئے آن گلِ سر سبد جاہ و منزلت جا دارد، گل خواہد کرد، و نوبہارِ غیرت وصال غلام رسول خاں کہ بہ طوقِ خدمت گزاری آں سرو سہی بوستانِ سیادت خود راہ خدام ارم می پندارد بار شہرت و رسوائی تواند آورد۔

رقعہ۔بنام معزاللہ، ہنگامے کہ از دہلی رفتہ و با کرم احمد یکے از دوستان بود رنجش بہ میان آمد۔

رقعہ۔نامۂ مولوی امام علی صاحب کہ بطے نیاز باد از نظر مبارک می‌گذرد، چشم دارم کہ ہم امروز بہ عالی خدمت مولوی عباس صاحب فرستادہ آید، نشود کہ چندے بارکشائے بستۂ قرطاس و قلمدان شود، حضرت خواجہ محمد نصیر (متوفی ۲ شوال ۱۲۶۱ھ) باصد شوق ملاقات و با آمیختن ہزاراں پردۂ دل بیختہ فرمودہ اند۔ زیادہ والسلام

رقعہ۔بنام نامی تفضل حسین خاں بہ ہنگام مرض الموت۔۔۔۔ شہر صد صدق و صفا توہم می دانی۔ ۔ ۔ ۔ در معاملۂ احمد نصیر و جناب مرا چہ جائے دم زدن است، اما چوں عنوان سخن از سخن عنوان بیاد دھد، جائے سخن بجواب استفسار ہماں مضمون مصرعہ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل۔ ۔ ۔

ظاہرا ایام حیات بہ پایاں رسید و نصف ملاقات کہ عبارت از نامہ و پیام است نیز تمام گردید، خانِ والا شان، چہ انصاف است کہ اولادِ من از خوانِ احسان شما بقدر نصیب خویش بہرہ یابند و من محروم باشم، ازیں دردِ نہاں چوں نخروشم و از ناخن رشک جگر چرا نخراشم، خوشتر آنکہ پنج

شش آثار تماکو کھا چرودی کہ نیکو تحفہ و ھدیۂ آن طرف است برائے این شوریدہ بخت ارسال فرمایند ، و کام و زبانِ لذت و دوست را شیرین کام دعا و ثنا نمایند ، کہ گروھا گروہ از دھلی بہ اجمیر رسیدہ اند تواند رسید ۔ ھاں وھاں چقدر خو کردۂ تلخ کافی گردیدہ ام ، بتقریب سخن شعرے از اشعارم بیاد آمد کہ این چنیں نہ شنیدہ باشند می نگارم ، و چشم انصاف دارم و پیوند است :—

ھر تلخ تر بہ عشق مذاق آشنا نہ بود
حسرت بہ زھر و زھر بخوناب شیشہ ایم

مولوی عبدالقادر رام پوری کا یہ لکھنا کہ تفضل حسین خاں عافیت دشمن ھے ، صحیح معلوم ھوتا ھے ۔ مومن کا اعتراف کہ میری اولاد تمھارے خوان احسان سے بقدر نصیب فائدہ حاصل کریں اور میں محروم رھوں اس لیے پانچ چھ سیر کھا چرودی تماکو بھیج دو ۔
احمد نصیر خاں کا تفضل حسین خاں کے پاس رھنا اس خط سے واضح ھوتا ھے جو احمد نصیر خاں کے نام ھے :—

پارۂ خوں شدہ جگرم سلامت ، روز کہ نامۂ سابق رقم پذیرفتہ بخیر مزاج جناب مستطاب خاں فلک پایہ کہ سایۂ عاطفت شان برفرق فرق‌دان سائے شما تا روز قیامت باد ، رشک افزائے گردشِ ایام و غیرت فرسائے روزگار نافرجام بود ، و لحظہ لحظہ و ساعت ساعت کالشمس فی‌الزوال رو از اوجِ صحت بہ حضیض کسل و اضمحلال می نمود ، بے گمان یقین می شد کہ ایام زندگانی بسر آمدہ ، المنۃللہ کہ این آفتاب از کسوف یاس و حرماں بر آمدہ ، چنداں تردد و تشویش بے صرفہ ، بکار نہ باید برد ۔

احمد نصیر خاں ، مومن کے پاس نہ رھتے تھے ، احمد نصیر خاں کے نام مومن نے جو خطوط لکھے ھیں ، ان سے واضح ھو جاتا ھے کہ وہ مومن سے

علاحدہ قیام رکھتے تھے اور مذکورہ بالا رقعے سے واضح ہے کہ خاں فلک پایہ مراد تفضل حسین خاں سے ہے جیسا کہ مومن نے تماکو کی فرمائش والے خط میں اپنا نقطۂ نظر واضح کیا تھا کہ میری اولاد تمھارے احسان سے بہرہ ور ہیں اور میں محروم رہوں۔ تفضل حسین خاں جب دھلی سے روانہ ہوئے تو مومن نے الوداعی قطعہ تاریخ لکھا جو یہ ہے :—

تاریخ سفر کر دن محمد تفضل حسین خاں صاحب از دھلی

جہانِ فضل، تفضل حسین خاں ناگاہ
جدا شد از من و گشتم غریب هم به دیار
شنید مومن ازیں غم صد، آہ، پیہم زد
دویست بود چو اندیشه ام گرفتار
بگفتمش که بهر حرف نیست مضمونے
تو شاعری نبود، آہ و ناله ات پیگار
مگر بطرز آں گفته باش ایں تاریخ
نه گفت هیچ مگر زد۔ شش آہ دیگر بار

۴۲

دو سو آہ کے اعداد ۷ × ۲۰۰ = ۱۴۰۰ ہوتے ہیں، چھ آہ ۶ × ۷ = ۴۲ ہوتے ہیں، چودہ سو میں سے بیالیس عدد کم کر دیے جائیں تو ۱۲۵۸ھ رہ جاتے ہیں۔ میر تفضل حسین خاں کے باغ کی تاریخ کہی ہے :—

به فکر سال شدم بر فلک که گفت سروش
فرا گرفت، زمین را حدیقۂ غلبا

۱۰۷ + ۱۱۶۰ = ۱۲۶۷ھ

تفضل حسین خاں کا مکان بنا تو اس کی تاریخ لکھتے ہیں :—

بنا کرد قصرے، تفضل حسین که از قلعۂ آسماں محکم است

چه خرم مکانے که تاریخ آں، نباشد تماشه گه عالم است

میر نواب ، میر تفضل حسین خاں کے بیٹے تھے ، ان کی شادی کا قطعه تاریخ کہا :—

(کلیات مومن صفحات ۱۸۹ و ۱۹۰ نولکشور طبع ششم)

وہ تفضل حسین ، یارِ قدیم نیک خو ، نیک ذات ، نیک سیر
گرم سامان بزم سور ہوا بہر چشم چراغ اہل نظر
میر نواب بے نظیر جہاں کیا خجسته پدر ، سعید پسر
کد خدائی کا کیا کہوں ساماں زیب کے دل میں ، کر لیا ہے گھر
مہر داماد ، ماہ پارہ عروس ایک سے ایک عالم آرا تر
فکرِ تاریخ میں ، سنا میں نے که رہا تھا سروش نیک اختر
لکھ دے، اے مومنِ ستارۂ شناس سالِ عقد ، اجتماع شمس و قمر ۱۲۶۱ھ

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے که مومن کے تعلقات میر تفضل حسین خاں سے کس قسم کے تھے۔ مومن خود داری کے باوجود اپنے مخلص دوستوں سے ہر قسم کی امداد لینا گوارا کرتے تھے اور اسی وجه سے ان کی غربت نمایاں نه ہو سکی ۔

۲ - حکیم احسن‌اللہ خاں خلف حکیم عزیزاللہ صدیقی—سال ولادت ۱۲۱۲ھ ہے - سر سید احمد خاں آثارالصنادید میں ان کا ذکر اس طرح کرتے ہیں :—

احترام‌الدوله ، عمدۃالحکماء ، حاذق‌الزماں حکیم محمد احسن‌اللہ خاں بہادر ثابت جنگ ، سر گروہ ارباب کمال، شیخ صدیقی ، ہراتی‌الاصل ہیں ، سلسله ان کے نسب کا حضرت خواجه زین‌الدین ہراتی رضی‌اللہ عنه که عرفائے دہر اور کملائے روز گار سے تھے اور طریقه پیری مریدی کا ان کے خاندان میں جاری تھا.... والد کی سوئے مزاجی سے کشمیر میں آئے ،.....ان کے والد نے حکیم محمد ذکاءاللہ خاں سے علم طب حاصل کیا اور اطبائے نامی شاھجہان‌آباد

پر سبقت لے گئے ، انھوں نے فنونِ حکمت و ھندسہ و ھیئت خدمتِ فضلائے عصر سے حاصل کر کر ، فنِ طبابت کو اپنے والد ماجد سے حاصل کیا....مسیحائی حاصل کی ، اھلِ شہر ان ھی کی طرف رجوع کرتے ھیں۔ اوائل میں فخرالدولہ نواب احمد بخش خاں مرحوم والیٔ فیروز پور جھرکہ کی ملازمت میں کمال عزت و توقیر کے ساتھ منصبِ طبابت پر ماسور ھوئے اور ان کی رحلت کے بعد اسدالدولہ نواب فیض محمد خاں والیٔ جھجر کے پاس اسی منصب عمدہ پر مقرر ھوئے ، اس رئیس کے انتقال پر ترک روز گار کر کے چندے خانہ نشین ھوئے لیکن ازبسکہ ھر حرف ان کے نسخے کا ھوالشافی ھے....حضرت معین‌الدین محمد اکبر بادشاہ عرش آرام گاہ نے...اپنے پاس بلا کر عطائے خلعت اور عنایتِ خطاب عمدۃالملک ، حاذق‌الزماں....خاص اپنے معالجے کے واسطے معین کیا۔ ان کے بعد ابو ظفر محمد سراج‌الدین بہادر شاہ بادشاہ غازی خلداللہ ملکہ و سلطانہ نے اپنے سنہ جلوس میں طلب کیا اور احترام‌الدولہ ثابت جنگ خطابِ سابق پر زیادہ کیا...ترقی مدارج یہاں تک ھے.....مدارجمیع امور سرکار بادشاھی کا اسی بلند اقتدار پر منحصر ھے.... خلق وسیع اور اھلِ شہر کی التماس کو پذیرا کرنے والا ، ھر ایک محسن سمجھتا ھے۔

جنگِ آزادی کی تحریک میں لوگوں کا خیال ھے کہ یہ انگریزی حکومت کی در پردہ حمایت کرتے رھے لیکن انگریزی عہد میں بھی ان کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا گیا۔ ۱۸۷۳ء میں انھوں نے رحلت کی ، نواب ضیاءالدین خاں نیردرخشاں نے قطعۂ تاریخ وفات لکھا ھے :۔

بدیں وجہ و ترکیب آں لفظہا　　بود سال فوتش حکیم غریب ۱۲۹۰ھ
(جلوہ صحیفہ زریں نیرورخشاں)

حکیم احسن‌اللہ خاں کی والدہ مومن کی حقیقی پھوپھی تھیں ، حکیم احسن‌اللہ خاں مومن سے عمر میں بڑے تھے ، انھیں مومن سے بہت الفت تھی ، مومن کی لاابالی طبیعت کو دیکھ کر انھوں نے کوشش کی کہ مومن کے

خطوط کی نقل محفوظ کی جائے تا کہ انشائے مومن ترتیب ہو سکے ۔ اس زمانے کا رواج مراسلت کا فارسی میں تھا ، مومن بھی دھلی کے مشاہیر فن میں شمار ہوتے تھے ، آخر مومن کو جبراً اور قہراً فرمائشی کچھ خطوط لکھنے پڑے اور کچھ ادھر آدھر سے جمع کیے ۔ مومن کے مرنے کے بعد یہی خطوط حکیم احسن اللہ خاں نے قلعہ دھلی کے سلطانی پریس (۱۲۷۱ھ) میں چھپوائے ۔ فارسی کلام بھی حکیم احسن اللہ خاں نے فرمائش کر کے عبدالرحمٰن آھی سے جمع کرایا اور ۱۲۷۱ھ میں مطبع سلطانی دھلی میں چھپوایا ۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ھے کہ انھیں مومن سے کس قدر محبت تھی اور یہ انھیں کی کوشش تھی کہ فارسی نثر و نظم جمع ہو سکی ۔ مومن بھی حکیم احسن اللہ خاں کا انتہائی احترام کرتے تھے ، چنانچہ ھر خط سے محبت اور عقیدت کا اظہار ھوتا ھے ۔ انشائے فارسی کا پہلا خط حکیم احسن اللہ خاں کی فرمائش کے جواب میں ھے ، لکھتے ھیں :-

تغافل پژوھا مہربانی نامہ بہ تاکید ارسال مسودات ژولیدہ رقم وا رسیدہ، و ازکاکل سلسلہ مویاں آشفتہ تر گردانیدہ ، ھنوز خامہ ام ، لب بہ جواب نہ کشودہ بود کہ نامۂ دیگر بہ مضمونِ شکایتِ تغافل ورود فرمود ، لا جرم خوئے پیماں شکن و خاطر عھد گسل از کافر کیشان مسلماں دشمن استعارہ نمودم ، و بیانِ نیاز بہ پاسخ ، فرمان واجب الاذعان گشودم ، توفیق عذر نیو شیدن و بہ درد دل رسیدن روز باد ، پیداست کہ گوھر معانیم ھمہ بے بہا است و دُرھائے مضامینم جملہ از دریا ، در جنبِ زر تمام عیار سخنم ، گوئی دست افشار پرویز کم عیار است.....

دوسرے خط کا جواب تحریر کرتے ھیں :-

با ایں ھمہ آشفتہ سری ھا با خود پیماں بستہ ام کہ ازیں ما زیر نغمہ کہ بزبان کلک داؤد الحان بگذرد تحسیں بہ ملاحظہ فصاحت آموختگان گرامی صحبت بگذرانم، وھر گوھرے کہ گریۂ خامۂ درافشاں

به دامن و جیب صفحه افشاند ، اولیں بر فرق فیض اندوختگاں عالی مجلس بر افشانم .... شہاب‌الدین نامی که به تعلیم اولاد غفور خاں آنجا وا کشیده است زمانها به صحبت ایں هیچ مداں رسیده ، گاهے که زانوئے سبق خوانی پیش من ته می کرد جزو چند به تمهید حکایت بے وفائی کج ادائی رقم زده بودم به غارت بود هر که از چنگال آں جفا پیشه ، صیاد نا قدر داں در رهاید ، صیدِ معانی شوخی سرشت بے تردد کمیں به دام می آید ۔

ایک اور رقعه ان کے نام ہے :—

فرماں تو دل پذیر و من بندۂ تو ، اما چکنم که دل بفرمانم نیست ، سراسیمگی تیره باطن روا ندارد که سطرے چند به جمیعت خاطر برنگارم و پریشانیٔ سیاه نامه نمی گذارد که معانیٔ دل پسند فراهم آرم ، بے ربطیٔ مضامین ایں رساله گواه منست و بدنمائی صورتِ الفاظ عذر خواه من ، نکته شناساں دانند که نکتۂ دل نشیں بے فراغ خاطر بر جا نه نشیند ، و عالی نگاهاں فهمند که بے امعانِ نظر روئے شاهد معنی اگر دیدۂ آفتاب است نه بیند ، تکلفِ شاعرانه به بے تکلفی صورت نه بندد ، و معانیٔ بیگانه با بیگانگئی خیال نه پیوندد ، .... اگر رجوع به تجاهل عارفانه نه نمایند ، و التفات به تقلیب حسن‌التعلیل نه فرمایند ، می دانید که ترصیعِ جواهر معانی چه قدر دشوار است ، و طباق سپیدی و سیاهی چه مشکل.....

ایک خط میں جو حکیم احسن‌الله خاں کے جواب میں ہے اور جس میں انهوں نے اپنے والد حکیم عزیزالله صدیقی کی بیماری میں دیکھ بھال کے لیے لکھا ہے، تحریر کیا ہے :—

ایں ماه هفت نوبت به عیادت جناب ممدوح به خانه رسیدم ، و محروم دیدار باز گشتم .... صبح پنجشنبه دیگر باره آستانه بوس بل دولت‌مند ملازمت می گردم ، و خدانخواسته اگر رنج می بینم ، هماں دم به

عرض ملازماں می رسانم ، خاطر مبارک مطمئن دارید ، و طریق صبر و شکیبائی نه گذارند ۔

مومن کے خطوط میں ایک خط منشی امیر علی کے نام ہے ، مومن نے ان کی تعریف اپنے دوست میر تفضل حسین خاں سے سنی اس لیے شوق نامه و پیام پیدا ہوا اور انھیں خط لکھا؛ غالباً یه سلسله آگے چلا ہوگا ، ہمارے پیش نظر یہی خط ہے ، اس سے ان کی دوستی میں سبقت کا جذبه واضح ہوتا ہے ۔ منشی امیر علی کی نسبت مولوی عبدالقادر رام پوری اپنے روز نامچے میں لکھتے ہیں (صفحه ۳۱۲ نسخه حبیب گنج) "۱۷ جولائی ۱۸۲۳ء کو اجمیر پہنچے اور اسی درمیان میں منشی امیر علی سندیلوی جو ایک مدت تک جنرل ارنل کے ساتھ اور کچھ دنوں کلارک صاحب کے ہمراہ جنرل سر ڈوڈ آکٹر لونی کی سفارش سے اجمیر میں پہنچ کر صاحب ممدوح اور ویلڈر صاحب کی مہربانی سے قائم مقام سررشته دار رہا اور جیسلمیر کی وکالت اور اخبار نویسی پر مقرر رہا ، اب اجمیر میں صدر امینی کر رہا ہے ، (صفحه ۳۳۲) - ۱۰ محرم ۱۲۴۰ھ مطابق ۵ ستمبر ۱۸۲۴ء کو اتوار کے دن میں جیسلمیر پہنچا اور مقیم ہوا ، منشی امیر علی ملاقات کو آیا "۔

مومن نے یه خط ۱۲۴۰ھ کے بعد ہی لکھا ہوگا ۔ عنوان ہے :—

اشتیاق نامه پیش از ملاقات بنام منشی امیر علی

وائے بر محرومیٔ بے کسے که از دولت ملازمت محروم ماند . . . . ورنه بر آں جناب سطوت مآب ، چوں ملک بوسه دادے ۔ گماں نبرند که ایں اظہار اشتیاق از مراسم تملق زمانه است یا از مضامین بے صرفۂ شاعرانه ، که بے فیض اندوزیٔ فیض سراپا برکت بایں پایه معارج شوق سراپا کہاں بر آمدن اهل بخیال در نمی آید . . . ہنگامیکه افضل کاملان جہاں تفضل حسین خاں بعد ملاقات خدام کرام زینت فزائے خرابۂ جہاں آباد گردیدند ، و به درد ایں مہجور درد مند فرارسیدند ۔

داستانِ محامد جمیله و اوصاف جزیله سامی بر زبان و گوش منت پا نہادند و خاطر نیاز مند چوں زبان مدح اشفاق به ثنا پائے از حد کشادند از آں روز موانست دلی و صفائے جانی در سینه دوستی پنہانی خار خارے داشت و چشم گوش برآواز و گوش چشم در راه . . . اکنوں که از مئے خبرت بے خبر شدم مشتاق وصل بودم و مشتاق ترشدم ، و در سامعه به ذکر مسرت افزا مایه‌دار سرور است باصره هم از دولت دیدار گنجور باد ۔

مومن کے احباب میں منشی کرم احمد بھی ہیں ، میر تفضل حسین خاں اور کرم احمد کے درمیان کوئی رنجش پیدا ہو گئی ، مومن نے صفائی اور صلح کے سلسلے میں میر تفضل حسین خاں کے نام خط لکھا ہے جس کا عنوان ہے :-

رقعه هم بنام معزالیه (تفضل حسین خاں) که از دهلی رفته ، و با کرم احمد یکے از دوستاں بود رنجش به میان آمد ۔

مولوی عبدالقادر رام پوری کے روز نامچے میں (صفحه ۳۲۲) بھی کرم احمد کا ذکر آتا ہے ، کمپنی کے زمرۂ ملازمان میں غالباً یه بھی کسی معزز عہده پر فائز تھے ؛ چنانچه مولوی عبدالقادر نے لکھا ہے که ۳ جمادی الآخر ۱۲۳۹ھ مطابق ۴ فروری ۱۸۲۴ء کو رات کے وقت اجمیر میں ملاقات کے واسطے تشریف لائے اور پھر نصیر آباد چلے گئے ۔

حامد علی خاں ۔ ۳۰ دسمبر ۱۸۳۰ء کو سنیچر کے دن بہادر شاہ تخت نشین ہوئے (صفحات ۴۸ تا ۶۳ ۔ بہادر شاہ ظفر ۔ از امیر احمد علوی) . . . . . اس عرصے میں مرزا مغل بیگ نے جو علاوہ کم علم اور کم شعور ہونے کے خائن بھی تھے ، بعض بیش قیمت جواہرات شاہی میں تغلب کیا ، راز فاش ہو گیا اور قلعے سے نکالے گئے ۔ ان کی جگه لکھنؤ کے ایک شریف زادے حامد علی وزیر ہوئے ، آن سے مومن کی ذاتی دوستی تھی ، مومن امرا اور نوابین کی مدح سرائی سے گریز کرتے

تھے لیکن دوستوں کی فرمائشوں سے مجبور تھے اور جن سے خصوصی تعلقات تھے ان کی ہر نئی بات پر تاریخ نکال ڈالتے - حامد علی خاں کی وزارت کی مدح سرائی نہ کی بلکہ ذاتی دوستی کا حق اس طرح ادا کیا ہے - (کلیات مومن ، طبع پنجم نولکشور) -

اے وزیر بلند پایہ تجھے — التفات شہی مبارک ہو
قدر عالی و خصلتِ محمود — خان حامد علی مبارک ہو
کارگاہِ سپہر سے ہر روز — تجھ کو خلعت نئی مبارک ہو
ذات کرسی ، ترا مقام بلند — کیا کہوں پالکی مبارک ہو
فیلِ گردوں مطیع ہے تیرا — فیل تشریف بھی مبارک ہو
میری تیغِ زباں کی تیزی سے — تجھ کو اعدا کشی مبارک ہو
مومن آیا ہے بزم میں تیری — صحبتِ آدمی مبارک ہو
تہنیت خوانِ کامیابی ہے — صلۂ دوستی مبارک ہو
بہر تاریخ یوں کیا بے فکر — خلعت آصفی مبارک ہو ۱۲۵۴ھ

نواب حامد علی خاں ایام جنگ آزادی میں انگریزوں کے مخبر سمجھے جاتے تھے اس لیے اُن کا مکان لوٹ لیا گیا لیکن عجیب بات یہ ہے کہ انگریزی فوجوں کے داخلے کے وقت یہ بھی حفظ آبرو اور جان کے لیے دھلی سے نکلے (داستانِ غدر صفحات ۱۱۶ ، ۱۱۷ ، نواب حامد علی خاں صاحب کا آدمی میرے والد کے پاس آیا اور کہا بادشاہ قلعے سے سوار ہو گئے ، رعیت سب نکل رہی ہے ، خدا کے لیے گھر بار اور مال کو چھوڑو ، بچوں کو لے کر شہر سے نکلو) تو برست سے مع خاندان پکڑے آئے (داستان غدر صفحہ ۱۳۲) ، غالب کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ تباہ اور برباد ہو چکے تھے -

لالہ جوالا پرشاد - مومن کے بچپن کے دوستوں میں سے تھے ، حکیم احسن اللہ خاں نارنولی سہندی کی فرمائش کرتے ہیں اور

لاله جواله پرشاد کے متعلق لکھتے ہیں کہ وہ بچپنے سے میرا یار ہے ، اپنی بیماری کا ذکر بھی اس خط میں کرتے ہیں اور مہندی اس کی معرفت منگواتے ہیں۔ ایک خط حکیم غلام حسن خاں اپنے چچا کو لکھتے ہیں جو اُن دنوں ریاست حیدر آباد میں مقیم تھے۔ لاله شیام لعل مومن کے دوست کے بیٹے تھے اور مشیرالملک کے رسالے میں ملازم تھے ، مومن اس کی سفارش کرتے ہیں کہ جو کچھ التجا کرے پوری کی جائے۔ زکریا بیگ مومن کے رشتہ دار تھے ، اُن کی ایک خط میں سفارش بڑے زور دار لفظوں میں کی ہے ، حکیم احسن اللہ صاحب کی والدہ کے نام کے خطوط ہیں۔ اس سے اتنا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مومن کے تعلقات بڑے وسیع تھے اور وہ حفظ مراتب کا لحاظ کرتے تھے۔ حکیم احسن اللہ صاحب کو جو خط لکھے ہیں ، اُن سے احترام کا اظہار ہوتا ہے۔ تفضل حسین صاحب سے دوستی عزیزوں سے زیادہ خلوص پر مبنی معلوم ہوتی ہے ، منشی امیر علی کے نام خط سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ موزوں اشخاص سے دوستی پیدا کرنے میں پیش قدمی کرتے تھے ، منشی کرم احمد اور منشی تفضل حسین کی باہمی رنجش کو دور کرنے میں حق دوستی بجا لاتے ہیں اور دو دوستوں کو ملانے میں پہل کرتے ہیں۔ ہندو اور مسلمان اُن کی نظر میں یکساں تھے ، لاله جواله پرشاد کی نسبت یہ لکھنا کہ میرا بچپن کا دوست ہے ، اُن کے خلوص کا آئینہ دار ہے (بہادر شاہ ظفر صفحہ ۱۵۴ از رئیس احمد جعفری)۔

حکیم سکھا نند رقم تخلص ، اُن کے رمل میں شاگرد تھے اور مومن کا ادب والد کی مثل کرتے تھے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ شاگردوں سے بھی اس طرح ملتے تھے کہ ہر شاگرد یا تو مخلص دوست بن گیا تھا یا اولاد کا رویہ رکھتا تھا۔ صہبائی ، علوی ، غالب ، آزردہ ، ذوق وغیرہ معاصرین اُن کے احباب تھے اور اسی بنا پر غالب نے مومن کے مرنے پر یہ قطعہ کہا تھا :—

شرط است کہ روئے دل خراشم همه عمر
خون نابه به رخ زدیده پاشم همه عمر
کافر باشم اگر به مرگِ مومن
چوں کعبه سیه پوش نباشم همه عمر

اُن کے دوستوں کی تعداد شمار سے باہر ہے ، دہلی کی علمی سوسائٹی کا ہر فرد اُن کا فدائی اور یار تھا اس لیے یہ نا مکمل فہرست ہی سمجھی جائے۔

معاصرین

مومن نے جس زمانے میں ہوش سنبھالا تو دہلی باوجود تباہی کے ہندوستان کا مرکز علم و ادب تھا ، فنون لطیفہ کے بہترین ماہر دہلی میں موجود تھے ؛ شاہ عبدالعزیز ، شاہ عبدالقادر ، شاہ رفیع الدین ، فرزنداں شاہ ولی اللہ علم کے آفتاب اور ماہتاب تھے اور افغانستان اور ترکستان بھی طالبانِ علم حصولِ علم کے لیے جوق در جوق دہلی آتے اور فیض یاب ہوتے۔ شاہ غلام علی مرزا مظہر کے جانشین اور خلیفہ تھے اور علوم دینی کی تدریس کے علاوہ سلوک کی منازل طے کرانے میں خاص شہرت رکھتے تھے ؛ بیرونی طلبا کافی تعداد میں ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہوتے تھے اور ان کا دم گئے گزرے زمانے میں غنیمت تھا ، خواجہ میر درد کی خانقاہ کی رونق اُن کے نور سے اور خواجہ محمد نصیر کے دم سے تھی جو شعر و سخن کے علاوہ موسیقی کے بھی ماہر تھے (ان کے یہاں چودھویں تاریخ کو قوالی کی مجلس میں ہمت خاں مشہور ماہر موسیقی ، راگ رس خاں بین نواز وغیرہ شامل ہوتے جن کی نظیر ہندوستان میں نہ تھی)۔ طب یونانی میں یکتائے روزگار طبیب حکیم شریف خاں ، حکیم ذکاء اللہ خاں ، حکیم نصر اللہ خاں (وصال) وغیرہ موجود تھے۔

خوشنویسی کے فن کو سید محمد امیر پنجہ کش (نستعلیق) ،

میر امام‌الدین (خط نسخ)، حافظ کلو خاں اور مولوی حیات علی رونق دے رہے تھے۔ مصوری کی آبرو غلام علی خاں، مرزا فیض علی خاں، مرزا شاہ رخ بیگ اور محمد عالم کے دم سے تھی۔

شاعری اور دلّی لازم و ملزوم ہیں، دھلی میں ابھی میر اور سودا، سوز، قائم، یقیں، مرزا مظہر وغیرہ اساتذۂ سخن کے نغمے گونج رہے تھے اور اُن کے شاگرد شاعری کے تنِ بےجان میں دم ڈال رہے تھے۔ تراش خراش دھلی کی فطرت میں تھی اس لیے اس تنزّلی دور میں بھی یہ کام ایسے لطیف انداز میں ہوا کہ دنیا محوِ حیرت ہوگئی۔ میر کا جس وقت انتقال (۲۰ شعبان ۱۲۲۵ھ) ہوا، اُس وقت مومن کی عمر صرف دس سال کی تھی، شعر و سخن سے وابستگی اسی سن سے شروع ہو گئی تھی، میر کی لے کانوں میں گونج رہی تھی اور سخن شناس اس شعر کے قائل تھے:-

سارا عالم پہ ہوں میں چھایا ہوا   مستند ہے میرا فرمایا ہوا

غلام حسین شکیبا (مجموعہ نغز صفحہ ۳۴۶ کی تالیف کے وقت ۱۲۲۱ھ میں زندہ تھے، غالباً وہ کافی بعد میں فوت ہوئے) شاگرد میر بھی لال قلعے میں رسائی رکھتے تھے، خواجہ محمد نصیر رنج[۱] (صفحہ ۲۷۷) درد کے نواسے تھے، شاعری کے رموز خواجہ نانا سے حاصل نہ کیے ہوں لیکن مذاقِ سخن اُن ہی سے ورثے میں پایا تھا اور آخر عمر تک فدائے شعر و موسیقی رہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ شکیبا کے یہاں میر کا

---

۱ - بریلی ... قبل ۱۲۲۵ھ و در آں ضمن با میر نصیر کہ صاحب ذہن رسا متوسل بخاندان خواجہ میر دھلوی و تربیت کردۂ اگستس بروک صاحب بود، ملاقات شد (صفحہ ۳۱ روزنامچہ عبدالقادر خاں)۔

بنارس ۱۲۲۹ھ و با میر نصیر الدین کہ سابق در بریلی تعارف بہم رسیدہ بود باز ملاقاتہا شد آخر ازین جا ہم روانۂ لکھنؤ شدم (صفحہ ۷۷ روزنامچہ)

رنگ نہیں، نہ رنج، ثانیٔ درد تھے اس لیے ان کا اثر دوسروں پر کیا مرتب ہوتا۔ مصحفی، انشا، جرأت، مرزا سلیمان شکوہ کے دربار کی کچھ دنوں لکھنؤ میں زینت بنے رہے، جب نواب سعادت علی خاں کا دربار جما تو انشا وہاں میر محفل قرار پائے۔ قتیل بھی ان دنوں میں فارسی کے کبھی کبھی اردو مشاعروں میں شریک ہوتے، میر صاحب کی شعر گوئی کی تعریف پر مجبور ہوئے، جرأت کی شاعری کا لہجہ عامیانہ اور سطحی جذباتِ محبت پر منحصر تھا اس لیے میر نے برسرِ مشاعرہ جرأت کو سرزنش کی کہ ''تم شعر کہنا کیا جانو، اپنا چوما چاٹا کہ لیا کرو'' (مجموعہ نغز) لیکن میر کی تنقید وقت کے دھارے کو نہ روک سکی۔ اودھ میں رنگ رلیوں کا دور تھا اور جرأت کا طوطی بول رہا تھا لیکن ۱۲۲۴ھ میں جرأت سدھارے اور دوسرے سال میر عالم فانی سے رخصت ہوئے۔ اب مصحفی اور انشا استادان فن ایک طرف رہے اور دوسری طرف نوخیز شعرأ رہے جن میں ناسخ نے طرز نو کی بنیاد ڈالی، مصحفی نے ناسخ پر اعتراض کیا کہ وہ غزل قصیدے کی روش پر کہ رہا ہے، صغیر علی مروت رام پوری کی نسبت بھی اس کا یہی اعتراض تھا (شاگرد جرأت، اگرچہ مروت منحرف تھا)، سوز کے رنگ کی بنیاد مرزا نوازش حسین خاں نوازش کے دم سے جاری رہی، قائم خواجہ میر درد اور سودا کے شاگرد تھے (متوفی ۱۲۰۸ھ)، میر قمرالدین منت دھلوی نے قائم سے اردو کلام پر اصلاح لی تھی، ان کے بیٹے میر نظام الدین ممنون دھلوی تھے جن کی شاگردی کا سکہ دھلی اور لکھنؤ مین یکساں رائج تھا۔ قائم کی شاگردی کا دوسرا سلسلہ میر مہدی مائل دھلوی کے شاگرد شاہ نصیر دھلوی سے جاری ہوا، شاہ نصیر نے دھلی کی بزم سخن سر کر لی تو لکھنؤ کا رخ کیا اور مصحفی اور انشا اور قتیل سے معرکے کیے؛ یہاں بھی اپنی شاعری کا لوہا منوایا اور پھر ریاست حیدر آباد دکن کا رخ کیا اور وہاں بھی استادی کا ڈنکا بجایا لیکن

دھلی میں ابھی آستادان فن تھے جو میر کی بے دماغی سے مرعوب نہ ہو سکے تھے۔ ان کے سرگروہ حکیم قدرت اللہ قائم (متوفی ۱۲۴۶ھ) صاحب مجموعۂ نغز ھیں جو ھدایت اللہ خاں ھدایت دھلوی (متوفی ۱۲۱۵ھ) شاگرد درد ھیں۔ ان کے بیٹے حکیم عزت اللہ عشق دھلوی بہترین شاعر تھے، ان کا سلسلۂ شاگردان طویل نظر آتا ھے، ان کے ساتھی حکیم ثناءاللہ خاں فراق برادر زادۂ و شاگرد ھدایت ھیں۔ سعادت یار خاں رنگین (متوفی ۱۲۵۱ھ) میر و مرزا کا دور دیکھے ہوئے تھے، قائم کی شاگردی میں منسلک ھو کے سودا سے شاگردی کے بارے میں ھم پلہ نظر آتے ھیں۔ رنگین نے مذاقِ عام کا ساتھ دیا، جرأت انشا اور رنگین جدید طرز کے بانی ٹھہرے، رنگین نے ریختی کی ایجاد کا شرف بھی حاصل کیا۔ مرزا علی لطف دھلوی (متوفی ۱۲۵۳ھ) صاحب گلشنِ ھند (تالیف ۱۲۱۵ھ) جس کی نسبت سودا اور میر کی شاگردی کی نسبت کی جاتی ھے، وہ بھی اس وقت دکن میں داد سخن دے رھا تھا۔ شاہ کمال الدین شاگرد قائم و جرأت (حیات ۱۲۵۳ھ تک متحقق ھے) صاحب مجمع الانتخاب نے لکھنؤ سے دکن کا رخ کیا تھا اور وھاں آستادی کا علم بلند کیا۔ شیخ غلام علی راسخ عظیم آبادی (متوفی ۱۲۳۸ھ) شاگرد میر بہار میں میر کا دم بھرتے تھے اور طرز میر کو زندہ کر رھے تھے، فریاد بھی سلسلۂ درد کو بہار میں رائج کر کے خدمتِ سخن میں مصروفِ سخن تھے۔

شیخ ولی محمد نظر اکبر آبادی (متوفی ۱۶ اگست ۱۸۳۰ء) آگرے میں نظم کے تن بے جان میں جان ڈال کر ملک کو انقلاب کا راستہ دکھانے میں مصروف تھے، مولوی نیاز احمد نیاز بریلوی تصوف کے مسائل آردو میں ادا کر کے سنت درد کو زندۂ جاوید بنا رھے تھے (متوفی جمادی الثانی ۱۲۵۰ھ)۔ ان خادمانِ سخن کی خدمات ناقابلِ فراموش ھیں؛ یہ کہنا بڑی زیادتی ھوگی کہ ترقی کی راھیں مسدود ھو گئی تھیں کہ قدرت

نے مومن اور غالب کو اصلاحِ سخن کے لیے بھیجا۔ اسی زمانے میں (۱۲۶۰ھ) مرثیہ گوئی میں خلیق اور ضمیر نے اختراع کی اور مرثیے کو اوجِ کمال پر پہنچا دیا۔ دلّی میں اس وقت مختلف اساتذۂ فن شاعری کی دکانیں لگائے بیٹھے تھے :-

۱۔ شاہ نصیر کا کاروبار اونچا تھا ، حافظ عبدالرحمٰن احسان لال قلعہ دھلی میں سکۂ سخن چلا رہے تھے ، اسی زمانے میں میر نظام الدین ممنون نے اپنی دکان جمائی ، شاہ عالم آفتاب تخلص (متوفی رمضان ۱۲۲۱ھ) نے فخرالشعرأ کا خطاب دیا ۔[صاحب گل رعنا نے (صفحہ ۲۷۹) یہ غلط لکھا ھے کہ اکبر بادشاہ نے فخرالشعرأ کا خطاب عنایت کیا ، ملاحظہ ھو مجموعہ نغز (جلد دوم صفحہ ۲۱۲) جس میں صاحب مجموعہ نے شاہ عالم کی جانب سے خطاب فخرالشعرأ ملنا بیان کیا ھے ، چونکہ مجموعہ نغز میں اکبر شاہ کا ذکر بحیثیت ولیعہد سلطنت ھے اور شاہ عالم کا بحیثیت بادشاہ ۔ اگرچہ اسی سال ۱۲۲۱ھ میں شاہ عالم کا انتقال ھو جاتا ھے اور اکبر ثانی تخت نشین ھو جاتا ھے لیکن قائم کا بیان ھے کہ وہ شاہ عالم سے علاحدہ ھو چکا ھے اس لیے سلسلۂ ملازمت ۱۲۲۱ھ میں منقطع ھو گیا تھا]۔

معاصرین کا بیان ھے کہ ان کی شاعری میں روش خاص تھی ، مصحفی تذکرۂ ھندی (صفحہ ۲۳۸، ۲۳۹ تالیف ۱۲۰۹ھ) میں لکھتے ھیں :-

تا آں کہ در عرصۂ قلیل قوت شاعری چنانکہ شاعر را باید پیدا کرد و کلام خود بہ رتبۂ کلام پدر رسانید اکثرے از موزونان استفادۂ شعر ازو کنند ۔

صاحب مجموعۂ نغر کا بیان ذرا واضح ھے ۔ (مجموعہ نغز جلد دوم صفحہ ۲۱۲)

در سلک شعرائے پائے سریر خاقانی بہ قدر شناسی و دیدہ وری حضرت ظل سبحانی بہ خطاب فخرالشعرائی عز و احترام داشت و موافق طبع مشکل پسند بادشاہ بدیہہ ھم ازو سر انجام می یافت ...... از چندے استحقاقے خدمت حضور فیض گنجور نمودہ .....

شیفتہ کی رائے ہے (گلشن بے خار صفحہ ۱۸۷) :-

گفتارش خیلے دلچسپ و دل نشین است و ملاحت کلامش نہایت عذب و شیریں، دربستن مضامین بیگانہ، یگانہ است، و فکر صحیح صائب از غلطش آستادانہ قوت نظم اکثر اصناف سخن دارد۔

سرسید احمد خاں (آثار الصنادید طبع اول باب چہارم صفحہ ۲۱۲) اس طرح اظہار رائے کرتے ہیں :-

سخن میں ایک طرز تازہ کو ایجاد کیا اور ابیات بلند کو معانی ارجمند سے آباد کیا، متانت کلام اور صفائی عبارت اور تازگیٔ مضمون اور غرائب تشبیہ اور قوی استعارات جیسے اس سرکردۂ اہل کمال کے سخن میں موجود ہے، کسی اہل فن کے سخن میں متصور بھی ہے، الحق ریختہ کو فارسی اور اُردو کو دری کر دیا، نہ ان کے قصیدے کے سامنے قصائد قدما کو رتبہ ہے اور نہ ان کی غزل کے آگے غزلیات متاخرین کو مرتبہ، ہر نقطہ ان کے سخن کا گوہر آبدار اور ہر لفظ ان کے کلام کا لولوئے شاہوار، طبع بلند ان کی دریائے زخار ہے اور خامۂ معنی طراز ابر گوہر بار۔۔۔

عرصہ تین برس کا ہوتا ہے کہ اس جہان ناپائدار سے رخت سفر باندھ کر راہی جنت ہوئے، کسی شاعر نے یہ دو شعر ان کی تاریخ وفات میں پائے۔ تاریخ!

میر ممنون ازجہاں بگذشت و نزدعالمے زندگی را از ممات او بود حکم ممات
سرجیب فکر کردم، گفت ناگہ پیرعقل شاعرِ شیریں زبانِ ہند تاریخ وفات

گلستاں سخن کے مؤلف یہ فیصلہ کرتے ہیں (مرزا قادر بخش صابر کی تالیف ۱۲۷۱ھ، بعض کے نزدیک صہبائی مؤلف ہیں، صفحات ۴۳۸:۴۳۹) :-

ریختہ میں ایک طرز تازہ اختراع کی ......شوخی غزل کے سامنے جوانوں کی طبع خجل، متانت قصیدہ کے روبرو پیروں کی وضع منفعل،...... تراکیب

فارسی کو زبان ریختہ سے ایسا ارتباط بخشا کہ کمال آشنائی سے بیگانگی کا اثر نہیں پایا جاتا اور معانی درست کو الفاظ قریب الفہم سے اس طرح جلوہ دیا ... کور سوادان کم فہم کہ اس کے سخن بلند کے معانی غریب اور مضامین دل فریب اور نکات باریک کو سمجھ نہیں سکتے، خود اس کی طرف التفات نہیں کر سکتے اور ارباب فہم کہ سواد روشن اور طبع سلیم رکھتے ہیں، غرابت تشبیہ اور استعارات اور دور آہنگی تلمیح و اشارات اور متانت تراکیب اور رشاقت اسالیب اور برجستگی نکات اور بلندیٔ ابیات میں توکچھ سخن نہیں کر سکتے لیکن اس غرض سے کہ ناخن دقت کی کاوش اور طبیعت رسا کا دخل ظاہر ہو، کہیں کہیں سرقے کے ساتھ متہم کرتے ہیں ... سخن چینوں کی عنان طبیعت اگر تعصب کے ہاتھ میں نہ ہوتی، اس کلام میں احتمال توارد کو راہ دے کر معذور رکھتے اور باقی سخن کے لطف سے طبع انصاف کو مسرور .... مدت مدید تک نواح اجمیر میں عہدۂ صدر الصدوری پر مامور رہا، آخر ضعف پیری کے عذر سے اس مشغلے سے دشت کش اور شہر شاھجہان آباد میں خانہ نشین ہوا، دس گیارہ برس کا عرصہ ہوا کہ سفر آخرت اختیار کیا۔

ان رایوں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ممنون نے نئی طرز سخن ایجاد کی تھی جو نادر تشبیہات اور استعارات اور دور آہنگ تلمیحوں اور اشاروں، متین ترکیبوں اور مناسب اسلوب بیان اور معانی بلند اور مضامین بیگانہ پر مشتمل تھی، اس طرزکا نوآموزوں پر اثر پڑا اور احسان اور شاہ نصیرکا حلقۂاثر ٹوٹنے لگا اور طرز ممنون نے ترقی پائی۔

۲ - مفتی صدرالدین آزردہ اور مہجور تخلص شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے شاگرد رشید تھے اور شاعری کا شوق ہوا تو ممنون کی شاگردی اختیار کی (صاحب گل رعنا کا بیان ہے کہ لوگ کہتے ہیں کہ ممنون کے شاگرد تھے، حقیقت ہے صاحب مجموعہ نغز نے مفتی صدر الدین کا مہجور تخلص کے تحت حال لکھا ہے اور ممنون کا شاگرد لکھا ہے)۔

شیفتہ آزردہ کے متعلق لکھتے ہیں کہ دہلی ہی مولد اور منشا ہے اور صدر الصدور کے عہدہ پر فائز ہیں اور لوگوں کی حاجت روائی کرتے ہیں، میرے اعتقاد میں جو دن آں کی ملاقات کے بغیر گذرے وہ ایام عمر میں داخل نہیں، فنون ادبیہ میں دوسرے اعشی اور جریر ہیں، حکمت میں باقر اور نصیر، اس درجے کا شاعر ایران میں بھی پیدا نہ ہوا، ان کی تعریف ناممکن ہے (گلشن بے خار صفحہ ۱۱)۔

سرسید آثار الصنادید (صفحہ ۴۷ طبع اول) میں اس طرح لکھتے ہیں :-

ہزار بار بشویم دہن زعطر و گلاب ہنوز نامِ تو بردن کمال بے ادبی است

...باوجود ان مراتب بلند اور اس منصب ارجمند کے خلق محمدی اختیار کیا ہے کہ افادۂ علوم اور افاضت مسائل دین کے وقت ہر ادنیٰ کو اجازت سخن ہے .... موزونیٔ سخن کی طرف بھی متوجہ ہو کر نظم و نثر میں اوقات شریف کو مصروف فرماتے ہیں .. غالب نے شیفتہ کو ایک مشاعرے کی شرکت کے متعلق لکھا ہے کہ اس میں رنج راہ کی تلافی مخدوم و معظم و صدر اعظم مولوی محمد صدر الدین خان بہادر کے دیدار سے ہو گئی، شیفتہ ہی کو ایک اور مشاعرے کا حال لکھتے ہیں کہ حضرت آزردہ اگر دیر میں آئے لیکن انہوں نے آ کر دل کو صفا اور زبان کو نوا بخشی اور میں نے گریستن کی زمین میں اپنا قصیدہ پڑھا (آج کل فروری ۵۲ء غالب صفحہ ۲۶- از خواجہ احمد فاروقی)۔ مولوی عبدالقادر خاں روز نامچے میں ان کی علمیت کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

مولوی فضل امام کے مشہور شاگردوں میں سے ہے، جس زمانے میں مجھ سے ملاقات ہوئی ان کی توجہ کتب علمیہ سے زیادہ فارسی اور اُردو شاعری کی طرف تھی، اسی وجہ سے میں نے آں کا ذکر زمرۂ شعرأ میں کیا ورنہ یہ کام آس کے لائق نہیں اور آس کے درجۂ اعتبار سے باعث عار۔ مولانا آزردہ بے شک مرزا کی طرز خاص کو جو انہوں نے ابتدا میں اختیار

کی تھی، ناپسند کرتے تھے (صفحہ ۱۸۱) اور جو خیال کہ ابتدا میں مرزا کی نسبت مولانا کے خاطر نشین ہو گیا تھا، وہ آخر تک اُن کے دل میں کسی نہ کسی قدر باقی رہا - چنانچہ مرزا نے جو ایک فارسی قصیدہ مولانا ممدوح کی شان میں لکھا ہے، اُس میں اسی مضمون کی طرف نہایت لطیف اشارہ کیا ہے کہ مولانا اُن کی شاعری کو تسلیم نہیں کرتے تھے، گریز ہے :

با چنیں اندہ کہ پر گفتیم و دل خالی نشد
خواجہ گر اندہ گسار من نبودے وائے من
آنکہ در یکتائی وے در فنِ فرزانگی
متفق گردیدہ رائے بو علی با رائے من
آنکہ چوں خواھد نیامش نامہ نامی ساختن
بر نگارد عقلی فعالش کرم فرمائے من
دل بدین و صفم نیاشاید سخن کوتہ کنید
آنکہ ننگ اوست بودن در سخن ھمتائے من

یادگار غالب صفحات ۱۸۰، ۱۸۱ - ۱۶ جمادی الآخر مطابق ۵ فروری ۱۸۲۵ء
"در جے پور بپاس حکیم محمد واصل خاں مقام کردم و مولوی صدرالدین را دیدم"
(روز نامچہ صفحہ ۳۰) - یہ شعر ریختہ کا مجھے یاد ہے :-

یا تنگ نہ کر ناصح ناداں مجھے اتنا
یا مجھ کو دکھا دے دھن ایسا کمر ایسی (روز نامچہ صفحہ ۱۳۸)

صاحب گل رعنا (صفحات ۳۲۷، ۳۲۸ حاشیہ) لکھتے ھیں :-

خدا جانے ان کے وقت میں کتنی برکت تھی، صدر الصدوری کے فرائض کے ساتھ حکام و رؤسائے شہر سے میل جول، مشاعروں کی شرکت، سب سے بالا تر درس تدریس کا مشغلہ تھا، بادشاہ کا مدرسہ دارالبقا سلطنت کی تباھی کے ساتھ برباد ھو چکا تھا، اُس کو اپنے روپیے سے زندہ کیا، عمارت درست کی، طلبہ کے وظائف اور اُن کے پڑھانے کو اساتذہ مقرر کیے اور بطور مدرس اعلیٰ منتہی طلبہ کے اسباق اپنے ذمے رکھے، ھفتہ میں ایک بار تعطیل کے دن سب

کو لے کر باغ جاتے ، طرح طرح کے میوے اور لذیذ کھانے اُن کو کھلاتے اور خوش ہوتے ۔

شاگردوں میں نواب سید صدیق حسن خان بہادر ، مولوی سمیع اللہ خان، سی - ایم- بی، مفتی سعداللہ ، مولوی ذوالفقار علی، مولوی فیض الحسن اور ان جیسے خدا جانے کتنے علما اُن کے دامن تربیت میں پرورش پا کر نکلے جن سے ایک عالم فیض یاب ہوا - ۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے اور اکیاسی برس کی عمر پا کر ۱۲۸۵ھ میں وفات پائی - مولانا فضل امام خیر آبادی سے فنون حکمیہ اور حضرت شاہ عبدالعزیز علیہ‌الرحمۃ اور اُن کے بھائیوں سے علوم دینیہ اور معارف ادبیہ کی تعلیم پائی تھی -

مرزا اسداللہ خاں کی اصلاح کا بیڑا آزردہ نے اُٹھایا اور اُن کی طرز بیدل کا اس قدر مذاق اُڑایا کہ آخر کو اُن کو اپنی روش تبدیل کرنا پڑی - حالی کی رائے ہے کہ آزردہ سادہ روش کو پسند کرتے تھے اور اسی لیے معاصرین نے آزردہ کی رائے کی ہمنوائی کی -

مولوی کریم الدین تذکرۂ طبقات شعرائے ہند (صفحہ ۴۴۶) میں لکھتے ہیں:- آزردہ تخلص مفتی صدرالدین خاں بہادر صدرالصدور شاہجہان آباد .... صدہا شاگرد اُن کے علوم و فنون درسیہ کے ہیں اور بہت فاضل ان کی شاگردی میں داخل ہیں- ہر چند کہ مناسب نہیں کہ اس تذکرۂ شعرائے اُردو میں جو کہ اُن کے سامنے کچھ حقیقت نہیں رکھتا ، اُن کا نام لکھوں مگر اتنا میں جانتا ہوں کہ بدون نام نامی اُن کے کے یہ کتاب رونق نہ پاوے گی اور پسند احباب نہ ہوگی ، کیوں کہ اس زمانے کے شعرائے اُردو گویوں میں وہ مثل شاہنشاہ کے ہیں ؛ اگرچہ اشعار اور استعداد عربی کی اتنی کچھ رکھتے ہیں کہ اچھے اچھے مصنفوں کی حقیقت اُن کے سامنے کچھ نہیں مگر پھر بھی بسبب اس امر کے کہ ہمہ دان ہیں اشعار اُردو بھی فرماتے ہیں.... ۱۸۴۷ء میں قرین پچاس برس کے اُن کی عمر ہوگی -

مولوی فقیر محمد جہلمی اپنی کتاب حدائق الحنفیہ (صفحہ ۴۸۲ مطبوعہ نولکشور پریس ۱۸۸۱ء) میں تحریر فرماتے ہیں :-

مؤلف حدائق الحنفیہ بھی ۱۲۷۶ھ میں جب مولانا موصوف بستی حضرت نظام الدین اولیا میں اقامت گزیں تھے، اُن کی خدمت میں حاضر ہوا اور تیرہ ماہ تک اُن کی خدمت میں مشرف رہ کر علوم نقلی و عقلی کا استفادہ کرتا رہا، اُس وقت میں مولانا باوجودیکہ چوہتر سال کے تھے مگر ذوق شعر و سخن میں جوانان عاشق مزاج سے زیادہ مذاق رکھتے تھے۔ عربی، فارسی اُردومیں نہایت عمدہ شعر کہتے تھے، آزردہ تخلص تھا اور بمقتضائے اس کے ہمیشہ فرط عشق اور ولولۂ محبت رکھتے تھے ..... اشعار کے پڑھنے میں نہایت دل شگاف آواز اور لحن حزیں اور صورت درد انگیز رکھتے تھے۔ جس نے آپ کی زبان سے سخن سنا ہے، وہی اس کیفیت کو جانتا ہے کہ کیا انشاد شعر تھا یا ایجاد سحر۔ غالب و حسرتی و مومن وغیرہ شعرائے دہلی نے آپ کی مدح و تعریف میں بڑے بڑے قصائد و اشعار تصنیف کیے ہیں اور فضلائے زمانہ نے آپ کے تلمذ و شاگردی کو باعث تفاخر تصور کیا ہے۔ بہت لوگ بلاد و امصار دور دراز سے علوم متداولہ اور فنون مروجہ حاصل کر کے آپ کی خدمت میں آتے اور ایک دو سبق (صفحہ ۴۸۳) یا کوئی مختصر کتاب پڑھ کو فراغت حاصل کرتے اور محصلین اور اہل فضیلت میں شمار کیے جاتے تھے۔ تصانیف تھوڑی ہیں، عمر تدریس و افتا میں گذاری، رسالہ ''منتہی المقال فی شرح حدیث لا تشدالرحال'' اور ''درالمنضود فی حکم امرۃ المقصود'' اور ''اجوبۂ کثیرہ استفا'' یاد گار۔ آخیر عمر میں ایک دو سال مرض فالج میں مبتلا رہ کر اکاسی سال کی عمر میں یوم پنجشنبہ ۲۴ ربیع الاول ۱۲۸۵ھ میں فوت ہوئے۔

صاحب گلستانِ سخن[1] (صفحات ۱۱۳ تا ۱۱۵) کا بیان ہے:- حدیث و فقہ

---

۱ - صاحب خمخانہ جاوید لکھتے ہیں :-

باقی صفحہ ۲۱۶ پر،

و تفسیر میں درجۂ اجتہاد.... ہر چند نسبت شاعری سے ان کو ننگ و عار ہے، لیکن شاعری کو آن کے ساتھ منسوب ہونا پایۂ اعتبار اور مایۂ افتخار ہے، اگر شعر اس سے بلند مرتبہ نہ ہو جاتا شعری کی نسبت شعر آسمان بریں تک نہ پہنچتا۔

اصلاحی پروگرام باقاعدہ آزردہ نے ترتیب دیا اور اس کے احباب نے ہاتھ بٹایا، شاہ نصیر اور حافظ عبدالرحمٰن احسان کی شاعری ممنون کے سامنے ابھر نہ سکی تھی، فخر الشعرائی کا خطاب اس نے مقابلے میں حاصل کیا تھا۔ ممنون کے شاگرد بھی درجۂ استادی پر فائز تھے اس لیے بگڑتے ہوئے مذاق سخن کو بہت جلد آزردہ نے سنبھال لیا۔ آزردہ کے یہاں باقاعدہ دو ہفتے بعد مجلس مشاعرہ منعقد ہوتی اور اساتذۂ فن شریک ہو کر داد سخن دیتے۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے یہاں بھی مہینے میں دو محفلیں منعقد ہوتیں؛ اسی طرح باری باری آزردہ اور شیفتہ کے یہاں ہفتہ وار محفل مشاعرہ برپا ہوتی اور اردو شاعری کو معراجِ کمال پر پہنچانے کی مساعی جاری تھیں۔ آزردہ نے غالب کو طرز بیدل سے ہٹا کر اردو شاعری میں بڑا احسان کیا اس لیے جدید اردو شاعری کی تحریک ممنون نے چلائی اور آزردہ نے اس کی حمایت میں پوری مساعی حسنہ سے کام لے کر ایک نیا موڑ اردو شاعری میں پیدا کیا۔

۳ - آزردہ کے حامیوں میں آن کے دلی دوست مولوی فضل حق خیرآبادی (آرزو تخلص) نظر آتے ہیں جن کی سخن فہمی کی دھوم تھی۔ سرسید احمد آثارالصنادید میں اس طرح ذکر کرتے ہیں (صفحہ ۱۰، طبع اول ۱۸۴۷ء):—

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱۵:

بعض تذکروں میں مرقوم ہے اوائل میں چند غزلیں شاہ نصیر صاحب کو دکھائیں، کچھ دنوں میاں مجرم اکبر آبادی سے مشورہ لیا اور آخر میں ممنون کے شاگرد ہو کر کمال حاصل کیا۔ عربی، فارسی، ریختہ میں شعر کہتے تھے۔ غدر میں ماخوذ ہو کر بعد کو رہا ہوئے۔ ۱۶ جولائی ۱۸۶۸ء مطابق ۱۲۸۵ھ میں بعمر اکیاسی سال انتقال کیا۔

مولانا ، مخدومنا ، مولوی فضل حق خلف مولوی فضل امام ـــ تحصیل علوم عقلیہ اور نقلیہ کی اپنے والد ماجد سے کی ، جمیع علوم و فنون میں یکتائے روزگار ہیں اور منطق اور حکمت کی توگویا انھیں کی فکر عالی نے بنا ڈالی ہے ۔ ولادت ۱۲۱۱ھ .... صاحب تذکرہ علمائے ہند (صفحات ۱۶۴ تا ۱۶۵) اس طرح رقم طراز ہیں :ـــ

شاگرد پدر خود مولوی فضل امام است، حدیث ازمولانا عبدالقادر دہلوی اخذ کردہ ، قرآن مجید در چہار ماہ یادگرفتہ ، فراغ علمی بعمر ۱۳ سال حاصل نمودہ ، مرید شاہ دھومن دہلوی بود ، درعلم منطق و حکمت و فلسفہ ، ادب و کلام و اصول ، و شعر فائق الاقران ، استحضار فوق البیان داشت ، نظمش زائد بر چہار ہزار اشعار خواہد بود ۔ از بلاد بعیدہ طلبۂ علم آمدہ ازو مستفید می شدند ۔ بسال ۱۲۶۴ھ مؤلف ہیچمدان مقام لکھنؤ بخدمتش رسیدہ بود، وے کہ در عین حقہ کشی و شطرنج بازی ، تلمیذ را سبق افق المبین می داد و مطالب الکتاب را باحسن بیانے دل نشیں می نمود ۔ تالیفات رائقہ دارد ، انگریزاں او را بزمانۂ فساد ہند قید کردہ بجزیرہ رنگوں (جزائرانڈمان میں نظر بند کیے گئے تھے ۔ سید اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی بھی الزام بغاوت میں مقید ہوئے تھے اور وہاں مولوی فضل حق خیر آبادی کی فرمائش سے منیر نے ایک قصیدہ کہا ہے) ، کلیات منیر ۔ صفحہ ۳۴ مطبع ثمر ہند لکھنؤ :ـــ

مولوی بے نظیر ، فضل حق اسم شریف
دہلی سے تا لکھنؤ مشتہر و موتمن
قید میں ، میں اور وہ ، رہتے تھے ایک ہی جگہ
عین سمندر میں تھے ، غرقۂ بحر محن
کہنے لگے ایک دن ، کچھ سبب اس کا بتا
شاعر اُردو زبان ، اس میں ہو نو یا کہن
مصطلحاتِ عجم اور کنایاتِ فرس
کس لیے کرتے نہیں ، زینتِ نظمِ سخن)

آنجا بتاریخ ۱۲ صفر ۱۲۷۸ھ وفات یافتہ۔

غالب نے ایک خط میں مولانا فضل حق کی دھلی سے روانگی کا واقعہ بڑے درد بھرے الفاظ میں بیان کیا ھے، مرزا ابو ظفر نے رخصت کے وقت بہت یاس آمیز فقرات ادا کیے۔ مولانا فضل حق خیر آبادی پر غالب کو اس قدر اعتماد تھا کہ بقول حالی (صفحہ ۱۰۲ یادگار غالب) جب مولوی فضل حق سے مرزا کی رسم و راہ بہت بڑھ گئی اور مرزا اُن کو اپنا خالص و مخلص دوست و خیر خواہ سمجھنے لگے تو انھوں نے اس قسم کے اشعار پر بہت روک ٹوک کرنی شروع کی یہاں تک کہ اُنھیں کی تحریک سے اُنھوں نے اپنے اردو کلام میں سے جو اُس وقت موجود تھا، دو ثلث کے قریب نکال ڈالا اور اُس کے بعد اُس روش پر چلنا بالکل چھوڑ دیا۔

۴۔ مولوی عبدالقادر رامپوری (صدرالصدور) ان مشاهیر میں سے ھیں جن کی نسبت کسی ایک مقام سے کرنا درست نہیں، ان کے والد مولوی مرزا محمد اکرم آشنا دھلی میں پیدا ھوئے تھے اور مولوی عبدالقادر کی دادی بھی دھلوی تھیں اس لیے دھلی کی زبان کا بڑا خیال تھا۔ مولوی عبدالقادر روزنامچے میں لکھتے ھیں کہ جب مراد آباد میں سکونت ھوئی تو میری دادی میرے والد کی بول چال پر گرفت کرتی تھیں۔ یہ ۱۱۹۵ھ میں رامپور میں پیدا ھوئے اور مختلف علما سے علوم درسی کی تکمیل کی (مولانا رستم علی اور مفتی شرف الدین رامپوری وغیرہ) اور انگریزی ملازمت میں صدرالصدوری کے درجے پر پہنچے۔ انھوں نے اپنا روزنامچہ ۱۸۲۵ء تک کا لکھا ھے، اس میں ملک کے مختلف علاقوں کی سیاحت کا حال لکھا ھے؛ دھلی میں ان کی بار بار آمد و رفت رھی، وھاں کے مشہور علما اور شعرأ کا تذکرہ بھی کیا ھے، شاہ نصیر، مفتی صدرالدین وغیرہ کا ذکر بحیثیت اساتذۂ فن ھے اور مومن کے متعلق لکھا ھے کہ وہ نوجوان شعرأ میں ممتاز ھے، غالب کا ذکر نہیں ملتا لیکن غالب سے ان کے خصوصی تعلقات تھے۔ غالب نے ایک رقعے میں ان کا ذکر نہایت احترام سے کیا ھے اور مثنوی ”باد مخالف“

کے سلسلے میں لکھا ہے کہ میں نے اس کی نقلیں مشہور ادبّا کے پاس بھیجی تھیں ، اگر اس میں خامی ہوتی تو یہ لوگ کیوں گرفت نہ کرتے ۔ مولوی عبدالقادر بھی ان میں شامل[1] ہیں لیکن غالب کی طرز بیدل سے یہ بھی متنفر تھے ؛ چنانچہ مولانا حالی یادگار غالب (صفحہ ۱۰۱ ، ۱۰۲) میں لکھتے ہیں :۔

ایک دفعہ مولوی عبدالقادر رامپوری نے جو نہایت ظریف اور خوش مذاق فاضل تھے ، مرزا سے کہا ”آپ کا ایک اردو شعر سمجھ میں نہیں آتا“ اور اس وقت دو مصرعے موزوں کر کے مرزا کے سامنے پڑھے :۔

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے سے نکال

مرزا سن کر سخت حیران ہوئے اور کہا کہ حاشا ! یہ میرا شعر نہیں ہے ۔ انھوں نے اصرار کیا ، آخر کو مرزا سمجھ گئے کہ مجھ پر اس پیرائے میں اعتراض کرتے ہیں اور جتاتے ہیں کہ تمھارے اسی قسم کے اشعار ہوتے ہیں[2] ۔

---

۱ - عود ہندی صفحہ ۱۵ مطبع نوالکشور کانپور ۱۸۸۷ء :۔
غرض اس تحویر سے یہ ہے کہ یہ مثنوی وھاں لکھی گئی اور ایک ایک نقل مولوی کرم حسین بلگرامی اور مولوی عبدالقادر رامپوری اور مولوی نعمت علی عظیم آبادی اور ان کے امثال اور نظائر کے پاس بھیجی گئی ۔ اگر یہ لوگ جگہ پاتے تو میری کھال ادھیڑ ڈالتے ۔

۲ - صابر گلستان سخن (صفحہ ۳۸۸ ، ۳۸۹) کا بیان ہے : مولوی عبدالقادر متوطن رام پور فاضل جلیل القدر اور عالم بے بدل تھا ۔ باوجود پیرانہ سری کے ظراقت پسند تھا اور فکر باوجود ضعف پیری کے قوی ، ہر چند طول تقریر کا سر رشتۂ لا ینقطع تھا لیکن نہ سامع کو اس کے تکلم کے وقت ملالت سے انتسب ۔ ۔ ۔ مدت مدید مراد آباد میں عہدہ جلیلہ صدرالصدروی پر مامور اور

باقی حاشیہ صفحہ ۲۲۰ پر

مولوی عبدالقادر قادر اور غمگین تخلص کرتے تھے - امیر مینائی انتخاب یادگار (صفحہ ۲۷۳) میں لکھتے ہیں کہ عربی ، فارسی ، اردو ، بھاکا، مرہٹی سب زبانوں میں شعر کہتے تھے، کلیات ان کا گم ہو گیا ، رجب ۱۱۶۵ھ میں رامپور میں انتقال کیا ، روزنامچے میں اپنی اٹھائیس تصانیف کے نام لکھے ہیں ، اب یہ کتابیں ناپید ہیں -

دھلی کی اصلاحی بزم کے غمگین رکن تو نہ تھے لیکن ہمدرد ضرور تھے اور اسی لیے غالب کی طرز بیدل پر اظہار بیزاری کیا ہے - مومن کے رنگ سخن کو پسند کرتے تھے اسی لیے مومن کا ذکر دھلی کے پسندیدہ نوجوان شعرأ میں کیا -

۵ - مرزا سعادت یار خاں[1] رنگین تخلص طہماسپ بیگ خان تورانی کے بیٹے تھے جو بخت خاں کے عہد میں با اقتدار تھے - مصحفی کا بیان ہے (صفحہ ۱۰۱) ''فہمیدہ اور سنجیدہ جوان ہے ، فن سپاہگری اور گھوڑے کی سواری میں بے مثل ، شاعری میں بھی خوش فکر ، آغاز میں شاہ حاتم سے مشورہ کیا ، اب کہ شاعری میں امتیاز پیدا کر لیا ہے - اپنا مرتب شدہ دیوان مجھے دکھایا ، بہت کم اصلاح کلام پر ہوئی ، چونکہ عاشقانہ مزاج ہے اکثر قطعات اور غزلیات اور نامے خوب لکھے ہیں - ہمیشہ مرشد زادہ آفاق مرزا سلیمان شکوہ بہادر کے دربار مین حاضر رہتا ہے''- یہ بیان ۱۲۰۹ ھجری کا ہے جب کہ اس کی عمر انتالیس سال کےقریب تھی -

---

بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۱۹ :

کار گزاری اور امانت کے ساتھ مشہور ، اتفاقاً ایک بار حاکم بالا دست کی نا قدر دانی سے خاطر نازک کو گرانی بہم پہنچی اور سررشتۂ ملازمت کو منقطع کرکے کنج عزلت میں انزوا اختیار کیا -

۱ - سعادت یار خاں رنگین—اس کی عمر ستر سے زائد ہے لیکن شوخ کلامی سے جوان معلوم ہوتا ہے، اقسام شعر میں سخن بلند ہے ، ریختی میں میر ، سوز اور میر انشا اللہ خاں سے اور ہزل میں صاحبقراں سے بہتر ہے(روز نامچہ مولوی عبدالقادر خاں صفحہ ۱۳۱) -

صاحب مجموعۂ نغز (صفحہ ۲۷۸ ج-۱) رنگین کو جوان رعنا ، رند مشرب صاحب مروت ، پاکیزہ مذہب ، خلیق اور یار باش لکھتے ہیں حاتم کے انتقال پر محمد امان نثار سے بھی شاگردی ظاہر کرتے ہیں ، چار دیوان ترتیب دینے کی اطلاع دیتے ہیں اور مجالس رنگین میں لکھتے ہیں کہ اکثر شعرأ پر تنقید کی ہے بلکہ شیخ سعدی پر اعتراض کیے ہیں ، "ریختہ سے مناسبت رکھتا ہے کم علم ہے"۔

شیفتہ نئی بات یہ لکھتے ہیں کہ عجیب بات یہ ہے کہ رنگین کہتا تھا کہ میں اس سال ملک عدم کا سفر کروں گا اور یہ سچ نکلا - اسی سال کی عمر میں ۱۲۵۱ھ میں رحلت کی ، اکثر شہروں کی سیر کی اور جوانی میں عشق اختیار کیے ، خوش صحبت اور خوش اختلاط ہے ، بڑھاپے میں بھی ظریف الطبع ہے ، کلام دیوان ریختہ اور بیختہ سے بمشکل انتخاب ہوا (۸۸ صفحہ گلشن بیخار) -

سعادت یار خاں رنگین - متوطن شاہجہان آباد ، وقتے کہ مرزا سلیمان شکوہ بہادر از دھلی بہ لکھنو تشریف فرما شدند، خان مذکور ھمراہ رکاب آمدہ ، چنانچہ از فقیر ہم صورت آشنا گردیدہ ، و سالہا سال اتفاق ملاقات — جوان خوش فکر و خوش مزاج است - یہ بیان شاہ کمال کا ہے (مجمع الانتخاب) -

صاحب گل رعنا (صفحات ۲۶۷ ، ۲۶۸) تحریر کرتے ہیں :—

رنگین ہمہ گیر طبیعت رکھتے تھے ، ہر رنگ میں انہوں نے اپنے جوہر دکھائے ہیں جو ان کے مجموعۂ تصنیفات کے دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے -

مثنوی دلپذیر جو زبان کی صفائی اور پاکیزگی میں سحرالبیان کے بعد اس زمانے کی بہترین تصنیفات میں شمار ہونے کے قابل ہے - تمام تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ ریختی کے موجد تھے، دھلی کی بزم سخن ان سے متاثر ہوئی یا نہیں، یہ ثابت کرنا دشوار ہے۔ ممکن ہے ان کا عامیانہ عاشقانہ رنگ

نو آموزوں پر اثر انداز ہوا ہو لیکن کسی معاصر تذکرہ نویس نے ان کے رنگ سخن کو پسند نہیں کیا ۔ شیفتہ نے چند شعر بمشکل دواوین سے انتخاب کیے ہیں ۔ اس لیے ہم کہ سکتے ہیں کہ دھلی کا جدید اسکول شاعری رنگین سے قطعاً متاثر نہیں ہوا البتہ ریختی میں ان کی پیروی باعث افتخار سمجھی گئی ۔

٦ ۔ حکیم ثنا اللہ خاں ۔ فراق.....مصحفی تذکرۂ ہندی (صفحہ ۱۵۷) میں رقم طراز ہیں :—

ثنا اللہ خاں ، تخلص فراق ، ہدایت اللہ خاں ہدایت کا بھتیجا ہے ، جوان حلیم اور سلیم اور خوش فکر اور شیریں گفتار ، شاعری میں استفادہ خواجہ میر درد سے کیا بلکہ ان ہی کو شاعری میں کامل الفن تصور کرتا تھا ، آخر میری نظروں کے سامنے تحصیل طب کی اور اب حکیم ثناء اللہ خاں کے نام سے شہرت ہے ، اردو دیوان شستہ اور رُفتہ ہے ۔ فقیر جب تک دھلی میں رھا، تعلقات دوستی کے روز افزوں تھے اور اکثر مشاعروں کی محفلوں کا بانی فراق ہوا ، خدائے تعالیٰ اسے جہاں بھی ہو سلامت رکھے !

صاحب مجموعہ نغز (ج ۔ ۲ صفحات ۴۹ ، ۵۰) اور وضاحت کرتے ہیں :-

شیرین زبان ، ملاحت بیان ، فصاحت قرین بلاغت آگیں ...لودھی پٹھانوں میں سے اور ہدایت کا بھتیجا ہے اور مرید خواجہ میر کا ہے ، اکثر اشعار ہدایت نے اپنے چچا کو دکھائے اور کچھ کلام سودا کی نظر سے گزرا ہے ۔ علوم ضروریہ میں بقدر ضرورت واقف اور فن طب میں حکیم حاذق ہے ، اکثر دھلی کے نومشق اس کے شاگرد ہیں اور زیادہ تر دھلی کے شعرأ اس کی طرز پر شعر کہتے ہیں ۔ مجھ سے اتنی گہری دوستی ہے جو بیان نہیں کی جا سکتی ہے ۔

شیفتہ گلشن بے خار (صفحہ ۱۴۹) میں اس طرح لکھتے ہیں :—

از مشاہیر اہل سخن جہان آباد است و از خواجہ میر درد ہم کسب باطن و ہم کسب شعر نمودہ ۔ در طب مہارت شائستہ داشت، فکرتش شستہ و صاف، طبعش خالی از اعوجاج و اعتساف ، و فاتش را سالے چند آمدہ ۔

نساخ کی رائے ہے (صفحہ ۲۶۱ سخن شعرا): شعر عاشقانہ خوب کہتے تھے۔

صاحب گل رعنا تحریر کرتے ہیں (صفحہ ۲۷۰ طبع سوم) :—

شعر و سخن سے ان کو خدا داد مناسبت ہے ، حضرت خواجہ میر درد کے فیض صحبت سے اس میں ترقی ہوئی اور چند روز کی مشق میں انھوں نے قدرت کاملہ بہم پہنچائی ۔

فراق کی وفات غالباً ۱۲۴۶ھ میں ہوئی ، دہلی میں ان کا رنگ مقبول تھا جیسا کہ معاصرین لکھ رہے ہیں ۔ چند شعر نمونتاً پیش کیے جا رہے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ مذاق شاعری کو شستہ رکھنے میں فراق نے کوشش کی ۔

دل تھامتا کہ چشم پہ کرتا تری نگاہ
ساغر کو دیکھتا کہ میں شیشہ سنبھالتا
بعد مرنے کے بھی اک گردش رہی ہم کو مدام
مشق خاک اپنی رہی تھی ، کچھ سو پیمانہ بنا
ہر غنچہ میں بو ہے تری ، ہر گل میں تیرا رنگ
جس پر بھی تری شکل و شمائل نہیں معلوم
آتا ہے یہ ہچکیوں کا مجھے بے سبب نہیں
بھولے سے اس نے یاد کیا ہو عجب نہیں

۷ - نصیر - مصحفی کا بیان ہے کہ میاں نصیر ، میر حیدر جہاں کی اولاد سے ہے ، جوان خوشگو ہے، فقیر جب دہلی میں تھا (۱۱۸۶ تا ۱۱۹۸ھ) تو اکثر مشاعرے میں آتا تھا، اسی نو مشقی میں اس کی طبیعت کی روانی اور

تیزی ظاہر ہوتی تھی ، اب کہتے ہیں کہ شاعرانہ قوت پیدا ہوگئی ہے ۔
(صفحہ ۲۶۱ تذکرہ ہندی ۱۲۰۹ھ) ۔

قاسم تفصیل سے حالات لکھتے ہیں (صفحات ۲۷۲ ، ۲۷۳ مجموعہ نغز شعر ج-۲) :-

شاہ نصیر الدین عرف میاں کلو دہلوی ۔ باپ کا نام شاہ غریب.....اور محمد نصیر الدّین بہت ناز و نعمت سے پلا ہے ، اس کے باپ نے متعدد نوکر چاکر اور استاد وغیرہ اس کی تربیت کے لیے مقرر کیے تھے ۔ باپ کے مرنے کے بعد اسے شاعری کا شوق پیدا ہو گیا ، شاہ محمدی مائل کا شاگرد ہو گیا جو اس کا رشتہ دار بھی تھا اور مائل قائم قیام الدین علی کا شاگرد ہے ، قائم سودا کا شاگرد تھا اور ہدایت شاگرد درد سے بھی اصلاح لی تھی اس لیے نصیر کا سلسلہ بھی سودا اور درد تک پہنچتا ہے ۔ اگرچہ فن شاعری کے اصولوں سے کچھ زیادہ آگاہی نہیں رکھتا لیکن شاعری سے مناسبت کامل رکھتا ہے ، طبعی مناسبت اور سیر مشقی کی وجہ سےاس کا کلام پرمغزمعلوم ہوتا ہے۔ اکثر تازہ مشق اس کے شاگرد ہیں اور اکثر نو مشق اپنا کلام اسے دکھاتے ہیں ۔ شاعری کا خیال اس قدر ہے کہ سودا اور میر بھی اس کی نظر میں نہیں جچتے ، دوسروں کا کیا شمار ، بغیر کسی وجہ کے ہر ایک سے الجھتا ہے ، اپنے کو ملک الشعراء سمجھتا ہے ۔ نصیر کے والد میرا بہت خیال کرتے تھے ، اگرچہ نصیر میرے سامنے ہی پیدا ہوا ہے اور اس کی بہت سی باتیں مجھے معلوم ہیں لیکن تغافل سے کام لیتا ہے اور خلاف امید ملتا ہے ؛ خیر ہمیں کیا برتن سے وہی ٹپکتا ہے جو اس میں ہو ، میں تو طالب علم ہوں شاعری سے کیا واسطہ ۔

یہ حالات، ۱۲۳۱ھ میں قاسم نے قلم بند کیے تھے ۔ مصحفی نے جب ریاض الفصحا ۱۲۱۶ھ میں لکھنا شروع کیا تو اسے خیال ہوا کہ نصیر کا درجہ شاعری بلند ہو چکا ہے اور لوگوں کی رائیں بدل چکی ہیں اس لیے اس نے ۱۲۱۶ھ اور ۱۲۳۶ھ کے درمیان دوبارہ نصیر پر قلم اٹھایا، اس سے مصحفی کی

حقیقی رائے معلوم ہو جاتی ہے۔ وہ شاہ نصیر کے متعلق لکھتا ہے (ریاض الفصحا صفحات ۳۳۷، ۳۳۸) :- ایک جوان ہے، ذی فطرت، صاحب ہوش، جن دنوں کہ دہلی میں (۱۱۸۶ھ تا ۱۱۹۸ھ) میاں خورم علی خورم کے مکان میں مجلس مشاعرہ قائم کی تھی، مبتدیوں کی مانند موزوں طبع تھا، اب شوق اس کا رہبر ہوگیا اور درجۂ کمال پر پہنچا دیا۔ دہلی میں استادی کا علم بلند کیا ہے اور دہلی کے لوگ اس کے حلقۂ شاگردی میں داخل ہیں اور مسلم الثبوت جانتے ہیں اور ملک الشعراء کہتے ہیں۔ اس کی روانیٔ طبع میں کوئی شک نہیں لیکن جب لکھنؤ آیا اور یہاں کے فصحا سے ملا اور مشاعروں میں طرحی غزلیں پڑھیں تو اعلیٰ شاعری کا مقام اسے معلوم ہوا، تذکرۂ ہندی میں دو سنے ہوئے شعر لکھ دیے تھے، اب چونکہ قریبی زمانے میں دو تین بار یہاں آ چکا ہے، طرحی مجلسوں میں شریک ہوا، جو کچھ اس کا پڑھا ہوا کلام یاد رہ گیا وہ لکھا جاتا ہے۔ اس کی عمر ساٹھ سے متجاوز ہوگی؛ عمر کے بارے میں جو آخر میں فقرہ ہے، وہ الجھن میں ڈالتا ہے۔ آغاز میں جوان اور آخر میں عمر ساٹھ سے متجاوز، ایک معمہ ہے، اس کی تطبیق یوں ہو سکتی ہے کہ جس وقت حال لکھنا شروع کیا (۱۲۱۶ھ) اس وقت جوان تھے اور جس وقت تذکرہ ختم کیا (۱۲۳۶ھ) اس وقت عمر ساٹھ سے متجاوز لکھی اور بیس سال میں ایک شخص جوان سے بوڑھا ہو سکتا ہے۔

شیفتہ تعارف اس طرح کرتے ہیں (صفحہ ۲۳۰ گلشن بیخار) :-

ساٹھ سال سے شاعری کا شوق ہے، اکثر شہروں لکھنو، حیدر آباد وغیرہ میں مکرر گیا ہے اور ہر شہر کے مشہور شعراء سے مل کر مشاعروں اور طرحی غزلوں میں حصہ لیکر نام پیدا کیا، دہلی کے قیام کے زمانے میں پندرہ اور انتیس تاریخ ہر مہینے کی محفل مشاعرہ منعقد کرتا ہے اور سنگ لاخ زمینوں میں مصرع طرح دیتا ہے، فقیر سے بھی تعارف اور شناسائی ہے، نیک اور اچھی عادت والا ہے۔

شیفتہ نے دیدہ و دانستہ نصیر کے بارے میں اغماض سے کام لیا، انھوں نے

نصیر کی شاعری کے متعلق کوئی اظہار خیال نہیں کیا، ہاں نصیر کی افتاد طبع کو ظاہر کر دیا کہ وہ سنگلاخ زمینوں میں طرح کرتے ہیں لیکن طرز نصیر سے اس قدر نفرت تھی کہ ان کے شاکرد قطب الدین حشیر (صفحہ ۱۷۶) کے سلسلے میں لکھتے ہیں :- کہتے ہیں شاہ نصیر کے شاگردان رشید سے ہے، فقیر نے اسے مجالس مشاعرہ میں دیکھا اور وہیں کلام سنا، اپنے اُستاد کے طریقے کا پیرو ہے۔

نساخ کی رائے بھی ملاحظہ ہو (صفحہ ۵۲۲ سخن شعرا) :-

مضامین عالی و تازہ خوب باندھتے تھے۔ سنگ لاخ اور مشکل زمینوں میں ان سے بہتر کہنے والا پیدا نہیں ہوا۔

صاحب طور کلیم لکھتے ہیں (صفحہ ۱۱۶) کہ سنگ لاخ زمنیوں میں لکھتا اور صاحب بزم سخن (صفحہ ۱۱۳) کی رائے ہے کہ مشہور استاد ہے، مضامین عالی باندھتا ہے۔

صاحب گل رعنا (صفحہ ۲۷۰) کا خیال ہے: کلام میں شکوہ الفاظ کے ساتھ نئی نئی تشبیہیں اور استعارے پائے جاتے ہیں، زمنیں بھی نئی نئی نکالی ہیں جس میں شعر کا سر سبز کرنا ہر کسی کا کام نہیں، سید انشا اور جرأت کی تقلید ہے، کچھ الفاظ ان کے ہاں متروک ہیں مگر اتنے نہیں ہیں کہ ناسخ و آتش کے ساتھ ان کو جگہ دی جائے۔

مولوی عبدالقادر خاں غمگین نصیر کے متعلق اختصار سے کام لیتے ہیں (روزنامچہ مخطوط رضا لائبریری رامپور و حبیب گنج) :-

آج کل شاعری میں شہرت نصیر الدین نصیر کی ہے اور یہ مطلع مشہور ہے :-

پشت لب پر ہے ترے یہ خط ریحان ایسا
منہ تو دیکھو، لکھے یاقوت رقم خاں ایسا

جہاں تک شہرت کا تعلق ہے نصیر عوام پر چھائے ہوئے تھے لیکن ان کی رسائی خواص میں نہ تھی، لال قلعے میں احسان کا دخل تھا اور دلّی کی علمی مجلس آزردہ، ممنون، فراق، قاسم، عشق وغیرہ کے زیر اثر تھی لیکن ذوق اور مومن شہرت عام سے مرعوب ہو کر شاہ نصیر کی طرف جھکے لیکن جب ذوق سلیم نے رہبری کی تو شاگردی کا سلسلہ توڑ دیا۔ یاں اس پہلوان سخن کی زور طبع کا اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ صاحب گلستاں سخن (صفحات ۱۶۵ و ۱۶۶) لکھتے ہیں:-

منشی حافظ فیض پارسا، مدرسہ دھلی انگریزی میں تعلیم حساب پر مامور تھے.... مدرسہ غازی الدین خاں میں جو شاہجہان آباد کے دروازہ اجمیری کے باہر واقع ہے، اس بزرگ نہاد کی تکلیف سے بزم مشاعرہ منعقد ہوتی تھی اور چند مدت تک وہ ھنگامہ گرم رہا۔ مشاہیر شعرائے شیریں سخن، شاہ نصیر غفراللہ‘ اور مومن خاں مرحوم اور شیخ ابراہیم ذوق مغفور اور ان کملائے قادر سخن کے تلامیذ اورموزوں طبعان شہرجمع ہوکر لطف اٹھاتے۔ اسی زمانے میں شاہ نصیر لکھنؤ سے آئے اور دو غزلیں وہاں کی کہی ہوئیں اس مشاعرے میں پڑھ کر دادِ سخن ِ تحسین حاصل کی، دوسروں نے حسد سے کام لیا اور دونوں زمنیوں یعنی ’’قفس کی تیلیاں،، اور ’’کفن پتھر کے،،میں غزلیں شاگردوں سے پڑھوائیں۔ شاہ نصیر نے آئندہ مشاعرے میں قریب پچاس غزلیں کہ کر شاگردوں سے پڑھوائیں۔ کئی مہینے تک یہ سلسلہ جاری رہا، آخر الامر ذوق نے محمد سراج الدین ظفر کی مداح میں اسی زمین میں لکھ کر پڑھا۔ یہ واقعہ ولیعہدی کے زمانے (۱۲۳۱ھ تا ۱۲۵۳ھ) کا ہے، خود نصیر کے متعلق حالات میں وضاحت کرتے ہیں (صفحات ۳۶۲ و ۳۶۳):- ھر چند استعداد علمی سے بہرہ ور نہ تھا بلکہ سواد بھی چنداں روشن نہ تھے لیکن روشنی طبع خدا داد سے خلوت دل میں ہزار شمع سخن بزم افروز تھی، پر گو، تشبیہ نو اور استعارہ جدید بہم پہنچایا، شعر طرز صائب پر رکھتا ہے، بلندیٔ تلاش سے مشاعرے میں کسی کی غزل کو اس کی غزل

پر تفوق نہ ہوتا ، سنگ لاخ زمین میں کوئی مقابل نہ تھا ، جرأت ، قتیل ، و انشا و مصحفی کی ' حیات میں لکھنؤ گیا ' وھاں مشاعرے میں مقابلہ کیا ۔ ' چمن سرخ ترا ' ' فانوس ھیں گویا ' آٹھ طرحیں تھیں انھوں نے مزید 'چمن کی مکھی میں' بھی غزل کہی ۔ مصحفی کے شاگرد نے اعتراض کیا ... اس معرکے میں شاہ نصیر جیتے ، اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ معاصرین ناقابل تھے بلکہ عوام کم فہم ھوتے ھیں اسی لیے وہ مداح ھوتے ھیں ..... ذوق ، مومن ، تسکین شروع میں اسی کے شاگرد تھے ، سلسلہ سودا تک پہنچتا ھے ، یہ شاگرد مائل ھے اور وہ سودا کا شاگرد ھے ۔

اگر اس پہلوان سخن کی نظر لکھنو اور حیدر آباد کی طرف نہ ھو جاتی تو دھلی کے مذاق شاعری کے بگڑنے میں کون سی کسر باقی رہ گئی تھی لیکن نصیر کے باغی شاگردوں نے استاد کے رنگ سخن کو جمنے نہ دیا اور شاہ نصیر صرف عوام کے مقبول شاعر رھے ۔

آزاد مرحوم کی رائے بھی قابل ملاحظہ ھے ۔ (آب حیات صفحہ ۴۰۷) :

کلام کو اچھی طرح دیکھا گیا ، زبان شکوہ الفاظ اور چستیٔ ترکیب میں سودا کی زبان تھی اور گرمی اور لذت اس میں خدا داد تھی ، انھیں اپنی نئی تشبیہوں اور استعاروں کا دعویٰ تھا اور یہ دعویٰ بجا تھا ۔ نئی نئی زمنیں نہایت برجستہ اور پسندیدہ نکالتے تھے مگر ایسی سنگ لاخ ھوتی تھیں جن میں بڑے بڑے شہسوار قدم نہ مار سکتے تھے ، تشبیہ اور استعارے کو لیا ھے اور نہایت آسانی سے برتا ھے ـــــ بعض الفاظ مثلاً ٹک ، واچھڑے ، تس پر وغیرہ جو کہ سید انشاء اور جرأت تک باقی تھے ، وہ انھوں نے ترک کیے مگر آئے ھے ، جائے ھے وغیرہ افعال انھوں نے بھی استعمال کیے ھیں ۔ جن سنگ لاخ زمنیوں میں وہ مشاعرے کو تڑپا دیتے تھے اوروں کو غزل پوری کرنی مشکل ھوتی تھی ۔ اکثر بزرگ پرانے پرانے مشاق کہ علوم تحصیلی میں ماھر کامل تھے ، مثل حکیم ثناءاللہ خاں فراق ، حکیم قدرت اللہ

قاسم ، شاگرد خواجہ میر درد ، میاں شکیبا شاگرد میر ، مرزا عظیم بیگ اور شیخ ولی اللہ محب شاگرد سودا ، حافظ عبدالرحمان احسان وغیرہ موجود تھے، سب ان کے دعوے سنتے تھے اور محض موقع پر اپنی بزرگی سے ان کی طنزوں کو برداشت کرتے تھے مگر خاموش نہ کر سکتے تھے ۔

سر سید کی رائے بھی دیکھ لیجیے (آثارالصنادید صفحہ ۲۱۳) :—

شعر ریختہ کو بطرز صائب ، مدعا مثل اکثر فرماتے تھے ، مشکل زمینوں کی طرف جس میں سخن طرازوں کو قدم رکھنا دشوار ہوتا ، بیشتر توجہ کرتے اور حق یہ ہے کہ اُن زمینوں میں یہ غزل قریب بہ قصیدہ ، بل دو غزلہ فکر کرتے اور اکثر ابیاتِ غزلِ ، بیت‌الغزل ہوتے اور باوجود اس کے کہ علم شعر سے بہرہ کم تھا لیکن جن زمینوں میں وہ قدم رکھتے اور ان کو بہ زور طبع خدا داد سرانجام دیتے ، مدعیانِ کمال کو مجال نہ ہوتی کہ اُس میں جرأت کریں ، اکثر ریختہ گویان شاہ جہاں آباد نے اپنے زعم میں کوس لمن الملکی کو بلند آوازہ کرتے ہیں ، اوائل حال میں اُنھیں سے تلمذ کیا گیا تھا گو بعد مدت مشق کمال کو پہنچا کر ، کبھی مباحثہ اور کبھی طنز و تشنیع پر مستعد ہوئے . . . دو بار لکھنؤ تشریف لے گئے اور سامنے مرزا قتیل کے مصحفی اور انشاءاللہ خاں کے ساتھ بساطِ مشاعرہ آراستہ کیا ، تین بار حیدر آباد کو گئے . . . وہیں مدفون ہوئے ۔

اس رائے سے واضح ہوتا ہے کہ سر سید جیسے اصحاب نصیر کی شاعری سے مرعوب تھے لیکن غالب اور مومن اور اُن کے شاگرد اس روشِ عامیانہ سے محفوظ رہے ۔

۸ ۔ حافظ عبدالرحمٰن، تخلص احسان ، (ولادت ۱۱۸۷ھ وفات ۱۲۶۷ھ)

قاسم کے بقول (صفحات ۵۴ و ۵۵ مجموعہ نغز ج-۱) ابتدا میں رحمٰن تخلص کرتا تھا، جوان ہے، نہایت ہی متین، خوش مزاج اور سنجیدہ، فارسی میں بھی

شاعری کرتا ہے ، اس کے اکثر خاندانی حافظ اور فقیہ ، ان کا باپ شاہ عالم کا پیش امام تھا . . . شعرائے پایۂ تخت میں یہ بھی منسلک ہے ، شیریں زبان اور خوش فکر ہے اور کلام با حلاوت ہے۔

شیفتہ کا بیان ہے ، (صفحہ ۱۸ گلشن بے خار) ''شاہ عالم کے عہد کے شعرأ میں سے ہے ، برسوں مرزا ایزد بخش کی سرکار میں مختاری کے عہدے پر سرفراز رہا ۔ بڑھاپے کے باوجود اکثر بزم مشاعرہ میں شامل ہوتا ہے ، اس کے عاشقانہ اشعار دل میں اتر جاتے ہیں ، صنائع لفظی میں (مانند ، اشتقاق ، طباق وغیرہ) حد سے زیادہ توجہ کرتا ہے ۔ راقم سے تعارف ہے ، صاحب نیک اخلاق ہے''۔

سر سید آثارالصنادید (صفحہ ۲۲۰ طبع اول) میں لکھتے ہیں :-

سخن سنجِ دقیقہ گزیں، معنی رس، خوردہ بیں، یگانہ جہاں ، فرید آوان ، حافظ عبدالرحمٰن خاں ، احسان ، استعداد کتابی نہایت اور تحقیقِ مصطلحات بغایت ... ریختہ گوئی کو کمال اور زبان اردو کو نہایت جمال بخشا ، ساٹھ برس کی مشق سخن دلالت کرتی ہے کہ کیا ملکہ اصنافِ سخن میں بہم پہنچا ہوگا ، صنعت تجنیس و اشتقاق بیشتر ان کے کلام بلاغت نظام میں مستعمل ہے ، حق یہ ہے کہ ان صنعتوں کو اپنے سخن میں اچھی طرح سے نبھایا ہے ۔ قلعۂ معلیٰ میں بیشتر سلاطین انھیں کے شاگرد ہیں ، باوجود ضعف پیری کے سخن میں ہنوز شوخی جوانی کی موجود ہے ۔

نساخ تحریر کرتے ہیں (صفحہ ۱۱ سخن شعرأ) :-

احسان تخلص حافظ عبدالرحمٰن خاں خلف حافظ غلام رسول خاں آستاد و مختار مرزا فرخندہ بخت بہادر ابن شاہ عالم بادشاہ ، باشندۂ دھلی ۱۲۶۷ھ میں انتقال کیا ، صاحب دیوان گزرے ۔

صاحب طورِ کلیم (صفحہ ۹) کی رائے ہے :-

صنائع لفظی پر بہت مائل تھا ۔ اس کے باوجود کلام سادہ پرکار کہتا ۔

بزم سخن کے مؤلف (صفحہ ۱۰) کا خیال ہے :—

بقول صاحب خمخانہ (جلد اول صفحات ۱۴۸ تا ۱۵۱) اچھی طبیعت رکھتا تھا ، صنائع لفظی پر مائل تھا ، ۱۲۶۷ھ میں پچاسی سال کی عمر میں انتقال کیا ۔ لیکن مولوی کریم‌الدین پانی پتی نے ۱۸۴۴ء میں گلدستۂ نازنیناں مرتب کیا تو دیباچے میں مشہور شعرأ کا بیان کیا ہے ، اُن میں ظفر ، آزردہ ، ذوق ، مومن ، غالب ، ناسخ ، جرأت ، انشا ، نصیر ، صہبائی معروف ، ممنون ، تسکین ، نگہت ، قاسم ، فراق ، مصحفی وغیرہ کا ذکر کیا ہے ، احسان کا نام نہیں ۔

احسان غیر معروف شاعر نہ تھے اسی لیے جب مولوی کریم‌الدین نے تذکرہ طبقات شعرائے ہند ۱۸۴۷ء میں مرتب کیا تو اُس کے دیباچے میں اس طرح ذکر کیا ہے :—

احسان حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان محمد شاہ کے وقت کا شاعر ہے ۔ جو اس زمانے تک موجود ہے اور بڑا اُستاد ہے، اُس کے بھی بہت شاگرد ہیں ۔

۹ ۔ ذوق محمد ابراهیم نام، باپ شیخ محمد رمضان نامی ایک غریب سپاہی تھے، ۱۲۰۴ھ میں دھلی میں پیدا ہوئے اور حافظ غلام رسول شوق کے مکتب میں آبتدائی تعلیم پائی اور انھیں کی صحبت میں ذوقِ شعر و سخن پیدا ھوا ۔ جب کچھ آ گیا تو شاہ نصیر سے اصلاح لینے لگے اور ساتھ ھی کچھ درسی کتب پڑھ لیں ۔ اب مشاعروں میں حصہ لینے لگے اور شہرت ھونے لگی تو ابو ظفر نے اصلاح لینی شروع کی ۔ اُسی زمانے میں اکبر شاہ ثانی کی تعریف میں ایک قصیدہ ذوق نے لکھا ، اس پر ''خاقانیٔ ھند'' کا خطاب ملا ۔ اُس وقت اُنیس سال کی عمر تھی ، ولیعہد سلطنت کے یہاں سے تنخواہ مقرر ھو گئی تھی اس لیے اطمینان سے شاعری کا موقع مل گیا ۔

شاہ نصیر سے انحراف شاگردی کا حال آزاد تفصیل سے لکھتے ہیں ، نصیر اور ذوق کی منزلیں جدا تھیں اس لیے ذوق کا ساتھ دینا ممکن ہی نہ تھا۔ ذوق نے اپنی خداداد طبیعت سے ایک نیا رنگ پیدا کیا ، شیفتہ ۱۲۵۰ھ میں ان کے متعلق لکھتے ہیں (صفحہ ۷۴ گلشن بے خار) :—

ذوق تخلص ، شیخ محمد ابراهیم دهلوی المخاطب به خاقانیٔ هندی ، آئینۂ طوطی بلاغت است و طوطیٔ شکرستان فصاحت، جامۂ سحر بیانی به بالایش راست ، و دامنِ آتش زبانی از بادِ نفسش شعله افزا است ، رنگینیٔ خیالش ، جلوۂ لاله و گل بنظرمی فزاید و شمع فکرتش پروانه وار دل می رباید ، اگر لفظ بنشیں در کلامش آید ، جاں فزا تر از قسمِ عیسیٰ است ، و اگر حرف "برو" در سخنش گذرد ، دلکش تر از خوش آمدے شاهد زیبا ، هر مصرعش تیرے است از ترکش کمانِ ابروانِ برجسته و هر بیتش دشنه ایست دلها خراشیده و سرها شکستهٔ ، از مدت سی سال به مشق سخن می پردازد و در سرکار مرشد زاده آفاق مرزا ولی عهد بهادر علم امتیاز می افرازد ، قوت مشقے که او راست دیگرے را دیده نشد و معهذا رطب و یابس که شیوۂ بسیار گویان است ، در کلامش کمتر و بر جمیع اصنافِ سخن قدرت تمام دارد ۔ بالجمله از شعرائے مسلم و مقرر است و با ایں همه کثرت فکر و هجوم اشعار هنوز به ترتیب دیوان نه پرداخته، صحبتش گاه گاه اتفاق من افتد از منتخبات زماں و مغتنمات دوران است۔

شیفتہ نے ذوق کی دل کھول کر داد دی ہے ، یہ وہ زمانہ ہے کہ ظفر ولیعہد سلطنت تھے اس لیے کسی دباؤ کا قیاس نہیں کیا جا سکتا ۔ بتیس سالہ مشقِ سخن ظاہر کرتی ہے کہ ذوق نے ۱۲۲۰ھ کے متصل میدانِ سخن میں قدم اٹھایا ، خصوصیات کلام میں فصاحت ، بلاغت ، روانی ، نشست الفاظ اور رنگینیٔ خیال کا حوالہ دیا ہے ۔

سر سید آثارالصنادید میں مزید اضافہ کرتے ہیں (صفحات ۲۱۶ و ۲۱۷) :-

پیشگاہ سلطنت سے خطاب خاقانیٔ ہند سے سرفراز ہیں ، مشق سخنوری اس درجے کو پہنچی ہے کہ کوئی بات اس صاحبِ سخن کی غالب ہے کہ پیرایۂ وزن سے معرّا نہ ہوگی ، پُر گو اور خوش گو غزل ویسی ہی اور قصائد ویسے ہی ، غزل گوئی میں سعدی و حافظ و قصیدے میں انوری و خاقانی ، مثنوی میں نظامی کو اگر اس سخن گو کی شاگردی سے فخر ہو تو کچھ عجب نہیں ۔ شمار ان کے اشعار گوہر نثار کا بجز عالم‌الغیب کے اور کوئی نہیں کر سکتا ، دقیقہ سنجان روزگار بے لے جا سکتے ہیں کہ جس کا کلام وحی نظام ، فخر متقدمین اور شرف متاخرین ہو اس کی ذات فایض‌البرکات بنی نوع میں کس قدر فضل و شرف رکھتی ہوگی ، اس قدر جامعیت کہ فصاحتِ عبارت اور متانتِ تراکیب اور تازگیٔ طرز اور جدت معنی اور غرابتِ تشبیہ اور حسنِ استعارہ اور خوش اسلوبیٔ کنایہ اور لطف تلمیح اور پاکیٔ الفاظ اور تنگ گذری کلمات اور بست قافیہ اور نشست ردیف ، نظم و نسق کلام اور حسن آغاز و انجام ایک جائے میں جمع ہیں ۔ متقدمین سے متاخرین تک کسی اور فرد بشر کو حاصل نہیں ہوئی ، اگرچہ اصنافِ سخن خصوصاً غزلیات اور قصاید سے دفتر ہے اور ہر شعر نقطۂ انتخاب سے مزیّن[1] . . . .

صفیر بلگرامی جلوۂ خضر (صفحات ۲۳۱ تا ۲۳۳) میں رقم طراز ہیں :-

خیر جناب ذوق کی بلند خیالی اور سلاست بیانی دونوں مسلّم ہیں ، سودا کی تلاش اور انہیں کی سہل بندش ان کے کلام میں موجود ہے ، محاوروں کی طرف زیادہ ڈھلتے ہیں اور زور خاقانی کا ہے ۔ خاقانیٔ ہند خطاب بادشاہ نے واجبی دیا تھا اور میرے نزدیک خاقانی کا طالع بھی

---

۱ ۔ صاحب گلستان سخن کی (صفحہ ۲۲۲) رائے ہے :- ذوق شیخ ابراہیم مخاطب بہ خاقانیٔ ہند . . . . بلندی سخن ، شرینیٔ طرز ، معانی وافر ، مضامین کثیر . . . . وفات صفر ۱۲۷۱ھ . . . .

لائے تھے کہ جس طرح خاقانی اپنے اُستاد سے منحرف ہو گیا ، اُن کو بھی ایسا ھی موقع ملا مگر اپنی لیاقت ذاتی سے تہذیبانہ برتاؤ کیا . . . . مگر بیناکاران کی زبردستی بندشوں کو نگاہ تعجب سے دیکھتے ھیں اور کہتے ھیں کہ اس قادرالکلامی پر جناب ذوق کو کلام کے سلجھانے کا ذوق نہ تھا......

صاحب طورِ کلیم (صفحہ ۳۷) کی رائے ھے :—

صاحبِ قوت فکر خدا داد است ، بر جمیع اصنافِ سخن قدرتے کہ او راست ، در ریختہ سرایاں نتواں یافت ۔ گفتارش در پاکیٔ زبان و بلندیٔ معنی و شوخیٔ اشارات و کرسی نشینیٔ ترکیب و بست قافیہ و نشست ردیف طراز یکتائی دارد ۔ از مائدۂ نغمہ سرائی او را حقے معلوم و از خوان بادرہ سنجی را نصیبے مفروض ، زبانش را پاکیزگی غاشیہ بردوش ، بیانش را شائستگی گرد راہ جامۂ وے ، جگر کاو چکامہ اش دلخراش ، رباعیات وے ناخن بدل زن ، مقطعاش شور انگیز . . . .

بزم سخن (صفحہ ۵۱) کے مؤلف اس طرح نکتہ سنج ھیں :—

بلبل شاخسارِ فصاحت ، طوطیٔ شکرستانِ بلاغت ، شیخ محمد ابراھیم دھلوی المخاطب بہ خاقانیٔ ھند ، فروزش گر خانوادۂ سخن اوست و شمع کاشانۂ فنِ لطافت ازوے بالا گرفت ، و عذوبت پایۂ والا ستائش او محتاجِ گزارش نیست ، بلکہ غازۂ شہرت بر رو دارد و در جمیع اصنافِ سخن دستے بلند داشت ، لاسیما در قصاید ھمتہائے برنخاستہ ، از شاہ نصیر باستفادہ پرداخت ۔

صاحب گل رعنا ، (صفحات ۲۸۴ تا ۲۸۶) لکھتے ھیں :—

کلام کے باب میں جو رائے آزاد نے دی ھے ، اُس پر کچھ اضافہ نہیں ہو سکتا ، اُنھوں نے ٹھیک کہا ھے کہ عام جوھر ان کے کلام کا تازگیٔ مضمون ، صفائیٔ کلام ، چستیٔ ترکیب ، خوبیٔ محاورہ ،

اور عام فہمی ہے مگر رنگ مختلف وقتوں میں مختلف رہا ۔ ابتدا میں مرزا رفیع سودا کا انداز تھا؛ جب نواب الٰہی بخش خاں معروف کی صحبت میں جو خواجہ میر درد کے انداز کو پسند کرتے تھے ، آن کی غزلیں خواجہ صاحب کے انداز میں بنانے لگے، مرزا ابو ظفر نوجوان تھے وہ جرأت کے انداز کو پسند کرتے تھے ، ان کی غزلیں جرأت کے انداز میں بناتے تھے ، نتیجہ اُس کا یہ ھوا کہ خود ان کی غزل اخیر کو ایک گلدستہ گلہائے رنگا رنگ کا ھوتی تھی ، دو تین شعر بلندخیالی کے ، ایک دو تصوف کے ، دو تین معاملے کے (دیکھو آبِ حیات) ۔

نساخ کی رائے اور سُن لیجیے (صفحہ ۱٦٦ طبع اول سخن شعرأ) :—

مضامین تازہ و عالی و عاشقانہ خوب باندھتے تھے ، راقم الحروف کے زعم میں ریختہ گویوں میں اس قدرت کا شاعر پیدا نہیں ہوا ، بارہ سو اکہتر ھجری (۲۴ صفر) راھی ملک بقا ھوئے[۱]۔

ذوق کا درجہ زبان کی خدمت کے لحاظ سے بلند ہے، داغ نے اصلاح زبان کا کام تکمیل کو پہنچا کر دھلی کا نام روشن کیا ، اس لیے ذوق نہ صرف قصیدے میں بلند درجہ رکھتا ہے بلکہ اُردو کی ترقی میں بھی اُس کو نمایاں مقام حاصل ہے ۔

۱۰ ۔ غالب تخلص ، اسد اللہ خاں نام ، عرف مرزا نوشہ کی نسبت شیفتہ اس طرح سخن طراز ھیں (صفحہ ۱۳۹ گلشن بے خار) :—

اونچے خاندان سے ھیں اور آگرے کے قدیم رؤسا میں سے ، اب دھلی مسکن ہے ، چمنِ معانی کا بلند پرواز طوطی ہے اور شیوا بیانی کے گلشن بلبل نغمہ سنج ، اُس کی بلند خیالی کے سامنے آسمان کی بلندی زمین کی پستی ہے ، . . . . . اگر آج نایاب اشیاء کی جستجو کرے تو اُس کی دکان کے سوا نہیں ملتیں، برسوں سے شاعری

---

۱ ۔ قاموس المشاھیر ، مؤلفہ مولانا نظامی بدایونی ، ولادت ۱۱ ذی‌حجہ ۱۲۰۴ھ ، وفات بروز چہار شنبہ ۲۴ صفر ۱۲۷۱ھ ۔

میں مشغول ہے ، آغاز شاعری میں اپنی دشوار پسند طبیعت کے تقاضے سے مرزا عبدالقادر بیدل کی طرز میں شاعری شروع کی اور دقت آفرینی کرتا تھا۔ آخرکار اس طرز کو چھوڑ کر ایک دلکش طرز اختیار کی ، دیوان کو ترتیب دینے کے بعد دوبارہ دیکھا ، اکثر اشعار حذف کر دیے ، تھوڑا منتخب کیا ، مدتوں سے اردو شاعری کا خیال نہیں ، فارسی زبان میں اچھی مہارت اور قدرت حاصل ہے ، اہم اساتذہ میں شمار ہے ، غزل نظیری کی غزل کی مانند بے نظیر اور قصیدہ عرفی کے قصیدے کے مانند دلپذیر، مضامین شعر کو بخوبی سمجھتا ہے اور تمام نکات اور لطائف پر نظر ہے اور یہ ایسی فضیلت ہے کہ بعض شاعروں سے مخصوص ہے ، اس لیے کہ خوش فکر اگرچہ کمیاب ہے لیکن خوش فہم زیادہ کمیاب ہے۔ ان دو صفات کی کسی ذات میں یکجائی بہت کم دیکھی گئی ہے اور ایسے خوش نصیب کم ہیں جن میں یہ ہر دو صفتیں ہوں۔ اگرچہ کبھی کبھی ملاقات ہوتی ہے لیکن حقیقی ربط دلی مستحکم ہے۔

یہ تعریف شیفتہ نے بہت سوچ سمجھ کر کی ہے چونکہ وہ مومن کے شاگرد تھے لیکن اظہار حقیقت میں فراخ دلی سے کام لیا ہے - ۱۲۵۰ھ سے پہلے ہی غالب طرز بیدل کو چھوڑ چکے تھے اور دیوان موجودہ منتخب ہو چکا تھا۔

مولوی کریم الدین تذکرۂ طبقات شعرائے ہند (صفحات ۳۷۷ تا ۳۷۸ مطبوعہ دہلی ۱۸۴۸ء) میں لکھتے ہیں :—

خاندان فخیم اور رؤسائے قدیم سے ہے ، ابتدا میں درمیان اکبر آباد کے رہتے تھے ؛ اب شاہ جہاں آباد میں ۱۲۵۰ھ کے قبل سے رہتے ہیں - مہارت کتب فارسی کی ان کو بہت ہے ، اکثر آدمی شاہ جہاں آباد میں اُن کے شاگرد ہیں - فارسی شعر بھی اُن کا بہت اچھا ہوتا ہے ، ایک دیوان فارسی زبان کا اُن کی تصنیف سے منشی نورالدین صاحب کے اہتمام سے مطبع صادق الاخبار میں چھپا ہے ، بہت بڑا

دیوان ہے یہ دیوان ۱۲۶۳ھ میں مطابق ۱۸۴۷ء کے چھپ کر تیار ہوا ہے اور ایک دیوان اُردو اُن کی تصنیف سے بہت چھوٹا ہے، وہ بھی مطبع سیدالاخبار میں درمیان ۱۸۴۳ء (صحیح تاریخ ۱۸۴۱ء ہے) کے چھپا تھا۔ حال اس دیوان کا یہ سننے میں آیا ہے کہ مرزا نوشہ نے ایک دیوان بہت بڑا کئی ہزار شعر کا فراہم کیا تھا، اُس کو منتخب کر کے چھوٹا سا دیوان دو تین جزو کا بنا لیا، وہ دیوان بندے کے پاس بھی ہے۔ میں نے جو ثقہ لوگوں کی زبانی سنا تھا نقل کر دیا، دروغ بر گردن راوی لیکن اس مقولے کا موید قول صاحب تذکرہ گلشن بے خار کا بھی ہے۔ وہ بھی یہ لکھتے ہیں کہ بہت اشعار حذف کر کے یہ دیوان انتخاب کر لیا ہے، قصیدہ اور غزل دونوں (صفحہ ۳۷۸) اس شاعر مذکور کے فارسی زبان میں بہت ہیں، اُردو میں صرف غزلیں ہیں، اَور قسم کے اشعار دیکھنے میں نہیں آئے۔ ان ایام میں یعنی درمیان ۱۸۴۷ء کے ایک حادثہ اُن پر جانب سرکار سے بڑا پڑا جس کے سبب اُن کو بہت رنج لاحق ہوا۔ عمر اُن کی اس سال میں قریب ساٹھ برس کے ہوگی۔ نواب ضیاءالدین احمد خاں نے ۱۲۵۴ھ میں دیوان کی تقریظ لکھی ہے، اس میں تعداد اشعار (۱۰۹۸) ظاہر کی ہے (صفحہ ۹۷ دیوانِ غالب طبع دوم، مطبع دارالسلام دہلی، واقع محلہ حوض قاضی مبینہ اقل العباد عنایت حسین در ماہ مئی ۱۸۴۷ء باہتمام نورالدین احمد لکھنوی حلیہ انطباع پوشید) لیکن صفحہ ۹۸ پر ہے ''ہمگی اشعار شعری اشعار غزل و قصیدہ و قطعہ و رباعی یک ہزار و یک صد و اند یافتم'' اس لیے مولوی کریم الدین نے دیوان میں صرف غزلوں کا حوالہ غلط دیا ہے۔

دیوان اول صفحہ ۹۵ میں ۲۵ شعر کا یہ قصیدہ شامل ہے، مصرع :—

ساز یک ذرہ فیض چمن سے بے کار

یہ منتخب قصیدہ حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کی منقبت میں ہے۔

دوسرے قصیدۂ منتقبہ کے بھی تین اشعار دیوان میں (صفحہ ۹۹) موجود ہیں جس کا مصرع ہے :—

دہر جُز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں

دیوان اول میں گیارہ رباعیاں بھی ہیں اور قطعات بھی اس لیے کریم الدّین کا بیان درست نہیں۔

سر سید اسی سال ۱۸۴۷ء میں آثارالصنادید (صفحات ۱۳۶ ، ۱۳۷) میں رقم طراز ہیں :—

جلیل (فصاحت جنگ بہادر استاد نظام ، شاگرد امیر مینائی) سوانح عمری امیر مینائی صفحات ۶۹ تا ۷۲ (مطبوعہ مطبع سیدی حیدر آباد) ۱۳۴۷ھ میں غالب کے رام پور کے سفر کے حالات میں لکھتے ہیں :—

رام پور میں مرزا غالب سے ایک سقے نے لڑکی کے عقد کے سلسلے میں امداد طلب کی تھی ، وعدہ کر لیا تھا ، اتفاقاً رخصتانہ نہ ملا ، مرزا پالکی میں چلے ، شہر سے باہر پہنچے کہ یاد دلانے پر نذرانہ نواب نے بھیجا ، مرزا نے سقے کو بلایا اور جب آ گیا تو روپیہ دے کر چلے . . . . . مولوی ولی محمد خاں بسمل کو اپنے شعر سنانے کا بہت شوق تھا ، غالب کو مطلع سنایا ، ایک مطلع سنتے ہی غالب نے کہا کہ مجھ کو اٹھاؤ۔ ضعف کی وجہ سے اٹھنے میں سہارا درکار ہوتا تھا ، لوگوں نے اٹھایا مرزا صاحب ولی محمد خاں کے گرد پھرے ، سر پر بوسہ دیا اور کہا اس سے زیادہ سننے کی مجھ میں تاب نہیں۔

دیوان حافظ ان کی لسان‌الغیبی کے عہد میں دلوں سے فراموش ، زبان خلاق‌المعانی ان کے معنی ایجاد کے زمانہ میں خاموش ، چراغ انوری انھیں کے شعلۂ فکر سے روشن . . . . (صفحہ ۱۳۷) اسم سامی ان کے والد کا عبداللہ بیگ خاں تھا۔ آپ اتراک سے ہیں . . . . . جد امجد سمر قند سے اپنے باپ سے ناخوش ہو کر ہند آئے اور لاہور میں

معین الملک کے رفیق ہوئے۔۔۔۔ اس کے بعد وارد دهلی ہوئے۔
غالب کے والد دهلی میں پیدا ہوئے اور یہیں نشو و نما حاصل کی، پھر کسی سبب سے بود و باش اکبر آباد اختیار کی اور حضرت ممدوح کو پانچ برس کا چھوڑ کی رحلت کی۔ چچا نصر اللہ بیگ خاں جنرل لیک صاحب کے رفیق رہے، صلہ میں دو پرگنہ مضافات اکبر آباد میں ملے۔ ۱۸۰۶ء میں ایک سانحہ میں جاگیر ضبط ہوئی اور عوض میں نقدی مقرر ہوئی۔ پھر وہاں سے انس طبیعت کے سبب دهلی میں آئے اور اسی معاش پر قناعت کر کے گوشہ نشینی اختیار کی ہے اور بہترین شغل آپ کا اس عالمِ تنہائی میں سخن سنجی اور معنی پروری ہے، حق یہ ہے کہ جانِ سخن پر منت اور سرِ معنی پر بار احسان رکھتے ہیں۔۔۔ راقم آثم کو جو اعتقاد ان کی خدمت میں ہے، اس کا بیان نہ قدرت تقریر میں ہے اور نہ احاطۂ تحریر میں آ سکتا ہے اور چونکہ ''دلہا را بہ دلہا راہ باشد'' ان حضرات کو بھی وہ شفقت راقم کے حال پہ ہے کہ شاید اپنے بزرگوں کی طرف سے کوئی مرتبہ مشاہدہ کیا ہوگا۔ میں اپنے اعتقاد میں اُن کے ایک حرف کو بہتر ایک کتاب سے اور اُن کے ایک گُل کو بہتر ایک گلزار سے جانتا ہوں۔

ایک دیوان قصاید و غزلیات کا (صفحہ ۱۳۹) تیس جزو سے زیادہ مرتب اور منطبع ہوا ہے اور اسی طرح سے نثر اور ایک کتاب، پنج آہنگ نہایت فوائد جلیلہ پر مشتمل، قریب چودہ پندرہ جزو کے آپ کے نتائجِ فکر سے ہے۔۔ اور ایک مثنوی مشتمل اوپر غزوات حضرت رسالت دستگاہی ختمی پناہی صل اللہ علیہ وسلم کے اگرچہ نا تمام ہے لیکن پھر بھی قریب پندرہ سولہ جزو کے ہو چکی ہے۔ صابر لکھتے ہیں (گلستان سخن صفحات ۳۸۲ و ۳۸۳):-
سخن سنج بے مثل و نظیر اور صاحب طرز دلپذیر، سخن کی فراوانی اور ہجوم معانی اور متانت تراکیب اور شاقت اسالیب اور شوخیٔ اشارات، چستیٔ عبارات .. مباحث سخن میں بلاغت کے ساتھ ادا اور حشو و زوائد سے

بزم کلام میں مثل زہاد اجتناب کرنا ... اس ناظم کشور کمال میں ملاحظہ ہوتے ہیں ۔

نساخ تحریر کرتے ہیں (صفحہ ۳۴۲ سخن شعراء) :- نجم الدولہ دبیر الملک اسداللہ خاں بہادر نظام جنگ معروف بہ مرزا نوشہ خلف عبداللہ بیگ خان اولاد میں افراسیاب کے ہیں، مولد ان کا اکبر آباد، مسکن دہلی، طبیعت ان کی بہت دشوار پسند ہے، اشعار فارسی ان کے اشعار ظہوری ترشیزی و مرزا عبدالقادر بیدل کے ہم پہلو ہوتے ہیں، اشعار اردو میں بھی وہی انداز ہے ۔ اوائل میں اردو غزلوں میں اسد تخلص کرتے تھے، بڑا عرصہ گزرا کہ کلکتہ میں بھی آئے تھے ۔ راقم کو دہلی میں رہنے کے ہنگام میں ان کی خدمت میں نیاز حاصل ہوا تھا، کلیات ان کا نظر سے گذرا، بارہ سو پچاسی ہجری میں انتقال کیا ۔

شہرت آئینہ داغ جلد اول (صفحہ ۳۴ و ۳۵) مطبوعہ مطبع اسلامیہ لاہور ۱۹۰۵ میں لکھتے ہیں :-

ایک روز میں مرزا غالب کی خدمت میں حاضر ہوا، اس وقت کھانا نوش فرما رہے تھے (کھانا کیا تھا، سامنے ایک چھوٹے سے گلاس میں ماءاللحم رکھا تھا) ۔ میں مؤدب ہو کر ایک طرف بیٹھ گیا، آپ نے ایک رنگترہ میری طرف پھینکا کہ اس سے شغل کیجیے ۔ چونکہ رمضان کا مہینہ تھا اور مجھے روزہ تھا، میں نے اس رنگترہ کو ہاتھ نہیں لگایا ۔ آپ تاڑ گئے اور کہا : "ہیں، یاں آپ مولوی ہو گئے ہیں"۔ میں ہنسا تو آپ بھی مسکرانے لگے ۔ جب آپ کھانا نوش فرما چکے تو جو قلمی رسالہ آپ کے سامنے رکھا تھا، اس کو بنانے لگے، غالباً اصلاح دے رہے تھے، میں نے گزارش کی "جناب! کیا ارقام فرما رہے ہیں" تو فرمانے لگے، "اس میں فارسی الفاظ بہت ٹھونس دئے گئے ہیں اس لیے انہیں نکال رہا ہوں اور شستہ اردو الفاظ اس میں ڈال رہا ہوں"۔ میں نے ادب کے ساتھ گذارش کی "آپ کا دیوان بھی تو فارسی سے مالا مال ہے"۔ فرمانے لگے "وہ جوانی کی

نازک خیالیاں ہیں ۔ شہرت! بعض شعر تو ایسے ادق میرے قلم سے نکل گئے ہیں کہ میں اب ان کے معنی نہیں بیان کر سکتا "۔ پھر فرمانے لگے " دھلی والوں کی جو اردو ہے اس کو ہی اشعار میں لکھنا چاہیے ، آخر عمر میں ہماری تو یہی رائے قائم ہوئی ہے "۔ میں نے ادب کے ساتھ گزارش کی کہ داغ کی اردو کیسی ہے ، فرمانے لگے کہ ایسی عمدہ ہے کہ کسی کی کیا ہوگی ، ذوق نے تو اردو کو اپنی گود میں پالا تھا ، داغ اسی کو نہ فقط پال رہا ہے بلکہ اس کو تعلیم دے رہا ہے ۔

انتخاب یادگار (صفحات ۲۴۱ ، ۲۰ ۔ ۲۴) میں امیر مینائی لکھتے ہیں:—

قوم ان کی ایبک ہے ، اقوام ترک سے جد اعلیٰ ان کے ماوراالنہر سے ہندوستان میں آئے اور نواب نجف خاں کے عہد میں منصب دار شاہی رہے، جب ریاست مغلیہ برہم ہوئی ، ملازم مہاراجہ جے پور ہوئے اور بود و باش شہر آگرہ میں اختیار کی ، مرزا عبداللہ بیگ خاں ان کے والد ماجد خواجہ غلام حسین کمیدان متوطن شہر آگرہ کے یہاں منسوب ہوئے اور مرزا نوشہ وہیں پیدا ہوئے اور تا سن شعور وہیں مشغول تحصیل کتب درسیہ عربی و فارسی رہے ۔ ابتدا میں شیخ معظم نامی ایک معلم سے کچھ تعلیم پائی ، پھر ایک ایرانی آتش پرست سیاح سے جس کا نام آتش پرستی میں آورمزد اور بعد قبول اسلام عبدالصمد (قاضی عبدالودود کے بقول یہ فرضی نام ہے اور خود غالب نے بھی کبھی کبھی ایسا کہا ہے ، احوال غالب مرتبہ مختار الدین آرزو) تلمذ ہوا ، دو برس وہ ان کے مکان پر مقیم رہا اور زبان فارسی سکھائی ، جب سن تمیز کو پہنچے ، مرزا الٰہی بخش خاں معروف دھلوی کے یہاں منسوب ہوئے اور شہر دھلی میں توطن اختیار کیا ۔ معلومات ان کی زبان فارسی میں کالشمس فی رابعة النہار آشکار ہے ، نظم و نثر اردو کی چار دانگ ہندوستان میں پکار ہے ، تالیفات و تصنیفات کے نام لکھے جاتے ہیں ۔ فارسی میں کلیات جس میں غزلیں ردیف وار ہیں اور قطعات اور قصائد اور رباعیات اور مثنویاں یہاں سب قسم کے اشعار ہیں ۔

قادر نامه جو خالق باری کے طرز پر موزوں کیا ہے ، مہر نیمروز اور ماہ نیم پہ نثر میں دو تاریخیں ہیں ..... دستنبوجس میں غدر کے واقعات ہیں ، قاطع برہان جس میں برہان قاطع کے بعض لغات پر خدشات ہیں ، پنج آہنگ اس میں فارسی زبان کے منشات ہیں ، اردو مین ایک دیوان اور اردوئے معلیٰ اور عود ہندی ان دونوں میں اردو زبان کے خطوط ہیں ، الحاصل مرزا صاحب کی طباعی اور ذکاوت ان کے نتائج افکار سے پیدا ہے ، بات سے بات پیدا کرنا تمام کلام سے ہویدا ہے ، اس سرکار فیض آثار کے نمکخوار قدیم ہیں - جناب غفران مآب نواب محمد یوسف علی خاں صاحب بہادر فردوس مکان طاب ثراہ کو ان سے تلمذ تھے، اس عہد میں وظیفہ خوار رہے ، بندگان ولی نعمت ابد اللہ ظلال اجلالہم کی عہد دولت میں جب تک زندہ رہے مورد پرورش بیشمار رہے - چوھتر برس کی عمر پائی ، بارہ سو پچاسی میں ذیقعدہ کی دوسری تاریخ وفات پائی - سلطان نظام الدین حضرت محبوب الٰہی قدس سرہ' العزیز کی درگاہ میں دفن ہیں -

مولف جلوۂ خضر (جلد اول حاشیہ صفحات ۲۱۸ تا ۲۲۱) اپنے استاد کی تعریف میں رقم طراز ہیں :-

غالب علیہ الرحمة..... میرے نزدیک ہندوستان کے کلام فارسی پر ولایتی فارسی کا تعین چار شخصوں کے کلام پرھوا : اول امیر خسرو ، دوم حسن دھلوی ، سوم مرزا بیدل ، چہارم غالب - اگرچہ ناصر علی سرھندی اور مرزا مظہر جان جاناں مظہر اور غنی کشمیری اور غنیمت اور خاں آرزو اور آزاد بلگرامی اور میر امامی بلگرامی اور امام بخش صہبائی اور شاہ الفت حسین فریاد ، یہ سب کے سب خوش گو اور شاعر بے بدل تھے مگر جامۂ ایجاد جو خدا داد ہے انھیں چاروں کے راست قامت پر راست آیا اور ان چاروں کے سوا جن کے نام نامی لکھے گئے، ان پر بھی نغزگفتاری کا خاتمہ ہوا ....

اردو نظم بھی ایک خاص طور کی ہے ، اس میں بھی ایجاد خاص ہے ،

آخر میر تقی کا رنگ بالکل آتار لیا۔ اوائل میں حضرت نے ناسخ کی ایجاد پرتوجہ فرمائی اور فارسی گوئی کی عادت سے اس کو بلند کر دیا یعنی نہ ناسخ کی طرز رہی اورنہ دھلی کی، دقت پسندی کے ساتھ ترکیب و بندش فارسی زیادہ کر دی یہاں تک کہ سوائے فعل کے کوئی لفظ ھندی اکثر شعروں میں نہیں آیا مثلاً :۔

شمار سبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

مگر جب دقیقہ سنجوں نے حضرت کے اشعار کو بے معنی کہنا شروع کیا تو حضرت نے فرمایا :۔

نہ ستائش کی تمنا ، نہ صلے کی پروا
گر نہیں ھیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

اور اس انتخاب کے بعد سے میر تقی میر کے طرز کو اختیار کیا..... حقیقت میں میر کا انداز جو کچھ برتا تو غالب ھی نے برتا ۔ اگرچہ میر تقی میر کی زبان کی مناسبت تو نہیں ھے کیوں کہ ان کے وقت میں زبان بہت صاف ھو چکی تھی مگر بندش اور الفاظ کی چستی اور درستی بالکل میر کی ھے..... اردو نثر میں پوری واقعہ نگاری کا ایجاد انھیں کا ھے ورنہ اس سے پہلے مرصع اور مسجع غیر واقع نثر لکھی جاتی تھی۔ اردوئے معلیٰ انھیں جواھر بھرے خطوط کا مخزن ھے جس میں اس نئی ایجاد کا رنگ ھے۔ بعد طبع اردوئے معلیٰ چودھری عبدالغفور صاحب سرور مارھروی نے کہ حضرت غالب کے شاگرد تھے اور مرید حضرت صاحب عالم صاحب مولف کے نانا کے تھے ، وہ خطوط اردو حضرت غالب کے (صفحہ ۲۲۱) جو ان کے نام اور جناب نانا صاحب کے نام اور لوگوں کے نام آئے تھے ، جمع کر کے اس کا نام عود ھندی رکھا ، جن دنوں میں حضرت غالب کی ملازمت کو مارھرہ ھو کر دھلی گیا تھا ، وہ انشا مرتب ھو رہے تھے ، چنانچہ

اس مسودے کی نقل میں اپنے ساتھ بھی لایا تھا ۔ اب تو وہ کتاب چھپ گئی مگر میرے نام کے خطوط چونکہ بعد اس کے میرے پاس آگرے اور پٹنے میں آئے تھے ، وہ اس ترتیب میں داخل ہونے سے رہ گئے مگر ایک تقریظ رسالہ رشحات صفیر المشہور بہ فیض صفیر تانیث و تذکیر کی اس میں چھپی ہے ،...

۱۱ - صہبائی مولانا مولوی امام بخش ، دھلی کے آسمان ادب کے درخشندہ ستارے تھے ۔ اردو شاعری میں ان کی کوئی یادگار نہیں لیکن گلستان سخن کی نسبت معاصرین کا خیال تھا کہ صہبائی کی تالیف ہے ، دھلی کے اکثر ارباب علم و فن ان کی شاگردی کے سلسلے میں منسلک نظر آتے ھیں ۔ سرسید احمد خاں کے مخلص دوست تھے اور آثارالصنادید کی تالیف میں ان کی کافی مدد کی ؛ چنانچہ سر سید ان کا ذکر اس طرح کرتے ھیں ۔ (آثار الصنادید صفحات ۱۷۷ و ۱۸۰ طبع اول) :—

نسب آپ کا والد کی طرف سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ھے اور والدۂ مشفقہ کی جانب سے حضرت غوث‌الثقلین تک پہنچتا ھے.....اس جزو زماں میں ایسی جامعیت کے ساتھ کوئی کم نظر سے گزرا ھے اور طرفہ یہ ھے کہ فنون متعارفہ ، سخنوری مثل تحقیق لعت و اصطلاحات زبان دری اور تدقیق مقامات کتابی اور تکمیل عروض و قافیہ و استکمال فن معما وغیرھا میں ایسا کمال بہم پہنچایا ھے کہ ھر فن میں یک فنی کہنا چاھیے.....شروح کتب اور رسائل قواعد زبان فارسی اور رسائل علم عروض و قافیہ اور معما جو آپ کے ریختہ قلم نزاکت رقم ھیں..... ان کا تتبع بھی متعسر ، خصوصاً رسالہ گنجینہ..... ریزہ جواھر ، مدح بہادر شاہ میں سہ نثر ظہوری سے بہتر—اس سر جملۂ نیکو کارانِ آفاق اور راقم میں سررشتۂ محبت و اخلاص ایسا مستحکم ھے کہ گویا دو قالب میں ایک جان ساری ھے.....

مولوی کریم الدین کی تصویر کشی یہ ہے (تذکرہ طبقات شعرائے ہند، صفحات ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵):—

مولوی امام بخش صہبائی ساکن شاہ جہان آباد چیلوں کے کوچہ مین رہتے ھیں، ان کا حلیہ یہ ہے: قد میانہ، تمام سر پر بال، رنگ گندم‌گوں کھلا ھوا، دبلے پتلے منہ پر چیچک کے بھی داغ کہیں کہیں ھیں۔ شعر مجسم، فارسی میں بڑی دست قدرت رکھتے ھیں، ھمارے زمانے میں کتب فارسی سے مثل ان کے کوئی ماھر نہیں، ظرافت پسند، علم دوست، رات دن طلبا کو پڑھاتے ھیں، تمام کتب درسیہ پر عبور ہے، کتب عربیہ میں سے صرف و نحو اور معانی اور منطق بھی جانتے ھیں مگر بجز فارسی کے اردو شعر نہیں کہتے، عمر ان کی بالفعل اس سال یعنی ۱۲۶۱ ھجری میں قریب چالیس برس کے ھوگی۔ عبداللہ خاں[1] فارسی خواں جو شاھجہان آباد میں مشہور تھے، ان سے تحصیل فارسی کی اور کتب عربیہ بھی متفرق جائے پڑھی، طب میں بھی دست قدرت رکھتے ھیں، نفیسی وغیرہ پڑھا دیتے ھیں، علم معما اور عروض اور زبان فارسی اور قافیہ میں ان کو کمال ہے۔ ابتداء حال ان کا یہ ہے کہ معلم گری کیا

۱۔ علوی کا حال نواب صدیق حسن خاں شمع انجمن (مطبوعہ مطبع رئیس المطابع شاھجہانی بھوپال ۱۲۹۳ء صفحہ ۳۱۸) میں اس طرح لکھتے ھیں:- با علوی، مولوی عبداللہ‌خاں دراصل باشندہ مئو قائم گنج ضلع فرخ‌آباد بود و صاحب فضیلت و سخن دری خدا داد، مدتے دراز بہ شاہ جہاں آباد بسر برد وکسب علوم و فنون فرمود، شاگرد مولوی محمد اسمعیل شہید دھلوی است و تبعیت جہاد با سید احمد بریلوی مرحوم بجا آورد و در نظم و نثر شانے بلند و مکانتے ارجمند داشت و در فن طبابت دم عیسیٰ می نمود، امام بخش صہبائی دھلوی شاگرد اوست - بعد مراجعت از دھلی ملازمت از نواب سید محمد علی خاں بہادر شمس آبادی داماد وزیر صوبہ اودھ گزید و در سلک متوسلانش منخرط گردید، وفات اوھم در آنجا بہ عارضۂ تپ محرق اتفاق افتاد، بنیاد سخن فتاد است.....

کرتے تھے ۔ بعد مدت مدید کے جب ان کی محنت اور فارسیت دانی کا غلغلہ شاھجہان آباد میں بلند ہوا، چند جائے امیروں کے لڑکوں کی تعلیم پر مقرر ہوئے؛ چنانچہ گڑ والوں میں اور بعض متمول کشمیریوں میں چند جائے متفرق ان کے وقت تقسیم ہوئے ، درس دینا اور خرچ ما یحتاج اپنا سب جائے سے تنخواہ پا کر کرنا شروع کیا ، رفتہ رفتہ نواب حامد علیخاں بہادر کی سرکار میں ان کے لڑکوں کے پڑھانے کے واسطے مامور ہوئے ۔ جس سال میں کہ لفٹنٹ گورنر بہادر یعنی طامسن صاحب جوکہ عالم کامل اور قدر شناس اہل علوم کے ھیں ، شاہ جہان آباد میں واسطے بندوبست مدرسے کے آئے ، اچھا مدرسوں کا معہ طلباء کے امتحان لے کر یہ تجویز کی کہ ایک مدرس فارسی مدرسے کے واسطے اچھا مستعد مقرر کرنا چاھیے ۔ شاہ جہان آباد میں سے لوگوں کی تلاش ہوئی ، مفتی صدرالدین خاں بہادر نے جو ھمارے زمانے میں شاہ جہاں آباد کے صدرالصدور ھیں ، جناب طامسن بہادر کی خدمت میں یہ عرض کی کہ اس شہر میں اچھے فارسی دان تین شخص منتخب روزگار ھیں : ایک مرزا نوشہ صاحب ، دوسرے مولوی امام بخش صاحب ، تیسرے حکیم محمد مومن خاں ۔ لفٹنٹ گورنر بہادر نے تینوں کو بلوایا ، مرزا نوشہ صاحب نے بسبب اس کے کہ نوکری سے مستغنی تھے ، انکار کیا، حکیم محمد مومن خاں صاحب نے درخواست ایک سو روپیہ ماھواری تنخواہ کی کی ، مولوی امام بخش صاحب نے چونکہ کسی طرح کا وسیلہ بجز روزگار کے ، وجہ معیشت نہ رکھتے تھے ، حسب خواھش لفٹنٹ گورنر بہادر کے حکم اجابت کی ، چالیس روپیہ ماھواری ان کے واسطے مقرر ہوا ؛ مدرس اول فارسی خوانوں کے مقرر ہوئے ، ۱۸۴۰ء میں درس تدریس کرنے لگے ، کیوں کہ وہ شخص اسی عہدے کے قابل تھا ۔ بعد ایک عرصے کے پچاس روپیہ تنخواہ ہوگئی، ھنوز وھی تنخواہ پاتے ھیں، شاھجہان آباد کے مدرسے میں پڑھاتے رھتے ھیں ۔ بموجب حکم لٹریری سوسائیٹی کے کتاب حدائق البلاغة کا ترجمہ جو اصل میں شمش الدین فقیر کی تصنیف ہے، اردو میں اس شخص نے بہت اچھا کیا ہے ۔ جلوہ داغ مولفہ احسن مارہروی (صفحات ۱۴، ۱۵، ۱۹۰۲ء)

مرزا صاحب فرماتے تھے کہ ایک مرتبہ محلہ زینت باڑی میں مشاعرہ ہوا ، گیسو اپنا ، جادو اپنا ، اسی ردیف و قافیے میں مصرع طرح دیا گیا - مولوی امام بخش صہبائی کا زمانہ تھا ، میں بھی غزل کہ کر لے گیا ، جب میں نے یہ مقطع پڑھا کہ -

لگ گئی چپ تجھے اے داغ حزیں کیوں ایسی
مجھ کو کچھ حال تو ، کمبخت بتا ، تو اپنا

اس کو سنتے ہی آفریں صد آفریں کہتے ہوئے حضرت صہبائی اٹھے اور گلے سے لگا لیا -

یادگار غالب میں (صفحہ ۱۸۲) حالی غالب اور صہبائی معاصرت کا حال اس طرح لکھتے ہیں :-

صہبائی اور علوی بھی چونکہ مرزا بیدل کا تتبع کرتے تھے اور مرزا غالب نے اس طریقے کو بالکل چھوڑ دیا تھا اس لیے وہ مرزا کو اور مرزا ان کو کم مانتے تھے .... مشاعروں میں اکثر ایک دوسرے سے مٹ بھیڑ ہوتی رہتی تھی، مرزا کو اپنے خیالات کی اور اپنے اشعار کی تہذیب و تنقیح میں زیادہ کوشش کرنی پڑتی تھی اور یہی ان کی اصلی ترقی کی بنیاد تھی -

مؤلف گلستان سخن (صفحہ ۳۳۳) بھی صہبائی کے شاگرد تھے اور گلستان سخن کی ترتیب میں بقول صابر ، صہبائی نے مدد دی تھی - نمونہ کلام میں فارسی کلام پیش کیا ہے :-

منکر کفر مشو گر سر ایماں داری
کعبہ یک پارۂ سنگ است ز بتخانۂ ما
بمیرتم که چو از من بمرگ راضی نیست
بزندگانی دشمن چگونه خرسند است

مؤلف جلوہ خضر (ج-۱ صفحات ۲۱۷، ۲۱۸) کی رائے ہے :-

یہ بزرگ آخر زمانے میں خان آرزو کا مذاق رکھتے تھے، بہت سی کتابیں قواعد فارسی اور اردو میں اور عروض و قافیے میں لکھی ہیں اور اور حدائق البلاغت کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے.....قول فیصل بہت مدلل لکھا ہے اور مینا بازار اور پنج رقعہ کی شرح ...اور بہت فوائد آمیز رسالے تحریر کیے ہیں، کلیات ان کا تین جلدوں میں چھپ کر شائع ہوا ہے، معمے کا بہت شوق تھا، اردو کلام ان کا بجز اس کے بعض جگہ ترجمہ حدائق البلاغت میں ہے اورھاتھ نہ آیا۔

صہبائی کا فیضان اردو شعرا تک پہنچا ہے اس لیے ان کا ذکر ضروری ہے ؛ چنانچہ مولوی کریم الدین مولف تذکرہ شعرائے ہند کے همراہ صہبائی مومن کے باس پہنچے اور ان کے مشاعرے میں جانے کی اس طرح سفارش کرتے ہیں :-

(صفحات ۱۵م، ۱۶م بہادر شاہ ظفر از رئیس احمد جعفری)

حکیم صاحب (مومن) ہماری طرف متوجہ ہوئے کہنے لگے ''ارے بھائی صہبائی! تم تو کئی دن سے نہیں آئے، کہو خیریت سے تو ہو اور آپ کے یہ کون ہیں ؟'' مولوی صہبائی نے کہا ''یہ پہلے کالج میں میرے شاگرد تھے اب مطبع کھول لیا اور وہاں مشاعرہ کرنا چاہتے ہیں، آپ کو تکلیف دینے آئے ہیں ''۔ حکیم صاحب نے ہنس کر کہا '' بس مجھے معاف ہی کیجیے، اب دہلی کے مشاعرے شریفوں کے جانے کے قابل نہیں رہے۔ ایک صاحب ہیں جو اپنی امت کو لے کر چڑھ آتے ہیں، شعر سمجھنے کی تو کسی کو تمیز نہیں، مفت میں واہ واہ اور سبحان اللہ کا غل مچا کر طبیعت کو منغض کر دیتے ہیں ''۔

اس سے اردو مشاعروں میں ان کی دلچسپی ظاھر ہوتی ہے، نیز اکثر شاگرد صہبائی کے اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شاعری کرتے تھے، وہ دلی کے بزم ادب کے نو رتن تھے ۔

۱۲ - ظفر - ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ ثانی ۲۸ شعبان ۱۱۸۹ھ کو کو پیدا ہوئے[1]۔ اردو شاعری کے دور متاخرین کے اردو شعرا کسی نہ نہ کسی طرح ظفر سے وابستہ رہے ہیں اس لیے ظفر کے بغیر کوئی بزم سخن بھی مکمل نہ ہو سکے گی - ظفر نے میر، سودا، درد و قائم کے شاگردوں کے معرکے دلّی میں دیکھے، شاہ عالم اس کے دادا (آفتاب تخلص) فدائے ادب تھے، باپ کو بھی اکبر شاہ ثانی (ذرہ تخلص) شعر و سخن سے دلچسپی تھی - ظفر نے جب ہوش سنبھالا تو قلعۂ معلیٰ میں بزم سخن برپا تھی اس لیے شاعری سے وابستگی پیدا ہو گئی - ۱۲۲۱ھ میں صاحب مجموعۂ نغز (صفحات ۳۷۲، ۳۷۳) نے ان کی شاعری کا بیان کیا، ہے اس وقت شاہ عالم زندہ تھے -

مرزا ابوالمظفر بہادر خلف الصدق مرشد زادہ ولی عہد والا جاہ مرزا اکبر شاہ بہادر است ... بہ تہذیب اخلاق حمیدہ خیلے مہذب و بہ تادیب آداب پسندیدہ بہ غایت مؤدب.....، خوش طبع صاحب وضع...شعرے کہ از طبع دربار جناب ایشاں می تراود لولوئے باشد لاء لاء سخنے کہ از فکر صائب حضرت شاں بر سر آرد درے باشد یکسر صفا و سر بسر بہا شوق ایں فن شریف بسیار در سر دارند و اکثرے از اوقات ہایوں بہ سخن سازی و نکتہ پردازی ہمت می گمارند اگرچہ دریائے ریختہ طبع صافی خویش کم و بیش گاہ گاہ بہ بعضے جوہریاں جوہر شناس می نمائند اما از برخوردار کامگار میر عزت اللہ عشق مد عمرہ و زاد قدرہ، کہ ارثاً سر رشتۂ استادی ایں دودمان عالی شان دارد و اکثر استشارہ می فرمائند -

---

۱ - مجمع السلاطین (صفحہ ۳۱ مطبوعہ بمبی ۱۲۷۲ھ) میں محتشم الدولہ غوث محمد خاں نواب جاورہ لکھتے ہیں :-

ولادت بست ہشتم شعبان ۱۱۸۹ھ روز شنبہ از بطن لعل بائی در قلعہ شاہجہان آباد سال جلوس بست و ہشتم جمادی الثانی ۱۲۵۳ھ تا تحریر سنہ ہذا سلامت باکرامت اند و تا حال نوزدہ سال مدت سلطنت -

شیفتہ نے جب گلشن بیخار (۱۲۴۸ھ تا ۱۲۵۰ھ) لکھا، اس وقت اکبر شاہ ثانی شاہ اور ظفر ولی عہد سلطنت تھے۔ شیفتہ (صفحہ ۱۲۹) نے اصل کلام پر رائے نہیں دی بلکہ اخلاق فضائل اور خوشنویشی کی تعریف کی ہے، ذوق سے اصلاح کا ذکر ہے لیکن کلام کی روش بدلی ہوئی ہے۔ قاسم نے جو کلام نمونے کے طور پر پیش کیا ہے، اس کا رنگ متاخرین شعرا سے ملتا ہے، کہیں کہیں درد کا رنگ بھی جھلکتا ہے، جرأت اور رنگین کی جھلک ایک غزل میں نظر آتی ہے، ایک غزل سے شاہ نصیر کا اثر نمایاں ہوتا ہے:

دیکھے ہے سدا جلوہ قدرت کا تماشا
جوں آئینہ وا کیوں ہو چشم پر طاؤس

میر کی روش پر بھی چلنے کی کوشش کی ہے!

ان کی شکلیں خاک و خوں میں آہ رلیاں دیکھیاں
رنگ محلوں میں جنھوں نے رنگ رلیاں دیکھیاں

اس لیے قاسم کا یہ کہنا صحیح ہے کہ کلام بعض جو مبصرین کو دکھاتے ہیں اور اکثر عشق سے مشورہ کرتے ہیں، ان مبصرین نامعلوم الاسم میں شاہ نصیر عبدالرحمٰن احسان اور نظام الدین ممنون وغیرہ بھی ہوسکتے ہیں۔

ذوق کا اثر ان اشعار سے واضح ہوتا ہے جو شیفتہ نے پیش کیے ہیں:—

ہمارے آگے ہی ذکر اگلے دوست داروں کا
پرانے مُردوں کی وہ ہڈیاں اکھاڑتے ہیں
دل دے کے ان کو ایسی اذیّت ہوئی ہمیں
اب دل کبھی نہ دیں گے نصیحت ہوئی ہمیں
تیس دن وعدے پہ غرّے کے پھراتا ہے مجھے
جب ہوا چاند تو غرّہ ہی بتاتا ہے مجھے

نساخ لکھتے ہیں (صفحہ ۳۰۷ سخن شعرا) :

ظفر۔پادشاہ دہلی ، شاگرد نصیر دہلوی و محمد ابراہیم ذوق ، بعد غدر[1] نوے برس کی عمر میں بارہ سو اناسی ہجری میں رنگون میں انتقال کیا، اکثر خطوط کو اچھی طرح سے لکھتے تھے ، شعر نہایت شیریں و نمکین کہتے تھے، چار دیوان ان کے نظر سے گزرے۔

صاحب طور کلیم کا قول ہے (صفحہ ۶۷) :۔

کہ شاہ نصیر سے اصلاح لیتا تھا ، پھر خاقانی ہند ذوق کی شاگردی اختیار کی اور ذوق کے انتقال پر غالب سے مشورہ کیا ، انتخاب کی فرصت نہ تھی، تذکروں سے کلام لیا۔

لیکن بزم سخن کے مولف نے واضع رائے لکھی ہے (صفحہ ۸۲) :۔

کلام میں بلند درجہ ہے سادہ اور پر کار ، محاورہ گوئی اور معاملہ بندی پر قدرت کاملہ حاصل ، شاہ نصیر اور ذوق سے اصلاح لی اور کچھ مدت غالب سے ۔ صاحب گل رعنا (صفحہ ۲۹۳ طبع سوم) کی رائے ہے :۔

ان دونوں (ذوق ، ظفر) کو پڑھو اور ہر ایک کے انداز سخن پر غور کرو تو پھر اسی فطرت سلیم سے فتویٰ لو ، دونوں کی حیثیتیں جداگانہ نظر آئیں گی ، ذوق پھر بھی ذوق ہیں ، ظفر کے استاد ، ان کے کلام کی رنگینی ، ترکیب کی چستی ، مضمون کی بندش ، جوش و خروش ، ان کی باتیں ان کے ساتھ ہیں ۔ ظفر کے یاں جو سامان نظر آئے گا وہ اس سے

---

۱ - ادب اردو جلد ۳ نمبر ۱ جنوری تا مارچ ۱۹۵۲ء - تلامذہ غالب - از مالک رام ایم - اے - لکھتے ہیں "۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء کو اکبر ثانی فوت ہوئے ، ظفر تخت نشین ، بعد غدر جلا وطن رنگون میں ۱۸۵۸ء میں پہنچے، ۷ نومبر ۱۸۶۲ء بعارضہ فالج فوت ہوئے ، اصلاح میاں نصیر سے ، ان کے دکن جانے پر میر کاظم حسین بے قرار سے ، ۱۸۰۸ء میں بیقرار میر منشی رزیڈنٹ ہوئے تو ذوق استاد ہوئے چار روپیہ تنخواہ...."

ملتا جلتا ہوگا اور ہونا بھی چاہیے کیوں کہ استاد کا رنگ شاگرد میں آنا ضرور ہے مگر پھر بھی وہ دوسری طرح کا ہوگا؛ محاوروں کی فراوانی یہاں زیادہ ملے گی مگر جوش و خروش کی جگہ دل و جگر کے ٹکڑے حروف و الفاظ بن کر آنسوؤں کی سیاہی اور آہ جگر دوز کے قلم کے لکھے ہوئے تم کو ملیں گے، اب انہیں ظفر کا سمجھو یا ذوق کا ۔ ۱۲۷۱ھ میں جب شیخ ابراہیم ذوق کا انتقال ہو گیا تو مرزا نوشہ غالب کے متعلق یہ خدمت ہو گئی تھی ۔ مولانا حالی نے یادگار غالب میں جہاں اس کا ذکر کیا ہے وہاں انہوں نے بھی بجائے ذوق کے غالب کے متعلق ناظر حسین مرزا کی زبانی آزاد کے اسی مضمون کو دھرا دیا ہے مگر مقدمۂ دیوان حالی میں ایک موقع پر ذوق و ظفر کے کلام میں قریب قریب اسی طرح کا فرق بیان کیا ہے جو میں نے لکھا ہے :—

وہ کہتے ہیں کہ ذوق کی غزلوں میں عموماً زبان کا چٹخارہ اپنے معاصرین کی زبان سے زیادہ ہے مگر وہ جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں صفائی سے بہت دور جا پڑتے ہیں، ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں اول سے آخر تک یکساں ہے لیکن اس میں تازگیٔ خیالات بہت کم پائی جاتی ہے ۔

اس بحث کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ظفر کی کمزوری صحیح اور ان کے ساتھ اساتذہ کی کاوش فکر مسلّم مگر اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کی ساری عمر کی محنت پر پانی پھیر کر استاد ذوق کو ان کے دیوانوں کا مالک بنا دیا جائے ۔

اس بد نصیب بادشاہ کی ساری زندگی رہتے جھیکتے گزری ، دلوں کے ارمان دل ہی میں رہے ، سلطنت کا خواب جو دیکھا تھا اس کی تعبیر یوں ظاہر ہوئی کہ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد قلعۂ معلیٰ سے بھی نکال کر رنگون پھینک

دیے گئے۔۔۔جوان جوان بیٹے اور پوتے اُن کی آنکھوں کے سامنے کھڑے کر کر کے گولی مار دیے گئے، طوق و سلاسل اور خدا جانے کیا کیا جو کچھ بھی اس منحوس شاعری کی بدولت اُن کو ہوس ہوتی ہوگی، وہ سب نکل گئی اور جتنے دنوں کی زندگی تھی، رنگون کے بلا خانے میں بے کسی و بے بسی کے ساتھ پوری کر کے ۱۲۷۹ھ میں پیوند خاک ہو گئے۔ اب کوئی یہ بھی نہیں جانتا (معلوم ہو چکا) کہ اُن کو گور و کفن ملا بھی یا نہیں، لیکن میں مذکورہ بالا رائے سے متفق نہیں؛ ظفر نے ذوق کو بھی رنگِ سخن بدلنے پر مجبور کیا جیسا کہ ذوق کے حالات میں آزاد مرحوم نے (آبِ حیات) لکھا ہے کہ مرزا ابو ظفر جوان تھے، وہ جرأت کے انداز کو پسند کرتے تھے، اُن کی غزلیں جرأت کے رنگ میں بناتے تھے (معروف کی غزلیں درد کے رنگ میں بناتے، ذوق کا اپنا رجحان طبع سودا کی جانب تھا)، نتیجہ اُس کا یہ ہوا کہ خود اُن کی غزل آخیر کو ایک گلدستہ گلہائے رنگا رنگ کا ہوتی تھی؛ دو تین شعر بلند خیالی کے، ایک دو تصوف کے، دو تین معاملے کے۔

ظفر مبتدیوں کی ہمت افزائی بھی کرتے تھے؛ چنانچہ داغ دہلوی کی روایت ہے (جلوۂ داغ صفحات ۱۵ و ۱۶):—

ایک مرتبہ نجم الدولہ حضرت غالب مرحوم نے 'قلم نکلے'، 'دم نکلے'، 'ہم نکلے'، اس ردیف و قافیے میں بڑے زور کی غزل کہی، اتفاقاً یہی طرح قلعے کے مشاعرے میں دی گئی۔ مرزا صاحب فرماتے تھے کہ شب مشاعرہ میرے پاس مصرع طرح پہنچا، میں نے غزل کہی، اُستاد کو دیوان خاص میں سنائی، اُنھوں نے غزل کو سن کر فرمایا کہ خاصے شعر ہیں، اتنے میں بادشاہ تشریف لے آئے اور مشاعرہ شروع ہو گیا۔ میں نے بھی اپنے نمبر سے غزل شروع کی، جب یہ شعر پڑھا:—

ہوئے مغرور وہ جب مری آہ بے اثر دیکھی
کسی کا اس طرح یا رب نہ دنیا میں بھرم نکلے

یہ شعر سن کر بادشاہ نے اپنے پاس بلایا اور پیشانی پر بوسہ دیا۔

(اسی طرح ظہیر دہلوی نے ظفر کی ہمت افزائی کا واقعہ لکھا ہے) :—

نثار علی شہرت (شاگرد شیفتہ و قلق میرٹھی) مؤلف سوانح عمری داغ المعروف بہ آئینہ داغ جلد اول (صفحہ ۱۰ مطبوعہ اسلامیہ پریس ۱۹۰۵ء) میں اسی مشاعرے کی اپنی غزل کا واقعہ لکھتے ہیں: نثار علی شہرت خلف حسین علی فرحت کی پیشی مشاعرۂ ظفر میں ایک ساتھ ہی ہوئی، پہلے غالب نے غزل پڑھی پھر ذوق نے، اُن کے بعد دو تین اَور شاعروں نے، پھر داغ نے دس بارہ شعر پڑھے جس میں سے یہ یاد ہے (مذکورہ بالا شعر)۔ جب داغ نے غزل تمام کی تو جہاں پناہ نے فرمایا ''کیا اچھی طبیعت پائی ہے'' پھر نواب الٰہی بخش خاں نے کہا ''یہ لڑکا برادر حسین علی فرحت کا ہے، اگر حکم عالی ہو تو یہ بھی پڑھے''، اجازت دی :—

کہاں جائیں کدھر جائیں نہیں بنتی کہیں اپنی
کبھی ہم دیر سے بھاگے، کبھی کعبے سے ہم نکلے

حضور نے فرمایا الحمدللہ.... میں نے والد سے آ کر کہا۔ انھوں نے کہا ایسی جرأت نہیں چاہیے۔

حکیم قدرت اللہ خاں قاسم اور ان کے فرزند حکیم عزت اللہ خاں عشق، نواب الٰہی بخش معروف اپنی شاعری کے لحاظ سے بلند شعرا میں ہیں لیکن ان کی شاعری کا اثر مومن و غالب وغیرہ پر نہ ہو سکا اس لیے ان کا ذکر تفصیلاً مناسب نہیں، ہاں اودھ کے چند شعرا کا تذکرہ بے جا نہ ہوگا جن کی شاعری کا چرچا دہلی تک پھیلا اور شعرائے دہلی ان سے متاثر بھی ہوئے۔

۱۳۔ مصحفی تخلص، غلام ہمدانی نام، ولادت کے مقام میں اختلاف ہے؛ مولوی عبدالقادر خاں نے اپنے روز نامچے (۹۰ الف) میں مصحفی کا بیان کردہ مقام بلم گڑھ نواح دہلی کا علاقہ بتایا ہے اور میر حسن کے بقول موضع اکبر پور (امروہہ) ہے۔ مبتلا گلشن سخن (۹۱ ب) میں کہتا ہے کہ شرفائے امروہہ سے

ہے (دستورالفصاحت حاشیہ صفحہ ۹۳ از عرشی صاحب) ۔ یہ بات صحیح ہے کہ مصحفی نے ابتدائی تعلیم و تربیت امروہے میں پائی جیسا کہ مصحفی نثار اور محزون کے حالات میں لکھتے ہیں (تذکرۂ ہندی صفحہ ۲۲۷)۔ (خلاصہ طبقات الشعرأ ، قدرت اللہ شوق صفحہ ۱۴۱) شوق لکھتے ہیں ''متوطن شاہ درہ مقیم لکھنؤ ۔ عالم شاہ پیرزادہ محزوں تخلص ، ساکن قصبہ امروھہ، جس زمانے میں کہ میں مکتب نشین تھا ، امروھے میں شاعری میں شہرت رکھتا تھا ، محرم کے مہینے میں مرثیہ اور سلام بھی کہتا تھا اور پڑھتا تھا ، دو تین شعر اس کے یاد ہیں ۔

نثار (میر عبدالرسول صفحہ ۲۵۴ تذکرہ ہندی) کے متعلق لکھتے ہیں کہ فقیر نے آسے ابتدائے شاعری میں قصبۂ امروھہ میں دیکھا تھا ، اکثر ہفتہ عشرہ کے بعد ملاقات ہو جاتی تھی اور شاعری کا ذکر درمیان میں آتا تھا ۔ میر اور مرزا کے معاصرین میں سے بہترین شاعر آسے میں نے پایا (دیباچہ دیوان ششم بر تولد من در احمد شاہی است ، تاالیوم عمرم از شصت متجاوز خواھد بود ۱۲۲۴ھ) در بلدۂ لکھنؤ تحریر یافت عمر آس کی ساٹھ برس ہوگی ، اب پتا نہیں زندہ ہے یا مردہ ۔

سال ولادت تخمیناً ۱۱۶۱ھ ہے، مصحفی نے احمد شاہ کے عہد میں اپنی ولادت ظاہر کی ہے۔ بقول مصحفی (تذکرۂ ہندی صفحات ۲۴۷، ۲۴۸) آس کے بزرگ خوشحال اور شاہی ملازمت پیشہ تھے۔ جس زمانے میں کہ انتظام سلطنت میں خلل پیدا ہوا ، مصحفی کا گھر بھی تباہ ہو گیا لیکن مصحفی نے یہ خوشحالی کا[1] دور نہ دیکھا ؛ آغاز شباب میں تحصیل علم میں مصروف ہوا اور کتب درسیہ فارسی کی تکمیل تیئیس سال کی عمر میں کر کے اردو شاعری کی طرف متوجہ

---

۱ - ریاض الفصحا صفحہ ۲۸۷، تکمیل فارسی و نظم و نثرآں بہ شاھجہان آباد درس سالگی بخوبی میسر آمدہ بود.....

ہوا ۔ آغاز جوانی میں دہلی آیا اور دہلی کے مشاعروں میں شرکت کی، خود بھی اپنے مکان پر مشاعرے کیے ۔ ۱۱۸۵ھ کے متصل روہیل کھنڈ کا سفر کیا، کچھ مہینے یہاں نواب محمد یار خاں امیر کی مصاحبت کی اور قائم سے نیاز حاصل کیا ۔ ضابطہ خاں پر جس وقت ذی قعدہ ۱۱۸۵ھ میں فوج کشی شاہ عالم نے کی اور یہ خبر روہیل کھنڈ میں پھیلی تو یہ مجلس شعر و سخن برہم ہو گئی اور مصحفی یہاں سے اودھ پہنچے، سودا سے ملاقات کی لیکن اس کی خود نمائی سے ناراض ہو گئے، دہلی آئے اور بقول خود بارہ سال نجف خاں کے دور میں عزلت میں گزار دیے اس زمانے میں عربی کی تحصیل بھی کی ۔

۱۱۹۸ھ[1] میں اودھ آئے اور یہیں رہ پڑے اور عربی کی تحصیل کی، مرزا سلیمان شکوہ دہلی پہنچے اور شعرا کا مجمع ہوا تو یہ بھی درباری شعرا میں داخل ہو گئے لیکن انشا نے چھیڑ چھاڑ کی اور ادبی بحث جدال و قتال تک پہنچی، مرزا سلیمان شکوہ نے انشا کا ساتھ دیا اس لیے مصحفی نے اس ذلت کو محسوس کیا ۔ لکھنؤ میں مختلف علمی مجلسیں قائم ہوئیں اور مصحفی

---

۱ - عقد ثریا (صفحات ۱۳، ۱۴) بیتاب ۔ محمد حیات نام دارد، شاگرد رائے شرپ سنگھ دیوانہ مولدش خطۂ بلگرام است ۔ در ایامے کہ فقیر ہمراہ غلام علی خاں ولد بھکاری خاں کہ مشاور الیہ از پیش گاہ خلاف جہاں بانی خلعت نوازش شاہانہ برائے بندگان عالی وزیر الممالک نواب آصف الدولہ بہادر و سر ہشٹن گورنر بہادر آوردہ بود در سنہ یک ہزار و یک صد و نود و ہشت صعوبت سفر کشیدہ از شاہجہاں‌آباد در لکھنؤ رسیدہ و بعد چندے بسبب برہمیٔ مزاج کہ تفصیل آں قضیہ دور دراز است ازو جدا شدہ خواستم کہ ہمراہ قافلۂ شاہجہاں آباد عطف عناں کنم مرزا محمد حسین قتیل کہ دراں روزہا نوکر نواب بود نظر بر سوابق آشنائی نمودہ ۔ مرا ازیں ارادہ باز داشتہ ۔ گفت گر برائے بادیہ پیمائی آمدہ بودید حالا چندے باشید و سیر ایں معمورہ ہم کنم القصہ بہ مکان مشار الیہ برد تا رخت سفر را کشادہ فروکش گردیدم بسیار بخلق و تواضع پیش آمد ۔

نے ہر ایک بزم میں قریب قریب حصہ لیا ، ذرائع معاش درس و تدریس اور شاعری پر رہا ۔ چنانچہ مولوی عبدالقادر خاں رام پوری نے ۱۲۲۹ھ میں جب ملاقات کی تو سبق پڑھانے میں مصروف تھے ۔ مصحفی نے اودھ کی شاعری کے بگڑے مذاق کو سدھارنے میں بڑی کوشش کی ، جس سر زمین میں میر اور سودا کا چراغ نہ جل سکا تھا ، وھاں مصحفی نے شمع روشن کی ۔ خواجہ حیدر علی آتش اس کے شاگرد رشید تھے اور ناسخ[1] شیخ محمد عیسیٰ تنہا (متوفی ۱۲۲۲ھ) کے ذریعے فیض یاب ہوئے تھے ۔ ناسخ نے براہ راست استفادہ مصحفی سے نہیں کیا لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ناسخ کے بگڑے ہوئے مذاق سخن کو سدھارنے میں مصحفی کا کلام بڑا کامیاب رہا ۔ کلیات مصحفی کے ایک نسخے (مملوکہ پنجاب یونیورسٹی) میں کسی ہمدرد یا شاگرد نے مصحفی کے معاصروں سے جھگڑے کا تذکرہ فاتحانہ انداز میں کیا ہے (یہ الحاقی عبارت کلیات میں اور کہیں بھی ہوگی ، میں نے سرسری ورق گردانی کی تھی ، آغاز صفحہ ۲۴۲ کلیات مصحفی ضخیم نسخہ مجلد) :—

دیگر در مدح . . . اعنی مولانا مصحفی شاعر شاعریست فصیحیست کہ تا امرءالقیس بحلقۂ شاگردانش زانوائے ادب تہ نہ کردہ ... میر تقی میر را باوجود تقدم زمانی ازو کبیدگئی خاطر بہم رسیدہ امّا او بے گناہ و شاہ ظہورالدّین

---

۱ ۔ حیات مصحفی از امیر احمد علوی رسالہ نگار مصحفی نمبر ۱۹۳۹ء صفحہ ۹۴ دیباچہ دیوان ششم مصحفی میں ہے :— در ایامے کہ فقیر بہ سبب کساد بازاری متاع گراں بہائے کلام فارسی بہ مقتضائے رواج زمانہ خود را مصروف بہ این شغل بے نظیر ریختہ داشت عالمے از حسد جامہ در خم نیل زدند، و جمع کور باطن منغض شدہ گاہے کہ پنجہ افگندند، پیش نہ بردند پس از انقضاے ایام چند چوں سلسلۂ موزونیت دراز کشید حصۂ نعمت الوان این خوان بہ شیخ ناسخ کہ یکے از دوستاں محمد عیسیٰ تنہا است و بہ فقیر ہم رسوخ از تہ دل دادر مقسوم گشت ۔ تخلص خود را اسم با مسمیٰ انگاشتہ بر طرز ریختہ گویان سادہ کلام در عرصہ قلیل خط نسخ کشیدہ و از قفائش بر قدم او خواجہ حیدر علی آتش ہم در رسیدہ سمند تیزگام خیال را از دائرہ چرخ اثیر بیروں برد ۔

حاتم کہ ابوالبشر ریختہ گویاں گذشتہ علیٰ رؤس الاشہاد مداح شعرش در دهلی بوده ، خدا گواه لاله ذوق رام حسرت ز حسرت فارسی گوئیش مردہ و قتیل المسمیٰ بہ ''محمد حسن'' خجرِ حسدهم کاریش بردل خوردہ۔ حسرت ریختہ گو بیک حرف از رشکش فقیر گردیده چوں فریدالدّین عطار دوکان عطارئی خود را برباد داده ، جرأت شاگرد همتایش چند بار قدم به عرصۂ مکابره اش گذاشته اما چوں معاویہؓ از علیؓ شکست ہائے فاحشہ خورده آخر از حسد قالب تہی کرده بخاک سیه برابر شده ، انشاء اللہ خاں بایں تسخر و طمطراق نه شنیدی که از دست و زبان شاگردانش چه دید و چه شنید و مرزا قاخر مکین به گوشت نرسیده که از مطالعۂ غزل در بعض مقام خود نسخه رسانیده اش چه بر خود پیچید ، حق تعالیٰ ذات با برکاتش را دیر گاه سلامت دارد۔

یہ مدح ۱۲۲۴ھ جرأت کے انتقال کے بعد لکھی گئی ہے، قتیل اور انشا اس وقت زندہ تھے، اجمالاً مصحفی سے تمام اساتذۂ فن کے جھگڑوں کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔

قاسم لکھتے ہیں (صفحات ۱۸۸ و ۱۸۹ مجموعہ نغز ج-۲) :-

کہ بیرونی لوگوں میں سے ہے لیکن اپنے بزرگوں کی ملازمت کے تعلق کی وجہ سے اپنے آپ بچپن سے دهلی آیا اور یہیں نشو و نما پائی ہے۔ متواضع خلیق، مہذب ، خندہ پیشانی ، پاکیزہ سیرت ہے ، کتب متداولہ نظم و نثر پر اچھی نظر ہے، دونوں زبانوں اردو اور فارسی میں شاعری کرتا ہے۔ ایک فارسی دیوان (مصحفی نے دو دیوانوں کا ذکر کیا ہے، ایک چوری گیا) اور تین اردو دیوان (آٹھ اردو دیوان ہیں) اور اردو فارسی شعرأ کے دو تذکرے (عقد ثریا ، تذکرۂ فارسی گو شعرأ ، تذکرۂ هندی ، تذکرۂ ریاضی الفصحا ، اردو شعرا) لکھے ہیں۔ مدت سے لکھنؤ میں مقیم ہے اور وهاں علم آستادی بلند کیا ہے، مرزا سلیمان شکوہ کی تعریف میں چند قصیدے کہے اور داد شاعری دی ہے۔ دهلی کے قیام کے زمانے میں چند مشاعرے بھی کیے ، میرے ساتھ

بھی مشاعرے میں بڑی انسانیت اور مروت سے پیش آتا ہے ، خدا اسے خوش اور سلامت رکھے !

یہ ایسے شخص نے تعریف کی ہے جس کے قلم سے کم لوگ محفوظ رہے ہیں ، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصحفی بہت حلیم الطبع اور ملنسار تھے -

شیفتہ کی تحریر ہے (گلشن بے خار صفحات ۱۷۷ و ۱۷۸) :—

کہ اس کی اصل قصبۂ امروهه ہے، آغاز جوانی میں دهلی آ کر اقامت کی ، آخر میں لکھنؤ گیا اور آخر عمر تک (۱۲۴۰ھ) وهیں رها - اس کی وفات کو دس سال ہو چکے ہیں ، بڑی لمبی عمر پائی - اس کی ابتدا سودا کے آخری عہد میں ہوئی، جرات اور انشاء سے مقابلے رہے- چھ دیوان ریختہ (آٹھ) کے اور دو تذکرے لکھے، فارسی میں ایک تذکرہ اور ایک دیوان ہے- قوت مشق کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مشرق کے شہروں میں وہ استادی میں مشہور تھا اور وہاں کے اکثر شاعروں نے اس سے استفادہ کیا- اگرچہ بسیارگو شاعروں کی مانند اس کا اکثر کلام کم رتبہ اور لطافت سے خالی ہے لیکن منتخب اشعار بہت اعلیٰ ہیں -

نساخ کی رائے میں (سخن شعرا صفحہ ۴۴۰) اشعار آب دار اور عاشقانہ ہیں -

صاحب طور کلیم (صفحہ ۹۱) کے نزدیک تمام اصناف سخن پر قدرت رکھتا تھا اور اس کے منتخب اشعار شرر انگیز ہیں اور بزم سخن کے مولف کے خیال میں (صفحات ۱۰۴ ، ۱۰۵) ایک جہاں اس سے مستفیض تھا ، تمام اصناف سخن میں یدطولیٰ حاصل تھا ، ریختہ میں فکر بلیغ نصیب تھی ، فارسی میں بھی شاعری کرتے تھے-

صاحب گل رعنا (صفحہ ۲۲۰) اس طرح رقم طراز ہیں :—

ان کی ہمہ گیر طبیعت نے کسی خاص رنگ پر قناعت نہیں کی ، ان کے کلام میں کہیں میر درد کا رنگ ہے، کہیں سودا کا انداز ، کہیں سوز کی سادگی اور جہاں کہیں اُن کی کہنہ مشقی اور اُستادی اپنے پیشرو اساتذہ کی خوبیوں کو یکجا کر دیتی ہے تو وہ اردو شاعری کے بہترین نمونے قرار دیے جا سکتے ہیں۔ اس مجموعی حیثیت سے بقول حسرت موہانی میر و مرزا کے بعد کوئی اُستاد ان کے مقابلے میں نہیں جنچتا اور یہ اپنے ہم عصروں میں سب سے برتر اور فائق نظر آتے ہیں ۔ آزاد نے بھی آبِ حیات میں اس کو تسلیم کیا ہے کہ یہ اصول فن سے بال برابر سرکتے نہ تھے ، کلام پر قدرت کامل پائی تھی، الفاظ کو پس و پیش اور مضمون کو کم و بیش کر کے اس در و بست سے شعر میں کھپاتے تھے کہ جو حق اُستادی کا ہے ، ادا ہو جاتا تھا ، ساتھ اس کے اصل محاورے کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ ایسے موقعوں پر کچھ سودا کا سایہ پڑتا ہے ، جہاں سادگی ہے وہاں معلوم ہوتا ہے کہ میر سوز کے انداز پر چلتے ہیں ۔

مگر باوجود اس کے افسوس ہے کہ آزاد نے انشا کو جا بجا مصحفی پر ترجیح دینے کی کوشش کی ہے ۔ انشا کی ذہانت اور طباعی میں کچھ شک نہیں مگر سخن سنجی اور مشاق کے لحاظ سے انشا کو مصحفی کے مقابلے میں لانا ہی مصحفی کی سخت توہین کرنا ہے ۔

مصحفی کے کلام کی اثر پذیری کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ لکھنؤ اسکول شاعری کی بنیاد اُسی کے شاگردوں کے ہاتھوں پڑتی ہے اور اساتذۂ لکھنؤ نے اساتذۂ دہلی کو زبان کی تراش خراش کا راستہ دکھایا ۔ آتش کی شاعری دراصل مصحفی ہی کا پیام ہے ۔

احمد علی خاں یکتا نے مصحفی کے عروج کی داستان ذرا تفصیل سے لکھی ہے (دستور الفصاحت صفحات ۹۳ ، ۹۴ ، ۹۵) ”پختگی اور متانت میں طرز مزرا کا زندہ کرنے والا اور ادا بندی اور ارسال مثل میں دوسرا سوز ہے ،

شیریں ادا ہے ، اصناف شاعری میں قادر اور ماہر ہے ، شاگرد بہت مہیا کرتے ہیں، کہتے ہیں کہ چھ دیوان مکمل کر لیے ہیں ، لیکن رطب و یابس بہت ہے اور اس کی قوت شاعری اور جودت طبع کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب وہ لکھنؤ میں وارد ہوا تو یہاں جرات کی شاعری کا دور دورہ تھا اور شہر کے تمام لوگ اس کی شاعری پر فریفتہ تھے ۔ مصحفی نے جب دیکھا کہ اس کی طرف کوئی متوجہ نہیں ہوتا تو اس نے جرات کی مخالفت شروع کر دی ۔ اکیلا جرات اور اس کے شاگردوں سے الجھا اور تھوڑے زمانے میں کافی شاگرد پیدا کر لیے۔ بیس سال تک لکھنؤ کے مشاعروں میں پڑھتا رہا، آخر جرات جیسا نام پیدا کر لیا بلکہ اس سے زیادہ شہرت حاصل کی ۔ اب شاعری اور معلومات فن میں اس کا کوئی حریف نہیں ، خدا اسے زندہ اور سلامت رکھے کہ لکھنؤ کے شاعروں میں یہی ایک باکمال ہے !

۱۴ ۔ انشا ۔ انشا اللہ خاں خلف حکیم میر ماشاء اللہ خاں مصدر تخلص ۔ قریباً ۱۱۶۵ھ میں مرشد آباد صوبہ بنگالہ میں پیدا ہوا ۔ مبتلا نے گلشن سخن (۱۰ ب بحوالہ حاشیہ دستور الفصاحت صفحہ ۱۰۴) میں لکھا ہے کہ میں نے اسے بچپن کی عمر میں میر محمد جعفر کے عہدِ حکومت میں دیکھا تھا ، آج کل سنا گیا ہے کہ وہ تمام اوصاف سے متصف ہے [عہد حکومت میر محمد جعفر ۷ شوال ۱۱۷۰ھ تا ۹ ربیع الاول ۱۱۷۴ھ ۔ دوبارہ ۱۳ محرم ۱۱۷۷ھ کو انگریزی فوج کی حمایت میں داخل مرشد آباد ہوا ۔ قاسم علی خاں عالی جاہ انگریزی فوج سے مقابلہ کرتا رہا لیکن یہ مقابلہ نواب شجاع الدولہ کی امداد سے جاری تھا ، وہ در حقیقت عضو معطل تھا ؛ چنانچہ ۸ ذی حجہ ۱۱۷۷ھ کو اس نے فقیرانہ لباس پہن لیا تھا ۔ (۱۴ شعبان ۱۱۷۸ھ مطابق ۶ فروری ۱۷۶۵ء میر جعفر کا انتقال ہوا (سیر المتاخرین جلد دوم اردو ترجمہ صفحات ۲۹۵ تا ۳۰۴) اس لیے مبتلا نے اول دور حکومت میر جعفر میں انشا کو چھ سات سال کی عمر میں دیکھا ہوگا اور صغر سنی کا لفظ صحیح استعمال کیا ہے]۔

شیخ احمد علی نے مخزن الغرائب (۶۰ ب بحواله حاشیه دستورالفصاحت صفحات ۱۰۴، ۱۰۵) میں زیادہ تفصیل سے کام لیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ انشاء میر ماشاء اللہ خاں جعفری النسب کے بڑے بیٹے ہیں، نجفی الاصل ہیں، اس کے دادا نوراللہ نجفی ہندوستان میں پیدا ہوئے، میر ماشاء اللہ نے باپ کے خلاف حصول دنیا میں کوشش کی، بنگالے میں نمایاں علاج کیے اور اکثر میدان جنگ میں داد شجاعت دی، تمام جسم پر زخموں کے نشانات تھے، نواب قاسم علی خاں کے زوال پر نواب شجاع الدولہ مرحوم کے پاس آئے، اس بگڑے زمانے میں بھی انیس ہاتھی اُن کے دروازے پر تھے، سخاوت میں مشہور تھے لیکن جو کی روٹی اور مرغ پلاؤ کو یکساں سمجھتا اور ہمیشہ زمین پر سوتا اور شب بیدار تھا، آخر جب زمانے کو بدلا ہوا پایا تو فرخ آباد میں گوشہ نشین ہو گیا - نواب مظفر جنگ بقدر ضرورت تواضح کرتے تھے، چند سال ہوئے کہ انتقال ہو گیا اور وہیں مزار ہے - اب انشاؔ کا حال سنیے: موصوف نے بچپن میں کتب صرف اور نحو اور منطق اور حکمت ''صدرا'' تک پڑھیں، جب سولہ سال کی عمر ہوئی تو نواب شجاع الدولہ کے مصاحب ہو گئے- اسی زمانے میں اردو دیوان نئی طرز پر بغیر امداد کسی استاد کے ردیف وار ترتیب دیا اور کچھ عربی فارسی اشعار بھی لکھے ہوئے تھے - ایسی دلکش اور موزوں تقریر تھی کہ اہل دربار میں سے کوئی مد مقابل نہ تھا، صورت بھی پسندیدہ تھی اس لیے شجاع الدولہ کا منظور نظر ہو گیا اور درباری حسد کرنے لگے، کچھ مدت بعد شجاع الدولہ (۲۴ ذی‌حجہ ۱۱۸۸ھ) کا انتقال ہو گیا اور آصف الدولہ کے دربار میں رذیلوں کا دخل ہو گیا تو انشاؔ وہاں سے نجف خاں ذوالفقار الدولہ کے لشکر میں کچھ دنوں اور کچھ مدت بندھیل کھنڈ میں رہے اور پھر اپنے والد کے ہمراہ دھلی پہنچے- محمد بیگ ہمدانی (متوفی ۷ رمضان ۱۲۰۱ھ صفحہ ۱۸۷ وقائع عالم شاہی) کے ساتھ عزت سے رہنے لگے اور چند بار میدان جنگ میں جانبازی کے جوہر دکھائے لیکن زندگی تھی سلامت لوٹے - جے پور میں محمد بیگ خاں ہمدانی

کے بھتیجے (بقول میر ہمشیرہ زادہ ذکر میر صفحہ ۱۴۹) میرزا اسمٰعیل بیگ خاں سے کسی بات پر الجھ پڑے اور کٹار نکال کر مارنے کو دوڑے اور جو کچھ منہ میں آیا آسے کہا لیکن خدا نے جان اور عزت محفوظ رکھی ورنہ مرنے میں کثر نہ تھی- پھر دہلی سے لکھنؤ آیا اور مرزا سلیمان شکوہ کی رفاقت میں رہے؛ چونکہ نازک مزاج ہے کسی بات پر آن سے ناراض ہو کر الماس علی خاں کے پاس چلے گئے، پھر کچھ عرصے بعد نواب سعادت علی خاں کے مصاحبین میں منسلک ہو گئے اور دونوں وقت کھانے میں شریک ہوتے۔ مجھے بھی انشا کی خدمت میں نیاز حاصل ہے، وہ بھی میرے حال پر شفقت کرتا ہے، دوستی میں بے مثل ہے، اردو شاعری میں طرز نو کا موجد ہے، جو کوئی آس کی مجلس میں جاتا ہے ۔ زمانے کے غموں کو بھلا دیتا ہے ۔ عجیب نقلیں اور دلچسپ قصے یاد ہیں اور اپنی طبیعت سے گڑھ لیتا ہے، آس کے لطیفے اگر جمع کیے جائیں تو کتاب بن جائے..... نواب میرزا قاسم علی خاں خلف نواب سالار جنگ کو ایک شعر کے سلسلے میں نواب سعادت علی خاں کے سامنے ذلیل کر دیا اور چار زبانوں فارسی، ترکی، عربی، اردو میں شعر کہتا ہے...... اپنے احباب کو بڑھاتا ہے؛ چنانچہ فخر الشعرا میر محمد حسین قتیل خاص دوست ہے، معاصر شعرا سے نہیں دبتا، مصحفی کو اس قدر ذلیل کیا کہ اگر غیرت ہوتی تو خود کشی کر لیتا ۔

میر علاؤالدولہ (تذکرۃ الشعرأ صفحہ ۳۶۲ دستور الفصاحت صفحہ ۱۰۴) لکھتے ہیں :

میر ماشاءاللہ طبابت میں مہارت رکھتا ہے، محقق اور خوش طبیعت ہیں اور وزیرالممالک شجاع الدولہ کے نوکر ہیں، آن کا لڑکا (انشا) خوبصورت جوان دل پسند ہے ۔ مؤلف تذکرۂ اشرف علی خاں کا دوست ہے ۔

قدرت‌اللہ شوق مکملۃ الشعرأ (۱۴ ۔ الف) میں لکھتے ہیں :— انشا متوطن دہلی، اب لکھنؤ میں مقیم ہے اور شاعری کا مدعی ہے، قابل جوان ہے، عربی،

فارسی ، اردو میں کامل مہارت ہے ، ایسا خوش تقریر ہے کہ تعریف نہیں کی جا سکتی ، آزاد مشرب ، آزاد مذہب ، قلندروں کی مانند چار ابرو کا صفایا ہے ، اردو شاعری میں اپنی طرز میں بے مثال ہے ، اردو دیوان مشہور ہے ، کبھی کبھی فارسی میں بھی شعر کہتا ہے ۔

گلشن ہند مع گلزار ابراہیم (مترجم مرزا علی لطف ، متوفی ۱۲۵۳ھ مؤلف علی ابراہیم خاں خلیل متوفی ۱۲۰۸ھ) مطبوعہ انجمن ترقی اردو میں ہے :—

علی ابراہیم نے ان کو بچپن کی عمر میں میر محمد قاسم علی خاں عالی جاہ کے عہد (۱۱۷۴ھ تا ۱۱۷۷ھ) میں دیکھا تھا ۔ علی لطف نے مفید اضافہ کیا ہے ۔ عجب خوش اختلاط اور صاحب استعداد ہے، سوائے قصیدوں کے مثنویاں زبان عربی میں انھوں نے نظم کی ہیں اور ترکی کی غزلیں بھی ان کی خالی کیفیت سے نہیں ۔ زبان فارسی میں صاحب دیوان ہیں، کشمیری اور مارواڑی کے سوائے اور بھی بہت سی بولیوں کے زبان دان ہیں ۔ سال گذشتہ انھوں نے ایک قصیدہ غیر منقوطہ ـــ نواب عمادالملک کی مدح میں لکھ کر کالپی بھجوایا اور صلے میں اس کے انعام تحسین اور آفرین کا بہت پایا ۔ بالفعل کہ ۱۲۱۵ھ میں مرشد زادہ آفاق مرزا سلیمان شکوہ کے سایۂ عاطفت میں لکھنؤ اندر اوقات ساتھ قناعت اور شکستہ پائی کے بسر کرتے ہیں۔ کلام ان کا ظرافت اور خوش اختلاطی سے معمور۔ امیرالدین احمد مؤلف تذکرۂ مسرت افزا (صفحہ ۲۳ مطبوعہ رسالہ معاصر پٹنہ ۔ از قاضی عبدالودود) کی رائے ہے :—

خوش خلق اور خوش ظاہر جوان ہے ، شیریں زبانی سے آشنا اور زبان دانی سے واقف ، طرز کلام مربوط اور روش اور مستحکم ، اس کی فکر روز افزوں ہے ... مصحفی تذکرۂ ہندی میں لکھتے ہیں (صفحات ۲۳ تا ۲۴ تالیف تذکرہ ۱۲۰۸ھ تا ۱۲۰۹ھ) :—

اس کے بزرگوں کا وطن نجف اشرف اور خود مرشد آباد میں پیدا ہوا ۔ تحصیل

کتب عربی اور فارسی اور طب بقدر ضرورت کی ہے ۔ ابتدائے عمر سے سوزونیٔ طبع کی وجہ سے تینوں زبانوں میں شعر کہتا ہے اور زور طبع دکھاتا ہے لیکن میلان طبیعت اردو شاعری کی طرف زیادہ ہے ۔ مثنوی ''شیر و برنج'' مولانا بہاءالدین آملی کی مثنوی ''نان و حلوہ'' کے جواب میں خوب لکھی ہے اور داد فصاحت دی ہے ۔ دیوان نظر سے گزرا اگرچہ تمام کلام کیفیت سے خالی نہیں لیکن کچھ اشعار سادہ اشعار سے انتخاب کیے ......

حکیم قدرت‌اللہ قاسم مجموعۂ نغز میں (ج - ۱ صفحہ ۸۰ تا ۸۶) انشا کا کردار اچھی طرح نمایاں کرتے ہیں :—

انشا کے آبا و اجداد نجف اشرف کے شرفا سے ہیں ، عمدہ معاش اور بہت معزز اور محترم رہے ۔ نواب ذوالفقار الدولہ نجف خاں کی امیرالامرائی کے زمانے میں میر ماشاءاللہ خاں دو زنجیر فیل کے ساتھ مشرقی علاقے سے دھلی میں وارد رہے ، بہت جواں مرد اور بامروت تھا ۔ کہتے ہیں کہ سراج الدولہ وغیرہ حکام بنگالہ کے عہد حکومت میں اٹھارہ زنجبر فیل حکیم ماشاءاللہ خاں کے فیل خانے میں تھے ، انشا اسی زمانے میں مرشد آباد میں پیدا ہوئے ۔ کافی حد تک علوم متعارفہ سے واقف ہے ، فن طب میں مہارت رکھتا ہے ، اس کا طرز شاعری سوز کے طرز پر ہے لیکن ہر رنگ میں کہتا ہے ، قصائد اور مثنویات سے زور طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے خاص کر وہ قصیدہ جو سلیمان شکوہ کی سال گرہ کی تہنیت میں کہا ہے جس کا مطلع یہ ہے :—

صبح دم ، میں نے جو لی ، بستر گل پر کروٹ
جنبش باد بہاری سے گئی نیند اچٹ

..... لیکن ایک عیب بھی ہے کہ انشا شوخ طبع ، ہنگامہ پسند اور خود بیں ہے، چنانچہ لکھنؤ میں مصحفی مسکین جیسے شخص کی ایسی ھجو کی جو بازاری لوگوں سے بھی بعید تھی نہ کہ سلاطین کی محفل میں ایسا واقعہ پیش آئے (واقعہ مشاعرہ امین الدولہ دھلی قبل ۱۲۰۱ھ مابین انشا و عظیم

وغیرہ - دیکھو تفصیل مجموعہ نغز و آب حیات طبع پانزدہم صفحات ۲۵۷ تا ۲٦۰) -

انشا ۱۱۸۹ھ اور وسط ۱۲۰۲ھ[1] کے مابین دلی رہے اور اس زمانے میں بندھیل کھنڈ فرخ آباد[2] وغیرہ آتے جاتے رہے ، خود دریائے فصاحت (طبع ۱۲٦٦ھ صفحات ۳۸، ۳۹ مطبع آفتاب عالم مرشد آباد) میں لکھتے ہیں :—

جس زمانے میں کہ وارد دہلی تھا ، شہرہ فصاحت مرزا جان جاناں مظہر (متوفیٰ ۱۰ محرم ۱۱۹۵ھ) کا مجھ تک پہنچا - خط ترشوا کر ، ڈھاکہ کی ململ کا کرتہ پہن کر، سرخ پگڑی باندھ کر، جامع مسجد کے متصل کیول رام بنیا نے مکان بنا دیا تھا ، اس کی چھت پر بیٹھے تھے ، حاضر خدمت ہوا ، سلام کیا اور وہ اٹھ کر بغل گیر ہوئے ، برابر بٹھایا - میں نے عرض کیا

''ابتدائے سن صبا سے تا اوائل ریعان اور اوائل ریعان سے الی الآن اشتیاق مالا یطاق عتبۂ عالیہ نہ بحدے تھا کہ سلک تحریر و تقریر میں منتظم ہو سکے، لہٰذا بے واسطہ و وسیلہ حاضر ہوا ہوں - ارشاد شد کہ اپنے تکوں بھی بدو طفلی سے تمھیں سے اشخاص کے ساتھ موانست اور مجالست رہا کی ہے -

مرزا مظہر بقول مصحفی ۷ محرم کی شب میں زخمی طمنچہ سے ہوئے اور ۱۰ محرم ۱۱۹۵ھ کو اسی زخم سے رہگرائے جنت ہوئے، اس سے پہلے وہ کافی کمزور ہو چکے تھے، مکتوب ۳۵ کلمات طیبات (صفحہ ٦۴) میں لکھتے ہیں :—

---

۱ - اسماعیل بیگ — ۱۲ شوال ۱۲۰۲ھ کو پانچ سو سپاہی دریا عبور کر کے غازی الدین کی حویلی میں ٹھہرے اور نواب غلام قادر صاحب نے قلعہ پر ناظر کی سازش سے قبضہ کیا - ۱۷ ربیع الاول ۱۲۰۳ھ کو غلام قادر خان دہلی سے فرار ہوا - (تاریخ عبرت افزا صفحہ ۴۲ تا ۸۴) -

۲ - میر ولی اللہ (تاریخ فرخ آباد ۱۴۲ ب حاشیہ دستور الفصاحت صفحہ ۱۰۷) لکھتے ہیں : انشا دو سہ بار وارد بلدۂ فرخ آباد شد، بچند زبان سی گفت - عربی ، فارسی، ترکی ، ہندی ، پنجابی ، بنگالی ، پشتو ، و جزآں ، وقت جلوس نواب سعادت علی خاں بر مسند وزارت بسی و چہار زبان قصیدہ گفتہ -

مرا طاقت رفتن به مسجد جامع بروز جمعه نمانده است و به خانه نمی روم.. فردا پس فردا خبر رحلت فقیر خواهد شنید ... غذا بقدر چهارم دام باقی است و رفتن تا بیت الخلا حکم سفر دارد۔

اسی زمانے میں مکتوب نمبر ۳۴ (صفحہ ۴۵) میں جو شعبان ۱۱۹۴ھ میں لکھا گیا ہے، تحریر فرماتے ہیں:—

حال مردم این شہر از روزے کہ نجف خاں آمدہ است از شاہ تا گدا تباہ است و ذکر خلاص مجدالدولہ (گرفتاری آغاز ۶ ذی قعدہ ۱۱۹۳ھ) بر زبان خاص و عام است۔ خدائے تعالیٰ زود بظہور آرد .... رمضان مبارک بر سر رسیدہ، یاران طریقت وحافظان قرآن مجید این بار درین جا بسیار فراہم آمدہ ......

اس لیے یہ ملاقات قریباً ۱۱۹۱ھ میں ہوئی ہوگی چونکہ ۲۴ صفر ۱۱۸۹ھ سے نجف خاں نے ڈیگ کا محاصرہ کیا اور ۱۰ صفر ۱۱۹۰ھ کو رعیت سنگھ جاٹ فرار ہوا، ۱۶ ربیع الاول ۱۱۹۰ھ کو فتح کی عرضداشت بھیجی گئی اور نجف خاں نے شاہ عالم کے ہمراہ جا کر ۱۱ شعبان ۱۱۹۱ھ کو غوث گڈھ کا قلعہ فتح کیا اور امیر الامرائی کا خطاب حاصل کیا، انشاء غالباً ۱۱۹۱ھ میں شاہ عالم کے دربار میں پہنچے ہوں۔ ۶ ذی قعدہ ۱۱۹۳ھ کو مجدالدولہ کی گرفتاری پر نجف خاں مختار مطلق ہو گیا اور ۲۲ ربیع الآخر ۱۱۹۶ھ کو دنیا سے چل بسا۔ اس عرصے میں انشائؔ نجف خاں کی حمایت کے بل بوتے پر دہلی میں مقیم رہے اور پھر محمد بیگ صاحب ہمدانی (متوفیٰ ۷ رمضان ۱۲۰۱ھ) سے وابستہ رہے اس لیے مستقل قیام دہلی میں کم ہی رہا لیکن نوک جھونک سے کوئی بات خالی نہ تھی، مظہر سے ملاقات میں بھی یہی پہلو نمایاں ہے۔ شیفتہ کی ان کے متعلق رائے اہم ہے (گلشن بےخار صفحہ ۲۹):—

سعادت علی خاں کے مقربان دربار سے تھا، فنون رسمیہ میں کچھ مہارت تھی لیکن ہر فن میں کوس لمن الملکی بجاتا، ہم عصر

شاعروں کا قافیہ تنگ کر دیا تھا، دیوان میں تمام اصناف سخن ہیں لیکن کسی صنف میں بھی پختگی نہیں، ہاں اس کے ذہن کی جودت اور کلام کی شوخی میں کوئی کلام نہیں، موت کو بیس برس گزر چکے ہیں، یہ شعر بہت اچھا ہے :—

اس سے خلوت کی ٹھہر جاتی تو میں اللہ سے
واسطے دو دن کے عرش کبریائی مانگتا

نساخ کی اطلاع ہے (صفحہ ۵۲ سخن شعرأ) :—

بہت سی زبانوں سے واقف تھے اور بہت سے فنون میں دخل رکھتے تھے، مشکل قافیوں میں شعر عاشقانہ اچھا کہتے تھے، مشہور ہے کہ کچھ روزوں میاں مصحفی سے اصلاح لے کر منحرف ہو کے ھجو لکھی تھی، میاں منتظر نے اس کا جواب لکھا ہے :—

مؤلف بزم سخن (صفحہ ۱۹) بھی مصحفی سے استفادہ کرنے کی تائید کرتے ہیں......ان کی رائے میں شاعری میں ایک خاص مذاق پیدا کیا تھا جس کا حصہ دوسروں تک نہ پہنچا۔ مصحفی کی شاگردی نئی اطلاع ہے، مصحفی نے خود تذکروں میں اس کا ذکر نہیں کیا، ھجو گوئی کا معرکہ انشاؔ اور مصحفی میں ۱۲۱۰ھ میں پیش آیا، چونکہ مرزا سلیمان شکوہ ۱۲۰۵ھ میں لکھنؤ پہنچے، بقول مصحفی (تذکرہ ھندی صفحات ۱۲۰ تا ۱۲۱) :—

این فقیر هم چوں نسبتِ دیگراں دریں کار زیادہ رسوائی داشت بگفتۂ میر انشاءاللہ خاں حسب‌الطلب حضور با وصف کم نشینی و شکستہ حالی شریک مجلس یاراں شدہ بود۔ چناں چہ در هماں تاریخ بہ حلقۂ ملازماں حضور در آمد . . . . وهمچنیں قلندر بخش جرأت کہ پس از فقیر بعد سہ چهار ماہ دولت ملازمتِ حضور حاصل نمودہ بہ نوازش خسروانہ در آمدہ و نیز نوکر شدہ . . . و میر انشاءاللہ خاں کہ بہ نائب

و مختار حضور یعنی خان صاحب و قبلہ خان زاد خاں بہادر کہ ایشاں در شعر فہمی و نثر نویسی نظیر خود ندارند صیغۂ اخوت خواندہ اند ہمیشہ مورد گوناگوں الطاف خسروی می باشند و چند بار بانعام لائقہ قباد گوشوارہ سر مباہات برافراختہ‌اند ۔ کمال تذکرہ مجمع الانتخاب (مملوکہ انجمن ترقی اردو بھارت) میں تحریر کرتے ہیں :-

سید انشاءاللہ خاں انشا تخلص خلف رشید حکیم ماشاءاللہ خاں صاحب بحضور مرشد زادۂ آفاق مرزا سلیماں شکوہ بہادر در لکھنؤ بہر فن بسیار ممتاز و سرفراز بود ، در آں باعث شوق شعر و سخن بحضور شاہزادہ فقیر حاضری شد ، از خاں صاحب ہم ملاقات ہر روز می ماند ، از فقیر بسیار بخوبی و اتحاد پیش می آمد ، چنانچہ در ابتداء مسودہ غزلیات وغیرہ فقیر از خان صاحب موصوف گرفتہ ردیف وار ترتیب دادہ دیوان مرتب ساختہ بعد ازاں نقل دیوان خود از نزد فقیر گرفتہ ۔ غرض فقیر از کلام واردات خان صاحب بدل الفتے دارد ، فقیر بحضور سلیماں شکوہ بہادر بہ لکھنؤ گذاشتہ آمدہ است ، حق تعالیٰ سلامت دارد ۔

(سفر کمال ۱۲۱۴ء)

انشا کی سفارش سے پہلے مصحفی ملازم ہوئے ، تین چار ماہ بعد جرائت بھی نوکر ہوئے لیکن انشاؔ سلیماں شکوہ کے نائب اور مختار کے برادرانہ تعلقات کی وجہ سے سلیماں شکوہ کے مورد الطاف ہیں ۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انشا اس وقت ملازم نہ تھے اور صرف انعام وغیرہ پر اکتفا کیا تھا ، البتہ جب ۱۲۱۰ھ میں انشاؔ نے مصحفی کی ہجو کہی اور اس کا سوانگ نکالا اور مصحفی نے اس کا جواب دیا تو انشاؔ نے بھڑکایا کہ سلیماں شکوہ پر بھی مصحفی نے چوٹ کی ہے ، سلیماں شکوہ نے ناراض ہو کر پچیس روپے سے پانچ کر دیے ، انشاؔ کی تنخواہ اس وقت چالیس روپے کر دی گئی تھی جس کا ذکر مصحفی بھی کرتا ہے :-

چالیس برس کا ہی ہے چالیس کے لائق
تھا مرد معمر کہیں دس بیس کے لائق
اے وائے کہ پچیس سے اب پانچ ہیں اپنے
ہم بھی تھے کئی روزوں میں پچیس کے لائق
اُستاد کا کرتے ہیں امیر اب کے مقرر
ہوتا ہے جو در ماھہ کہ سائیس کے لائق

ڈاکٹر ابواللیث صاحب کا خیال ہے (لکھنؤ کا دلبستان شاعری صفحہ ۱۵۵) کہ :-

۱۲۰۷ھ میں ولی‌اللہ محب کے انتقال کے بعد مرزا سلیمان شکوہ نے جن کے دربار کا مصحفی نے ذکر کیا ہے، مصحفی کو اپنا اُستاد بنایا، اس طرح سے خیال کرنا چاہیے کہ انشاؔ ۱۲۰۶ھ کے قریب لکھنؤ گئے۔

انشاؔ ۱۲۰۳ھ میں الماس علی خاں خواجہ سرا سے متوسل نظر آتے ہیں جیسا کہ مندرجہ تحت اشعار سے ثابت ہوتا ہے (رسالہ نئی تحریریں ستمبر ۱۹۵۸ء، اس کتاب میں ..... سید امجد الطاف صاحب) :-

یعنی الماس علی خاں بہادر کہ مدام
در جہاں دستِ سخاوت گہر افشاں باشد
چہل سالست کہ اوقات شریفش اینست
کس ندیدم بہ عبادت کہ بدیں ساں باشد ۱۲۲۳ھ

قطعہ وفات :-

شصت سالیست کہ اوقات شریفس آں بود
آوخ آوخ، زچنیں مرد مسلماں افسوس
سال تاریخ وفاتش ز خرد جستم، گفت
حیف اے آہ، از الماس علی خاں افسوس ۱۲۲۳ھ

گویا متذکرہ بالا قصیدہ ۱۲۰۳ھ میں لکھا گیا اور اس وقت شہزادہ سلیمان لکھنؤ میں وارد نہیں ہوئے تھے۔ یہ سفر تخمیناً ربیع الاول ۱۲۲۹ھ میں ہوا تھا۔

مولوی عبدالقادر خاں اپنے روزنامچے میں ان کی صلاحیتوں کا اس طرح ذکر کرتے ہیں (۳۹ ب):—

وایں زمانِ آخر عہد نواب سعادت علی خاں بود . . . حکیم مرزا علی صاحب پارۂ از آنچه بدل وے گذشت درباره بنده به میر انشاءاللہ خاں صاحب گفتند حکیم و خان صاحب و میر عبدالعلی ہرسہ بزرگوار بدیدن بنده آمدند و نوازش فرمودند، روز دیگر بخدمت خان صاحب مستفید شدم۔ اگرچه وے به شعر و شاعری مشہور است، لیکن بدانست من فن ہم نشینی شدن بجائے رسانیده بود که یکتائے زمانه اش دریں کار او را تواں گفت، بزباں اردو و فارسی و عربی و بنگله و پوربی و مرہٹی و کشمیری و ترکی و افغانی به لہجۂ آں قوم سخن گفتے و نثر فارسی رواں و بے تکلف خوب نوشتے، تیر اندازی و شمشیر بازی و سواریٔ اسپ نیکو می دانستِ میان رنداں پیر مغاں و در حلقۂ مشایخاں شیخ صنعاں بود۔

نواب سعادت علی خاں کے عہد میں دنیاوی جاہ و جلال کامل میسر تھا لیکن شاعری کا زوال بھی اسی عہد میں ہوا البتہ قواعد اردو کے سلسلے میں دریائے فصاحت لکھ کر گراں قدر خدمت انجام دی، داستان رانی کیتکی بھی اردو ادب میں قابل قدر اضافہ ہے، ہاں اور کوئی کارنامہ ایسا نہیں جس سے اردو شاعری میں انقلاب پیدا کرتے؛ آزاد کی رائے ان کے کلام پر یہ ہے (آبِ حیات صفحہ ۲۶۶ طبع پانزدہم):—

غزلوں کا دیوان عجب طلسمات کا عالم ہے؛ زبان پر قدرتِ کامل،

بیان کا لطف ، محاوروں کی نمکینی ، ترکیبوں کی خوشنما تراشیں دیکھنے کے قابل ہیں مگر یہ عالم ہے کہ ابھی کچھ ہیں ، ابھی کچھ ، جو غزلیں یا غزلوں میں اشعار با اصول ہو گئے وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں اور جہاں طبیعت اور طرف جا پڑی وہاں ٹھکانا نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قصائد بڑی دھوم دھام کے ہیں ، الفاظ کی شکوہ ، طبیعت کی بلند پروازیوں کی کوئی حد نہیں ـــ البتہ شوخ مضمون اور خوش آئند ترکیب اور نئی تراش سے کبھی قصیدے میں بانکپن ھی پیدا ہو جاتا اور کبھی تبذل ہو جاتا ۔ ۔ ۔ دیوان فارسی کا بھی یہی حال ہے، مضمون دیکھو تو کچھ نہیں ہاں لطف زبان اور خوبیٔ بیان کی تعریف نہیں ہو سکتی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (آب حیات صفحات ۲۸۸ تا ۲۸۹) ۔

انشا کا انجام بخیر نہ ہوا ، آزاد کہتے ہیں کہ دربار میں بعض لوگوں کی شرافت خاندانی کی بحث ہو رہی تھی ، نواب سعادت علی خاں نے انشا سے کہا کیوں بھئی ہم بھی نجیب الطرفین ہیں ، اسے اتفاق کہو یا زیادہ گوئی کا ثمرہ سمجھو ، سید انشا بول اٹھے ، کہ حضور بلکہ انجب ! سعادت علی خاں حرم کے شکم سے تھے ، وہ چپ اور تمام دربار درہم ہو گیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کے بعد نواب بہانہ ڈھونڈنے لگے ، حکم ہوا ”دربار کے سوا کہیں نہ جایا کرو“۔ اس قید بے زنجیر نے انھیں دق کیا ، زیادہ مصیبت یہ ہوئی کہ تعالی‌اللہ خاں نوجوان بیٹا مرگیا ، اس صدمے سے حواس میں فوق آ گیا یہاں تک کہ ایک دن سعادت علی خاں کی سواری ان کے مکان کی طرف سے نکلی، کچھ غم و غصہ ، کچھ دل بے قابو ، غرض سرراہ کھڑے ہو کر سخت و سست کہا ۔ سعادت علی خاں نے جا کر تنخواہ بند کر دی ، اب جنون میں کیا کسر رہی ۔

سعادت علی خاں سے بگاڑ اور جنون کے سلسلے میں سعادت یار خاں نے رنگین کی حکایت نقل کی ہے ۔

مؤلف تذکرہ گل رعنا (صفحات ۲۵۸ و ۲۵۹) اس کی تردید کرتے ہیں :ـــ

یہ آزاد کی نری جادو طرازی ہے، حیات دبیر کے مصنف نے مرزا اوج کی زبانی لکھی ہے، جو میر انشاءاللہ خاں کے نواسے تھے کہ سید انشا نہ مجنون ہوئے، نہ اُن کی تنخواہ بند ہوئی، صرف اتنا صحیح ہے کہ نواب سعادت علی خاں نے حکم دے دیا تھا کہ وہ سوا دربار کے اور کہیں نہ آئیں جائیں اور دربار میں بھی اُس وقت حاضر ہوں جب اُن کو بلایا جائے۔ انشا نے اسی حبس بے جا کی طرف اس شعر مین اشارہ کیا ہے:۔

بدوں حکم وزیرالممالک اے آغا
چناں کنم حرکت، نوکری است یا بازی

جنون کا واقعہ ۲۱ رجب ۱۲۲۹ھ[1] کے بعد پیش آیا ہوگا، واقعہ کی صحت یکتا کے بیان سے بھی ہوتی ہے کہ آخر میں مجنوں ہو گیا اور چند سال مبتلا رہ کر اسی مرض سے فوت ہوا۔ (دستورالفصاحت صفحہ ۱۰۷) اور ربیع الاول ۱۲۲۹ھ تک انشاؔ پر کوئی پابندی بھی عائد نہ ہوئی تھی چونکہ انشا حکیم مرزا علی اور میر عبدالعلی کے ہمراہ مولوی عبدالقادر کے مکان پر ملنے گئے تھے، تعالیٰ اللہ خاں کی موت سے دیوانگی کا کوئی تعلق نہیں، اُن کا انتقال ۱۲۱۳ھ میں ہوا جب کہ نواب سعادت علی خاں سے انشا کا توسل بھی نہ ہوا تھا۔ قطعات یہ ہیں:۔

(مجموعہ اشعار مصحفی مملوکہ ڈھاکہ یونیورسٹی - نئی تحریریں ستمبر ۵۴ء)

دریں ماتم کشیدہ مصحفی آہ ہمیں گفتا تعالیٰ اللہ خاں کو

۶ ۱۲۱۹ — = ۱۲۱۳ھ

(مجموعہ اشعار مصحفی مملوکہ ڈھاکہ یونیورسٹی نئی تحریریں ستمبر ۵۴ء)

---

۱ - نواب سعادت علی خاں کا انتقال ۱۱ جولائی ۱۸۱۴ء مطابق ۲۱ رجب ۱۲۲۹ھ کو ہوا بعض تاریخوں میں اختلاف ہے (تاریخ اودھ جلد سوم صفحات ۵۸، ۶۷ نجم الغنی صاحب)۔

تیغ قضا رشتۂ عمرش برید   مرگ بہ کنجِ لحدش خواند ضیف
گفت ہمیں ہاتفش از روئے درد   حور لقائے زِجہاں رفت حیف

۴ + ۱۲۰۹ = ۱۲۱۳ھ

(کرم خوردہ کلیات مصحفی مملوکہ پنجاب یونیورسٹی)

قاضی عبدالودود صاحب نے ۱۲۱۸ھ تاریخ وفات غلط نقل کی ہے ، دوسرا بیٹا اشکراللہ خاں ۱۲۲۲ھ میں فوت ہوا ، مصحفی کے اس شعر سے تاریخ نکلتی ہے :—

سال تاریخِ جدائی وا دریغا گفت و رفت
۱۲۲۳ھ
اشکراللہ آں پسر کو ، بود چوں ماہ ، ایں چہ شد

البتہ انشاؔ کے مخالفین کافی طاقتور ہو گئے تھے ، چنانچہ قتیل نے سجان قلی بیگ راغب کے متعلق (رقعہ ۱۳۶ صفحہ ۱۷ مطبع سلطانی لکھنؤ) لکھا ہے کہ اُس نے بعض معززین کی ہجویں کہیں اور جب اُن لوگوں نے باز پرس کی تو قسمیں کھائیں کہ ہجویں انشاؔ نے کہی ہیں ، میرا تمہارا کیا جھگڑا ، اُنھیں بھی یقین آ گیا ، سب انشاؔ کی سزا پر آمادہ ہوئے تو انشا کو بھی خبر ہو گئی ، اپنے بیٹے اور داماد کو بھیجا ، اُنھوں نے حلف اُٹھایا کہ یہ الزام جھوٹا ہے تب جان بچی ۔ انشاؔ کی سترہ سالہ لڑکی سولائی بیگم کا انتقال ربیع الاول ۱۲۲۸ھ (رقعہ ۲۰ قتیل) کو چیچک سے ہوا اور دو بچے رہے لیکن یہ صدمہ انشاؔ جھیل گئے تھے ، انشا کے پوتے ضیاءاللہ خاں خلف ماشاءاللہ خاں تخلص شفا کا ذکر غنچہ ارم (صفحہ ۱۱۳ مطبوعہ کلکتہ) میں ملتا ہے ۔ ۱۲۳۲ھ میں یہ ظریف اور بذلہ سنج شاعر دنیا سے رخصت ہوا ۔

۱۵ ۔ ناسخ—شیخ امام بخش نام ، والد کا نام شیخ خدا بخش تھا ۔ آبائی وطن لاہور تھا ، یہ ۱۱۸۰ھ میں لاہور پیدا ہوئے اور لکھنؤ میں سن تمیز

کو پہنچے۔ مصحفی نے جب ریاض الفصحا میں ان کا حال لکھا تو عمر ۳۷ سال تھی یعنی ۱۲۲۱ھ میں ان کا ذکر داخل تذکرہ کیا؛ قوی جثہ ، سپاہی وضع ، حلیم الطبع اور مہذب بقول مصحفی تھے (صفحہ ۳۳۴) - بیس سال کی عمر سے موزونی طبع کی وجہ سے اردو میں شعر گوئی شروع کی اور تازہ معنی کی تلاش شعر میں ہے ، باپ دادا تجارت پیشہ تھے خود کا بھی یہی کام ہے -

مولانا آزاد نے مولوی عظیم اللہ رغمی شاگرد ناسخ کے مرسلہ حالات داخل کر دیے ہیں اس لیے رغمی کی روایات قابل اعتبار نہیں - خدا بخش کو خیمہ دوز کا متبنیٰ بنایا ہے جو دولت مند اور لا ولد تھا ، اس کے مرنے پر خدا بخش کے بھائیوں کا وراثت دینے سے انکار کرنا اور مقدمہ بازی ہونا اور ناسخ کے حق میں فیصلہ ہونا ظاہر کیا ہے - خدا بخش کے انتقال کا قطعۂ تاریخ ناسخ نے کہا ہے :-

والدین زیں جہاں رحلت نمود　　یا الٰہ العالمین مغفور باد
گشت ناسخ سال تاریخ وفت　　با رسول ہاشمی محشور باد　　۱۲۱۶ھ

یہ روایت حسد کی بنا پر قائم کی گئی ہے ، کہ خدا بخش کے باپ نہ تھے آخر معاصریں کو اصلی باپ کی نشان دہی میں کیا عذر تھا - مصحفی نے ولدیت بالتصریح لکھی ہے اور یہ واقعہ ۱۲۳۱ھ کا ہے ، البتہ صاحب گل رعنا (صفحات ۳۴۰ ، ۳۴۱) نے لکھا ہے :-

بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ لکھنؤ میں میر کاظم علی ایک رئیس تھے ، انھوں نے ان کو اپنا فرزند بنا لیا تھا ، وہ مرے تو اچھی خاصی دولت وصیت نامہ کی رو سے ان کو مل گئی ، اب آسودہ حال ہو گئے اور ٹکسال میں ایک مکان لے کر بود و باش اختیار کی -

یہ روایت ایک حد تک صحیح ہے چونکہ ناسخ نے مرزا کاظم علی خاں کا قطعۂ تاریخ کا عنوان قبلہ و کعبہ لکھا - اس سے اندازہ ہوتا ہے مرزا کاظم علی خاں ناسخ کو اولاد سمجھتے تھے اور ناسخ بھی ان کو

باپ کی مثل سمجھتے تھے - مرزا کاظم علی کا انتقال ۱۲۴۹ھ میں ہوا ہے ، کاظم علی کے بیٹے محمد باقر[1] ۱۲۳۲ھ میں فوت ہو چکے تھے ، آن کا قطعہ تاریخ بھی ناسخ نے لکھا ہے - ایسی صورت میں معترضین کا کاظم علی کی جائداد ملنے سے حسد کرنا ناسخ کو نہ بھایا اور اس نے اپنی بریت میں یہ دو رباعیات لکھی ہیں جن کو نساخ نے سخن شعراء میں بھی نقل کیا ہے :-

کہتے رہے اعمام عداوت سے غلام　　میراث پدر میں نے مگر پائی تمام
اس دعوی باطل سے ستمگاروں کو　　حاصل یہ ہوا کر گئے مجھ کو بدنام
مشہور ہے گرچہ افترائے اعمام　　پر کرتے نہیں غور خواص اور عوام
وارث ہونا دلیل فرزندی ہے　　میراث نہ پا سکا کبھی کوئی غلام

نساخ لکھتے ہیں (صفحہ ۴۹۱ سخن شعراء) صاحب تذکرۂ سراپا سخن سید محسن علی محسن نے ان کو ولد شیخ خدا بخش لاہوری کر کے لکھا ہے لیکن یہ تاجر مذکور کے غلام مشہور تھے؛ چنانچہ خود شیخ ناسخ نے اس امر کے مندفع کرنے کے لیے رباعی مرقومہ بالا کہی ، بات وہی تھی جو صاحب گل رعنا نے لکھی اور دوسرے لوگوں نے ان کے اصلی باپ کو بھی نقلی کر چھوڑا -

ناسخ نے ہوش سنبھالا تو مصحفی ، جرأت ، انشا اور قتیل کی شاعری کا چرچا تھا ، جا بجا شعر و سخن کی محفلیں برپا ہوتیں ، بقول مصحفی بیس سال کی عمر میں انھیں بھی شوق ہوا ، شیخ محمد عیسیٰ تنہا [(متوفی ۱۲۳۲ھ "آج تنہا گیا دنیا سے عدم کو تنہا")

---

۱ - دیوان ناسخ (صفحہ ۴۹۳):— تاریخ وفات فرزند قبلتی و کعبتی مرزا کاظم علی خاں :

رفت چوں مرزا محمد باقر آہ　　بست و دو سالہ بفردوس بریں
گفت ناسخ سال تاریخ وفات　　حشر بادا با امام المتقین (۱۲۳۲ھ)

مصحفی :—

از سر آہ ایں نوا بکشید گنج معنی بخاک پنہاں شد

(معاصر حصہ اول پٹنہ از قاضی عبدالودود ، کلیات مصحفی نسخہ پنجاب)] ناسخ کے دوست تھے ، غالباً انھیں کی ترغیب سے ناسخ نے شاعری شروع کی ، آغاز میں مشورہ ان سے لیا ہو تو بعید نہیں چونکہ دبے الفاظ میں اس طرف اشارہ کرتے ہیں، دیباچہ دیوان ششم مصحفی (نگار مصحفی نمبر ۱۹۳۹ء ، صفحہ ۹۴ حیات مصحفی امیر احمد) جو ۱۲۲۴ھ میں لکھا گیا ہے اس میں بیان کرتے ہیں :—

در ایامے کہ فقیر بسبب کساد بازاری متاع گراں بہائے کلام فارسی، بہ مقتضائے رواج زمانہ خود را مصروف بہ ایں شغل بے نظیر ریختہ داشت عالمے از حسد جامہ در خم نیل زدند ، و جمع کور باطن منغض شدہ گاہے کہ پنجہ افگندند پیش نہ بردند ، پس از انقضائے ایام چند چوں سلسلۂ موزونیت دراز کشید ، حصہ نعمت ایواں ایں خوان بہ شیخ ناسخ کہ یکے از دوستاں محمد عیسیٰ تنہا است و بہ فقیر ہم رسوخ از تہ دل دارد ، مقسوم گشت ۔ تخلص خود را اسم با مسمیٰ انگاشتہ بر طرز ریختہ گویان سادہ کلام، در عرصۂ قلیل خط نسخ کشیدہ و از قفایش بر قدم او خواجہ حیدر علی آتش ہم در رسیدہ سمند تیز گام خیال را از دائرہ چرخ اثر بیروں برد ۔

ربیع الاول ۱۲۲۹ھ میں مولوی عبدالقادر غمگین رام پوری لکھنؤ پہنچے تو ناسخ ، مصحفی ، انشا ، قتیل کے برابر آ چکے تھے، وہ روز نامچہ صفحہ ۹۷ میں لکھتے ہیں :—

روزے در محفل مشاعرہ کہ در آں ایام بخانۂ مرزا جعفر می بود ، رفتم ، مرزا محمد حسن قتیل و مصحفی و میر نصیر دہلوی دران زمرہ سرگروہ بشمار می آمدند ، و شیخ امام بخش ناسخ را درآں ایام روز افزونی بہ ناموری

دریں کار بود ۔

ناسخ کے مربی مرزا حاجی قمر الدین (متوفی ۱۲۷۵ھ قیصر التواریخ جلد دوم صفحہ ۳۷) تھے ۔ ان کے عروج سے انھیں بھی ترقی نصیب ہوئی لیکن مرزا حاجی کی جگہ نواب معتمد الدولہ آغا میر کو ملی ، تو ناسخ آن کے ہمنوا ہوگئے اور آغا میر نے سوچا کہ ناسخ کے ذریعے مرزا حاجی کو گرایا جائے ؛ چنانچہ ایک اسکیم بنائی گئی اور اس میں ناسخ کی بھی گواہی ہوئی ۔ اس طرح آغا میر کی نظر میں ان کا مرتبہ اور بلند ہوگیا لیکن لوگوں نے یہ بات سند نہ کی ، آزاد کہتے ہیں (آبِ حیات صفحات ۳۴۵ ، ۳۴۶) کہ لکھنؤ سے نکلنے کا سبب یہ ہوا تھا کہ غازی الدین حیدر کے عہد میں جب ان کی تعریفوں کی آوازیں بہت بلند ہوئیں تو آغا میر سے کہا کہ اگر شیخ ناسخ ہمارے دربار میں آئیں تو ہم انھیں ملک الشعراء کا خطاب دیں ، معتمد الدولہ ان کے با اخلاص شاگرد تھے ، جب یہ پیغام پہنچایا تو انھوں نے بگڑ کا جواب دیا کہ مرزا سلیمان شکوہ بادشاہ ہوجائیں تو وہ خطاب دیں یا گورنمنٹ انگلشیہ خطاب دے ، ان کا خطاب لے کر میں کیا کروں گا ۔ نواب کے مزاج میں کچھ وحشت بھی تھی ، حسب الحکم شیخ صاحب کو نکلنا پڑا اور چند روز الہ آباد میں جا کر رہے ، نواب مر گئے تو پھر لکھنؤ میں آئے ۔ چند روز کے بعد حکیم مہدی جن کے بزرگ کشمیری تھے ، شاہ اودھ کی سرکار میں مختار تھے ، وہ ایک بدگمانی میں معزول ہو کے نکلے ، چونکہ وہ نواب آغا میر کے رقیب تھے ، شیخ صاحب نے تاریخ کہی جس کا مادہ ہے ع

کاشو برائے پختن شلغم گر یختہ (۱۲۳۵ھ)

مشکل یہ کہ چند روز کے بعد وہ پھر بحال ہوگئے ، شاعر نے الہ آباد کو گریز کی لیکن اکثر غزلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب لکھنؤ سے جدا ہوئے تڑپتے اور دن ہی گنتے رہے ، ایک شعر میں بھی لکھتا ہوں :-

دشت سے کب وطن کو پہنچوں گا کہ چھٹا اب تو سال آ پہنچا

حکیم مہدی کو دوبارہ زوال ہوا تو انھوں نے پھر تاریخ کہی، نیا انداز ہے :-

از جائے حکیم ھشت برگیر سہ مرتبہ نصف نصف کم کن (۱۲۴۸ھ)

اب کی دفعہ جو آئے تو ایسے گھر مین بیٹھے کہ مر کر بھی نہ اٹھے، گھر ھی میں دفن ہوئے۔

اس کی تفصیل قیصر التواریخ اور تاریخ اودھ (جلد دوم صفحات ۶۹ تا ۷۶ جلد سوم صفحات ۸۴ تا ۱۶۸) کے مصنف نے لکھی ھے کہ نواب معتمد الدولہ نے مرزا حاجی کو بادشاہ کی نظر سے گرانا چاہا، ایک قتل کی مصنوعی سازش ہوئی اور اس میں ناسخ کو گواہ بنایا گیا، مرزا حاجی پر الزام لگایا کہ انھوں نے نواب معتمد الدولہ کو قتل کرانا چاہا تھا۔ ناسخ کو ایک سو روپیہ ماہواز نواب معتمد الدولہ کی سرکار سے ملنے لگا، معتمد الدولہ حکیم مہدی علی خاں منتظم الدولہ کے خلاف تھے۔ (۱۲۳۳ھ تا ۱۲۳۴ھ) اٹھارہ ماہ معتمدولہ معزول رھے اور کار نیابت مرزا حاجی نے انجام دیا لیکن ۱۲۳۴ھ میں معتمدالدولہ پھر بر سر اقتدار آ گیا اور منتظم الدولہ اور مرزا حاجی کے خلاف جال بچھایا۔ منتظم الدولہ ملازمت چھوڑ گیا، ناسخ نے اس پر غزل کہی۔ محمد خاں قوال نے معتمد الدولہ کے سامنے یہ غزل گائی اور ھزار روپیہ انعام پایا۔ اس کے آخر کا مصرع ھے۔ ع

کاشو برائے پختن شلغم گریختہ

غالباً منتظم الدولہ ۱۲۳۰ھ میں فرار ہوئے، اس سال ناسخ اپنے جوڑ توڑ کی وجہ سے کچھ پھنس گئے تھے، آخر محفوظ رھے۔ خود قطعہ تاریخ کہا ھے :-

للہ الحمد کہ ماندم محفوظ سر ز تیغ و قدم از بندِ بلا

سال این رد بلا اے ناسخ گفت مرقوم کنم شکرِ خدا (۱۲۳۵ھ)

ناسخ کے چار خط کسی نے دبا لیے ، خدا جانے ان کے خلاف کوئی شازش تیار کی گئی تھی یا کیا ، اس کی تاریخ کا قطعہ کہا ہے :—

نمود غصب خطوط مرا ہزار افسوس مباد روز جزا ، آں جفا شعار ایمن
نوشت کاتبِ اعمال او پئے تاریخ سیاہ ہم جو قلم باد روئے آں خائن
(۱۲۳۵ھ)

آزاد کی یہ روایت کہ غازی الدّین حیدر کے مدحیہ قصیدے سے انکار کیا ، قطعاً غلط ہے ۔ ناسخ نے غازی الدّین حیدر کی شاہی پر قطعہ مدحیہ کہا جس کا شعر ہے :—

تاریخ سعید کرد ناسخ تحریر شہ اسکندر ، وزیر ارسطاطالیس (۱۲۳۴ھ)

مرزا حاجی کے زمانہ نیابت میں ناسخ نے تکلیف ضرور اٹھائی ہوگی آفرین علی خاں خواجہ سرا بادشاہ بیگم کی جاگیر کا مہتمم تھا اور وہ مرزا حاجی کا طرفدار تھا ، اس کے مرنے سے مرزا حاجی درباری حمایت سے محروم ہو گئے ، آخر معتمد الدولہ نے بادشاہ سے مرزا حاجی کی جلاوطنی کا حکم حاصل کر لیا ۔ مرزا حاجی پیادہ پا ، سر بازار تمازت آفتاب میں اپنے مکان سے نکل کر روانہ ہوئے ، جو شخص دیکھتا تھا ، ان کی شان و ثروت و عظمت و حشمت کو یاد کر کے روتا تھا ۔ مرزا محسن بھی ان کے ساتھ روانہ ہوئے ، انھوں نے یہ تاریخ اپنے اخراج کی فی البدیہ استخراج کی "ہائے غریبی ۱۲۳۸ھ" لیکن زمانہ سدا یکساں نہیں رہتا ، ۲۷ ربیع الاول ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۹ اکتوبر ۱۸۲۷ء کو دیوالی کے دن غازی الدّین حیدر نے چودہ برس حکومت کر کے اس دنیا سے کوچ کیا (تاریخ اودھ جلد ۴، صفحہ ۱۲۰)، ۲۸ کو دوسرے دن نصیر الدّین حیدر (۲۰ اکتوبر ۱۸۲۷ء) تخت نشین ہوئے ، معتمد الدولہ نے قلمدان وزارت سنبھالا لیکن رزیڈنٹ نے معزول کر کے نظر بند کر دیا ۔ صاحب رائے مورخ نے یہ تاریخ معزول کی لکھی ہے :—

"آج اس گھر کا سنیچر آترا"۔ میر فضل علی کو نیابت ملی (اعتماد الدولہ)، حکیم مہدی علی خان امید نیابت پر فرخ آباد سے چلے تھے ، کانپور مرزا حاجی کے پاس ٹھہرے - میر فضل علی اعتماد الدولہ کو نیابت مل گئی، وہ بھی ان ھی کا متوسل تھا - ۱۹ شوال ۱۲۴۵ء کو میر فضل علی اعتمادالدولہ کا انتقال ھوا -

ناسخ کو آخر ھجویہ غزل کی سزا بھگتنی پڑی - کچھ دن خانہ نشیں خوف سے رھے ، یا نظربند کئے گئے تھے خود کہتے ھیں :—

امروز دلا ظلم نمایاں گردید　　بر من ستم بے حد و پایاں گردید
گشتم چو بخانہ قید ، گفتم تاریخ　　ھے ھے افسوس خانہ زنداں گردید
(۱۲۴۳ھ)

باز پرس کے خوف سے ناسخ لکھنؤ چھوڑ گئے چونکہ اعتماد الدولہ ، آغا میر معتمد الدولہ کا مخالف تھا[1] -

الہ آباد میں بیٹے کی خبر صحت چیچک سے ملی ، قطعۂ تاریخ کہا :—

نور چشم شفا ز چیچک یافت　　دلم ایں مژدۂ مبارک یافت
سال مسعود گفت پیر خرد　　صحت نور چشم سعد بود (۱۲۴۳ھ)

---

۱ - قیصر التواریخ کے مصنف کا بیان ھے کہ منتظم الدولہ نے ایک چوبدار ان کی طلب کو بھیجا ، اسے انھوں نے پندرہ روپے دے کر ٹھنڈا شربت پلایا اور تدبیر سواری اور پگڑی کی فکر میں ٹہلنے لگے - وہ مرد پیر تھا ، سرد شربت پی کر اور بازار کی مٹھائی کھا کر صورت نشہ کی اسے پیدا ھو گئی ، شیخ جی عصائے پیر کو کوٹھری میں رکھ کر باھر نکلے ، سیدھے فقیر محمد خاں رسالدار کے پاس پہنچے ، خان صاحب نے منشی کنج بہاری کے میانے میں بطریق سواری زنانہ سوار کر کے کولہار بھیج دیا - وھاں سے کانپور ھوتے ھوئے الہ آباد پہنچے -

اسی جلاوطنی کی حالت میں تھے کہ بچے کے کپڑوں میں آگ لگنے کی خبر ملی اور یہ کہ کچھ ضرر نہ پہنچا، سجدۂ شکرانہ ادا کر کے قطعہ کہا :-

نامہ ام از وطن رسید امروز کاندر آن است این خبر جان سوز
یعنی آن نو بہار گل رخسار داد سر چوں انار آتش بار
از شرر ها بسوخت پیرھنش لالہ ساں داغ یافت یاسمنش
خالقِ نار لطف کرد بر او آتشِ شعلہ در نشست فرو
بہ طفیل ـــــــــــــ جہیم نار را کرد باغ ابراھیم
صدوسی سال چوں گل خورشید خندہ زن باد آن گلِ امید
سالِ تاریخ طبعِ کاملِ ما زد رقم حیف سوختہ دل ما (۱۲۴۴ھ)

۱۲۴۵ھ میں ناسخ کانپور میں تھے، وھاں ایک لڑکا بے دردی سے قتل کر دیا گیا، ناسخ بھی متاثر ہوئے، رشک کو لکھا کہ اس واقعے کو نظم کرو، رشک نے اُستاد کی فرمائش پوری کی، چند شعر یہ ھیں (دواوین رشک نظم مبارک۔ و نظم گرامی صفحات ۳۹۵ تا ۳۹۷، ۱۲۵۳ھ، ۱۲۶۱ھ)

قابلِ تحریر ھے نقلِ عجیب فی الحقیقت یہ فسانہ ھے غریب
بچہ اک کلوار کا تھا دل ربا اک پٹھان اس ماہ رو کا محو تھا
ان دنوں تھے کانپور میں ناگہاں میرے مرشد، ناسخِ معجز بیان
سن کے یہ احوال لکھ بھیجا مجھے نامہ اس عنوان سے آیا مجھے
یہ حکایت نظم کرنا چاھیے سب حقیقت نظم کرنا چاھیے
مار ڈالا بچہ اک کلوار کا خارجی سولی پر اب کھینچا گیا ۱۲۴۵ھ

آخر بادشاہ حکیم صاحب کی زبان آوری ھے جو کیوان جاہ کی مذمّت میں تھی آزردہ ھوا، رخصت حاصل کر کے فرخ آباد چلے گئے، اب ناسخ کی بن آئی لہٰذا تاریخ کہی ''بازگریختہ'' ۱۲۴۵ھ لیکن یہ خوشی عارضی ثابت ھوئی اور حکیم مہدی علی خاں ۷ جمادی الآخر ۱۲۴۶ھ مطابق ۳ نومبر

۱۸۳۰ء پھر خلعت وزارت سے سرفراز ہوئے، ناسخ کی امیدوں پر پانی پڑ گیا، حکیم صاحب کی مدت وزارت بھی تھوڑی رہی، دو سال سے پہلے ہی ان پر عتاب آیا اور بختاور سنگھ کو حکم ہوا کہ نظر بند کر لیا جائے، ٹیڑھی کوٹھی میں حکیم صاحب نظر بند ہوئے (۷ ربیع الاول ۱۲۴۸ھ مطابق اگست ۱۸۳۲ء)۔

حکیم صاحب فرخ آباد چلے گئے، ناسخ کو کہنے کا موقع مل گیا:—

افتاد حکیم از مراتب   تاریخ بطرز نو رقم کن
از جائے حکیم هشت بر گر   سه مرتبه نصف، نصف کم کن (۱۲۴۸ھ)

وزارت روشن الدولہ کو ملی (۱۲ جمادی الآخری ۱۲۴۸ھ مطابق نومبر ۱۸۳۲ء)، ناسخ نے بھی ۲۴ یا ۲۵ نومبر ۱۸۳۲ء مطابق غرۂ رجب ۱۲۴۸ھ یک شنبہ کو کانپور سے لکھنؤ سفر کیا۔ رشک نے اس واقعے کا ذکر ایک قطعہ میں کیا ہے (دواوین رشک حاشیہ صفحہ ۳۹۹):—

استاد زماں نے لکھنؤ کو   فرمایا کانپور سے جب کوچ
ہونے بھی نہ پائے ہم قدم بوس   اے طالع بدیہ تھا عجب کوچ
اس کوچ کی عیسوی ہے تاریخ   یک شنبہ و غرۂ رجب کوچ

محمد علی شاہ کے زمانے میں پھر ان کی یاد ہوئی اور ۱۲۵۳ھ میں پھر وزارت کا قلمدان انہیں دیا گیا، ناسخ کو فرار کے سوا چارہ نہ تھا، پھر وہی دائرہ شاہ اجمل کا تھا اور وہ تھے۔ اس جلاوطنی کے عرصے میں وہ بنارس اور عظیم آباد بھی گئے لیکن کہیں جی نہ لگا اور آستانہ شاہ ابو المعالی ہی انہیں بھا گیا تھا۔ چندو لال نے حیدر آباد سے زادِ راہ بھیج کر ترغیب دی کہ حیدر آباد آ جائیں لیکن لکھنؤ کا قرب ہی تسکین کے لیے کافی تھا، آخر پریشاں ہو کر ناسخ نے کہا:—

ہر پھر کے دائرہ ہی میں رکھتا ہوں میں قدم   آئی کہاں سے گردش پرکار پاؤں میں

ایک اور شعر ہے:—

دشت سے کب وطن کو پہنچوں گا میں   کہ چھٹا اب تو سال آ پہنچا

آخر دعا مستجاب ہوئی اور ۲۶ رمضان ۱۲۵۳ھ کو حکیم مہدی علی خاں نے دنیا سے کوچ کیا اور ناسخ کی سزا ختم ہوئی۔ عید الفطر لکھنؤ کی نہ ملی، عید کے تیسرے دن اتوار کو وطن نصیب ہوا، رشک نے خوش آمدید کہی :-

از آمدن جناب ناسخ بوطن   دیدم اے رشک روئے عیش و بہبود
صوری و معنوی نوشتم تاریخ   شہر شوال بود یک شنبہ بود

۱۲۵۳ھ

اس طرح ناسخ کے تین سفر قرار پاتے ہیں: ۱۲۴۳ھ تا ۱۲۴۵ھ سفر اول ہے، سفر دوم ۱۲۴۶ھ تا ۱۲۴۸ھ ہے اور تیسرا سفر ۱۲۵۳ھ کا ہے۔ ۱۲۴۳ھ سے ۱۲۴۸ھ تک جلاوطنی کی مدت طویل تھی اس لیے چھٹا سال ۱۲۴۸ھ میں کہا تھا (کہ چھٹا اب تو سال آ پہنچا)۔ یہ تو رہی ناسخ کی سیاسی زندگی، اب اُس کی شاعری کی بابت معاصرین وغیرہ کی رائیں سنیے :-

مصحفی کی ناسخ کی شاعری کے بارے میں رائے فرخ کے حالات میں ملتی ہے۔ مصحفی کا بیان ہے (ریاض الفصحا صفحہ ۲۴۵) :-

فرخ تخلص جوانیست الکن در ابتدا بمقتضائے موزونی چیز می گفت، آخر بہ شاگردیٔ شیخ امام بخش ناسخ سر امتیاز افراختہ، در چندے کلام خود را بپایۂ پختگی رسانیدہ غرورے پیدا، کرد و غزل را برویۂ مخترعۂ اُستادِ خود برابر قصیدہ گفتن و در مجالس خواندن فخر خود دانست۔

(صغیر علی مروت (تذکرۂ ہندی صفحہ ۲۴۵) کی نسبت بھی مصحفی کی یہی رائے تھی :-

اکثر غزلش قصیدہ طور است۔

مصنف قیصرالتواریخ لکھتا ہے (صفحہ ۷۰ جلد دوم) :-

فن شاعری اور تحقیق و تصحیح الفاظ میں ان کا نظیر نہ تھا، بہت سے شاگرد رشید اس شہر میں ہوئے۔

شیفتہ (گلشن بے خار صفحہ ۲۲۲) لکھتے ہیں :-

شیخ امام بخش، از ارباب لکھنؤ است، نسیم چمن طبعہ نگہت ریز، و شمیم گلِ فکرش دلآویز، طائر بلند پرواز غورش جز بشاخ سدرہ آشیان نسازد، و مرغ تیز بال خیالش جز ببام فلک جلوۂ نیندازد، والا مایہِ عالی پایہ، بلند اندیشہ نازک خیال است و در تلاش مضمون تازہ و معنی سیراب بے مثل و مثال، از اقسام سخنوری بہ غزل سرائی مائل و غیر از غزلیات و رباعیات صنفے آخر ازو دیدہ نشد۔

نساخ کی رائے کلام کے متعلق ہے (صفحہ ۴۹۱ سخن شعرائؐ) :-

اشعار ان کے بیشتر مثالیہ و پُر مضمون ہوتے ہیں، اکثر اشعار شعرائے متقدمین و متاخرین فارسی گو کو بہت اچھی طرح سے ترجمہ کیا ہے۔ مشہور ہے کہ کچھ روزوں محمد عیسیٰ تنہا شاگرد مصحفی سے اصلاح لے کر منحرف ہوگئے تھے، سوائے غزل اور رباعی کے اور کسی صنف میں دخل نہیں رکھتے۔

صاحب طور کلیم (لکھتے ہیں صفحہ ۱۰۸) :-

از اصنافِ سخن جز بر غزل و رباعی قدرتے نداشت، بشیوۂ خود در سخن ممتاز است بلکہ کم انباز ایں قدر ہست کہ مضامین بیگانۂ پارسی گویان بیشتر بستہ است۔

بزم سخن کے موئلف کہتے ہیں (صفحہ ۱۱۰) :-

آوردہ اند کہ از محمد عیسیٰ تنہا اصلاح می گرفت باز انحراف

ورزید و خود مصلح گفتار دیگراں گردید ۔ از حق گذشتن نباید ، و حرف راستی گذاشتن نشاید روشے کہ او تراشیدہ و نقشے کہ بر صفحۂ ایجاد کشیدہ ، بر غایت رسائی ذہن او دال است ۔ شک نیست کہ ناسخ بطرز خویش شاعر ممتاز بودہ است ۔ مضامین بلند می یابد و الفاظ دل پسند می آرد ۔ آزاد کی رائے ہے (صفحات ۳۴۶ ، ۳۴۷ آب حیات) کہ عموماً کلام ان کا شاعری کے ظاہری عیبوں سے پاک ہے اور اس امر میں انھیں اتنی کوشش ہے کہ اگرچہ ترکیب کی چستی یا کلام کی گرمی میں فرق آ جائے مگر اصول ھاتھ سے نہیں جانے دیتے اور بہ سلامت روی قرین مصلحت ہے کیونکہ نئے تصرف اور ایجاد انسان کو اکثر ایسے اعتراض کے نشانے پر لا ڈالتے ھیں جہاں سے سرکنا بھی مشکل ہو جاتا ہے ۔

غزلوں میں شوکت الفاظ اور بلند پروازی اور نازک خیالی بہت ہے اور تاثیر کم ، صائب کی تشبیہ و تمثیل کو اپنی صنعت میں ترکیب دے کر ایسی دستکاری اور مینا نگاری فرمائی کہ بعض موقع پر بیدل اور ناصر علی کی سرحد میں جا پڑے اور اردو میں وہ اس سے صاحب طرز قرار پائے ، انھیں ناسخ کہنا بجا ہے کیونکہ طرز قدیم کو نسخ کیا جس کا انھیں خود بھی فخر تھا . . . . شوکت الفاظ کہتی ہے کہ اگر وہ قصیدہ کہتے تو خوب کہتے مگر افسوس کہ اس طرف توجہ نہ کی (اردوئے معلیٰ میں غالب مرحوم کا ایک خط مرزا حاتم علی مہر کے نام ہے ، اس میں لکھا ہے ناسخ مرحوم جو تمھارے استاد تھے اور میرے بھی دوست صادق الودود تھے مگر ایک فنی تھے ، صرف غزل کہتے تھے ، قصیدہ مثنوی سے انھیں کچھ علاقہ نہ تھا ۔ اسی کتاب میں چودھری عبدالغفور کے خط میں چند شعر منتخب اساتذہ متقدمین کے لکھ کر تحریر کیا ہے کہ ناسخ کے ھاں کمتر اور آتش کے بیشتر یہ تیز نشتر ھیں) ۔

نظم - سراج کی نظم لوگوں کی رائے میں ان کے رتبہ عالی سے گری ہوئی ہے اور چونکہ پابندی ترجمہ حدیث کی ہے اس لیے اس پر گرفت بے جا ہے - آزاد نے مخالفین کے اعتراض بھی نقل کر دیے ہیں : اول یہ کہ شیخ صاحب کی اکثر نازک خیالیاں کوہ کندن و کاہ برآوردن جیسی ہیں اور غزل کے اصول سمجھنے کے لیے فارسی میں خواجہ حافظ اور شیخ سعدی سے اور اردو میں سوز، میر اور جرائت سے سند ملتی ہے - آزاد کی نظر میں یہ اعتراض صحیح نہیں - فارسی میں بیدل، ناصر علی وغیرہ خیال بلند اور معنی یاب استاد کہلائے -

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ غزل میں سخت اور سنگین الفاظ استعمال کیے جس سے کلام بھدا ہو گیا ہے :-

بے خطر یوں ہاتھ دوڑاتا ہوں زلفِ یار پر
دوڑتا تھا جس طرح ثعبانِ موسیٰ مار پر

آزاد کی نظر میں مشقِ سخن سے ایسے مشکل کلام میں بھی لطف پیدا ہو جاتا ہے -

تیسرا اعتراض شیخ ناسخ کا اعتراف ہے کہ خیال بندی اور دشوار پسندی کی قباحت سمجھ کر لطفِ زبان پر آ گئے تھے لیکن محاورے میں خوبی پیدا نہ کر سکے، پھس پھسی بندش اور پھنسڈے الفاظ استعمال کر جاتے ہیں، نیز سرقے کا اتہام بھی رکھا ہے، اس الزام سے سودا وغیرہ بھی بری نہیں -

صاحب 'گل رعنا لکھتے ہیں (صفحہ ۳۵۳) :-

بات یہ ہے کہ ناسخ کی قوت تخیل نہایت زبردست ہے، ایک چیز کو وہ سو سو دفعہ دیکھتے ہیں اور ہر دفعہ کے دیکھنے میں ان کو ایک نیا عالم نظر آتا ہے، پھر وہ کلام کی بنیاد اس پر قائم کر کے تمثیل اور مبالغے سے اس میں گرمی پیدا کرنے کی کوشش

کرتے ہیں مگر اس قوت کے استعمال کرنے میں اکثر اعتدال سے گذر جاتے ہیں۔ کہیں پر مبالغہ اصلیت اور واقعیت سے اتنا دور جا پڑتا ہے کہ ان کی بلند پروازی کے سامنے آفتاب تارا بن کر رہ جاتا ہے، کہیں پر تمام عمارت کی بنیاد صرف کسی لفظی تناسب یا ایہام پر ہوتی ہے، کہیں فرضی تشبیہوں اور استعاروں پر شعر کی بنیاد قائم کرتے ہیں جو لطیف اور قریب المأخذ نہیں ہوتے، کہیں پر کسی چیز کو کسی چیز سے تشبیہ دے کر اسی کے تمام لوازم اور اوصاف اس میں ثابت کرتے ہیں حالانکہ اس سے کسی قسم کی مناسبت نہیں ہوتی۔ یہ ان کا اندازِ بیان ہے جس کا نام نازک خیالی یا خیال بندی رکھا گیا ہے اور اسی نے متاخرین کی شاعری کو تباہ کر کے چھوڑا۔ یہ لوگ صرف گل و بلبل سے دیوان تیار کر کے اس کو چمنستانِ خیال بنا دیتے ہیں اور افسوس ہے کہ یہی ان کی شاعری کا طرۂ افتخار ہے۔

غرض یہ پہلوان سخن انہتر (۶۹) کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوا۔ رشک نے قطعہ تاریخ کہا۔

وا دریغا کرد رحلت ناسخِ معجز بیاں
انتقالش داد عالم را غم جاں کاہ وائے
یک ہزار و دو صد و پنجاہ و چارم سال بود
بود از ماہ محرم پنجمیں آں ماہ وائے
اشک روز مرگ و تاریخ و سنین و ماہ گفت
بود پنجم، بست و چارم پنجشنبہ آہ وائے

(۲۴ جمادی الاول ۱۲۵۴ھ)

بقول صاحب قیصرالتواریخ حکیم زین العابدین ناسخ کا بیٹا تھا، شاگردوں

میں میر علی اوسط رشک ، محمد رضا برق ، بحر ، قلق ، منیر ، خواجہ وزیر ، عروج وغیرہ تھے۔

اصلاح زبان ناسخ کا یادگاری کا زمانہ ہے جس کو بھلایا نہیں جا سکتا ۔

۱۶ - آتش ، (خواجہ) حیدر علی نام ، خواجہ علی بخش کے بیٹے ، خواجہ عبد اللہ اصرار کی اولاد سے تھے - آبائی وطن بغداد تھا ، جلائے وطن کے بعد دھلی قلعۂ کہنہ میں آ کر ٹھہرے ، خواجہ علی بخش دلّی سے فیض آباد اور محلہ مغل پورہ میں سکونت کی ۔ آتش فیض آباد میں پیدا ہوئے ، ابھی جوان بھی نہ ہوئے تھے کہ باپ کا سایہ سر سے اُٹھ گیا ، کسی مربی کے موجود نہ ہونے سے فوج کے لڑکوں کی صحبت میں بانکے اور شورہ پشت ہوئے ، نواب محمد تقی خاں ترق (شاگرد سوز) ان کو نوکر رکھ کر اپنے ساتھ لے آئے (اخیر زمانے میں معالی خاں کی سرائے میں رہتے تھے) ۔ لکھنؤ میں ان دنوں جرائت ، مصحفی ، انشاء اور قتیل کا طوطی بول رہا تھا ، روزانہ مشاعرے ہوتے ، انھیں بھی شوق ہوا ، مصحفی کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور مشق سخن سے کمال بہم پہنچایا ، دوسرے شاگردوں سے ممتاز نظر آنے لگے ۔ مصحفی ریاض الفصحا میں (صفحات ۴ ، ۵) لکھتے ہیں :- ابتدا سے اُردو شاعری کا شوق ہے اور فارسی کا بھی ، فارسی کی طرف زیادہ میلان طبع تھا ، ان دنوں اپنا کلام مجھے دکھاتا تھا ، ذہانت ظاہر ہوتی تھی ، اب کہ عمر اُس کی انتیس سال کی ہو گئی ہے ، اُس کی طبیعت کا دریا جوش و خروش میں ہے ، اُردو نظم متانت اور پختگی میں فارسی غزل سے کم نہیں ۔ معاصرین کو اس پر غلبہ حاصل کرنا دشوار معلوم ہوتا ہے ، اگر زندگی رہی اور چند سال مشق اسی طرح جاری رہی اور کوئی رکاوٹ پیش نہ آئی تو اپنے زمانے کے یکتا شاعروں میں سے ہوگا ۔

دیباچۂ دیوان ششم میں بھی مصحفی نے ناسخ کی ناسخیت کا ذکر کرتے ہوئے آتش کی آتشیت کا بھی بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ اس نے کلام کو چرخ اثیر تک پہنچایا دیا ہے (۱۲۲۴ھ) -

بقول صاحب 'گل رعنا (صفحات ۳۵۹ ، ۳۶۰) استعداد علمی خام تھی ، مگر رواج زمانہ ، بزرگوں کی صحبت اور مصحفی جیسے استاد کی شاگردی نے شاعری کی ضرورتوں سے ان کو اچھی طرح واقف کر دیا تھا - کلام کو مشق کے زور سے قوت دیتے رہے ، اصناف سخن میں غزل کے سوا اور کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا ، زبان کی تراش و خراش صفائی اور پاکیزگی میں اتنی کوشش کی کہ اپنے زمانے کے استاد مسلم الثبوت ہو گئے -

گذر بسر شاہی وظیفے پر تھی ، پچاس یا اسی روپیہ مہینہ ملتا ، کبھی شاگرد بھی امداد کرتے ، گیروا تہ بند باندھتے ، ڈنڈا ہاتھ میں رہتا ، سچے کام کا سلیم شاہی جوتہ پاؤں میں ، ڈنڈے میں سونے کا چھلہ لگا رہتا ، بھنگ بھی پیتے تھے ، گورا چٹا رنگ تھا ، داڑھی بڑھا لی تھی ، اس پر مہندی کا خضاب ، فقر و فاقے کی شان رہتی ، ایک ٹوٹے کھٹولے پر بیٹھے رہتے ، سامنے شکستہ حقہ ، یہی تواضع میں پیش کرتے -

ایک بیٹا محمد علی نام جوش تخلص تھا ، اخیر میں بیوی کے مرنے کے بعد آنکھوں کی بینائی جاتی رہی -

۱۲۶۳ھ میں ناسخ کے مرنے کے نو سال بعد یہ بھی اپنے رفیق قدیم سے جا ملے ، رشک نے تاریخ وفات کہی :-

خواجہ و آتش تخلص نام شاں حیدر علی
صبح روزِ چار شنبہ بود ، مردند از قضا

رشک صوری ، معنوی بنوشت تاریخِ وفات
از محرم بست و پنجم صبح ، ھے ھے اربعا

ایضاً

مرد نیک و شاعرِ جادو بیاں و وضع دار
از محاسن ممتلی بودند آتش ھائے ھائے
جائے ایشاں در گلستانِ جناں بے وجہ نیست
آتش گل واقعی بودند آتش ھائے ھائے
رشک تاریخ وفات آں چہ عالم سوز گفت
یادگار مصحفی بودند آتش ھائے ھائے

مشہور شاگردوں میں میر دوست علی خلیل ، میر وزیر علی صبا ، نواب سید محمد خاں رند ، نواب مرزا شوق اور پنڈت دیا شنکر نسیم وغیرہ ہوئے۔

شیفتہ کی رائے آتش کے خلاف جاتی ھے ، شیفتہ کہتے ھیں (صفحہ ۷ گلشن بے خار) :—

از مشاهیر شعرائے لکھنؤ است روش رندانہ و وضع بیباکانہ دارد ، و مردم آں دیار آتش و ناسخ را کہ از اساتذۂ مسلم آنجا است ، قریب هم انگارند ، و هردو را هم وزن شمارند ، و قباحت ایں تحقیق لایخفیٰ علیٰ من لہٗ حظ من الفہم و مع ذلک در نکوئی طبعش سخن نیست۔

غالب کی رائے اس کے خلاف ھے ، وہ کہتے ھیں کہ ناسخ کے ھاں کمتر ، آتش کے یاں بیشتر یہ تیز نشتر ھیں۔

غالباً شیفتہ نے خیال بندی اور تلاش معانی تازہ کو کمال ناسخ تصور کرتے ہوئے آتش پر ترجیح دی ، انھیں یہ تسلیم ھے کہ لکھنؤ کے سخن فہم دونوں کو برابر جانتے ھیں اس لیے شیفتہ نے یہاں ٹھوکر کھائی ھے۔

نساخ یہ کہ کر گذر جاتے ہیں (صفحہ ۵ سخن شعرا) :—

سوائے غزل کے اور کسی صنف سخن پر قادر نہ تھے، اشعار ان کے پُر مضمون و بامزہ ہوتے ہیں۔

بزم سخن کے مؤلف (صفحہ ۴) کی رائے ہے :—

فکر بلند و طبع ارجمند داشت۔

آزاد کی سنیے (صفحات ۳۸۱ تا ۳۸۳ آبِ حیات) :—

جو کلام ان کا ہے حقیقت میں محاورۂ اردو کا دستورالعمل ہے اور انشاء پردازیٔ ہند کا اعلیٰ نمونہ، شرفائے لکھنؤ کی بول چال کا انداز اسی سے معلوم ہوتا ہے، جس طرح لوگ باتیں کرتے ہیں اس طرح انھوں نے شعر کہ دیے ہیں۔ ان کے کلام نے پسند خاص اور قبولِ عام کی سند حاصل کی اور نہ فقط اپنے شاگردوں میں بلکہ بے غرض اہل انصاف کے نزدیک بھی مقبول اور قابل تعریف ہوئے؛ دلیل اس کی اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی، کہ بار بار چھپ جاتا ہے اور بک جاتا ہے، اہلِ سخن کے جلسوں میں پڑھا جاتا ہے اور عاشقانہ غزلیں موسیقی کی تاثیر کو چمکا کر محفلوں کو گرماتی ہیں . . . .

۱۷ - میر مہدی مجروح - تاریخ وفات نواب ضیاءالدین احمد خاں نیّر و رخشاں :—

شہر دھلی کو تفوق تھا، انھیں باتوں سے
کہ نظر آتے تھے ہر فن کے یہاں اہلِ کمال
محفل شعر کے تھے صدر نشینوں میں یہی
غالبِ سحر بیاں، شیفتۂ نغز مقال
مولوی علوی و صہبائی و ذوق و مومن
اُن میں ہر ایک سخن سنج تھا، بے مثل و مثال

اب نہ باقی رہی وہ رونق شہر دہلی کی
بہر تاریخ ، یہ کیا خوب ہے ہاتف کا مقال

۱۳۰۲ھ (منقول از تاریخ لطیف قلمی مؤلفہ مولوی مہدی علی خاں صفحہ ۲۴۰)۔

جواب معترضین | میں نے خود دیوان آتش کو دیکھا ، کلام مضامین بلند سے خالی نہیں ، ہاں طرز بیان صاف ہے اور تشبیہیں فارسیت کی بھی موجود ہیں مگر قریب الفہم اور ساتھ ہی اس کے اپنے محاورے کے زیادہ پابند ہیں ؛ یہ در حقیقت ایک وصفِ خدا داد ہے ، کہ رقابت اسے عیب کا لباس پہنا کر سامنے لاتی ہے ۔ کلام کو رنگینی اور استعارہ و تشبیہ سے بلند کر دکھانا آسان ہے مگر زبان اور روزمرہ کے محاورے میں صاف صاف مطلب اس طرح ادا کرنا جس سے سننے والے کے دل پر اثر ہو ، یہ بات بہت مشکل ہے ۔

بقول مؤلف گل رعنا (صفحہ ۳۶۱) صحیح بات یہی ہے کہ زبان کی صحت و صفائی میں آتش ، ناسخ کے دوش بدوش چلتے ہیں البتہ ناسخ نازک خیالی اور بلند پروازی میں ان سے بہت اونچے جاتے ہیں لیکن سوز و گداز میں آتش بہت آگے ۔

مومن نے اردو شاعروں میں ممنون سے اثر لیا ہے ، اس کے علاوہ فارسی ادب سے بھی استفادے کی مثالیں ملتی ہیں ، بات کو ذرا سا پیچ دے کر بات کرنے کا ڈھنگ غالباً عرفی کے مطالعے کا نتیجہ ہے ، فغانی کے اثر کا وہ خود اقرار کرتے ہیں :—

چھیڑ دیکھو ، جو سنا نالۂ موزوں میرا
غیر سے شوخ نے اشعار فغانی مانگے

چھٹا باب

مومن کی شخصیت

مومن نے اپنی شخصیت کا تعارف ان الفاظ سے کرایا ہے (انشائے فارسی مخطوطہ رضا لائبریری رامپور) :-

گوہر معانیم ہمہ بے بہا است و درہائے مضامینم جملہ از دریا... یاقوت معانی رنگینم با زار لعل لب رنگیں بتاں شکستہ !

بحکم نادرہ سنجی یگانۂ دہرم
نہ کس بہ نظم عدیلم، نہ کس بہ نثاری

حکیم احسن اللہ خاں کے خط کے جواب میں ۱۲۵۰ھ کے بعد یہ تعارف نامہ لکھا ہے، وہ زمانہ کی ناقدری کے شاکی ہیں، کہتے ہیں کہ میرے نظم و نثر کا کوئی گاہک نہیں، ایسے میں کیا خطوط لکھوں؟ ایک اور خط میں عذر کرتے ہیں کہ امسال بہت سے خطوط لکھے، لیکن عوام کے روزمرہ میں تھے اس لیے نہ بھیجے۔ احمد نصیر خاں سے ایک خط میں اپنے مذاقِ لطیف کا تذکرہ کرتے ہیں :-

آخر ایں ہمہ نالہ و فریاد صریر خامۂ اوست، و چوں با شعر و شاعری دارد کنایت از صراحت نیکو تر می داند۔

نعتیہ قصیدے میں دعویٰ کرتے ہیں :-

منم کہ نیست قرانم بھیچ قرن زماں
منم کہ نیست نظیرم، بہ ھیچ شہر و دیار
نبود و نیست ، عدیلِ من امتحاں اینک
ز زندگاں لب و خامہ زمردگاں اشعار
قصایدم حسدش سبعۂ معلقہ را
بہ کعبہ کرد پشیماں ، چوں سبعۂ سیّار

آردو کے نعتیہ قصیدے میں فخریہ ہے :- (صفحہ ۱۰)

ملے ھیں خاک میں کیا کیا مرے علوم و فنون
خدا کسی کو نہ دے ایسے طالع منکوس
حکیم وہ ھوں کہ جاتے رھیں حواس اگر
کرے معارضہ ، سر دفتر عقولِ و نفوس
طبیب وہ ھوں کہ ھو سوز سینۂ بلبل
نظارۂ رخِ گلفام سے مجھے محسوس
فنونِ نظم میں میں ، نے نکالی ایسی راہ
طریقۂ شعرائے سلف ھوا ، مطموس

منقبت کے قصیدے میں اپنی زبوں حالی کا بیان کیا ہے - (صفحات ۱۶ ، ۱۷)

ھائے مجھ سا عزیز ھو یوں خوار
حیف خورشید زیر خاکستر
واہ رے چرخ تیری نافھمی
مہ اوج کمال ، فال اختر
ملک پرویز چاھیے تھا مجھے
اسے شیریں حشم کیا تھا اگر
روتے ھیں تیری جاں کو ظالم
ایک میں کیا سارے اھل ھنر

دوسرے قصیدے میں کہتے ہیں: (صفحہ ۲۴، ۵۲)

شہا کسی نے نہ دی یہاں مرے ہنر کی داد
کہ نکتہ فہم نہ تھا، ایک سرور باذل
وحید عصر ہوں میں عقلِ اولیں ہے گواہ
فریدِ دہر میں ہوں صفحۂ زماں ہے سجل
مرے کلام سے ہیں گونہ گونہ فائدہ مند
ادیب و نبض شناس و منجم و فاضل
ہے فرق لفظ جدید اور معنئ نو میں
نہ کیوں کہ چپ ہو مرے آگے افصح وائل

پانچویں قصیدے میں ناقدرئ زمانہ بیان کرتے ہیں:۔ (صفحات ۲۹، ۳۰)

نہ ہنر کے مرے پرشش نہ سخن کی مرے قدر
نہ گہر کی مرے ارزش نہ طلا کی معیار
کس قدر حکمت اشراق سے دل جلتا ہے
ہو گئے شعلۂ دوزخ مرے دل کے انوار
غم بے قدرئ ہیئت سے جگر چاک ہوا
خرق افلاک سمجھتا تھا میں کتنا دشوار
ہوا بسکہ مریضوں سے حصول الآ رنج
کر دیا مجھکو مری چارہ گری نے بیمار
در منشور مرے زینت صد صدر ہوئے
لیک بزم امرا میں نہ ملا مجھکو بار
مو شگافی کی بہت شعر میں پر فائدہ کیا
ہے وہی دست تہی شانۂ دست ادبار
دُر نایاب تو کیا خاک سے بھی منہ نہ بھرے
جس کے در پر میں کروں لولوئے شاداب نثار

نواب وزیرالدولہ والیٔ ٹونک نے دعوت دی کہ ہمارے دربار میں آؤ اور یہیں سے زاد راہ لے کر حج کر آؤ، جواب میں اظہارِ حقیقت کرتے ہیں :- (صفحات ۴۱، ۴۲)

ہے ابھی آرزوئے وصل صنم ہے ابھی حسرت ہوس رانی
فکر انجام سد راہ ہوئی سن چکا ہوں حدیث صنعانی
بعد یک چند گر خدا چاہے میں ہوں اور تیرے در کی دربانی
آ کے اس بزم میں دکھاؤں گا شعلہ ہائے خرد کی نیرانی
میرے سینے کے صفحے میں ہے رقم علم دانا دلان یونانی
مجھ تلک پہنچے ہیں آب وجد سے ورثتاً نکتہ ہائے لقمانی
سپہر افلاک عقل و دانش ہوں فطرتی ہے مری درخشانی
نسر طائر کو سمجھے ہے بے پر مرغ فکرت کی بال جنبانی
وہ خرد مند ہوں کہے ہے مجھے عقل اول حکیم لاثانی
میں روش دان حکم برجیسی میں ادا فہم سیر کیوانی
ہوں وہ نبّاض جس کے ناخن میں حرکات عروقِ شریانی
آئینہ ہے صفا سے دل میرا کیا ہوا گر نہیں ہے حیرانی
سامنے میری تر زبانی کے نطق الکن، حدیث سحبانی
میرے ربطِ کلام کو پہنچے نثر سعدی نہ نظم سلمانی
جاں فزائی مرے سخن کی دیکھ سم گنے، خضر، آب حیوانی
میرے زاغ قلم کی نیم صریر صد صیغر ہزار دستانی
میرے گوہر تمام ناسفتہ میرے یاقوت سب بدخشانی
میری نیرنگیٔ تخیل سے سیمیا گر ہے روح نفسانی
میں وہ سرمایہ بلاغت ہوں جس کے در کا گدا ہے خاقانی
انوری کے بیان میں ہے کہاں میری تقریر کی سی تابانی
ملک معنی کا شہر یار کہے دیکھ خسرو مری قلم رانی
میری نسبت سے خاک ہند کو ہے رونقِ سرمۂ صفاہانی

آج ہوتا کمال تو کہتا اب تخلص سزا ہے نقصانی

اجیت سنگھ کے قصیدۂ مدحیہ میں رقم طراز ہیں :— (صفحہ ۴۶ طبع ششم)

شاعر بے نظیر ہوں ، سحر بیان دبیر ہوں
دم ہے مرا نمونہ معجزۂ پیمبری
سحرِ حلال سے مری جادوئے سامری خجل
طور کلیم اوج فکر ، نور خدا فسوں گری
میری طلاقت لسان میری فصاحتِ کلام
چارۂ صد مریض ہے از پے گنگی و کری
میرے معاند و حسود ، ہرزہ ستائے رفتگاں
ہاجی خویش و بے خبر ، مست بلب کف آوری
ہیں یہ سگانِ جیفہ خوار ، مغز سخن سے بے نصیب
کافر استخواں پرست ، طرفہ سگی و کافری
میں وہ شہ سریر فضل ، جس کے خطیب کے لیے
اوج و حضیض آسماں ، پست و بلند منبری
فرطِ جمال سے نہیں گرچہ لباس کا خیال
تو بھی تو بکر فکر کو ، ننگ ہے زہرہ معجری
قیمتِ حسنِ یوسفی ، میرے سخن کا رو نما
ہے یہ وہ حسن ، جس کی بیع ، مایہ فزاۓ مشتری
حضرت مومن اس قدر ، لاف اگرچہ ہے درست
طولِ مقال عیب و شعر ، جملہ عیوب سے بری

کیا مومن نے مذکورہ بالا اشعار میں تعلّی سے کام لیا ہے یا حقیقتاً وہ سنجیدگی سے علم و فضل ، حکمت و فلسفہ، طبابت اور نجوم ، و شعر و سخن میں اپنے آپ کو امام سمجھتا تھا ، اس کےلیے ہمیں معاصرانہ شہادتیں تلاش کرنی پڑیں گی ۔ وہ معاصرین میں سے کسی کو اپنا مد مقابل نہ

سمجھتے تھے ، اس کا ثبوت حالی کی تحریر سے ہوتا ہے ، یادگار غالب (صفحہ ۱۸۰) میں غالب کا ایک واقعہ لکھتے ہیں :—

مرزا نے ایک غزل کے مقطع میں اپنے تئیں کم از کم شیخ علی حزیں کا مثل قرار دیا ہے اور وہ مقطع یہ ہے :—

تو بدیں شیوۂ گفتار کہ داری غالب
گر ترقی نہ کنی ، شیخ علی را مانی

مومن خاں مرحوم نے جس وقت یہ مقطع سنا اپنے دوستوں سے کہنے لگے کہ اس میں بالکل مبالغہ نہیں ہے ، مرزا کو ہم کسی طرح علی حزیں سے کم نہیں سمجھتے۔

لطیفہ - ایک صاحب نے جو مومن خاں مرحوم کی تعلّیوں سے خوب واقف تھے ، یہ حکایت سن کر کہا کہ مومن خاں نے یہ اس لیے کہا کہ وہ اپنا رتبہ یقیناً شیخ علی حزیں سے بر تر و بلند سمجھتے تھے ، ورنہ وہ ہر گز مرزا کو شیخ کے برابر تسلیم نہ کرتے۔

غالب ایک غزل میں معاصرین (فارسی گو شعرائ) کا اس طرح ذکر کرتے ہیں، آغاز مومن کے نام سے ہوتا ہے (یادگار غالب صفحہ ۲۳۰) :—

اے کہ راندی سخن از نکتہ سرایان عجم
چہ بما منتِ بسیار نہی از کم شاں
هند را خوش نفسانند سخنور کہ بود
باد در خلوتِ شاں ، مشک فشاں از دم شاں
مومن و نیّر و صہبائی و علوی وا نگاہ
حسرتی ، اشرف و آزردہ بود اعظم شاں
غالب سوختہ جاں ، گرچہ نیر زد بشمار
هست در بزم سخن هم نفس و هم دمِ شاں

آزاد ان کی عالی دماغی کا ایک واقعہ نقل کرتے ہیں (آب حیات صفحہ ۴۱۷، طبع پانزدہم لاہور) :—

لطیفہ - ان کی عالی دماغی اور بلند خیالی شعرائے متقدمین و متاخرین میں سے کسی کی فصاحت یا بلاغت کو خاطر میں نہ لاتی تھی یہ قول ان کا مشہور تھا کہ گلستان سعدی کی تعریف میں لوگوں کے دم چڑھے جاتے ہیں، اس میں ہے کیا ؟ گفت گفت، گفتہ اند، کہتا چلا جاتا ہے، اگر لفظوں کو کاٹ دو تو کچھ بھی نہیں رہتا - ایک دن مفتی صدر الدین خاں مرحوم کے مکان پر یہی تقریر کی- مولوی احمد الدین کرسانوالہ، مولوی فضل حق صاحب کے شاگرد بیٹھے ہوئے تھے، انھوں نے کہا ''قرآن شریف میں کیا فصاحت ہے، جا بجا قال، قال، قالوا، قالوا ہے -

مومن کی شہرت دھلی میں نوجوانی کی عمر میں ہو چکی تھی، مولوی عبدالقادر خاں صدر الصدور (۱۸۲۵ء روزنامچہ صفحہ ۱۳۸ قلمی) لکھتے ہیں :—

و در شاعران نوجوان مومن خاں است کہ متصل کوچۂ چیلہ و نزدیک تر ازمکان معروف بہ کالا محل خانہ دارد، مسکن بزرگان وے کشمیر است و جد برادر جدش و نیز پدر و عمش نامور اند و بطابت معروف، مواضع جاگیر آناں شامل خالصہ شریفہ شدہ اند - اکنوں مانند دیگر خاندانہائے قدیم دھلی بہ عسرت بسر می برند، بہ فارسی و ریختہ شعرھا دارد، بیتے ازو یاد دارم :—

نہ جاؤں گا کبھی جنت کو نہ جاؤں گا
اگر وھاں نہیں نقشہ تمہارے گھر کا سا

شفیتہ اگرچہ مومن کے شاگرد ہیں لیکن مسلمہ نقاد بھی ہیں اس لیے ان کی رائے بھی اہمیت رکھتی ہے (صفحات ۱۹۵، ۱۹۶، ۱۹۷ گلشن بےخار) :—

بے بہا، لعل کان سخن دانی، یک دانہ گہر دریائے معانی، قرمان

فرمائے اقلیم سخن ۔ پایه بلند ساز ایں فن بدور آور ساغر بے غش ، نواگر نغمه هائے دل پذیر و دلکش ، صاحب جا یگاه رفیع ، صورتِ معانی بیان و بدیع ، مهر سپهر نکته دانی ، واقف سیر آسمانی ، شاعر حکمت پرور ، حکیم سخن گستر ، فریدِ عصر ، یکتائے دوراں ، جامع فنون شتیٰ حکیم محمد مومن خاں ، الذی اعطاه الله تعالیٰ استعداد من الجمع من اشتات الکمال ، وجریٰ فی ریاض قلبه من ینا بیع فیضه الاقدس انهار الافضال ـــــ هر چند نظر به کمالات متنوعه شاعری دونِ مرتبه اوست . اما چوں سخن دریں فن است اعراض نا مستحسن ، زبان جادو طرازش سحر را به مرتبه اعجاز رسانیده ، و سخن دلپذیرش طول را هم پایهٔ اعجاز گردانیده ، گوهر افشانی طبع نیساں بارش ، دامن دامن کان جواهر در جیب و آستیں مفلساں انداخته و گل ریزیٔ اندیشهٔ بهار نثارش چمن چمن ریاض جنت ، بچشم نظارگیاں جلوه گر ساخته ، در جنب تفرد ذاتش ماهتاب که به یکتائی علم است ، مانند ستارگاں بتعدد مشهور ، و بضیائے شمع فکرتش ذرات نا محسوس بجلوهٔ خورشید رخشاں ، مشاهد و منظور ، در پیش چنیں نیرگیتی آرا انوری کم از سها ، و دربارگاه چنیں خدیو فریدوں فر خاقانی کمینه چاکر ، اعنی یکے از وظیفه خواران خوان نعمت اوست و " یو فراس " یکے از حاشیه برداران میدانِ مکرمتِ او ، دعوی گراں بلندآهنگ همه دانی در حضرتش نغمهٔ هیچ مدانی می سرایند و مدعیاں طلیق اللسان به پیش گاهش لب می بندند و زبان باظهار لکنت می کشایند با ایں همه صفات که مذکور شد بے تحریک محرکے به فکر سخن نمی پردازد چنانچه اکثر کلامش بخواهش داعی آثم صورت ظهور گرفته و هم تدوین افکارش را فکر باعث گشته ، دیباچهٔ آں که ریختهٔ خامهٔ من است ، دراں به تفصیل ایں ماجرا باز کرده ام ، و اکنوں که التفاتے به نظم ریخته کمتر دارد گاهے گاهے که داد سخن سنجی و سحر آفرینی می دهد بر جان دری زباناں منت ها می نهد بزعم فقیر بقوت شاعری ایشاں کم کسے برخاسته ، در هرجنس سخن آں چناں مکانتے وافی دارد که کسے

را در یک صنف ہم میسر نیامدہ و باوجود تحائف لسانین بہر دو لفظ چنداں دست گاہے نصیب او گشتہ که پارسیان ازن خودی می انگارند ، و هندیاں خود بشرف این نسبت چه نازها که دارند۔ فرد :

مناجاتیاں مدح خوان من اند خراباتیاں خود ز آن من اند

ملا ظهوری ترشیزی سه صد سال پیش این بیت گوئی در خصوص ایشان گفته و شاید که ترا ازیں دراز نفسیها اشتباهے به خاطر گزرد ، حمل بر کثرت ایتلاف والتیام کنی ، یا ازیں گفتگو هائے غرضے درمیان دانی ، لا بل هکذا لا رتبتة فیه' اگر حظے از فهم خداداد داری بیاو به دیوانش نظر کن و به تصدیق و تکذیب من زبانِ انصاف بکشا ۔

اس رائے سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مومن کی تعلیوں میں کچھ اصلیت ضرور تھی جو شیفتہ نے تائید کی ۔ دیباچۂ دیوانِ مومن میں شیفتہ نے مومن کی مدح سرائی کے ساتھ ہی مومن کے طرز کلام کی حد بندی کر دی ہے (۱۲۴۳ھ میں دیباچہ لکھا کلیات مومن صفحات ۴ تا ۷) ۔

هر حرفش گنجینۂ مضامین و معانی اوست و سخن غیر را با کلامش نسبت هذیانات مسلیمه و آیاتِ قرآنی ، تگاور طبعش را چرخ چار میں در زیر گام اولین است ۔ نازم بجولان توسن خیالش. که فراز فلک تازد و پندارد که بر زمین است. . . . . ابیات قصیده در فراوانی چوں ثوابت و در درخشانی چوں سیّاره ، اشعارِ غزل هم مانندِ ماه فروغِ نظر ، وهم مانند مهرتاب سوز ، نظارۂ مطلعش هم جلوۂ مطلع آفتاب عالم تاب ۔ مصرعش بسانِ مصرع قامتِ یار بے جواب ، مخمس چوں پنجۂ خورشید فروزاں مثمن هم رنگ هشتم باغِ جناں ، مسدساتش در شش جهت منشور ، رباعیاتش در چار دانگ عالم مشهور ، و مراعاتے که از پے تهذیبِ سخن افزوده است ۔ گفتن را بیانش کالیوه کند ، و شنیدن را شوریده که از روز آغاز این فن نه زبانے چنیں نغز ها گفته و نه گوشے چنیں نوادر شنیده ۔ انموذج را مثلے چند بیاورم

که علی البسیل التزام هر جنس سخن وے از شعر[1] پُر کن تہی است ، سنگ[2] ریزهاے الفاظ غلط که پاستانی شعرا آن را با لعل و گوهر برابر شمرده اند ، با غیر نکیر در در هائے شاهوارش نا منسلک و غیر منتظم ، و[3] دوشیز هائے فکرتش به زیور گونا گوں صنائع آراسته و چناں بے تکلف که گوئی گوئنده را بلفظ سراے سرے نبوده ۔ تنها آرائش صورت معنی در نظر داشته ۔ طرز گزیں ، روش متیں ، الفاظ شگفته و دل پسند ، معانی تازه و بلند ، چستی اسطقس تراکیب ، شوکت کلمات ، تنو مندیٔ اندیشه ، نزاکت خیال ، رشاقتِ مضمون ، رعایت مقتضائے مقام ، شوخیٔ انداز ، جزالت عبارت ، الفاظ آشنا ، معنی بیگانه ، ته نشینی ، غور ، حسن ادا ، وقفِ فکرت اوست ۔ و بر احتراز از استعارات بعیده ، و تشابیه رذیله ، و تصورات رکیکه ۔ و تد قیقات وهمی و پیچش گزارش و محسناتِ صورت آراینده و معنی خراب کننده و معانی نا آشنا ، و مضامین بیگانه صرف همت او ، ناظوره اندیشه اش از لباس عاریتی همه تن عور است و به تقاضائے یکتاۓ از متاعِ دست فر سودۂ روزگار نفور ۔۔۔۔۔۔

سر سید احمد خاں آثار الصنادید (صفحات ۱۹۲ تا ۱۹۴ طبع اول ۱۸۴۷ء)
میں اس طرح اعترافِ کمال کرتے هیں :۔

جلوه دهِ عرایسِ مضامینِ تازه ، زیبِ و سادۂ کمالات بے اندازه ، سر مستِ نشۂ سخن وری نظر باز شاهد معنی پروری ، غواصِ محیطِ تدقیق ، آشنائے بحرِ تحقیق ، پیرایه پیرائے محامد پسندیده ، حلیه طرازِ اطوار گزیده ، غازه پردازِ چهرۂ خلقِ محمدی ، مظهر آثارِ سعادت ازلی و ابدی ، محمد مومن خاں مومن تخلص ، ان کے کمالات کا ظرفِ شمار سے افزوں اور حیطۂ تعداد سے بیروں هے ، معنیٔ تازه سے قالبِ الفاظ میں جان ڈالنی اور انفاس عیسوی سے معانی پژمرده کو تازه تر از گل اور سیرابِ تر از مل کرنا ایک شیوه هے ۔ خاصه اسی سخن سنج معنی پناه کا ، آن کے فروغِ ضمیر سے الفاظ دری کوکب[5] دری[6] اور آن کی متانتِ طبع سے سخنِ ریخته ، ایوانِ ریخته اگر یه کہا جاوے که شیرینیٔ زبان حافظ

اور نمکِ سخن سعدی اور متانتِ تراکیب انوری اور نشست الفاظ خاقانی اور آیانی عباراتِ ابوالفضل ہندی اور تازگیٔ معانی کمال الدین اصفہانی اور سوا اس کے جو خوبی صنف شعراً سے کسی کے ساتھ مختص ہے، سب ان کے کلام معجز نظام میں صرف ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ زبانِ ریختہ میں وہ کمال مبداء فیاض سے حاصل ہوا ہے کہ سودا کو ان کے سخن کے رشک سے جنون اور میر ان کے کلام کی خجلت سے مرقد میں سرنگوں، سخن گوئی کو بحدِ اعجاز پہنچایا اور شعر نے ان سے حکمت کا مرتبہ پایا۔ نکاتِ سخن اور دقایقِ سخن ان کے قلم سے اس طرح گرتے ہیں جیسے ابر سے بارانِ لطافت، ان کی طبیعت اور فروغ ان کے ضمیر میں ایسی ہے جیسے آئینہ میں صفا اور مشرق میں خورشیدِ رخشان، ابیاتِ ان کے مثل بیت ابر و سراپا انتخاب اور اشعار ان کے مانند مصرع زلف مجموعۂ آب و تاب، سخن ان کا باوصف پُر گوئی کے رکاکت سے خالی اور فکر ان کا باوجود غور کے عالی، ۔۔۔۔۔

کریم الدین (تذکرۂ طبقات شعرأ ہند ۱۸۴۸ء) اس طرح مدح سنج ہیں :—

ایسے ذہین اور ذکی اور ظریف اور عقلمند آدمی کم ہوتے ہیں۔ حال اُن کی استعداد کا یہ ہے کہ عربی میں شرح ملاء تک اور فارسی خوب جانتے ہیں اور کچھ طب میں بھی مہارت ہے۔ اصلاح اشعار کی شاہ نصیر سے انہوں نے لی ہے مگر در باب فنونِ نظمیہ کہ خدا نے اُن کو وہ بہرہ دیا کہ اپنے اُستاد نصیر وغیرہ تمام اقران پر سبقت لے گئے، شعر ان کا بہت اچھا ہوتا ہے۔۔۔۔ یہ شاعر اس طبقے میں بڑے اُستاد کامل شمار کیے جاتے ہیں۔ مومن دہلوی، ناسخ لکھنوی، آتش لکھنوی، نصیر دہلوی، ابراہیم ذوق دہلوی سوائے اُن کے اور شاعر بھی بہت اچھے کہنے والے ہیں مگر یہ لوگ ٹکسالی ہیں، ان کے کلام کی سند ہو سکتی ہے بخلاف اوروں کے کہ وہ لوگ اُن کے شاگردوں میں سے ہیں یا آنکہ اُن کے متبع ہیں سوائے اس کمال شاعری کے مومن مذکور کو علم نجوم اور رمل بھی بہت خوب آتا ہے، عروض جانتا ہے۔۔۔ اب پابند نماز و روزہ کے بھی بہ نسبت سابق کے بہت ہیں۔

گلستانِ سخن کے مؤلف اس طرح تعارف کراتے ہیں (گلستانِ سخن صفحہ ۳۴۳) :—

زمینِ سخن اُس کی بلندیٔ فکر سے رشکِ افلاک اور اوج فلک اُس کی علوئے طبع کے مقابل پستیٔ خاک، عروسِ معنی اُس کے حجلۂ طبع میں شوخ و برجستہ، رازِ غیب اُس کے سینۂ قلم میں سر بستہ، خامہ اُس کے سوزِ معنی سے نخل طور اور ورق اُس کے فروغ مضامین سے مطلع نور، مصرعِ آہ اُس کی غزل عاشقانہ میں تضمین اور اسرارِ یقین اُس کے ابیاتِ عارفانہ میں گوشہ گزیں، سخن سنجان عصر ہر چند بالا دویٔ فکر سے عرش تاز تھے لیکن جو کہ یہ والا نگاہ اپنی ہمت عالی کے اوج سے سب کے احوال پر نگاہ کرتا تھا، ہر سر بلند اُس کو پست اور ہر بزرگ اُس کو خرد نظر آتا اور وہ بے تصنع اُس کا نام اُسی پندار کے موافق زبان پر لاتا اور ہر چند مساحانِ اقلیم کمال، منازلِ دور دراز طے کر کے نشیب و فرازِ راہ سے واقف اور راہ و بے راہۂ سخن سے آگاہ تھے لیکن بسکہ یہ چابک خرام، کمال پیش بینی سے مراحل بے شمار باقی پاتا تھا، اُن کو کاہل قدم اور شکستہ پا جان کر بے اختیار ریش خند کرتا اور ان تیز قدموں کو نقش پا سے نارسا بتاتا جو کہ کوتاہ بینان روزگار، اس والا پائے گی اور علوئے ہمت سے آگاہ نہ تھے، اس کی نگاہ کو عیب بیں اور اس کی زبان کو خردہ گیر تصور کر کے زبانِ سرزنش دراز اور طومار شکوہ دراز کرتے۔

مذکورہ بالا آرائے ایسے اصحاب کی ہیں جو مومن کے احباب اور ملاقاتی اور باخبر ہیں اس لیے ان کی رایوں میں مومن کی شخصیت واضح طور پر نمایاں ہو جاتی ہے: شیفتہ صرف شاگرد ہے لیکن وہ مسلمۂ نقاد ہے اس لیے دوستی اور شاگردی کے علاوہ اس کا فرض تنقید بھی جادۂ راستی سے بالکل نہیں ہٹا سکتا، سر سید احمد خاں کے نانا خواجہ فرید کے خلاف مومن نے دو قطعے انتہائی توہین آمیز کہے ہیں اس لیے سر سید احمد خاں کو موقع تھا کہ آثار الصنادید میں اس کا بدلہ لیتے لیکن انھوں نے بھی انصاف کو

ھاتھ سے نہیں جانے دیا اور مومن کی خصوصیات بڑی کشادہ دلی سے بیان کی ھیں ، مولوی عبدالقادر رامپوری نے دھلی کی بزم سخن کے نواجوان شعرأ میں مومن کو قابل ذکر پایا اور نہ صرف بزم سخن دھلی کی ترجمانی کی بلکہ اپنی تائیدی رائے بھی پیش کر دی ، ذوق اور غالب آن کی اور ارباب کمال دلی کی نظر میں آس وقت تک قابلِ اعتنا نہ تھے ، یہ آزاد مستند رائے ھمیں آس فاضل زمانہ کی ملتی ھے جو مسلمہ ادیب ھے اور غالب کی نظر میں بھی قابل استناد اس لیے جنبہ داری کا سوال ھی پیدا نہیں ھوتا ھے -

کریم الدین نے دلی میں شاہ نصیر اور ذوق اور مومن کا عروج دیکھا (۱۸۴۸ء) وھی بیان کر دیا (صفحہ ۳۴۴ طبقات شعرأ) :-

وہ غالب سے بھی شناسا ھے اور مومن سے بھی لیکن وہ مومن کو ملک الشعرأ سے موسوم کرتا ھے - (گلدستہ نازنیناں ۱۸۴۴ء صفحہ ۱۰) - اس سے بھی یہی اندازہ ھوتا ھے کہ دلی میں مومن کی شخصیت غالب اور ذوق سے بلند تھی -

مزرا قادر بخش صابر دھلوی گلستان سخن میں مومن کی بلند نظری کی وضاحت کرتے ھیں اور معترضین کو جو مومن کی تعلیوں کے شاکی تھے ، جواب دیتے ھیں کہ حقیقتاً بجا طور پر مومن اپنے معاصرین کو اپنے مقابل میں کوتاہ نظر اور کم مرتبہ سمجھتا تھا ، اس کی فکر رسا اور ھمت عالی کے سامنے معاصرین شکستہ پا تھے اس لیے مومن کا استہزا آن پر درست ھے ، آس پر نکتہ چینی اور عیب بینی کا اعتراض غلط ھے -

اس کی تائید ایک اور روایت سے ھوتی ھے (بہادر شاہ ظفر از رئیس احمد جعفری صفحہ ۱۶۴) :-

خاں صاحب نے فرمایا کہ مولوی سراج احمد صاحب خورجوی فرماتے تھے کہ مومن خاں اور مولوی فضل حق صاحب شطرنج کھیلا کرتے تھے اور مومن خاں کھیل میں غالب رھتے تھے ، ایک مرتبہ مزرا غالب نے

مولوی فضل حق صاحب سے کہا کہ آپ اس قدر تیز طبع اور ذہین ہیں پھر کیا بات ہے کہ مومن خاں سے مات کھا جاتے ہیں ۔ مولوی فضل حق صاحب نے فرمایا کہ مومن بھیڑیا ہے ، اُسے اپنی قوت کی خبر نہیں ہے ، وہ عشق و عاشقی کے قصوں میں پھنس گیا ، اگر علمی مشغلے میں پڑتا اُس وقت اُس کے ذہن کی حقیقت معلوم ہوتی ۔ فی الحقیقت نہایت ذہین آدمی ہے ۔ (امیر الروایات صفحہ ۱۶۱) ۔

آزاد نے مومن کا زمانہ پایا ہے لیکن آبِ حیات میں مومن کو جگہ نہ دے کر ادبی ظلم کیا ، جب معاصرین نے اعتراض کیا تو عذر لنگ پیش کر دیا کہ میں نے اُن کے احباب کو خطوط لکھے کسی نے جواب نہ دیا اس لیے بغیر کافی معلومات کے تذکرہ میں جگہ نہ دی جا سکتی تھی ؛ اب طباعت ثانی کے وقت پھر تحریک کی آخر طباعت کتاب کے وقت مراسلہ وصول ہوا جو بجنسہ اختصار کے ساتھ پیش کیا جا رہا ہے ۔

حقیقت اس کے خلاف ہے ؛ مومن کے کلام میں شیعیت پر جا بجا اعتراضات ہیں جس کی خلش آزاد نے بھی محسوس کی ، سر سید نے فراخ دلی سے کام لیا اور اپنے نانا کی توہین کو برداشت کر لیا اور مومن کا ذکر مناسب الفاظ میں کیا لیکن آزاد مومن کے اس رویے سے بیزار تھے ۔ مومن نے مشہور زمانہ مجتہد غفران مآب سید دلدار علی کی وفات پر دل آزارانہ قطعہ کہا جس کا شعر ہے (نسخہ مخطوطہ دیوان فارسی مومن رضا لائبریری رامپور) :—

خبر تا یافتم من هم به کلکِ راستی طینت
به دوزخ رفت بے دیں سالِ مرگ او رقم کردم (۱۲۳۵ھ)

یہ رویہ قطعاً پسندیدہ نہ تھا ، آزاد نے اسی لیے ان کا ذکر نظر انداز کر دیا اور دوبارہ بھی مراسلہ موصولہ کو بھی بجنسہ درج نہیں کیا ۔
مراسلہ نگار کا بیان ہے[1] (آب حیات صفحات ۴۱۶ ، ۴۱۷) :—

---

۱ - شیخ محمد اسماعیل پانی پتی لکھتے ہیں :— مولانا الطاف حسین حالی نے اُن کی درخواست پر مومن کے مفصل حالات لکھ کر بھیجے تھے ۔ (تذکرۂ شعرائے متغزلین) ۔

ان کی تیزیٔ ذہن اور ذکاوتِ طبع کی تعریف نہیں ہو سکتی، وہ خود بھی ذہانت میں دو شخصوں کے سوا کسی ہم عصر کو تسلیم نہ کرتے تھے: ایک مولوی اسمٰعیل صاحب، دوسرے خواجہ محمد نصیر صاحب کہ آن کے پیر اور خواجہ میر درد کے نواسے تھے۔

اس پر آزاد مرحوم نے نوٹ لکھا ہے کہ اس سلسلے میں نواب مصطفیٰ خاں کی ایک وسیع تقریر ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایسا ذکی الطبع آج تک نہیں دیکھا، ان کے ذہن میں بجلی کی سی سرعت تھی وغیرہ وغیرہ، ساتھ اس کے مراسلت میں بعض آور معاملے منقول ہیں مگر ان میں بھی واردات کی بنیاد نہیں لکھی مثلاً یہ کہ مولا بخش قلق، مولوی امام بخش صاحب صہبائی کے شاگرد دیوان نظیری پڑھتے تھے، ایک دن خاں صاحب کے پاس آئے اور ایک شعر کے معنی پوچھے، انھوں نے ایسے نازک اور نادر مطلب بیان فرمائے کہ قلق معتقد ہو گئے اور کہا کہ مولوی صاحب نے جو معنی بتائے ہیں وہ آس سے کچھ بھی نسبت نہیں رکھتے لیکن نہ وہ شعر لکھا ہے نہ کسی صاحب کے معنی لکھے ہیں، ایسی باتوں کو آزاد نے افسوس کے ساتھ ترک کر دیا ہے، شفیق مکرم معاف فرمائیں۔

آزاد مرحوم کا تمثیلی واقعہ پر اعتراض درست ہے لیکن مومن کے بہت سے شناسا اور احباب اور شاگرد آزاد کی نظر سے گزرے ہوں گے، آن کے سماعی واقعات وہ آسانی سے لکھ سکتے تھے، صحیح واقعات کی تائید کرتے اور غلط واقعات کی تردید۔ آزاد کی ولادت ۱۲۴۳ھ مطابق ۱۸۲۷ء میں ہوئی اور مومن کی وفات کے وقت آن کی عمر پچیس سال کی تھی، آنھوں نے مومن کو مشاعروں میں شریک ہوتے دیکھا، آن کے حالات مشاہدہ کیے اور گذشتہ روایات سنی ہوں گی؛ پھر وہ مومن کے متعلق کیا ساز و سامان چاہتے تھے جو میسر نہ تھا اس لیے ہمارا یہ شبہ درجۂ یقین کو پہنچ جاتا ہے کہ مومن کے ذکر کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا گیا اور دوبارہ جب

آبِ حیات میں جگہ دی گئی تب مناسب درجہ نہیں دیا ، حالانکہ آزاد نے متقدمین اور متاخرین شعرأ میں سے بعض کو زندہ جاوید کرنے میں خاص کردار ادا کیا مگر مومن کے عیوب گنانے میں وہ پیش پیش نظر آتے ہیں مثلاً کلام کے سلسلے میں لکھتے ہیں (حاشیہ صفحہ ۴۲۰ آبِ حیات طبع پانزدہم) :—

بعض اشعار پر لوگوں کے اعتراض اُن کی تفصیل و تحریر ایک معمولی بات ہے مثلاً شمر جو بالتسکین ہے اسے شمر بالفتحتین باندھا ہے :—

دل ایسے شوخ کو مومن نے دے دیا کہ جو ہے
محب حسین کا ، اور دل رکھے شمر کا سا

یا نوحہ زنی کی نئی ترکیب ہے (دیکھو صفحہ ۴) اور ایسے ایجاد ان کے کلام میں اکثر ہیں۔

ان کی عالی دماغی کے سلسلے میں جو لطفیہ مولوی احمد الدّین ساکن کرسانوالا کا نقل کیا ہے ، اس سے مومن کی سبکی ہوتی ہے ، اگر آزاد مرحوم پورا مراسلہ نقل کر دیتے تو نواب مصطفیٰ صاحب شیفتہ اور دوسرے اصحاب کمال کی آرائے مومن کے بارے میں معلوم ہو سکتی تھیں۔

اس کے باوجود مومن ذہانت میں مولوی اسمٰعیل شہید اور خواجہ محمد نصیر کے قائل تھے، آبِ حیات سے یہ بات معلوم ہوتی ہے (مرآت الشعرأ جلد اول۔ مولوی محمد یحییٰ تنہا۔ مطبوعہ عالم گیر الیکٹرک پریس لاہور صفحہ ۳۸۶) :—

آپ کا نام حکیم مومن خاں اور تخلص مومن ہے۔ ولادت بمقامِ دھلی ۱۲۱۵ھ میں ہوئی ، والد کا نام حکیم غلام نبی خاں تھا۔ دھلی کے شرفا میں سے تھے۔ شعر و سخن کے علاوہ شطرنج اور نجوم سے بھی دلچسپی تھی۔ نجوم کے بعض تذکروں میں آپ کے احکام کی بہت تعریف لکھی ہے ، اپنے ایک شعر میں بھی اس طرف اشارہ کیا ہے، فرماتے ہیں :—

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس   آسمان بھی ہے ستم ایجاد کیا

آپ نے قصائد بھی لکھے ھیں لیکن ارباب دنیا کی تعریف میں کچھ نہیں کہا البتہ ایک قصیدہ مدحیہ میں ایک ھندو راجہ کی عنایت کے شکریے میں ضرور کہا ھے جس کا مطلع ھے :-

صبح ھوئی تو کیا ھوئی ھے وھی تیرہ اختری

ورنہ حقیقتاً آپ اس قدر غیور تھے کہ کسی عزیز یا دوست کا ادنیٰ احسان بھی گوارا نہ کرتے تھے -

جدت ادا - | شاعری میں اور خصوصاً غزل میں اصل چیز اور سب سے بڑی خوبی انداز بیان کی جدت ھے یعنی جو بات شعرا پہلے کہ چکے ھیں اس کو نئی طرز سے کہا جائے ، یہ وصف شاعروں کی ذھنی ترقی اور زبان کی وسعت کا نتیجہ ھوتا ھے ، اس کا خلاصہ یادگار غالب میں بقول حالی یہ ھے : قدیم خیالات و جذبات میں اپنے اپنے مبلغ فکر کے موافق نزاکتیں اور لطافتیں پیدا کرنے لگے ، یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ مرزا غالب نے سب سے پہلے یہ طرز اختیار کی تھی ، مرزا سے پہلے بھی بعض شعرأ کے کلام میں اس نئی طرز کی کہیں کہیں جھلکی نظر آ جاتی ھے مگر اس میں شک نہیں اول مرزا نے اور انھیں کی تقلید سے مومن ، شیفتہ ، تسکین ، سالک ، عارف ، داغ وغیرھم نے اس طرز کو بہت زیادہ رواج دیا خصوصاً مومن خاں مرحوم اس خصوصیت میں مرزا سے بھی سبقت لے گیے (صفحہ ۹۵)- داغ کے یہاں میر و مصحفی کا رنگ نہیں، غالب کا تخیل بھی نہیں البتہ مومن کی معاملہ بندی و شوخیٔ بیان ھے -

نساخ کی ولادت یکم شوال ۱۲۴۹ھ (شمع انجمن صفحہ ۴۸۷ نواب صدیق حسین خاں) کو ھوئی ، بارہ سال کی محنت کے بعد ۱۲۸۱ھ میں انھوں نے تذکرۂ سخن‌شعراء تیار کیا یعنی ۱۲۷۰ھ کے آغاز میں نساخ نے تذکرے کی بنیاد ڈالی ، مومن کے انتقال کے وقت ان کی عمر انیس سال تھی اور شعر و سخن سے دلچسپی رکھتے تھے - تذکرے کی تالیف کے دوران انھوں

نے دھلی تک سفر کیا اور اس وقت کے موجود شعراء سے ملاقاتیں کیں اور هر مکتبۂ فکر سے واقف ہوئے اس لیے مومن کے متعلق بھی ان کی رائے زیادہ اہم مانی جائے گی ، وہ لکھتے ہیں (سخن شعرأ صفحہ ۳٦۷) :—

علم تنجیم و طب میں خوب دخل رکھتے تھے ، جمیع اصناف سخن پر قادر تھے ، اشعار ان کے پُر مضمون و شیریں و عاشقانہ و نمکین ہوتے ہیں ، راقم کے زعم میں اس مزے کی طبیعت کا کوئی شاعر ریختہ گویوں میں گزرا نہیں ، کلیات ان کا نظر سے گزرا ۔

نواب صدیق حسن خاں شمع انجمن (مطبوعہ بھوپال ۱۲۹۳ھ صفحہ ۴۴۸) میں تحریر کرتے ہیں :—

مومن کامل و شاعر قابل بود ، همیشه پری زادان معنی را به دام معانی صید می کرد ، و سخن در فارسی و ریخته هر دو می سرائد ، از شعرائے نامور شاهجهان آباد و صاحبان استعداد خدا داد است ، در سالے که نامه نگار بنام نهاد طلب علم وارد الکۂ مذکورگردید ، چند ماه پیش از رسیدنم مومن رخت حیات به غفران کدۂ آخرت کشیده بود ۔

سید نورالحسن خاں تذکرۂ طور کلیم (صفحات ۹۷ ، ۹۸ ، ۱۲۹۸ھ) میں رقم طراز ہیں :—

در طب ید طولیٰ داشت و در نجوم پایۂ والا ، بر جمیع سخن قادر بود ، از لطائف شعر و شاعری کما هو حقه، ماهر ، به قوت مومن . کم کسے بر خاسته ، و بهر دو لفظ چنداں دستگاهے نصیب او گشته ، که پارسیاں از آں خود می انگارند ، و هندیان بشرف هم زبانی نازها دارند—الحق دریں فن محسود ابنائے روزگار است و مشهور هر شهر و دیار ، ناظورۂ بیان باز کش، سرمایۂ حیاتِ عشاق ناکام و معشوقۂ کلام دلاویزش ، تسلی خاطر هائے پُرآلام مذاق آشنایان معنی از عذوبت کلام شیرینش ذائقه لطف برداشته اند و نکته شناسانِ نغز گفتار سخنِ جادو فریبش را افسون دلربا نگاشته اند همانا وفات او در ۱۲٦۸ھ واقع شده ۔

سید علی حسن خاں اپنے بھائی سے مدح طرازی میں کم نہیں رہتے ہیں ، ان کی رائے یہ ہے (صفحہ ۱۰۸ بزم سخن) :—

جہان اوستاد است عالمے از بخل و جودش ثمر پایہ دامن بدعا آورد ، دانا داند کہ پایۂ ریختہ از پستی بہ اوج رسانده اوست زبانش سحر سامری می نماید و بیانش گرۂ دل بستگی می کشاید غزلیات او لاجواب است و مثنویات او مغز انتخاب علاوہ این فن در طب دستگاہ وافر داشت و از پارسی بہرۂ متظافر ، و بہ ایں ہمہ برخلاف طائفۂ شعرا کہ بیشتر مشرب آزادگی و وآرستگی پسندیدہ اند عقیدۂ مقبول کیش خود کردہ و بر جادۂ مستقیم است پائے عقیدت افشردہ ۔

مولوی نصر اللہ خاں قمر گلستان ہمیشہ بہار (مطبوعہ ۱۲۷۱ھ صفحہ ۱۱۱) میں اس طرح بیان کرتے ہیں :—

از دودمان گرامی و از خاندان نامی است ، از روز ولادت الی آن بسبب موافقت جہاں آباد واہل آں بسمتے حرکت نہ کردہ ، و بہ وصل شاہداں شیریں و وصال یاران رنگیں ۔ بہ لبان نوشیں کام و زبان حلاوت آگیں نکتہ دان ، سخن گوئے بروش نیکوئے درطب طبع آزمودہ، و در علم نصیبے کافی ربودہ ، دیوانش مملو از اصناف سخن ، و شہرۂ مثنویات او باکناف زمن ، امروز جنس سخن را در بازار سخن وراں ازو رواج و بہ زمرۂ عشقبازاں ایں دیار عالی مزاج است ، اگرچہ باو بر نخوردہ ام ، فاما تیر محبتش بر دل خوردہ ام

یادگار شعرأ مرتبہ طفیل احمد مطبوعہ ہندوستانی اکیڈیمی الہ آباد ۱۹۴۳ء صفحہ ۱۹۹ ، ۲۰۰ میں ہے (ترجمہ فہرست کتب خانہ شاہ اودھ از اثیر نگر) :—

اب دلی میں بہترین شاعر اور اچھے طبیب ہیں ، فارسی اور ریختہ کہتے ہیں ایک دیوان اور کئی مثنویاں کہی ہیں (گلشن بے خار) ، اپنے

مکان کی چھت پر سے گر کر مرے (۱۸۵۲ء) -

مولوی کریم الدین پانی پتی نے ۱۸۴۴ء میں مخصوص اساتذہ کا انتخاب کلام گلدستۂ نازنیناں (صفحات ۱۰۲ و ۱۰۳) کے نام سے شائع کیا ہے ، اس میں تعریف کرتے ہیں :—

مومن شاعر بے نظیر ، خاکِ پا جس کی باب شاعری میں اکسیر ، لعل کانِ سخنوری بے بہا ، سخن دانی میں گوہر یکتا ، عالم جمیع اصناف سخن ، واقفِ اصرار سخن ، چشمۂ فیض اس کے یے سب دانی و قاصی کامیاب فنون حکمیه اور احوالات سیاریات میں گوہر نایاب .... خاقانی ہر چند که زبان فارسی کا زبانِ مقدم میں گزرا لیکن اگر وہ بھی ہوتا تو جبین نیاز آستان اس شاعر پر گھستا گھستا مر جاتا ، وہ لطافت جو کلام فارسی اس شاعر کے میں ہے ہرگز نه پاتا ، کلام اس کے کو اگر سحر کہیں تو بجا ہے اور اگر افسوں کہیں تو سزا ہے اور اگر اعجاز کہیں تو سچ ہے ، حقیقت میں یه شاعر اسی رتبه کا ہے ، میر نے گرچه طرز نو اختیار کی پر اس رتبے کو نه پہنچ سکا ، سودا کو گو دعویٰ ہمسری ہر شاعر کا سودا ہو پر یہاں وہ بھی دیوانه ہو گیا ، خاقانی و فیضی و انوری اگرچه فیض خاقان سے منور ہوئے پر ان کے سامنے ان کا بھی چراغ نه روشن ہوا ، حکیم اس پایے کے که بو علی سینا اگر تمام عمر قانون طبابت کے سیکھنے میں گنوائے پر ان کے سامنے نبض دیکھنے کا شعور نه پائے ، المختصر موصوف به جمیع صفات کمالِ اور قادر ہر تمام فنون حکمة ، نام ان کا حکیم محمد مومن خاں سلمہ‌اللہ تعالیٰ ، قلم میں یه طاقت کہاں که ایک شمه شمائل شاعر موصوف کا لکھ سکے ، ناچار تمام اوصاف اس شاعر بے بدل ، جامع جمیع کمال و فضل کے ذہن متہم نارسائی کا نه کر کے قلم انداز کیے جاتے ہیں اور کچھ اشعار ان کے دیوان سے قلم برداشته لکھے جاتے ہیں کیوں که اس شاعر کا دیوان ہی اس قابل نہیں ہے که

اس میں سے انتخاب کیا جائے بلکہ سب اشعار درجہ مساوات کا خوبی اور مرغوبی میں رکھتے ہیں۔

تاریخ جدولیہ کے مؤلف خادم علی (صفحہ ۱۴۴) کی رائے بھی قابل دید ہے:—

مضامین اچھے الا بندش میں کچھ کلام ہے —

جلوۂ خضر (جلد اول صفحہ ۲۳۵ تا ۲۴۰) میں سید صفیر احمد صفیر بلگرامی اپنی نقادانہ رائے کا اس طرح اظہار کرتے ہیں:—

مومن خاں ۔ انڈر سیکرٹری | یہ خود حکیم تھے اور حکیم غلام نبی خاں دہلوی ولد حکیم نامدار خاں کے بیٹے تھے ۔ قول آزاد... یہ شاہ نصیر کے شاگرد تھے، بہرحال انھوں نے بھی استاد سے انحراف کیا، آخر خود اسی نئی تراش کی راہ پر چلنے لگے، مذاق ان کا بالکل جرأت کا تھا کیونکہ عادت اور طبیعت ویسی ہی رکھتے تھے، محلات کی سیر اور بیگمات کی صحبت اور عشق اور عاشقی کے چرچے ہمیشہ رہا کرتے تھے اور اپنی مثنویوں میں مومن خاں نے اپنا ہی قصہ نظم کیا ہے مگر طبیعت کی جودت اور قدرت نے دقت پسندی پر مائل کر دیا تھا... الغرض اس تحریر سے مقصد یہ ہے کہ دہلی کے زمانۂ آخر کے اساتذہ کہ مسلم الثبوت تھے، ان میں ہر ایک نے بندش میں اپنی طرز خاص اختیار کی مگر زبان کی صورت وہی رہی، محاورات پر چنداں توجہ نہ فرمائی، اگلے محاورے ان کے کلام میں بہت بھرے پڑے ہیں جن کا جی چاہے دیکھ لے بلکہ بندش کا طریق بھی میر تقی اور سودا سے لے کر ذوق و مومن تک یکساں ہے اور دہلی کی زبان کا ان ہی لوگوں پر خاتمہ ہوا، پس دہلی کے اساتذہ کا سرمایہ اسی قدر تھا جس قدر اس جلد سے ظاہر ہے... مومن خاں عاشق تن برشتہ طبیعت تھے اور حکمت نے ان کے عشق مجازی کے لیے نردبان کا کام لیا تھا، بڑے بڑے محلوں میں پہنچ جاتے اور اپنے نسخے چھوڑ آتے، مثنویوں سے ان کے کاروبار کی

حقیقت بخوبی واضح ہوتی ہے ، طبیعت کی وارستگی اور شوخی نے ان کے کلام میں علم کے ساتھ ضم ہو کر عجیب مزا پیدا کر دیا تھا ، زور طبیعت سے اس نہانی واقعات اور واردات خاطر کو تو ایسے پیرائے میں باندھ جاتے ہیں کہ دوسروں کے لیے کارے دارد ، واقعی عجب بامذاق شاعر ہو گیا ہے ، جرأت اس رنگ کے موجد تھے (صفحہ ۲۴۱) مگر بسبب کم علمی کے بہت کھل گئے تھے ، مومن خاں کے علم نے ان واقعات کو مشکل بندش اور پرانی ترکیبوں سے ایسے پردے میں رکھا کہ ادا شناس ہی اس کے مزے کو جانتا ہے ، اس سبب سے اکثر ان کے اشعار کو لوگ بے معنی بتاتے ہیں ، اس جگہ بسبب تطویل کے ترک کیا ۔

صفیر بلگرامی کی اسی رائے کے بعد حسرت موہانی کی تفصیلی رائے مومن کے مطالعے کے سلسلے میں ضرور دیکھنے کے لائق ہے۔ رسالہ اردوئے معلیٰ مئی ۱۹۰۵ء میں صفحات ۱ تا ۱۹ مومن کے متعلق تذکرۃالشعرأ کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں :۔

اہل لکھنؤ نے فارسی گوئی کو ناسخ و آتش ہی کے عہد سے ترک کر دیا تھا ، برخلاف ان کے اہل دہلی آخر وقت تک اسی روشِ قدیم کو نباہتے رہے ۔ چنانچہ میر و مرزا سے لے کر غالب و مومن تک بلکہ شیفتہ شاگرد مومن تک قریب قریب ہر استاد نے اردو گوئی کے ساتھ فارسی کو بھی ہاتھ سے نہیں جانے دیا اور اصل یہ ہے کہ لکھنؤ کی شاعری میں ناسخ کے وقت سے تصنع اور بے تکلفی کا جو عیب پیدا ہو گیا ، جس نے بلا مبالغہ لکھنؤ کی شاعری کو بالکل بے رنگ و بو کر دیا ، اس کا سبب بڑا یہی ہوا کہ لوگوں کی طبیعتیں فارسی زبان سے نا آشنا ہوتی گئیں ، حتیٰ کہ لکھنؤ کی شاعری نئی اور دلچسپ ترکیبوں ، نیز تازہ اور شگفتہ مضمونوں سے بیگانہ ہوتی گئی اور درد و اثر سے تو بالکل عاری ہو گئی ۔

ناسخ کا کلام بحیثیت فنِ شاعری نہایت مکمل اور صحیح ہے لیکن

بلحاظ لطفِ شاعری ملاحظہ کیجیے تو ایک گلدستہ ضرور ہے مگر کاغذی پھولوں کا۔

اب اس کے برخلاف مومن دہلوی کا دیوان اٹھائیے تو باوجود زبان اور فن کی لا تعداد کمزوریوں کے آپ اس میں سینکڑوں ایسے شعر پائیں گے، جن کو دیکھ کر دل و دماغ کو فرحت اور سرور اور روح کو کشادگی اور بالیدگی ہوگی۔

حکیم مومن خاں مرحوم کے اردو کلام میں جتنی غلطیاں ہیں اتنی شاید اُن کے برابر والے ہم عصروں میں سے کسی کے دیوان میں نہ ملیں گی اور غالباً اسی خیال سے حضرت آزاد صاحبِ تذکرۂ آب حیات نے ذوق و غالب کے ساتھ ان کا حال درج تذکرہ نہ کیا ہوگا۔ اگر اتنی غلطیاں لکھنؤ کے کسی شاعر سے سرزد ہوتیں تو اس کی نسبت کوئی استادی کا گمان بھی نہ کرتا لیکن مومن خاں کی اُستادی کو جس چیز نے قائم رکھا وہ ان کی فارسی زبان کے ساتھ طبعی مناسبت تھی جن کو دیکھ کر پڑھنے والا ان کی لغزشوں کو فراموش کر دینے پر مجبور ہو جاتا ہے مثلاً ان کی چند کمزوریوں کو ملاحظہ فرمائیے :—

(۱) اے محتسب نہ توڑ تو شیشے کو دیکھنا
آتی ہے مجھکو سنگ دل ، دل شکن کی یاد

یہاں ''سنگ دل'' صفت ہے اور جب تک اس کے ساتھ موصوف بھی مذکور نہ ہو مثلاً یار سنگ دل ، اس وقت تک اس سے محبوب مراد لینا قطعی غیر فصیح ہے ، ایک صورت اس خرابی کے رفع کرنے کی اور بھی ہے کہ صفت کے ساتھ ''وہ'' ''اس'' یا ''ایک'' کی قسم سے کوئی لفظ زیادہ کر دیا جائے مثلاً ''اس سنگ دل کی یاد'' لیکن مومن نے اس امر کا بہت کم خیال رکھا ہے اور جابجا اس قسم کی غلطی ہے۔

(۲) نہ چاہوں روزِ جزا داد یہ ستم دیکھو
کب آزماتے ہیں جب وقتِ امتحاں نہیں

یہاں اضافتِ فارسی کے ساتھ اعلانِ نون جائز نہیں ہے لیکن اس کی بابت یہ کہا جا سکتا کہ غالب نے بھی اس کو جائز رکھا ہے اور اس لیے ثابت ہوتا ہے کہ مومن کے زمانے تک لوگ اسے ناجائز جانتے تھے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ''آزماتے ہیں'' کے ساتھ ''وہ'' یا ''آپ'' کا لفظ ضروری تھا۔

(۳) سر سے شعلے اٹھتے ہیں آنکھوں سے دریا جاری ہے
شمع سے یہ کس نے ذکر اس محفل آرا کا کیا

یہاں ''جاری'' کی ''ی'' بہت دب کر نکلتی ہے، اس میں شک نہیں کہ افعال اردو میں ''ی'' کا دبنا غلطی نہیں ہے مثلاً ''آتے ہیں'' ''بر وزن فاعلن'' عام طور پر اشعار میں مستعمل ہے لیکن کلام اس میں ہے کہ افعال کے علاوہ دیگر الفاظ کو بھی یہی رعایت حاصل ہے یا نہیں۔ راقم الحروف کے نزدیک ایسا جائز نہیں ہے خصوصاً ایسی حالت میں کہ ''جاری ہیں'' مصرعہ مومن کے آخر میں واقع ہو کر اس عیب کو اور بھی نمایاں طور پر ظاہر کر رہا ہے۔

(۴) آنکھیں جو ڈھونڈھتی ہیں نگہ ہائے التفات
گم ہونا دل کا وہ مری نظروں سے پا گیا

یہاں ''نگہ'' کا ''وہ'' پر ختم ہونا اور پھر ایسے لفظ سے ملنا جس کے شروع میں بھی ''ہ'' موجود ہے بہت ثقیل معلوم ہوتا ہے۔

(۵) تم اٹھ گئے محفل سے ذکر آتے ہی مجنوں کا
سایے سے مری وحشت اے رشک پری اتنی

یہاں اے رشک پری کے ساتھ ''تم'' کا استعمال کسی صورت سے پسندیدہ نہیں ہے۔ مومن نے 'آپ'' ''تم'' اور ''تو'' کے استعمال کو جا بجا خلط ملط کر دیا ہے۔

(۶) کیا ہوا ، ہوا گر وہ بعدِ امتحاں اپنا
بے گناہ سزا پائے ، اب وہ دل کہاں اپنا

یہاں ''ہوا ہوا'' کی تکرار بغایت ناموزوں ہے اس قسم کی کراہت مومن کے اشعار میں بھی پائی جاتی ہے ۔

(۷) جوں نکہت گل جنبش ہے جی کا نکل جانا
اے باد صبا ، میری کروٹ تو بدل جانا

اس قسم کے مصرعوں میں جن کے دو ٹکڑے ہو سکتے ہوں شانِ استادی یہ ہے کہ دونوں ٹکڑوں کے الفاظ علاحدہ علاحدہ رہیں، اگر ایسا نہیں ہوتا تو شعر کی لفظی لطافت بالکل جاتی رہتی ہے مثلاً مومن کے اس شعر میں ''جنبش'' پہلے ٹکڑے کے ساتھ چلا جاتا ہے حالانکہ اس کا تعلق معنوی دوسرے ٹکڑے یعنی ''ہے جی کا'' سے ہے ۔

(۸) اک اور پڑھ وہ مومن شعلہ زباں غزل
جل جائیں جس کے رشک سے حاسد بسانِ شمع

یہاں ''شعلہ زباں'' کو جب تک ''شعلا زباں'' نہ کہیے مصرعہ موزوں نہیں ہوتا حالانکہ فارسی تراکیب میں آردو قاعدے کا جاری کرنا خطا ہے ، اس غلطی میں بہت سے مشہور شعراء اس وقت تک مبتلا ہیں لیکن راقم کے نزدیک ایسے بے خبر کو مشاق یا استاد کہنا درست نہیں ۔

اس کُو میں جا مریں گے مدد اے ہجوم شوق
آج آور زور کرتے ہیں بے طاقتی سے ہم

ارباب بینش پر روشن ہوگا کہ یہاں ''کو'' کس قدر بے جوڑ معلوم ہوتا ہے ۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے کلام مومن میں یہ سب نقص بر بنائے بے پروائی پائے جاتے ہیں نہ بسبب ناواقفیت ۔

اصل یہ ہے کہ جس طرح سے اہل لکھنؤ نے صحت لفظی کے مقابلے میں لطف مضمون کا خیال کیا ، اسی طرح سے اہل دہلی نے عموماً اور مومن خاں نے خصوصاً بمقابلہ مضمون صحت زبان کی جانب بہت کم توجہ کی چنانچہ غالب و معروف سے لے کر شیفتہ و سالک تک کے دیوان بلکہ اگر غور سے دیکھیے تو ذوق کا کلام بھی ان غلطیوں سے بالکل پاک نہ ملے گا ۔

(۹) گر وہاں بھی یہ خاموشی اثر افغاں ہوگا
حشر میں کون مرے حال کا پرساں ہوگا

موجب باب فصاحت اُستاد الاساتذہ حضرت مرزا اصغر علی خاں نسیم دہلوی کہ رنگینیٔ بیان کے بادشاہ تھے اور مومن خاں کے شاگرد ، اس شعر کے پہلے مصرع کے متعلق اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اُستاد نے "ململ" میں "کمل" کا جوڑ لگایا ہے ، اس میں شبہ نہیں کہ فغاں خموشی اثیر کی ترکیب خوب نہیں لیکن اس شعر میں اپنے اردو متعلقات کے ساتھ اس قدر بیگانہ نظر آتی ہے کہ مصرعہ ثانی کی سلاست بھی اس کے ثقل کی جانب سے ذہن کو منتقل نہیں کر سکتی ۔

یہ عیب غالب کے کلام میں بھی موجود ہے اور مومن اور غالب کی فارسی پسندی اس کی ذمہ دار ہے ۔

قصہ مختصر اس سے کہیں کہیں عیبِ ثقل ضرور پیدا ہو گیا ہے لیکن جیسا کہ ہم پہلے کہ چکے ہیں اُن کی اُستادی کی بنیاد بھی اُسی دست گاہ فارسی پر قائم ہے ، غور فرمائیے :—

مطلب جستجو نے یہ کیا حال کر دیا
حسرت بھی اب نہیں دلِ ناکامیاب میں
بدنام میرے گریۂ رسوا سے ہو چکے
اب عذر کیا رہا ، نگہِ بےحجاب میں

دیکھنے والے دیکھیں گے کہ "گریۂ رسوا" اور "دلِ ناکامیاب" کی

تازگیٔ ترکیب نے اس شعر کو کیا سے کیا کر دیا ہے اور یہ بھی غور کریں گے کہ جس شاعر کی طبیعت فارسی مذاق سے بخوبی آشنا نہ ہو وہ ایسی لطیف ترکیبیں کیوں کو تراش سکتا ہے :—

امتحاں کے لیے جفا کب تک التفاتِ ستم نما ، کب تک

یہاں پر دیکھنا یہ ہے کہ مصرعۂ ثانی میں "التفاتِ ستم نما" کی ترکیب کے زور سے کتنے بڑے وسیع مضمون کی گنجائش نکال لی ہے ، غرضکہ التفاتِ ستم نما ، شوقِ شکوہ اثر ، آہِ فلک افگن ، بیمار اجل چارہ ، غفلت جرأت آزما، شکوۂ زخم ریز، کوئے دلکشا اور اسی قسم کی بےشمار استوار اور پسندیدہ ترکیبیں جو دیوانِ مومن کے ہر صفحے بلکہ ہر غزل میں مل سکتی ھیں ، سب اُن کے فارسی مذاق کی بدولت ھیں اور وہ جو غالب نے مومن کی وفات پر لکھا تھا کہ

شرط است کہ روئے دل خراشم همه عمر
خوں نابہ رُخ زدیدہ پاشم همه عمر
کافر باشم اگر بہ مرگِ مومن
چوں کعبہ سیہ پوش نباشم همه عمر

وہ بھی مرزا نے مومن کے فارسی ھی اندازِ بیان کے خیال سے تحریر کیا ھوگا ورنہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ محض اُردو شاعری کے لحاظ سے ذوق کا رتبہ مومن بلکہ غالب سے بھی بہت بلند تھا اور یہ امر مشہور ہے کہ غالب کو ذوق کی شاعری فی‌الجملہ پسند نہ تھی ۔ مرزا غالب اور مومن کا اندازِ سخن بہت کچھ ملتا جلتا ہے ، غلبۂ فارسیت اور بعض موقعوں پر بلندیٔ مضمون کی بنا پر جس طرح مرزا کے بعض اشعار بہت مشکل ہو گئے ھیں اسی طرح مومن کے بھی بعض شعر کسی صورت سے آسان نہیں کہے جا سکتے ھیں مثلاً مومن :—

وہ علی الرغم ، عدو مجھ پہ کرم کرتے ہیں
ہے ستم لطف کے پردے میں ستم کرتے ہیں

یہاں علی الرغم عدو سے مراد ، خلافِ خواہش رقیب ہے یعنی محبوب جو مجھ پر لطف کر رہا ہے وہ صرف رقیب کو دکھلانے اور چھیڑنے کی غرض سے ہے ، پس مجھ پر اُس کا یہ لطف و کرم واقعی نہیں ہے بلکہ در حقیقت رقیب کے ساتھ چھیڑ چھاڑ اور لگاوٹ کا ایک جزو ہے اور اس لیے اس کو در پردہ ستم سمجھنا چاہیے . . . . .

مومن و غالب کی شاعری میں ایک اور بھی مشابہت کی صورت ہے . یعنی یہ کہ جس طرح مرزا صاحب جہاں فارسی ترکیبوں سے گذر کر سہلِ ممتنع پر آجاتے ہیں تو سادگی اور روانی کا دریا ہی بہا دیتے ہیں، بالکل اسی طرح مومن بھی جب چھوٹی بحروں میں صاف صاف کہتا ہے تو قیامت ہی ڈھا دیتا ہے ، ملاحظہ ہو:—

اثر اُس کو ذرا نہیں ہوتا　　　رنج ، راحت فزا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا　　　جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

ہمارے نزدیک اُردو شاعری کے لحاظ سے ذوق کا درجہ غالب سے اور غالب کا مرتبہ مومن سے بلند ہے لیکن درد اور تاثیر کلام کے لحاظ سے مومن کا کلام غالب سے افضل اور ذوق سے افضل تر ہے:—

گر یہی شوقِ شہادت ہے تو مومن جی چکے
مار ڈالے کاش کوئی کافرِ دل جو ہمیں

”کافرِ دل جو“ کی شگفتہ اور نئی ترکیب سے شعر میں جان ڈال دینا خاص انداز تھا مومن مرحوم کا اور اصل تو یہ ہے کہ شگفتگی اور لطافت الفاظ کی وہ ایک خاص شان جس کی ابتدا مومن خاں نے کی اور جس کو نسیمِ دہلوی مرحوم نے انتہا کو پہنچایا ، اس خاندان شاعری کے متوسلین کے علاوہ اور کسی کو نصیب نہیں . . . . . .

"قصہ مختصر مومن خاں کی اردو شاعری میں اگرچہ بحیثیت زبان بہت سے عیوب پائے جاتے ہیں لیکن آن کی آستادی دو وجہوں سے مسلم ہو گئی ہے : ایک تو ان کے خصوصیت انداز کی بنا پر . . . اور دوسرے اس سبب سے کہ فارسی مذاق اور ترکیبوں کی آمیزش سے آن کے کلام کی ایک خاص وقعت پیدا ہو گئی ہے جس کی مثال مرزا غالب کے سوا اور کسی شاعر کے کلام میں نہیں مل سکتی"۔

عبدالرحمٰن آہی ، خلف میر حسین تسکین نے خاتمۂ دیوان مومن لکھا ہے ۔ وہ مومن کے متبنیٰ اور بھانج داماد ہیں ۔ صاحب خمخانہ نے لکھا ہے کہ اکثر سخن سنجانِ گرامی کے زعم میں ان جیسا سخن فہم کوئی کم ہوا ہوگا ، آہی نے خاتمہ دیوان (صفحہ ۲۱۴) میں لکھا ہے :—

کتابے است عدیم النظیر و نسخہ ایست فقیدالبدل ، حروفش دلنشیں و معانیش نو آئین ، آنچہ در گفتار میر و میرزا جستہ جستہ تواں یافت ایں جا دستہ دستہ می تواں دید ، منصفی باید صاحبِ ذوق و ماہرِ فن تا وارسد کہ سخن ور شاعری نکردہ است بلکہ ساحری کردہ ، پایۂ سخنش چنداں کہ کاوی ، باثریابی ، ودرگفتارش چنداں کہ سنجی گراں تر بینی ، شعر را بدیں جا کہ رسانیدہ و ریختہ را ایں مرتبہ کہ بخشیدہ . . . .

منشی انوار حسین تسلیم سہسوانی شاگرد بیار مصحح مطبع نولکشور نے تقریظ میں (صفحہ ۲۳۴ دیوان مومن نولکشور طبع ششم) لکھا ہے :—

من کجا و کجا ستودگی زبانش ، بندش چست ، تلاش درست ، نشست الفاظ سبحان اللہ ، تازگیٔ مضمون واہ واہ ، زور قوتِ سخن دیدنی و شورِ طلاقتِ فن شنیدنی ، ساحری در پردۂ شاعری کردہ ، و دل صورت پرستان معنی بدست آوردہ ۔

صاحب گل رعنا (طبع سوم ۱۳۶۴ھ) نے مومن کے کلام پر تبصرہ کرنے سے پہلے مولانا آزاد کی رائے نقل کی ہے، لکھتے ہیں (صفحات ۳۰۱ ، ۳۰۲) :— اس

کو سن لو پھر جو بات رہ جائے گی اُس کو میں بیان کروں گا :۔

''اُن کے خیالات نہایت نازک اور مضامین عالی ہیں، استعارہ اور تشبیہ کے زور سے اور بھی اعلیٰ درجے پر پہنچایا ہے ، اُن میں معاملاتِ عاشقانہ عجیب مزے سے ادا کیے ہیں اسی واسطے جو شعر صاف ہوتا ہے اُس کا انداز جرأت سے ملتا ہے ، وہ اکثر اشعار میں ایک شے کو کسی صنفِ خاص کے لحاظ سے ذات شے کی طرف نسبت کرتے ہیں اور اس ہیر پھیر سے شعر میں عجیب لطف لطیف بلکہ معانی پنہاں پیدا کرتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اکثر عمدہ ترکیبیں اور نادر تراشیں فارسی اور استعارے و اضافتیں اُردو میں استعمال کر کے کلام کو نمکین کرتے ہیں''۔

بات یہ ہے کہ جو جذبات و خیالات غزل میں بیان کیے جا سکتے ہیں، وہ سب قدماء کے حصے میں آ گئے اور جتنے لطیف اور پاکیزہ اسلوب بیان کے ہو سکتے ہیں وہ سب ختم ہوگئے، ممکن تھا کہ متاخرین اُس دائرے سے نکل کر ہر قسم کے خیالات پر اپنی شاعری کی بنیاد قائم کر دیتے تو اُن کو زیادہ وسیع اور فراخ میدان مل جاتا مگر اُنھوں نے ایسا نہیں کیا، اُسی محدود دائرے میں اپنے اپنے مبلغِ فکر کے موافق لطافتیں اور نزاکتیں پیدا کیں۔

''مومن خاں کے ہم عصروں میں مرزا غالب نے اس میں نمایاں حصہ لیا ہے مگر جیسا کہ خود مولانا حالی نے یادگارِ غالب میں ایک موقع پر تسلیم کیا ہے کہ مومن خاں مرحوم اس خصوصیت میں مرزا سے بھی سبقت لے گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ مومن خاں نے جس قدر اسالیبِ بیان میں نزاکت و لطافت پیدا کر دی ہے وہ ان کی ذہانت اور جولانیٔ طبیعت کا تماشا گاہ ہے، قصیدوں میں ، غزلوں میں ، مثنویوں میں ہر جگہ ان کا اندازِ بیان ، کیفیت سے خالی نہیں مگر افسوس ہے کہ اُن کو مولانا حالی جیسا نقاد نہیں ملا جو ان کی کاوشِ فکر کے نتائج کو ملک میں نمایاں کرتا''۔

ان کے طرز ادا میں ایک بات اور بھی ہے جس کو مولانا شبلی نے شعرالعجم میں خصوصیاتِ غالب میں بیان کیا ہے ۔ کچھ شک نہیں کہ مرزا غالب بھی اُن کے ساتھ شریک ہیں مگر مومن کے یہاں یہ بات بہت نمایاں ہے کہ اکثر موقعوں پر مضمون کے بعض اجزا چھوڑ جاتے ہیں جس سے ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے ، یہ وہ موقعے ہوتے ہیں جہاں سننے والے کا ذہن خود بخود اُس جزو کی طرف منتقل ہو سکتا ہے ۔ یہ شاعری کا ایک نازک پہلو ہے جس میں کبھی بے اعتدالی بھی پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے شعر سخت پیچیدہ ہو جاتا ہے اور اس کے سمجھنے میں کاوشِ فکر کی ضرورت پڑتی ہے ۔

رام بابو سکسینہ تاریخ ادب اُردو میں اس طرح اظہار رائے کرتے ہیں (صفحات ۳۵۶ تا ۳۶۰) :—

اپنی قابلیت اور جوہر ذاتی کا حکیم مومن خاں صاحب کو اس درجہ خیال تھا کہ اُس کے مقابلے میں لوگوں کی فصاحت و بلاغت کو ۔ ۔ ۔ ۔

نواب سید امداد اثر کی رائے مومن کی غزل گوئی پر یہ ہے (کاشف الحقائق جلد دوم صفحات ۱۲۲ تا ۱۲۹) ۔

حکیم مومن خاں ، ذوق کے ہم عصر تھے مگر ذوق سے غزل گوئی کا رنگ علاحدہ رکھتے تھے۔ غالب بھی اسی زمانے میں تھے گو مومن کے بعد بہت دنوں تک زندہ رہے ۔ ہر چند مومن اور غالب دونوں شاعری کا داخلی پہلو برتتے تھے تو بھی ان دونوں کے مذاق شاعری جداگانہ تھے ۔ اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں ہے کہ مومن کی جتنی غزلیں ہیں ایک ہی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں ، مومن کی غزل سرائی دھلی کی غزل سرائی کا طور رکھتی ہے ، غزل سرائی میں مومن بھی وارداتِ قلبیہ اور امور ذہنیہ کے مضامین حوالۂ قلم کرتے ہیں گو اُن کے بیان میں خواجہ درد یا میر صاحب کے کلام کی پُر تاثیری پائی نہیں جاتی ہے ۔ ان دونوں بزرگوں کے کلام کی خوبی یہ ہے کہ جس طرح کمان سے تیر نکلے ان کا کلام سامع کے دل پر فوراً جا بیٹھتا ہے ، برخلاف

اس کے مومن کا اندازِ سخن ہے کہ جب تک بغور اُن کے کلام پر نظر نہ ڈالیے، لطفِ کلام حاصل ہی نہیں ہوتا اس لیے بعض بے مغزوں نے مومن کے دیوان کو سہمل قرار دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مومن ایک بڑے بلیغ شاعر ھیں مگر میر صاحب کے کلام کی رفعت، جلالت، مکنت، خستگی، برشتگی کو نہیں پہنچتے ھیں اور ہر چند وصل، فراق، غم، ملال، رنج، ضد، عداوت، حسد، رشک، اضطراب، بیتابی، بے خوابی کے مضامین خوب باندھتے ھیں مگر اُن کے کلام سے کبھی کبھی کوچہ گردی کی بُو آ جاتی ہے، اس پر بھی جوانانہ انداز کے ساتھ تہذیب کی عنان کبھی ھاتھ سے نہیں دیتے۔ خیر خواجہ اور میر کے مضامین کی بندش میں مومن خاں جو کچھ کم سمجھے جائیں مگر حقیقتِ حال یہ ہے کہ وہ ایک ایسے غزل سرا ھیں کہ اُن کی غزل سرائی پر اہلِ دہلی کو بلکہ ہر دیار کے مذاق کو ناز ہونا چاھیے۔ مومن خاں کی غزل سرائی تشبیہ سے اکثر پاک دیکھی جاتی ہے، استعارے بھی کثرت سے داخل کلام نہیں ہوتے اور مبالغے با مذاق سے خالی نہیں دیکھے جاتے، ان کی شاعری میں جو کچھ نقصان ہے وہ نقصانِ بندش ہے نقصانِ مضامین نہیں ہے مثلاً اگر تعقیدات کو ان کے کلام میں دخل نہ ہوتا تو ان کی غزل سرائی ترکیبِ زبان کے عیب سے پاک ہوتی۔ راقم قبل میں عرض کر چکا ہے کہ اکثر شعرائے دہلی غزل سرائی میں داخلی پہلو برتتے ھیں برخلاف اس کے شعرائے لکھنؤ خارجی پہلو سے بیشتر سروکار رکھتے ھیں۔ راقم ذیل میں دو غزلیں حوالۂ قلم کرتا ہے ایک مومن خاں کی ہے اور دوسری خواجہ آتش کی، اہلِ نظر پر روشن ہے، کہ مومن اس تمام غزل میں تین شعر کے سوا داخلی پہلو کے متمسک رہے ھیں اور آتش ساری غزل میں خارجی پہلو سے کام لیا کیے ھیں :—

مومن

کرتا ہے قتلِ عام وہ اغیار کے لیے
دس بیس روز مرتے ھیں دیدار کے لیے

دیکھا عذابِ رنج دل زار کے لیے
عاشق ہوئے ہیں وہ مرے آزار کے لیے
قتل اُس نے جرمِ صبر جفا پر کیا مجھے
یہ ہی سزا تھی ایسے گنہ‌گار کے لیے
لے تو ہی بھیج دے کوئی پیغام تلخ اب
تجویز زہر ہے ترے بیمار کے لیے
آتا نہیں ہے تو، تو نشانی ہی بھیج دے
تسکینِ اضطراب دل زار کے لیے
کیا دل دیا تھا، اس لیے میں نے تمھیں کہ تم
ہو جاؤ، یوں عدو مرے اغیار کے لیے
چلنا تو دیکھنا کہ قیامت نے بھی، قدم
طرزِ خرام و شوخیٔ رفتار کے لیے
جی میں ہے موتیوں کی لڑی اُس کو بھیج دوں
اظہارِ حالِ چشمِ گہر بار کے لیے
دیتا ہوں اپنے لب کو بھی گلبرگ سے مثال
بوسے جو خواب میں ترے رخسار کے لیے
جینا امیدِ وصل پہ ہجراں میں سہل تھا
مرتا ہوں، زندگانیٔ دشوار کے لیے
مومن کو تو نہ لائے کبھی دام میں وہ بت
ڈھونڈھے تار سبحہ کے زنّار کے لیے

آتش

نافہمی اپنی پردہ ہے دیدار کے لیے
ورنہ کوئی نقاب نہیں یار کے لیے
نورِ تجلی ہے ترے رخسار کے لیے
انکھیں مری کلیم ہیں دیدار کے لیے

قول اپنا ہے یہ سبحہ و زنّار کے لیے
دو پھندے ہیں یہ کافر و دیندار کے لیے

لطفِ چمن ہے بلبلِ گلزار کے لیے
کیفیتِ شراب ہے مے خوار کے لیے

سیری نہ ہوگی تشنۂ دیدار کے لیے
پانی نہیں، چہ ذقنِ یار کے لیے

اتنی ہی ہے نمود، مرے یار کے لیے
شہرہ ہے جس قدر مرے اشعار کے لیے

دشتِ عدم سے آئے ہیں باغِ جہاں میں ہم
بے داغِ لالہ و گُل بے خار کے لیے

شمشاد اپنے طرّہ کو بیچے تو لیجیے
اُس لالہ رُو کی لٹ پٹی دستار کے لیے

دو آنکھیں چہرے پر نہیں تیرے فقیر کے
دو ٹھیکرے ہیں بھیک کے دیدار کے لیے

سرمہ لگایا کیجیے، آنکھوں میں مہرباں
اکسیر یہ سفوف ہے بیمار کے لیے

حلقہ میں زلفِ یار کے موتی پروئیے
دنداں ضرور ہیں دہنِ یار کے لیے

گفت و شنید میں ہوں بسر دن بہار کے
گُل کے لیے گوش، زباں خار کے لیے

واضح ہو کہ گُہر بار، رخسار اور زُنّار اشیائے خارجہ سے ہیں، ناچار ان اشعار کے مضامین خالئ پہلو سے بندھے، اگر مومن خاں کچھ استعارہ پردازی پر عمل کر جاتے تو یہ قافیے داخلی پہلو کے مضامین کے ساتھ بندھ جاتے۔ غالب ہوتے توضرور یہی روش اختیار کرتے جیسا کہ اُن کی روش خاص کا تقاضا ہے۔ واضح ہو کہ خواجہ کی یہ غزل چھبیس شعر کی ہے، بطور

نمونہ ایک طرف سے بارہ شعر نقل کر لیے گئے ہیں، سوا مطلع کے کہ داخلی پہلو رکھتا ہے، جمیع اشعار اس غزل کے خارجی مضامین سے منتقل ہیں۔ یہ ایک عمدہ مثال اس دعوے کی ہے کہ لکھنؤ کے اُستادانِ غزل بہت زیادہ خارجی مضامین برتتے ہیں۔ ساری غزل خواجہ کی واردات قلبیہ اور امور ذہنیہ سے بہ مراحل دور ہے، جتنے امورِ عالم خارج سے متعلق ہیں وہی احاطۂ بندش میں در آئے ہیں۔ برخلاف اس کے مومن کی غزل ہے کہ تین شعر کے سوا بقیہ اشعار غزل محض امور ذہنیہ ہیں اور ہر چند اعلیٰ درجے کے وارداتِ قلبیہ سے خبر نہیں دیتے ہیں تو بھی امور داخلی ہونے کے باعث غزلیت ہی کی شکل قائم رکھنے والے ہیں۔ الحق غزل سرائی کے لیے داخلی پہلو کے مضامین نہایت مطبوع ہوتے ہیں؛ چنانچہ خواجہ کا پہلا مطلع جو داخلی پہلو رکھتا ہے، بقیہ اشعار غزل سے زیادہ غزلیت کا لطف رکھتا ہے۔ یہ تو خواجہ کی رنگینیٔ طبع کی خوبی ہے کہ خارجی مضامین بھی اُن کی غزلوں میں کچھ مزا دے جاتے ہیں ورنہ اگر کوئی دوسرا شاعر خارجی رنگ میں غزل لکھتا تو یقیناً اُس کی غزل میں۔۔۔خامی نہیں ہوتی۔ اہلِ مذاق سے پوشیدہ نہیں ہے کہ مومن کی غزل کس قدر غزلیت کا مزا دے رہی ہے، یہ لطف مجرد داخلی مضامین کی بدولت ہے، ورنہ بندش و زبان میں خواجہ کے اشعار مومن کے اشعار پر بدرجہا زیادہ غالب ہیں۔ ذیل میں کچھ اشعار مومن کے نمونے کے طور پر منسلک ھذا کیے جاتے ہیں:—

رات کس کس طرح کہا نہ رہا
نہ رہا پر وہ مہ لقا نہ رہا
غیر آ کر قریب خانہ رہا
شوق اب تیرے آنے کا نہ رہا
تیرے پردہ نے کی یہ پردہ دری
تیرے چھپتے ہی کچھ چھپا نہ رہا

کعبہ سے جانب بت خانہ پھر آیا مومن
کیا کرے جی نہ کسی طرح سے زنہار لگا
نقد جاں تھا نہ سزائے دیت عاشق حیف
خونِ فرہاد سر گردنِ فرہاد رہا
کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی
آشیاں اپنا ہوا، برباد کیا
وقتِ وداع بے سبب آزردہ کیوں ہوئے
یوں بھی تو ہجر میں مجھے رنج و عذاب تھا
اے مومن آپ کب سے ہوئے بندہ بتاں
بارے ہمارے دین میں حضرت بھی آ گئے

اردو کی رباعی نگاری کے سلسلے میں مصنف کاشف الحقائق (جلد دوم صفحات ۲۹۳، ۲۹۴) لکھتے ہیں :-

شعرأ میں کوئی شاعر رباعی نگار عمر خیام کے درجہ کا نظر نہیں آتا... نہایت جائے افسوس ہے کہ ذوق اور غالب سے نامی شاعروں نے بھی اس صنف شاعری کی طرف توجہ نہ فرمائی بلکہ خوشامدانہ انداز تحریر سے اس کو درجۂ ابتذال تک پہنچا ڈالا...... ذیل میں کچھ رباعیاں خواجہ میر درد اور مومن خاں نذر ناظرین کی جاتی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب کو رباعی نگاری کا مذاق حاصل تھا مگر مومن خاں اس صنف شاعری سے چنداں مناسبت نہیں رکھتے تھے، بہر حال ان کی رباعیوں سے کچھ رباعیاں چن لی جاتی ہیں۔

مومن خاں بحیثیت مثنوی نگار - | (صفحہ ۳۳۳ کاشف الحقائق جلد دوم)

استاد مومن کی کلیات میں چھ مکمل مثنویاں دیکھی جاتی ہیں، یہ سب کی سب مثنویاں تمام تر داخلی شاعری کا رنگ رکھتی ہیں، اس اعتبار سے ان مثنویوں کو میر تقی صاحب کی مثنویوں کی قسم کے ساتھ اتحاد حاصل ہے

مگر انداز کلام کا جو فرق ہے ، وہ وہی ہے جو ان دونوں استادوں کی غزل سرائیوں میں محسوس ہوتا ہے ، مومن خاں کی مثنویاں دقت انگیز پیرایہ رکھتی ہیں، اس نامطبوع انداز سے میر صاحب کی مثنویاں تمامتر بری ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مومن خاں بالقصد مضامین داخلی کو ایسی دشوار بندش دیتے ہیں کہ فہم کو ایذا لاحق ہوتی ہے ، برخلاف اس کے میر صاحب اپنی دائمی کیفیت سوز و گداز و خستگی کے ساتھ ادائے مضامین میں ایسی آسانی کی راہ اختیار کرتے ہیں کہ ان کے کلام کی پُر تاثیری میں کسی قسم کا نقصان لاحق نہیں ہوتا ہے ۔ خیر اب حضرات ناظرین مومن خاں کی مثنویوں کو بلا مقابلۂ احدے موازنہ فرمائیں ۔ فقیر کی دانست میں استاد مومن کی مثنویاں ہر چند زور طبیعت اور سخن آفرینی سے خبر دیتی ہیں مگر ان میں اخلاقی یا تمدنی یا مذہبی مضمون کا نشان نہیں پایا جاتا ہے، ان کی کوئی مثنوی ایسی نہیں دکھائی دیتی ہے جو خس برابر بھی مفید معاشرت ہو یا جس سے بال برابر بھی فائدہ عقبیٰ مرتب ہو ، اکثر مضامین عشقیہ ہیں مگر وہ بھی ایسے ہی ہیں جن سے یا کوچہ گردی کی بو آتی ہے یا ایسے ہیں کہ سوا نوجوانانِ غیر مقید ان کے ان کا گزار کسی اور دماغ میں ہو ہی نہیں سکتا ۔ المختصر فقیر کی دانست میں مومن خاں کی کوئی مثنوی مفید[1] بنی آدم نظر نہیں آتی ہے ، ـــ

اردو شاعری کی مختصر تاریخ ـــ از سید اعجاز احمد صاحب سہسوانی

---

۱ - مومن کی مثنویاں اس کی زندگی کی ترجمان ہیں، مومن سید احمد شہید کی بیعت کے بعد بھی رندانہ زندگی گزارتے رہے ، انھوں نے ریاکاری سے کام نہ لیا اور آپ بیتی لکھ کر تذکرہ نویسوں کو قیاس کی بھول بھلیوں سے نجات دی ۔ میر کی مثنوی معاملات عشق نے ان کی راہنمائی کی ۔ اگر تذکروں کی ورق گردانی کی جائے تو آبرو اور خان آرزو سے لے کر داغ تک سبھی اس دشت کی سیاحی کرتے رہے ہیں اس لیے فاضل مصنف کے اخلاقی معیار پر مثنویات مومن کس طرح پوری اتر سکتی ہیں ۔

علیگڑھ میگزین اگست ۱۹۳۸ء صفحہ ۸۴ -

مومن - حکیم مومن خاں ، ایک معزز ذی علم خاندان کے نہایت غیور مستغنی المزاج نازک خیال شاعر تھے ، طباعی و ذکاوت کا جوہر خداداد تھا ، اصنافِ سخن میں یکساں کمال دکھایا ہے ، قصاید اگرچہ امرا و سلاطین کی مدح میں نہیں کہے لیکن حمد و نعت و منقبت میں نہایت بلیغ قصیدے لکھے جن کی شان سب سے جدا ہے ، اکثر تشبیہیں تغزل کے مضامین میں شعرائے عرب کی طرح لکھی ھیں ، مدح میں بے حد زور اور جوش اخلاص کا رنگ ہے ، غزل میں تغزل کا حق ادا کیا ہے اور نفسیاتی شاعری کے بے مثل نمونے دکھائے ھیں جن کو خالص غزل کہا جا سکتا ہے ، معاملات حسن و عشق کو غزل میں محدود کرکے اس میں نازک خیالی کے معجزات دکھائے ھیں ، تغزل کے دائرے کو انھوں نے دوسرے مضامین سے بالکل محفوظ رکھا، یہاں تک کہ ساقی، مے کدہ، شراب اور ساغر کا بھولے سے بھی نام نہیں لیتے ، پانچ مثنویاں بحورِ خمسہ میں نہایت زور دار لکھیں اور ان میں اپنی ھی عاشق مزاجی و وارفتگی کا رنگ دکھایا ہے - تاریخ گوئی میں عجوبۂ روزگار تھے ، بڑے حاذق طبیب اور کامل منجم بھی تھے ، مولانا شاہ ولی اللہ محدث دھلوی کے خاندان کے فیض یافتہ اور مولانا شہید دھلوی کے انصار اور رفقاء سے تھے- ۱۲۶۸ھ میں راھیٔ دارالبقا ھوئے - اب تک ان کے طرز کی کوئی کامل تقلید نہ کر سکا -

جلال الدین احمد جعفری تاریخ قصاید اردو (مطبع انوار احمدی الہ آباد صفحات ۳۸ تا ۴۰) میں تحریر کرتے ھیں :-

محمد مومن خاں نام ، مومن تخلص ، حکیم غلام نبی خاں کے بیٹے تھے - ۱۲۱۵ھ ، ۱۸۰۰ء میں بیدا ھوئے ، جب ذرا ھوش سنبھالا تو مولانا شاہ عبدالقادر سے عربی کتابیں پڑھیں ، جب استعداد درست ھوگئی تو والد اور چچا حکیم غلام حیدر خاں اور حکیم غلام حسن خاں سے طب کی کتابیں پڑھیں

اور انھیں کی زیر نگرانی نسخہ نویسی کی - اسی زمانے میں نجوم کا شوق پیدا ہوا ، اس کو بھی اہل کمال سے حاصل کیا اور مہارت بہم پہنچائی - شعر و سخن سے طبعی مناسبت تھی ، عاشق مزاجی نے اور بھی چمکایا ، ابتدامیں شاہ نصیر کو اپنا کلام دکھایا ، پھر ذہن خدا داد کے اطمینان پر اصلاح لینی چھوڑ دی اور بطور خود مشق سخن کرنے لگے ، رنگین طبع ، رنگین مزاج خوش وضع ، خوش پوشاک اور عاشق مزاج تھے - اپنا کلام دردناک آواز اور دل پذیر ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے ، ان کے خیالات نہایت نازک اور مضامین بلند ہوتے تھے ، استعارہ و تشبیہ کے زور سے وہ بات پیدا کرتے تھے جو دل پر جادو کا اثر رکھتی ہے - اس جامع کمال ہستی نے بہار زندگی کے صرف باون برس مزے لے کر ۱۲۶۶ھ مطابق ۱۸۴۹ء میں وفات پائی اور مہدیوں کی جانب دہلی دروازے کے باہر حضرت شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمۃ کے مقبرے کے پاس سپرد خاک کیے گیے - انھوں نے شاعری کے ذریعے سے روپیہ پیدا کرنا پسند نہیں کیا اور نہ نجوم و رمل کو ذریعۂ معاش بنایا ، جو کچھ دہلی میں میسر تھا اسی پر قناعت کی - اگرچہ چار پانچ مرتبہ دلی سے باہر نکلے اور بدایوں ، سہسواں اور رامپور وغیرہ گئے - ان کے مجموعۂ کلام میں غزلوں اور مرثیوں کے علاوہ ۹ قصاید بھی ہیں جن میں ۷ قصیدے علی الترتیب حمد و نعت اور خلفائے راشدین اور سیدنا حضرت امام حسن رضی اللہ عنھم کی منقبتوں میں کہے گئے ہیں - اور ۸ و ۹ نواب وزیر خاں نصرت جنگ والئ ٹونک اور راجہ اجیت سنگھ برادر راجہ کرم سنگھ رئیس پٹیالہ کی مدح و ثنا میں لکھے گئے ہیں - پختگی و روانی میں اگرچہ مومن ، ذوق کی سلاست و فصاحت تک نہیں پہنچتے لیکن زور اور ندرتِ کلام میں ان کا مرتبہ دوسروں سے کم نہیں - تشبیب عموماً نادر ہوتی ہے اور اسی کے ساتھ ہر قصیدے میں تعلّی اور شکایت زمانہ جو تقریباً سنت شعرأ ہے ، خاص شکوہ و شان سے کی جاتی ہے - تخلص یا گریز نسبتاً کمزور ہے ، قصاید میں علمی مضامین بکثرت

لاتے ہیں اور چونکہ خود نجوم و رمل اور طب میں ید طولیٰ رکھتے تھے اس لیے مخصوص مصطلحات سے کلام کا اغراق بڑھا دیتے ہیں، کہیں کہیں تلمیحات اور آیات اور احادیث کی طرف بھی اشارات کرتے ہیں کلام میں خیالات کی پیچیدگی کے ساتھ کہیں کہیں بندشوں کی سستی اور نادرستی تعقید پیدا کر دیتی ہے، فلسفہ و اخلاق ان کے کلام میں الشاذ کالمعدوم کا حکم رکھتا ہے۔

نیاز فتح پوری کی رائے ہے (کلام مومن پر ایک طائرانہ نگاہ صفحات ۱، ۲ تا ۶۴ انتقادیات حصہ اول) :۔ اگر میرے سامنے اردو کے تمام شعرائے متقدمین و متاخرین کا کلام رکھ کر (بہ استثنائے میر) مجھ کو صرف ایک دیوان حاصل کرنے کی اجازت دی جائے تو میں بلا تامل کہ دوں گا کہ مجھے کلیات مومن دیدو اور باقی سب اٹھا لے جاؤ۔ ایک سننے والے کے دل میں قدرتاً اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ میں ایسا کیوں کہوں گا اور اس ترجیح کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟ اس مقالے میں اسی سوال کا جواب دینے کی کوشش کی گئی ہے جس سے مقصود مومن کی شاعرانہ قیمت کا اندازہ کرنا ہے۔

اگر یہ صحیح ہے کہ دنیا میں حقیقتیں نہیں بدل سکتیں تو پھر ذوقِ انسانی کے اختلافات بھی صرف تعبیرات کے اختلافات ہیں، شاعری حقیقت نہیں ہے بلکہ حقیقتوں کا اظہار ہے، صداقت نہیں ہے بلکہ صداقتوں کی تعبیر ہے، خود کوئی کیفیت نہیں ہے بلکہ کیفیت کا ایک بیان ہے اور تعبیر بیان کا اختلاف فطرت انسانی ہے۔

انسان کی قوت شعور بہ حیثیت ایک فطری قوت ہونے کے تمام افراد میں مشترک ہے لیکن بلحاظ احساس و تاثر وہ ایک دوسرے سے مختلف ہو سکتی ہے، انسان کا دماغ اپنی ساخت کے لحاظ سے مختلف زاویے رکھتا ہے اور انہیں زوایا کے لحاظ سے اس کے خطوط نظر میں انحراف پیدا ہوتا

یہ عالم ہے کہ غالب کی انتہائی پرواز بھی اس کی فضا تک نہیں پہنچتی (لیکن یہ سب انہیں حدود کے اندر جن کو حدودِ تغزل کہا جاتا ہے).....

مومن کا محبوب بھی جرأت اور انشا کی طرح بازاری ہی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ جرأت و انشا کا عشق بھی بازاری ہے اور مومن بہت بلندی سے دیکھتے ہیں اور اسی بلند فضا تک محبوب کو بھی لے جانا چاہتے ہیں، جرأت و انشا اگر اپنی تمنا میں کامیاب نہیں ہوتے تو وہ ترک محبت کے لیے بھی آمادہ ہو جاتے لیکن مومن کی پاکیزگیٔ ذوق کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنی امید کو بھی اس عالمِ آب و گل سے جدا قرار دے کر ایک غیر فانی چیز بنا دیتا ہے یہاں تک کہ اس کی محبت کی فضا محبوب و جلوۂ محبوب سے بھی بے نیاز ہو جاتی ہے؛ چنانچہ لکھتا ہے:—

قطع امید سے سر کاٹنے کو کیا نسبت
مجھ میں وہ دم ہے ابھی جو ترے خنجر میں نہیں

میں نہیں سمجھتا کہ تمنا کو اس سے زیادہ رفیع و جلیل بنایا جا سکتا ہے۔

مومن اسلوب ادا اور قدرتِ بیان کا بادشاہ ہے، وہ معمولی سے معمولی بات کا بھی اظہار کرتا ہے تو بھی اس لطف کے ساتھ کہ اس میں جدت پیدا ہو جاتی ہے اور ذہن سامع بے اختیارانہ طور پر اس سے لطف اٹھاتا ہے، پھر وہ اسی سلسلے میں جب آن ہونی کو ہونی اور ہونی کو آن ہونی ثابت کر جاتا ہے کو تو عجیب سماں پیدا ہو جاتا ہے۔ شب فراق کی انتہائی تکلیف سے مر جانا یا مرنے کی آرزو کرنا بالکل قدرتی خواہش ہے اور اگر کوئی شاعر اس کے خلاف جائے گا تو یقیناً فطری ادعا کے خلاف کرے گا لیکن ملاحظہ ہو مومن کس حسن کے ساتھ اس کی توجیہ کرتا ہے:—

شب فراق میں بھی زندگی پہ مرتا ہوں
کہ گو خوشی نہیں ملنے کی، پر ملال تو ہے

مومن کی ایک خصوصیت جو بہت کم کسی آور کے ہاں پائی جاتی ہے یہ ہے کہ کہیں کہیں وہ ایسے مخفی لیکن نہایت پر کیف مفہوم کے کے نشانات چھوڑ جاتا ہے کہ ہر شخص کی نگاہ وہاں تک نہیں پہنچ سکتی، پھر کہیں یہ خصوصیت وہ ترکیب الفاظ سے پیدا کرتا ہے مثلاً:

کثرت سجدہ سے وہ نقش قدم کہیں پامال سر نہ ہو جائے

مومن کا ایک مخصوص انداز بیان جو غالب کے ہاں کمتر اوردوسرے شعرأ کے ہاں بالکل نہیں پایا جاتا، کسی واقعے کے بیان میں درمیانی کڑیوں کو ملانے کی خدمت ذہن سامع کے سپرد کر دینا ہے، پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ سننے والا نہایت آسانی کے ساتھ اس خلا کو پُر کر کے مفہوم تک پہنچ جاتا ہے...الغرض مومن کا یہ انداز بیان ان کے کلیات میں ہر جگہ نظر آتا ہے اور کوئی غزل اس رنگ سے خالی نہیں۔ مومن فارسی ترکیبیں استعمال کرنے میں بھی خاص ملکہ رکھتے تھے اور اس باب میں جو چیز انھیں غالب سے ممتاز کرتی ہے، وہ ترکیبوں کی نزاکت ہے۔غالب کی فارسی ترکیبوں میں اشکال لفظی کے ساتھ دقت معنی بھی اور مومن کے ہاں ترکیبوں کی لطافت کے ساتھ مفہوم وسیع ہو جاتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مومن و غالب دونوں نے فارسی ترکیبوں کے استعمال میں عرفی و بیدل کا تتبع کیا اور بہت سی ترکیبیں وہی یا اسی نوع کی اختیار کیں جو عرفی و بیدل کے ہاں پائی جاتی ہیں لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ اس باب میں مومن کو نہ صرف اولیت بلکہ فضیلت حاصل ہے...

اسی کے ساتھ جب شوکت الفاظ اور رفعت خیال کی طرف توجہ کرتے ہیں تو بہتر سے بہتر قصیدہ گو شعرأ کی صف میں

بھی ممتاز نظر آتے ہیں...مومن کی مثنویوں خاص چیز ہیں اور ان میں انھوں نے اپنی جولانیٔ فکر کی پوری آزادیاں دکھائی ہیں۔

ان کی کلیات میں علاوہ غزل ، قصیدہ ، مثنوی کے تضمین ، ترجیع بند ، تخمیس ، قطعات ، رباعیات ، تاریخیں اور معمے بھی نظر آتے ہیں اور سخت سے سخت نقاد بھی ان کو کسی جگہ سے گرا ہوا ثابت نہیں کر سکتا۔

آردو شاعری پر ایک نظر۔۔۔کلیم الدین احمد (دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۲ء۔ آردو مرکز پٹنہ صفحہ ۱۳۹) :۔

غالب اور سودا کی نازک خیالی اور معنی آفرینی مومن میں بھی موجود ہے ، مومن بھی بلند اور اعلیٰ خیالات کو حلقۂ شعر میں لاتے ہیں اور اکثر آن کا تخیل تو اس قدر بلند پروازی کرتا ہے کہ مضمون مثلِ عنقا نظر سے غائب ہو جاتا ہے ، آن کی نازک خیالی مشہور و معروف ہے اس لیے وہ غالب کے شریک ہیں بلکہ شریکِ غالب ہیں :۔

کرۂ خاک ہے گردش میں طپش سے میری
میں وہ مجنوں ہوں کہ زنداں میں بھی آزاد رہا (صفحہ ۱۴۰)

کہتے ہیں کہ زمین کی گردش کا سبب کوئی قانونِ عالم نہیں ، یہ گردش شاعر کے دل کی طپش کی وجہ سے ہے ، زمین کی گردش سے زنداں بھی دردش میں ہے ، پھر آسے زنداں میں قید کرنے سے کیا حاصل ہو سکتا ہے ، طپش دل نے آسے آزادیٔ جاوید بخش دی ہے۔ نزاکتِ خیال ظاہر ہے لیکن صرف نازک خیالی کسی شاعر کا منتہائے خیال نہیں ہو سکتی۔ مومن میں یہ نقص ہے کہ وہ نازک خیالی اور معنی آفرینی کو کبھی اصلی شاعری سمجھنے لگتے ہیں ، نازک خیالی اور شاعری مترادف الفاظ نہیں، مومن کی کاوش ، آن کا معنی آفرینی میں انہاک ، آن کے تخیل کی پرواز یہ سب چیزیں تحسین کے قابل ضرور ہیں لیکن آن کے شعروں میں اکثر تاثیر نہیں

ہوتی اس لیے دل و دماغ کو کچھ لطف حاصل نہیں ہوتا :-

بچاؤں آبلہ پائی کو کیوں کر خارِ ماہی سے
کہ بامِ عرش سے پھسلا ہے یا رب پاؤں دقت کا
سرشکِ اعتراضِ عجز نے الماس ریزی کی
جگر صد پارہ ہے اندیشۂ خوں گشتہ طاقت کا
نہ یہ دستِ جنوں ہے اور نہ وہ جیبِ جنوں کی شاں
کہ ہو دستِ مژہ سے چاک پردہ چشمِ حسرت کا
نہ دے تیغ زباں کیوں کر شکستِ رنگ کو طعنے
کہ صفحہائے خرد پر حملہ ہے فوجِ خجالت کا
نہ پوچھو گرمیٔ شوقِ ثنا کی آتش افروزی
بنا ماہیٔ دستِ عجز شعلہ شمعِ فکرت کا (صفحہ ۱۴۱)

ہر ہر شعر مومن کی معنی آفرینی اور نازک خیالی کا نمونہ ہے مثلاً پہلے شعر میں مومن کا مقصد حمد باری ہے لیکن حمد باری آسان کام نہیں ، یہ رتبہ کچھ سہل نہیں ، مومن اسی کی دشواریٔ بیان کرتے ہیں۔ حمدِ باری کی فکر میں ان کے ادراک نے بہت کچھ تگ و دو کی یہاں تک کہ پاؤں میں آبلے پڑ گئے لیکن حصولِ مدعا میں کامیابی معلوم ، آخر ہمت نے پرِ پرواز پھیلائے اور بامِ عرش تک رسائی ہوئی لیکن راستے کی دشواری کی وجہ سے پاؤں قائم نہ رہ سکا اور پھسلا تو ایسا پھسلا کہ تحت الثریٰ میں جا کر رُکا لیکن یہاں دوسری مشکل دقت کا سامنا ہوا ، اب پاؤں کے آبلوں کو ماہیٔ زمین کے کانٹوں سے بچائیں تو کس طرح - دوسرے شعروں میں بھی اسی قسم کی مضمون آرائی ہے لیکن مومن کی تعریف کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ ان شعروں میں تاثیر نام کو نہیں - میں نے کہا ہے کہ نازک خیالی اور شاعری مترادف الفاظ نہیں ، اگر کوئی شاعر نازک خیالی کو شاعری سمجھنے لگے تو اس کی شاعری کی اہمیت معدوم نہیں تو کم ضرور ہو جائے گی لیکن اردو شاعری میں نازک خیالی ، معنی آفرینی یعنی دماغی

عنصر کی کمی رہے ، اس کا زیادہ سے زیادہ حصہ پیش پا افتادہ خیالات، سستے تصورات سے بھرا پڑا ہے ، پھر یہ بھی کہ شاعری کو صرف جذبات کے اظہار کا آلہ سمجھا گیا ہے اور یہ غلط فہمی صرف مشرق تک محدود نہیں ، مغرب بھی مدتوں اس کا شکار رہا ہے اور یہ اس لیے کہ شاعری کو محض تفنّن طبع کا ذریعہ سمجھا گیا ہے ، شاعری محض تفنّنِ طبع کا ذریعہ نہیں ، اس میں انسان اپنی بہترین دماغی صلاحیّتوں سے کام لیتا اور لے سکتا ہے ۔ شاعری تک بندی نہیں لیکن زیادہ سے زیادہ اردو غزلوں میں تک بندی کے سوا کچھ بھی نہیں ۔ غنیمت ہے کہ غالب اور مومن اس حقیقت سے (صفحہ ۱۴۲) واقف تھے اور وہ اپنی بہترین دماغی صلاحیّتوں سے اپنے شعروں میں کام لیتے تھے اس لیے غالب اور غالب سے بھی کچھ زیادہ مومن کے شعر صرف ہمارے جذبات ہی کو نہیں بھڑکاتے بلکہ ہمیں غور و فکر کی بھی دعوت دیتے ہیں۔ مومن کے سیدھے سادھے شعروں میں بھی دعوتِ فکر موجود ہے :—

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے
کہیں صحرا بھی ، گھر نہ ہو جائے
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا
میں الزام اُن کو دیتا تھا ، قصور اپنا نکل آیا
پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے
اس کا نہ دیکھنا نگہِ التفات ہے
درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

اس قسم کی مثالیں مومن کے کلام میں بہت ملتی ہیں ۔ ظاہر ہے کہ یہاں نازک خیالی ، معنی آفرینی اصل مدعا نہیں ، ساتھ ساتھ یہ شعر ذہن کو

اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں اس لیے جو دماغی لطف ان سے ملتا ہے وہ عموماً اردو شعروں سے نہیں ملتا، بہرکیف جہاں مومن معنی آفرینی میں کاوش کرتے ہیں وہاں نئی نئی (صفحہ ۳۴۱) ترکیبیں بھی تراشتے ہیں اور اکثر یہ ترکیبیں دل نشین ہو جاتی ہیں لیکن کبھی کبھی یہ اردو کی سلاست میں اشکال بھی پیدا کرتی ہیں لیکن ایسا کم ہوتا ہے - عموماً یہ بندشیں اپنی دلکشی اور ندرت کی وجہ سے حسنِ کلام میں اضافہ کرتی ہیں البتہ کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ جس طرح مومن کبھی اپنی نازک خیالی کی نمائش میں شاعری سے دست بردار ہو جاتے ہیں اسی طرح وہ کبھی کبھی نئی ترکیبیں صرف اپنی قوتِ ایجاد دکھانے کی غرض سے ایجاد کرتے ہیں - اگر شاعر کے خیالات انوکھے ہیں، اگر اس کے تجربات میں ندرت ہے تو وہ بلا قصد نئی بندشیں ایجاد کرتا ہے لیکن اکثر اردو شعرأ اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں اور وہ یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ الفاظ کتنے ہی نادر کیوں نہ ہوں، استعارے کتنے ہی نایاب کیوں نہ ہوں، اگر وہ صرف اپنے حُسن کے لیے استعمال ہوں تو لائقِ تحسین نہیں ہوسکتے - مومن اکثر اسی غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں، خموشی اثر، اجل چارہ، جراحت زار، اشکِ واژونہ اثر، بیگانہ آشنا وغیرہ اسی قسم کی بہت سی ترکیبیں استعمال کرتے ہیں اور اگرچہ وہ کبھی بہک جاتے ہیں لیکن عموماً یہ ترکیبیں شعروں میں بحسن و خوبی اپنی اپنی جگہوں پر جم جاتی ہیں اور کسی خیال یا تجربے کی ترجمانی میں مفید ثابت ہوتی ہیں، ان میں لطافت بھی ہوتی ہے اور ان کی وجہ سے (صفحہ ۳۴) مضمون اختصار اور زور کے ساتھ نظم ہو جاتا ہے - مومن کی دنیا بھی محدود ہے، غالب و سودا کی دنیا کی طرح وسیع و فراخ نہیں اور وہ کبھی اس تنگ دنیا سے نکلنا بھی نہیں چاہتے اس لیے اُن کے اشعار میں مضامین کے لحاظ سے وہ تنوع نہیں جو سودا اور غالب کے کلام کو میسّر ہے لیکن مومن صاحبِ طرز ہیں، اُن کا الگ اسلوب ہے اور اپنے مخصوص رنگ میں جواب نہیں رکھتے - یہ درست ہے

کہ وہ درد اور غالب کی طرح مسائل تصوف کو نظم نہیں کرتے اور یہ بھی صحیح ہے کہ وہ بلند فلسفیانہ خیالات سے پرہیز کرتے ہیں ، اس وجہ سے اُن کا میدانِ شاعری تنگ تر ہو جاتا ہے - میر کی طرح مومن کی دنیا میں بھی عشق کی حکمرانی ہے ، عشقیہ جذبات جو اُن کے شعروں میں ملتے ہیں، وہ وہی ہیں جو اُن کے دل پر گذرے ہیں - مصنوعی جذبات سے اُنھیں پرہیز ہے، جس عشق کا وہ ذکر کرتے ہیں وہ عشق حقیقی نہیں ، عشق مجازی ہے ، وہی عشق جس سے وہ باخبر تھے اس لیے ان کے سارے جذبات و کوائف داخلی ہیں- یہ عشق وہی ہے جو عام طور سے اردو غزلوں میں ملتا ہے، اس کے کرشمے بھی وہی ہیں : وصل، ہجر،اشک، جنوں ، آہ و فغاں ، انھیں کا مختلف پیرائے میں مومن کی غزلوں میں بھی بیان ہے اور ظاہر ہے کہ جذبات کچھ نئے نہیں- تمام غزل گو شعرأ انھیں مضامین کا سہارا لیتے ہیں، فرق صرف یہ ہے کہ مومن ان پر محض رسماً طبع آزمائی نہیں کرتے ، ان کا دل ان کوائف سے آشنا تھا اس لیے اُن کی غزلوں میں صرف قافیہ پیمائی نہیں ، حقیقت و واقعیت کا جلوہ ہے- مومن کے اشعار کی نوعیت ان کے اشعار میں کھلی ہوئی ہے- مومن کسی پردہ نشین کے عشق میں مبتلا تھے ، وصل و ہجر کی کشمکش اُمید و بیم کی تصویر کشی ہر جگہ ہے ، ان کے جذبات صادق ہیں ، وہ وارداتِ قلبی کا بیان کرتے ہیں اس لیے ان کے بیان میں پاکیزگی اور شیرینی ہے ، کہیں رکاکت اور استبذال کا پتا نہیں . . . . . ہیچ سمجھتے تھے . . . . . گلستان سعدی کو معمولی کتاب کہتے . . . . اپنے معاصرین ذوق و غالب کو کیا خطرے میں لاتے ، ان کے کلام کو نگاہ حقارت سے دیکھتے اور ان کا مضحکہ اڑاتے تھے ....

رنگِ کلام - مومن خاں کا کلام نازک خیالی اور بلند پروازی کے لیے شہرۂ آفاق ہے ، ان کی تشبیہیں اور استعارے بالکل غیر معمولی ہوتے ہیں اور کلام میں خصوصیت پیدا کر دیتے ہیں- اس میں بلند پروازی کے ساتھ صحیح جذبات نگاری کا جوہر بھی ہے اور یہی چیز ان کو طرز لکھنؤ سے

علاحدہ کر دیتی ہے ، عاشقانہ رنگ کے وہ استاد کامل ہیں ، ان کی علمی لیاقت اور طباعی ان کو معمولی پامال مضامین سے بچاتی ہے ، مثل غالب کے وہ بھی کلام میں فارسیت کے بہت دلدادہ ہیں کیوں کہ فارسی میں ان کو بھی وھی تبحر حاصل تھا - بعض وقت یہ فارسیت کی کثرت اچھی نہیں معلوم ہوتی اور کلام کو سخت اور گنجلک کر دیتی ہے - اُن کی مثنویاں سر تیز نشتر ہیں جن میں حرمان نصیب عاشق کے سوزِ محبت کا اظہار ہے ، وہ جذبات سے بھری ہوئی ہیں ، مضطر دلوں کی صدائے باز گشت معلوم ہوتی ہیں البتہ ان میں یہ کمی ہے کہ عشق بازاری ہے اور طرز ادا بلند نہیں ، اس معنی میں وہ طلسم الفت اور زہر عشق وغیرہ کے رنگ کی کہی جا سکتی ہیں - مومن کے یہاں الفاظ کا طلسم ہے اور اسی لفظی ہیر پھیر سے تخیل کے نئے راستے کھل جاتے ہیں -

مومن کا مرتبہ بحیثیت شاعر -| مومن شعرائے اردو میں ایک خاص درجہ رکھتے ہیں ، نہ صرف اپنی ذہانت اور طباعی اور دل فریب شاعری کی وجہ سے یا اس لیے کہ ان کے معاصرین ان کی بڑی قدر کرتے تھے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ ایک صاحبِ طرز ہیں جن کے پیرو نسیم دہلوی ، منشی امیراللہ تسلیم، حسرت موہانی وغیرہ سے ایسے نام بر آوردہ لوگ ہیں .....

ضیاء احمد صاحب مقدمۂ دیوان مومن (شانتی پریس آلہ آباد ۱۹۴۷ء صفحات ۳۱ ، ۴۸ ، ۵۰ ، ۵۱ ، تا ۶۵) میں تحریر کرتے ہیں :-

مولانا فضل حق خیر آبادی سے مراسم تھے تاہم اختلاف عقائد کی بنا پر بحث ہو جاتی تھی - ایک بار دونوں میں مناظرہ ہوا ، مومن غالب رہے چوں کہ مزاج مکدر ہو گیا تھا اس لیے یہ شعر کہ کر چل دیے :-

لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں
مومن نہ ہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ہم

(مولانا فرقتی اور آرزو تخلص کرتے تھے) پھر مولانا خود منانے کو گئے اور بالآخر صلح ہو گئی جس پر مومن نے یہ شعر پڑھا:

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم

اس کے ساتھ یہ ملحوظ رہے کہ بزرگان دین کی عقیدت و محبت کو ہمیشہ جزو ایمان سمجھتے تھے، اگر ان کے والہانہ جوش مذہب کا نمونہ دیکھنا ہو تو ان کے قصاید نعت و منقبت ملاحظہ ہوں۔

غزل | غزل مومن کا سرمایۂ کمال ہے۔ آج وہ صاحب طرز اور مجتہد فن مانے جاتے ہیں۔ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ مومن ہمیشہ روش عام سے علاحدہ رہتے تھے، ان کی مشکل پسند اور جدت طراز طبیعت کسی شعبے میں بھی تقلید کرنا عار سمجھتی تھی پھر شاعری اس کلیہ سے کیوں کر مستثنیٰ رہتی اس لیے انھوں نے اس میں نئی طرز ایجاد کی جو معاملہ بندی کے باوجود جرأت کے انداز سے بلند تر ہے اور مضمون آفرینی کے یا وصف غالب کی طرز سے نازک تر ... مومن نے چند روز شاہ نصیر کو جو بقول صاحب شعرالہند، دہلی کے ناسخ تھے، اپنا کلام دکھایا تھا، پھر جب ناسخ کا دیوان لکھنؤ سے دہلی پہنچا تو مومن و غالب دونوں نے ان کا تتبع کرنے کی کوشش کی مگر شکر ہے کہ یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی ورنہ اردو کو مومن کا انفرادی رنگ کیوں کر نصیب ہوتا اور غالب کے فلسفیانہ حقائق کیسے عالم وجود میں آتے ... غالب رنگِ میر پر آئے، مومن اپنے ذاتی طرز پر.... ان کے ہم عصروں میں ذوق اور غالب دونوں مقلد ہیں یعنی ایک کے کلام میں سودا، نصیر، معروف، مصحفی، انشا، جرأت کا تتبع پایا جاتا ہے اور دوسرے کے یہاں بیدل اور میر کا۔ صرف ایک مومن ہیں جن کو مجتہد فن کہا جا سکتا ہے، ابتدائے مشق میں ضرور ان کے کلام میں بھی ناسخ و نصیر کا رنگ جھلکتا

تھا ، علاوہ بریں کہیں کہیں بیدل کا انداز بھی نظر آتا تھا ....

اُن کی غزلیات ایک خاص طرز کی حامل ہیں . . . . . . اس طرز کی خصوصیات حسب ذیل ہیں :—

۱ تغزل - اردو شعرأ میں مومن نفس تغزل کے اعتبار سے جس نقطۂ عروج تک پہنچ گئے ہیں دوسروں کو اُن کا عشر عشیر بھی حاصل نہیں - فارسی کے شعرائے متاخرین کی غزلوں میں تغزل کے علاوہ فلسفۂ اخلاق ، تصوف سبھی کچھ ہے اور اردو غزل میں بھی . . . . مومن کا وصف یہ ہے کہ اُنھوں نے غزل کو اُس کے حقیقی مفہوم پر منحصر کر دیا ہے . . . . . . مومن کی تمامتر شاعری داخلی ہے -

۲ - نازک خیالی اور مضمون آفرینی متاخرین شعرائے فارسی کی شاعری کا مابہ الامتیاز وصف ہے کہ وہ ذرا سی بنیاد پر تخیّل کی سر بلند عمارت قائم کر دیتے ہیں - فغانی اس طرز تازہ گوئی کا بانی گذرا ہے جس کے مقلد ایران میں محتشم کاشی اور شفائی اور ہندوستان میں عرفی و نظیری تھے ؛ اس رنگ کو ظہوری ، جلال ، طالب ، کلیم نے ترقی دی اور علی اور بیدل نے انتہا کو پہنچا دیا - ان لوگوں کے کلام میں عموماً اغلاق اور دقت پائی جاتی ہے جس کی وجہ یا مبالغے کا دور از کار ہونا ہے یا ایہام و رعایت پر شعر کا مبنی ہونا یا استعارہ در استعارہ کا استعمال یا بڑے خیال کو مختصر عبارت میں ادا کرنا - مومن بھی فارسی کے شاعر تھے اس لیے اس رنگ سے آشنا ہونا اُن کا ناگزیر تھا تاہم اردو میں سب سے پہلے اور سب سے آخر انھوں ھی نے اس کو برتا اور اپنی دوسری خصوصیات کلام سے اُس کو اپنا لیا اس لیے یہ کہنا ہرگز مبالغہ نہیں کہ وہ اردو میں اس طرز کے موجد اور اس انداز میں منفرد ہیں۔ غالب بھی ایک نازک خیال اُستاد ہیں مگر مومن شریک غالب ہیں -

۳ - ندرت اسلوب اور شوخیٔ ادا صاحب مراۃالشعر لکھتے ہیں

کہ اچھا شعر ، حسن الفاظ ، حسن ادا کا مجموعہ ہے ، مومن کا کلام بڑی حد تک اس وصف کا مصداق ہے ۔

۴ - مکر شاعرانہ | ... مومن اپنے مطلب کو اس خوبی سے ادا کرتے ہیں کہ مخاطب اس میں اپنا فائدہ تصور کرتا ہے مثلاً یہ کہنا کہ دشمن کی طرف نہ دیکھو اس لیے یہ پیرایہ اختیار کیا ، مصرع :۔

ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا

۵ - معاملہ بندی | فارسی میں مرزا اشرف جہاں قزوینی معاملہ بندی (وقوعہ گوئی) کا مستقل موجد کہا جاتا ہے ، ان سے پہلے جرأت نے بھی اس رنگ میں بہت کچھ لکھا تھا مگر یہ بسبب کم علمی کے بہت کھل گئے تھے ؛ اس کے برخلاف مومن نے دہلی کی متانت کو ہر جگہ نباہا ہے اور دائرہ تہذیب میں رہ کر جذبات عشق کو ادا کیا ہے ۔

۶ - طنز | (طعنہ دینا) اور تعریض (کنایہ میں بات کہنا ہے) ۔ تغزل کے اجزائے ترکیبی میں ایک چیز تعریض بھی ہے جو اردو شعرا کے یہاں مومن کے برابر شاذ و نادر ہی کہیں نظر آتی ہے ۔

(۷) علمیت (۸) مذہبیت (۹) تراکیب جدیدہ (۱۰) مقطع میں تخلص سے کام لینا بھی خصوصیات مومن میں ہیں ۔

ضیاء احمد نے سبطین احمد صاحب کے اعتراضات مومن کے خلاف نقل کیے ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے :۔

(۱) مومن کے یہاں تصنع آمیز پیچیدگی اور دقت نظر ہے، علو تخیل اور بلندیٔ فکر نہیں ۔

(۲) ان کا میدان محدود ہے ، وہ مناظر و مظاہر عالم سے غیر متاثر نظر آتے ہیں اور معشوق ، خود اور رقیب کے سوا سب سے بے تعلق ۔

(۳) ان کا عشق پست اور بے لگام شہوانیت کا مظاہرہ ہے جس میں پردہ، چلون اور روزن اور ڈوپٹے کے سوا اور کسی کی گنجائش نہیں۔

(۴) زبان میں خامیاں ہیں اور متروکات کا جو اسی زمانے میں ترک ہو رہے تھے، استعمال زیادہ ہے مثلاً افغان (فغاں)، جائے (جا)، کبھو (کبھی)، موا (مرا)۔

(۵) تعقیدات سے شعر اکثر معما بن کر رہ جاتا ہے۔

(۶) رعایات و صنائع کی بھرمار سے کلام میں بے لطفی آ گئی ہے۔

(۷) مترادفات اکثر بے ضرورت استعمال کیے ہیں اور انتخاب الفاظ اچھا نہیں۔

مومن کے معاصر اساتذہ میں یوں تو آزردہ، احسان، ممنون وغیرہ کئی خوشگوار ارباب فن ہیں مگر جو مقبولیت و شہرت ذوق و غالب کو نصیب ہوئی کسی کو نہ ہوئی۔

ضیاء احمد صاحب لکھتے ہیں (صفحہ ۷۳ دیوان مومن) :—

راقم جس نتیجے پر پہنچا ہے وہ یہ ہے کہ اردو شاعری کی کائنات کے یہ موالید ثلثہ اپنے اپنے رنگ میں بے نظیر ہیں اور اصلاً قدر مشترک ان میں بہت کم ہے تاہم اس قدر کہا جا سکتا ہے کہ مومن مثنوی کے بادشاہ ہیں اور ذوق قصیدے کے؛ رہی غزل اس میں تینوں کا رنگ جداگانہ اور اپنی جگہ بے مثل ہے، غزل میں نازک خیالی، معاملہ بندی اور سوز و گداز میں مومن اپنے تمام معاصرین سے فائق ہیں، اسی طرح صفائی زبان اور محاورہ بندی میں ذوق اور فلسفہ و تصوف کے بیان میں غالب سب ہم عصروں سے بر تر ہیں۔

پروفیسر وقار عظیم مومن کی نسبت اس طرح خیال کرتے ہیں (مومن کا تغزل از نظیر صدیقی، نگار جون ۱۹۵۳ء صفحہ ۴۶) :—

یہ کہتے وقت کہ مومن اردو کے تنہا غزل گو شاعر ہیں جن کے رنگ

تغزل میں ہر جگہ خلوص اور سچائی ہے، میرے ذہن میں تغزل کا وہی مفہوم ہے جو عاشق، محبوب اور رقیب کے مثلث میں گھرا ہوا ہے، غزلوں میں اس کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوتا ہے لیکن میں تغزل اسے نہیں کہتا اور اسی لیے یہ دعویٰ کرتے وقت میری نظر میں میر، غالب اور آتش کی عظمت مومن کی غزلوں سے زیادہ ہے۔ جس چیز کا نام تغزل ہے اس کی کمی میر، غالب اور آتش کے یہاں بھی نہیں بلکہ جیسا کہ میں نے ابھی کہا یہ تغزل اکثر صورتوں میں محض رسمی اور روایتی ہے ۔ میر غالب اور آتش اپنی شاعرانہ پیمبری کے باوجود تغزل کو اکثر ان کی رسمی اور روایتی قیدوں سے باہر نہ نکال سکے۔ یہ کام سب سے پہلے مومن نے کیا اور اس طرح کیا کہ یہ ان کا رنگ خاص بن گیا، اس میں ان کا کوئی شریک نہیں ۔ مومن کی غزلوں میں عشق کی داستان گل اور بلبل، شمع اور پروانے، ساقی اور بادہ کی زبان سے بیان نہیں کی گئی ۔ ان کی رشک پسند طبیعت کو گورا نہ تھا، کہ اپنے عشق کی کہانی ان پیاموں کی زبانی دوسروں تک پہنچائیں اور اس لیے چند گنے چنے شعروں کو چھوڑ کر جن میں یہ اشارے برائے نام موجود ہیں (ان کے اچھے شعروں میں یہ بات نہیں) مومن کی غزلیں ان روایتی اشاروں سے بالکل پاک ہیں ۔

پروفیسر وقار عظیم مضمون ''طرز داغ میں رنگ مومن کی جھلکیاں'' (نگار جنوری فروری ۱۹۵۳ء) میں تحریر کرتے ہیں :—

مومن کے تغزل کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ تغزل کو روایت کا ایک عنصر اور جزو سمجھ کر کبھی رسمی انداز سے نہیں برتتے، انھوں نے ایک عورت کو اپنا محبوب بنایا ہے اور محبت کے اس رشتے کی مختلف کڑیوں سے اپنے انداز تغزل کو حسن و دل فریبی دی ہے، جس طرح ان کے عشق میں خلوص اور ان کے محبوب کی دلبری و دل ستانی کی ساری صفات کے باوجود ایک خاص طرح کا رکھ رکھاؤ اور روک تھام ہے اور یہی خلوص اور یہی رکھ رکھاؤ اور یہی روک تھام اکثر جگہ ان کے رنگ تغزل میں نمایاں ہے؛ عورت کو بلا شرکت غیرے محبوبی کا یہ شرف دینے میں

جرأت ان کے پیش رو ہیں لیکن چونکہ جرأت کا عشق محبوب فطری شان بے نیازی کے احساس اور احترام سے نا آشنا اور محروم ہے اس لیے اس عاشقی اور اس محبوبی نے جس تغزل کی تخلیق کی ہے، اس پر بوالہوسی کی عریانی و بے باکی ہے، وہ حقیقت اور صداقت سے قریب ہو کر بھی شدت تاثیر سے خالی ہے اس تغزل کو دوست رکھنے والا مسرت کی لطیف کیفیتوں کے بجائے اکثر شرم ساری و خجالت سے اپنا دامن بھرتا ہے۔ مومن کے تغزل میں صحت مندی کا جو گہرا پرتو ہے وہ نہ صرف اسے عشق و عاشقی کی دنیا میں عالی مرتبہ بناتا ہے بلکہ شاعری کے نقطۂ نظر سے بھی اس میں ایک ایسی کشش پیدا کرتا ہے جو مومن سے پہلے کسی کے حصے میں نہیں آئی، مومن کے بعد البتہ بہت سوں نے اس سے اپنی جھولیاں بھری ہیں۔ مومن کے عشق کا یہی مخلصانہ انداز اور اس کے محبوب کا یہی غیر رسمی لیکن دل آویز تصور ہے جس نے مومن سے تغزل کے ایسے شعر کہلوائے ہیں۔

عرش گیاوی مؤلف حیات مومن کی رائے (صفحات ۱۱۰، ۱۱۱) بھی سن لیجیے :—

تغزل کا ان کے انداز یہ ہے کہ اشعار ان کے مضامین پیچیدہ، نازک خیالوں اور نادر ترکیبوں کے ساتھ درد و غم سے معمور ہیں، ایک ہی لفظ کو متواتر لاتے ہیں اور معنی عجیب و دلکش پیدا کر دیتے ہیں۔ بہترے شعر ایسے بھی ہیں جو بالکل سہل ممتنع ہیں اور عام دماغوں کی وہاں تک رسائی نہیں۔ یہی سبب ہوا کہ کلام ان کا خاص پسند رہا اور ہے۔

رئیس احمد جعفری مومن کے متعلق ''بہادر شاہ ظفر (صفحہ ۱۱۴) میں لکھتے ہیں :—

طبیب حاذق، شاعر بے مثال، مرد مومن، خود دار اتنا کہ زبان کسی تاجدار اور تاجور کی مدح و قصیدے سے آلودہ نہیں ہوئی، جو خود

اقلیم شعر و سخن کا تاج دار ہوا ، جذبۂ مذہبیت کا یہ عالم کہ شوقِ شہادت سے سر شار ، حضرت سید احمد شہید کی تحریک احیائے دین کے سلسلے میں جو والہانہ اشعار کہے ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں ۔ تغزل کا رنگ دوسروں سے ممتاز بھی اور منفرد بھی ، مرزا غالب نے مومن کا جب یہ شعر سنا :۔

تم میرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

تو اپنا دیوان دینے پر تیار ہو گئے ۔

اس طول کلام کو مختصر کر کے ہم مومن کی رائے شعر و سخن کے سلسلے میں سنانا چاہتے ہیں ، حکیم احسن اللہ خاں مومن سے فارسی خطوط محفوظ رکھنے کی فرمائش کرتے ہیں ، مومن کا نثر فارسی کا انداز بھی دل کش تھا لیکن مومن اپنی پریشانی کا اظہار کرتے ہیں اور عذر خواہی میں لکھتے ہیں :۔

نکتہ شناس جانتے ہیں اور عالی نگاہ سمجھتے ہیں کہ بغیر دقتِ نظر شاہد معنی کا چہرہ خواہ دیدۂ آفتاب ہی کیوں نہ ہو نہ دیکھے۔۔۔۔اور معانی بیگانہ ، بیگانیٔ خیال کے ساتھ نہ وابستہ ہوئے اور جب تک محو حیرت نہ ہوئے تو آئینہ جوہر بے پردہ صورت الفاظ کو نہ دکھا سکے۔۔۔۔اگر تجاہل عارفانہ اور حسن التعلیل پر محمول نہ کریں تو آپ جانتے ہی ہیں کہ جواہر معانی کی میناکاری کس قدر دشوار ہے اور طباق سیاہی اور سپیدی کتنا مشکل ۔۔۔۔۔میں کہ دوسرے کے مضمون کا استعارہ کنایتاً بھی عیب جانتا ہوں ۔۔۔۔۔۔ موجودہ پریشانی میں کیا کروں ۔

ایک شعر میں معنی بند اور مضمون یاب اپنی صفت قرار دی ہے :۔

اگرچہ شعر مومن بھی نہایت خوب کہتا ہے
کہاں ہے لیک معنی بند و مضموں یاب اپنا سا

درد و اثر اور سوز و گداز میں مومن کا کلام مرثیہ جیسا موثر ہے :—

تو غزل سنج ہے یا مرثیہ خواں اے مومن
رو دیا جس نے کہ دیکھا ترا لکھا کاغذ

مضمون یابی کا ایک اور شعر میں ذکر ہے :—

مومن سے اچھی ہو غزل تھا اس لیے یہ زور شور
کیا کیا مضامین لائے ہم ، کس کس ہنر سے باندھ کر

طرز واسوخت یعنی معاملہ بندی میں مومن کو کمال حاصل ہے ، وہ خود بھی مدعی ہیں :—

کہنہ اور غزل بطرزِ واسوخت مومن یہ اسے سنائیں گے ہم

آتش بیانی کا دعویٰ سوز و گداز کی بنا پر اپنے اشعار میں کرتے ہیں :—

پڑھتا ہے کہیں غزل جو مومن
لگ اٹھتی ہے ایک بار آتش
مومن اس شعلہ زبانی کی کہاں قدر مگر
منہ در آبلہ سے گرمیٔ فریاد بھرے
پڑھے مومن نے کیا کیا گرم اشعار
بھری تھی دل میں یا رب کس قدر آگ

مومن کو اپنی نزاکت خیال اور علمیت کا غرور تھا، وہ بجا کہتے ہیں:—

شاعری اپنی ہوئی نیرنگیٔ دانش وری
جو سخن ہے سو طلسم راز بطلیموس ہے

ان کے کلام کو سمجھنے کے لیے علمیت اور سخن فہمی کی ضرورت تھی - جو اصحاب سخن فہم نہ تھے وہ مومن کے کلام پر معاصرین کو ترجیح دیا کرتے ہیں ، ان کی نسبت مومن کا فیصلہ ہے :—

مومن اسی نے مجھ سے دی برتری کسی کو
جو پشت فہم میرے اشعار تک نہ پہنچا

وہ تاثیر بیان میں اپنے کلام کو سحر حلال اور درجۂ اعجاز تک

پہنچا دیتے ہیں :—

اعجاز جان دے ہے ہمارے کلام کو
زندہ کیا ہے ہم نے مسیحا کے نام کو
رواں فزائیے سحرِ حلال مومن سے
رہا نہ معجزہ باقی ، لبِ بتاں کے لیے

مومن انداز تغزل کو اپنے لیے خاص کرتے ہیں اور ان کا ادعا ہے کہ عشق و محبت کی ترجمانی ان کے کلام سے ہوتی ہے :—

کھل گیا عشق صنم ، طرز و سخن سے مومن
اب چھپاتے ہو عیب ، بات بناتے کیوں ہو
اپنے ڈھب کی کیا پڑھی اک اور مومن نے غزل
دو ہی دن میں یہ تو کیسا ماہرِ فن ہو گیا

مومن اپنے ہم عصر شعراء پر مندرجہ ذیل اشعار میں طنز و تعریض کرتے ہیں :—

شعر تر مومن مرے وہ ہیں کہ ہنگامِ جواب
خوف سے منہ اور زبانِ ہر سخن ور خشک ہو
مومن یہ شاعروں کا مرے آگے رنگ ہے
جوں پیش آفتاب ہو بے نور تر چراغ
اک اور پڑھ دو مومنِ شعلہ زبان غزل
جل جائیں جس کے رشک سے حاسد بسانِ شمع
حق تو یہ ہے کیا غزل اک اور مومن نے پڑھی
آج باطل سارے استادوں کا دعویٰ ہو گیا
یار مومن سے بھی ہیں مدعیٔ طبع رواں
واہ افکار تر ان ادمغۂ یابس کے

اپنے کلام کی قدر و قیمت سے مومن واقف تھا ، آزردہ (مولوی

صدر الدین)، مولوی فضل حق خیر آبادی، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ وغیرہ اس کے قدر دان سخن تھے اس لیے مومن کی یہ تعلی بے جا نہیں کہی جا سکتی :—

ایسی غزل کہی ہے کہ جھکتا ہے سب کا سر
مومن نے اس زمین کو مسجد بنا دیا
انصاف کے خواہاں ہیں، نہیں طالب زر
تحسینِ سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا
مدت سے نام سنتے تھے مومن کا بارے آج
دیکھا بھی ہم نے اس شعراء کے امام کو
سن رکھو، سیکھ رکھو، اس کو غزل کہتے ہیں
مومن اے اہلِ فن اظہار ہنر کرتا ہے
رشک دامان جواہر اور لکھی ہے غزل
جس کو مفلس بھی نہ بدلے نسخۂ اکسیر سے
مومن بخدا سحر بیانی کا جبھی تک
ہر ایک کو دعویٰ ہے کہ، میں کچھ نہیں کہتا
مومن تجھے تو وہی ہے مومن ہی وہ نہیں
جو معتقد نہیں تری طبعِ سلیم کا

آخر میں مومن خود ہی دل کو تسلی دیتا ہے :—

عبث ترقیٔ فن کی ہوس ہے مومن کو
زیادہ ہوئے گا کیا اس سے بے مثال تو ہے

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے بیان مطابق مندرجہ ذیل خصوصیات کلام مومن میں پائی جاتی ہیں :—

طرز گزیں، روش متیں، الفاظ شگفتہ و دل پسند، معانی تازہ و بلند، چستیٔ تراکیب، شوکت کلمات، تنومندیٔ اندیشہ، نزاکت خیال، رشاقت مضمون، رعایت مقتضائے مقام، شوخیٔ انداز، جزالت عبارت،

الفاظ آشنا ، معنئ بیگانہ ، تہ نشینی غور ، حسن ادا ، مضامین بیگانہ ۔

اس کے علاوہ مومن استعارات بعیدہ اور تشابیہ رذیلہ اور تصورات رکیکہ سے گریز کرتا، وہمی دقائق اور ادائیگی میں الجھن کو پسند نہ کرتا، ایسی ظاہری خوبیاں جو صورت کو آراستہ کریں اور معانی کو خراب کریں ان سے پرہیز تھا، اس کی قوت فکر دوسروں کے پامال اور فرسودہ مضامین باندھنے سے متنفر ہے ۔

سر سید کی نظر میں مومن کے کلام میں شرینئی زبان حافظ اور نمک سخن سعدی اور متانت تراکیب انوری اور نشست الفاظ خاقانی اور تازگئ معانی کمال الدین اصفہانی پائی جاتی ہے ، نازک خیالی اور بلند پروازی اور مضمون آفرینی کے بھی مداح ہیں ۔

اسی طرح صابر (گلستان سخن) بلندئ فکر اور نزاکت خیال اور مضمون آفرینی اور غزلیت کی ستائش کرتے ہیں ، وہ مومن کی بلند نظری کی تعریف کرتے ہوئے معاصرین کی نکتہ چینی کو پسند نہیں کرتے۔ صابر کا بیان ہے کہ اس کی پرواز تخیل اور بلندئ فکر کے سامنے معاصرین عاجز تھے اور اسی سبب سے مومن اپنی رسائئ ذہن اور بلند پروازئ خیال پر نازاں تھا اور معاصرین کا مذاق اڑاتا ۔ صفیر بلگرامی کی نظر میں مومن معاملہ بند شاعر تھے، ان کے بقول جرأت اسی رنگ کے موجد تھے مگر بسبب کم علمی کے بہت کھل گئے تھے، مومن خاں کے علم نے ان واقعات کو مشکل بندش اور پرانی ترکیبوں سے ایسے پردے میں رکھا کہ ادا شناس ہی اس کے مزے کو جانتا ہے ۔

حسرت موہانی کی رائے میں شگفتہ اور نئی ترکیب سے شعر میں جان ڈال دینا خاص انداز تھا مومن مرحوم کا اور اصل تو یہ ہے کہ شگفتگی اور نطافت الفاظ کی وہ ایک خاص شان جس کی ابتدا مومن خاں نے کی اور جس کو نسیم دہلوی مرحوم نے انتہا کو پہنچایا ، اس خاندان شاعری کے علاوہ اور کسی کو نصیب نہیں ؛ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اردو شاعری کے لحاظ سے

ذوق کا درجہ غالب سے اور غالب کا مرتبہ مومن سے بلند ہے لیکن درد اور تاثیر کلام کے لحاظ سے مومن کا کلام غالب سے افضل اور ذوق سے افضل تر ہے۔

غزل کی جو تعریف غزلیت اور تغزّل کے عنوان سے ڈاکٹر سید عبداللہ صاحب نے کی ہے (صحیفہ جون ۱۹۵۸ء) اس کی روشنی میں صرف مومن کا کلام پورا اترتا ہے۔ مولانا امام امداد اثر کی نظر میں حافظ اور غالب ہی ایسے شاعر ہیں جو غزلیت کی کسوٹی پر پورے مصداق ٹھہرتے ہیں۔ یہ بات تو اپنی اپنی پسند کی رہ جاتی ہے، آخر غزل کو فلسفہ اور اخلاق اور تصوف کا ترجمان کیوں بنایا جائے؟ کیا دوسرے اصنافِ سخن میں ایسے دقیق مضامین ادا نہیں ہو سکتے ہیں جو غزل جیسی صنف لطیف کو ان مضامین عالیہ کے بار سے مجروح کیا جاتا ہے؟ ہم اس طویل بحث کو مختصر کرتے ہیں اور کلام مومن پر اس کا تصفیہ چھوڑتے ہیں۔ اس کی تغزل سے بھر پور یہ چند غزلیں ملاحظہ کیجیے اور فیصلہ کیجیے کہ غزلیت کے عناصر کس حد تک اس میں پائے جاتے ہیں:—

مفت بیٹھے بٹھائے لوگوں نے مجھ پہ طوفان اٹھائے لوگوں نے
تذکرے جائے جائے لوگوں کے کر دیے اپنے آنے جانے کے
دل سے دفتر بنائے لوگوں نے وصل کی بات کب بن آئی تھی
اپنے نقشے جمائے لوگوں نے بات اپنی وہاں نہ جمنے دی
دونوں کے ہوش اڑائے لوگوں نے سن کے اڑتی سی اپنی چاہت کی
دشمنوں کے پڑھائے لوگوں نے اور ہی کچھ پڑھا دیا، اس کو
آسے کیوں کر سنائے لوگوں نے بن کہے راز ہائے پنہانی
وہ تماشے دکھائے لوگوں نے کیا تماشا ہے جو نہ دیکھے تھے
کیا کیا ہائے ہائے لوگوں نے کر دیا مومن اس صنم کو خفا

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم
پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم
ہنستے جو دیکھتے ہیں کسی کو کسی سے ہم
منہ دیکھ دیکھ روتے ہیں کس بیکسی سے ہم
ہم سے نہ بولو تم اسے کیا کہتے ہیں ذرا
انصاف کیجیے، پوچھتے ہیں آپ ہی سے ہم
بیزار جان سے جو نہ ہوتے تو مانگتے
شاہد شکایتوں پہ تری مدعی سے ہم
اُس کُو میں جا مریں گے، مدد اے ہجوم شوق
آج اور زور کرتے ہیں بے طاقتی سے ہم
صاحب نے اس غلام کو آزاد کر دیا
لو بندگی کہ چھوٹ گئے بندگی سے ہم
بے روئے مثلِ ابر نہ نکلا، غبارِ دل
کہتے تھے اُن کو برقِ تبسم ہنسی سے ہم
ان ناتوانیوں پہ بھی تھے، خارِ راہ غیر
کیوں کر نکالے جاتے نہ اُس کی گلی سے ہم
کیا گل کھلے گا، دیکھیے ہے فصلِ گل تو دور
اور سوئے دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم
منہ دیکھنے سے پہلے بھی کس دن وہ صاف تھا
بے وجہ کیوں غبار رکھیں آرسی سے ہم
ہے چھیڑ اختلاط بھی غیروں کے سامنے
ہنسنے کے بدلے روئیں نہ کیوں گدگدی سے ہم
وحشت ہے عشقِ پردہ نشیں میں دمِ بکا
منہ ڈھانکتے ہیں پردۂ چشمِ پری سے ہم

کیا دل کو لے گیا ، کوئی بیگانہ آشنا
کیوں اپنے جی کو لگتے ھیں کچھ اجنبی سے ھم
لے نام آرزو کا تو دل کو نکال لیں
مومن نہوں جو ربط رکھیں بدعتی سے ھم

جو پہلے دن ھی سے دل کا کہا نہ کرتے ھم
تو اب یہ لوگوں کی باتیں سنا نہ کرتے ھم
اگر نہ ھاتھ میں ، اُس دلربا کے ، دل دیتے
تو دل پہ ھاتھ سدا دھر لیا نہ کرتے ھم
اگر نہ دام میں زلفِ سیہ کے آ جاتے
تو یوں خراب و پریشاں رھا نہ کرتے ھم
اگر نہ لگتی چپ اُس بدگماں کی شوخی سے
تو بات بات میں مضطر ھوا نہ کرتے ھم
اگر جلاتے نہ اُس شعلہ رو کے عشق میں جی
تو سوزِ آتش غم سے جلا نہ کرتے ھم
نہ جاتے اس بتِ ھرجائی کی گلی مین آ کر
تو دوڑے دوڑے قلق سے پھرا نہ کرتے ھم
اُس آفتِ دل و جاں پر اگر نہ مر جاتے
تو اپنے مرنے کی ھر دم دعا نہ کرتے ھم
نہ بھرتے دم جو کسی شعلہ رو کی خواھش کا
تو ٹھنڈے سانس ھمیشہ بھرا نہ کرتے ھم
اگر نہ آنکھ تغافل شعار سے لگتی
تو بیٹھے بیٹھے یہ یوں، چونک اُٹھا نہ کرتے ھم
نہ ھوش کھوتے ، اگر اس پری کی باتوں پر
تو آپ ھی آپ یہ باتیں کیا نہ کرتے ھم

نہ کرتے اُس کی برنگِ حنا جو پابوسی
تو شکلِ برگِ حنا ، یوں پسا نہ کرتے ہم
اگر نہ ہنسنا ، ہنسانا کسی کا بھا جاتا
تو بات بات پہ یوں رو دیا نہ کرتے ہم
نہ لگتی آنکھ تو دن رات سوتے ہی رہتے
کسی کی چاہ نہ کرتے تو کیا نہ کرتے ہم
اگر نہ دیکھتے وہ پیاری پیاری صورت آہ
تو ایک ایک کے ، منہ کو تکا نہ کرتے ہم
جو غم بتوں کا نہ ہوتا تری طرف مومن
تو دیکھ چرخ کو ہے ہے خدا نہ کرتے ہم

اُس نقشِ پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

نہ جاؤں گا کبھی جنت میں میں نہ جاؤں گا
اگر نہ ہوے گا نقشا تمہارے گھر کا سا

محو مجھ سا دمِ نظارۂ جاناں ہوگا
آئینہ ، آئینہ دیکھے گا ، تو حیراں ہوگا
خواہش مرگ ہو اتنا نہ ستانا ورنہ
دل میں ، پھر تیرے سوا اور بھی ارماں ہوگا
کیوں کر امیدِ وفا سے ہو ، تسلی دل کو
فکر ہے یہ کہ وہ وعدہ سے پشیماں ہوگا
درد ہے جاں کے عوض ، ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے ، جو درماں ہوگا

دیدۂ حیراں نے تماشا کیا　　دیر تلک وہ مجھے دیکھا کیا
آنکھ نہ لگنے سے سب احباب نے　　آنکھ کے لگ جانے کا چرچا کیا
اُن سے پری‌وش کو نہ دیکھے کوئی　　مجھ کو مری شرم نے رسوا کیا
سچ ہی سہی آپ کا پیمان ولے　　مرگ نے کب وعدۂ فردا کیا

وصل کی شب، شام سے میں سو گیا　　جاگنا ہجراں کا بلا ہو گیا

تیرے پردہ نے کی یہ پردہ دری　　تیرے چھپتے ہی، کچھ چھپا نہ رہا
تو ، فلک ، مرگ، ہم سے سب غافل　　اب کسی کا بھی آسرا نہ رہا

نہ مانوں گا نصیحت ، پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا
کہ ہر ہر بات میں ناصح تمھارا نام لیتا تھا

کیا خجل ہوں اب علاجِ بیقراری کیا کروں
دھر دیا ہاتھ اُس نے دل پر، تو بھی دل دھڑکا کیا

جو پھر جائے اُس بے وفا سے تو جانوں　　کہ دل پر نہیں زور چلتا کسی کا

الجھا ہے پاؤں یار کا، زلف دراز میں　　لو آپ ، اپنے دام میں صیاد آ گیا
دل کو قلق ہے ترکِ محبت کے بعد بھی　　اب آسماں کو شیوۂ بیداد آ گیا

کچھ قفس میں ان دنوں لگتا ہے جی　　آشیاں اپنا ہوا برباد کیا

یہ عذرِ امتحانِ جذبِ دل کیسا نکل آیا
میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

وقتِ وداع بے سبب آزردہ کیوں ہوئے
یوں بھی، تو ہجر میں مجھے رنج و عذاب تھا

یادِ ایام و وصلِ یار افسوس دھر کے انقلاب نے مارا
کس پہ مرتے ہو، آپ پوچھتے ہیں مجھے فکرِ جواب نے مارا

رتبہ افتادگی کا دیکھو، ہے عرش کے بھی پرے مقام مرا

کسی کا سوز دل ہرگز تجھے باور نہیں آتا
تو سب کو جانے ہے اے میر عالم تاب اپنا سا
اگر مرضی یہی ٹھہری کہ تجھ کو چھوڑ دوں، مجھ کو
بتا دے اور کوئی غیرتِ مہتاب اپنا سا

بے خود تھے، غش تھے، محو تھے، دنیا کا غم نہ تھا
جینا وصال میں بھی، تو مرنے سے کم نہ تھا
گو حسد سے ہو، پر اب بھی ہے وہی، ناصح کی بات
ناحق آس جانِ جہاں کو اک نظر دکھلا دیا

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزۂ غماز دیکھنا
دشنامِ یار طبع حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس، نزاکتِ آواز دیکھنا

اتنا تو نہ گھبراؤ، راحت یہیں فرماؤ
گھر میں مرے رہ جاؤ اور آج اور بھی، کل جانا

عشق ان کی بلا جانے، عاشق ہوں تو پہچانے
لو مجھ کو اطبا نے سودے کا خلل جانا
دم لینے کی طاقت ہے بیمارِ محبت ہے
اتنا بھی غنیمت ہے مومن کا سنبھل جانا

جی طعنِ وصلِ حور سے کیسا جلا دیا   روزجزا کا، ذکر جو محفل میں شب ہوا

دھو دیا اشکِ ندامت نے گناہوں کو مرے
تر ہوا دامن، تو بارے پاک دامن ہو گیا

قابو میں نہیں ہے دل کم حوصلہ اپنا
اس جور پہ جب کرتے ہیں تجھ سے گلہ اپنا

روتے تو رحم آتا، سو اُس کے رو برو تو
اک قطرہ خوں بھی چشمِ خوں بار تک نہ پہنچا

لگ گئی چپ مجھ کو تو بھی بات وہ کرتا نہیں
کیا کہوں قسمت کو، کہنا دشمنوں کا ہو گیا
جوشِ عشق و حسن نے کیا رنگ بدلا دیکھنا
اشک خونی سے مرے منہ زرد اُس کا ہو گیا
یہ کسی سے ہو کہ ان لطفوں پہ گستاخی نہ ہو
غیر ہم سا کب ہوا، ہر چند ہم سا ہو گیا

کیا رشک غیر تھا کہ تحمل نہ ہو سکا
میں جان کر حریفِ تغافل نہ ہو سکا
پروردۂ وفا سے ہو کب ترکِ عاشقی
کیا ناز تھے کہ مجھ سے تحمّل نہ ہو سکا

وہ عکسِ زلف چشم عدو میں پڑا نہ ہو
نظّارہ مجھ سا جانبِ سنبل نہ ہو سکا

شعلۂ دل کو نازِ تابش ہے اپنا جلوہ ذرا دکھا جانا
اُس کے اُٹھتے ہی ہم جہاں سے اُٹھے کیا قیامت ہے دل کا آ جانا
گھر میں خود رفتگی سے دھوم مچی کیوں کہ ہو، اُس تلک مرا جانا
پوچھنا حالِ یار ہے منظور میں نے ناصح کا مدعا جانا
مے نہ اُتری گلے سے جو اُس بِن مجھ کو یاروں نے پارسا جانا
شکوہ کرتا ہے بے نیازی کا تو نے مومن بتوں کو کیا جانا

اس وسعتِ کلام سے جی تنگ آ گیا
ناصح تو میری جان نہ لے، دل گیا، گیا
یہ ضعف ہے تو دم سے بھی کب تک چلا گیا
خود رفتگی کے صدمے سے مجھ کو غش آ گیا
کچھ آنکھ بند ہوتے ہی، آنکھیں سی کھل گئیں
جی اک بلائے جان تھا اچھا ہوا گیا
میرا گلا ہنسی سے نہیں گھونٹتے تھے وہ
کیا سوچ کر رقیب، خوش آیا خفا گیا
آنکھیں جو ڈھونڈھتی تھیں نگہ ہائے التفات
گم ہونا دل کا وہ مری نظروں سے پا گیا
بوئے سمن سے شاد تھے اغیار بے تمیز
اُس گل کو اعتبارِ نسیم و صبا گیا
آتی نہیں بلائے شبِ غم نگاہ میں
کس مہروش کا جلوہ نظر میں سما گیا

وہ ہنسے سن کے نالہ بلبل کا مجھے رونا ہے خندۂ گل کا

دھیان ہے غیر کے تحمّل کا ہوش دیکھا ترے تغافل کا

چلون کے بدلے مجھ کو زمین پر گرا دیا
اس شوخِ بے حجاب نے پردہ اٹھا دیا
ہم دم دکھا اب اس کو کسی ڈھب کہ رحم آئے
ناصح کو میرے حالِ زبوں نے رلا دیا

دل قابلِ محبتِ جاناں نہیں رہا
وہ ولولہ ، وہ جوش ، وہ طغیاں نہیں رہا
دل سختیوں سے آئی ، طبیعت میں ناز کی
صبر و تحملِ قلقِ جاں نہیں رہا
کیا اچھے ہو گئے کہ بھلوں سے بُرے ہوئے
یاروں کو فکرِ چارہ و درماں نہیں رہا
ناکامیوں کا گاہ گلہ ، گاہ شکر ہے
شوقِ وصال و اندوہِ ھجراں نہیں رہا
پھرتے ہیں کیسے پردہ نشینوں سے منہ چھپائے
رسوا ہوئے کہ اب غمِ پنہاں نہیں رہا
بے کاریٔ امید سے فرصت ہے رات دن
وہ کاروبار حسرت و حرماں نہیں رہا
بے سیرِ دشت و بادیہ لگنے لگا ہے جی
اور اس خراب گھر میں کہ ویراں نہیں رہا
کیا تلخ کامیوں نے لبِ زخم سی دیے
وہ شور اشتیاقِ نمک دان نہیں رہا
بے اعتبار ہو گئے ہم ترکِ عشق سے
از بس کہ پاس وعدہ و پیماں نہیں رہا

نیند آئی ہے فسانۂ گیسو و زلف سے
وہم و گمانِ خوابِ پریشاں نہیں رہا
کس کام کے رہے جو کسی سے رہا نہ کام
سر ہو (ہے؟) مگر غرور کا سامان نہیں رہا
مومن یہ لافِ الفتِ تقویٰ ہے کیوں، مگر
دلّی میں کوئی دشمن ایماں نہیں رہا

مومن نے محبت کی اور بار بار کی اور ہر مرتبہ عہد کیا کہ اب کہیں دل نہ لگاؤں گا، اُن کی مثنویوں میں بہ تفصیلی داستان ملتی ہے، موجودہ غزل اسی کیفیت کی ترجمان ہے :—

کیا رم نہ کرو گے، اگر ابرام نہ ہوگا
الزام سے حاصل، بجز الزام نہ ہوگا
ناکامیٔ امید پہ صبر آئے تو کیا آئے
ہر بات میں کہتے ہو کہ یہ کام نہ ہوگا
کیا کیجیے، دل شوخیٔ فطرت پہ جو آ جائے
میں تو یہ سمجھتا تھا کہ وہ رام نہ ہوگا

———

اثر اس کو ذرا نہیں ہوتا — رنج راحت فزا، نہیں ہوتا
بے وفا کہنے کی شکایت ہے — تو بھی وعدہ وفا نہیں ہوتا
کس کو ہے ذوقِ تلخ کامی لیک — جنگ بن، کچھ مزا نہیں ہوتا
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے — ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا — جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا
چارۂ دل سوائے صبر نہیں — سو تمہارے سوا نہیں ہوتا
کیوں سنے عرضِ مضطرب مومن — صنم آخر خدا نہیں ہوتا

———

کیا ہوا، ہوا گر وہ، بعدِ امتحاں اپنا
بے گنہ سزا پائے، اب وہ دل کہاں اپنا
بعد مدت اس کو سے یوں پھرے تنگ آ کر
جائے جائے پھرتے ہیں پوچھتے مکاں اپنا
صبر بعدِ آسائش، اس قلق پہ مشکل تھا
عیشِ جاوداں نکلا، رنجِ جاوداں اپنا
دیر و کعبہ یکساں ہے عاشقوں کو اے مومن
ہو رہے وہیں کے ہم، جی لگا، جہاں اپنا

ہم جان فدا کرتے گر وعدہ وفا ہوتا
مرنا ہی مقدر تھا، وہ آتے تو کیا ہوتا
اس حسن پہ خلوت میں جو حال کیا، کم تھا
کیا جانیے کیا کرتا، گر تو مری جا ہوتا
اچھی ہے وفا، مجھ سے جلتے ہیں جلیں دشمن
تم آج ہوا سمجھو، جو روزِ جزا ہوتا
جنت کی ہوس واعظ بے جا ہے کہ عاشق ہوں
ہاں سیر میں جی لگتا، گر دل نہ لگا ہوتا
ہے بے خودیٔ دائم، کیا شکوہ تغافل کا
جب میں نہ ہوا اپنا، وہ کیوں کر مرا ہوتا
ہم بندگیٔ بت سے ہوتے نہ کبھی کافر
ہر جائے گر اے مومن، موجود خدا ہوتا

عدم میں رہتے تو شاد رہتے، اسے بھی فکرِ ستم نہ ہوتا
جو ہم نہ ہوتے تو دل نہ ہوتا، جو دل نہ ہوتا تو غم نہ ہوتا
ہوئی خجالت سے نفرت افزوں، گلے کیے خوب آخریں دم
وہ کاش اک دم ٹھہر کے آتے، کہ میرے لب پر بھی دم نہ ہوتا

جو آپ در سے اٹھا نہ دیتے ، کہیں نہ کرتا میں جبہہ سائی
اگرچہ یہ سر نوشت میں تھا ، تمھارے سر کی قسم نہ ہوتا
وصال کو ہم ترس رہے تھے ، جو اب ہوا تو مزا نہ پایا
عدو کے مرنے کی جب خوشی تھی کہ اس کو رنج و الم نہ ہوتا
ہوا مسلماں میں اور ڈر سے نہ درسِ واعظ کو سن کے مومن
بنی تھی دوزخ ، بلا سے بنتی ، عذابِ ہجرِ صنم نہ ہوتا

تارے آنکھیں جھپک رہے تھے　　تھا بام پہ کون جلوہ گر رات

اظہار شوقِ شکوہ اثر ، آس سے تھا عبث
یعنی کہا کہ مرتے ہیں تم پر کہا ، عبث
تھا ہم پہ لطف تو ، پئے افزائشِ الم
صد شکر غیر ہو گئے ، اس سے خفا عبث
اے مہروش یہ حسن تو ہرگز نہ چھپ سکے
چلون تو کیا ہے پردے کا بھی چھوڑنا عبث

پنجۂ شانہ سے تو زلفِ گرہ گیر نہ کھینچ
دل سے دیوانہ کو مت چھیڑ ، یہ زنجیر نہ کھینچ
ہم تو بچتے نہیں تا شام وہ آئے بھی تو کیا
اے دعائے سحری منتِ تاثیر نہ کھینچ
اے ستم پیشہ مرے بعد کہاں نشۂ عشق
دیکھ خمیازہ حسرت ہے یہ شمشیر نہ کھینچ
روزِ غم کون بھلا آن کے ہوتا ہے شریک
انتظارِ اثر نالۂ شب گیر نہ کھینچ
مومن آ کیشِ محبت میں کہ سب جائز ہے
حسرت حرمت صہبا و مزامیر نہ کھینچ

رویا کریں گے آپ بھی پہروں اسی طرح
اٹکا کہیں جو آپ کا دل بھی میری طرح
نے تاب ہجر میں ہے نہ آرام وصل میں
کم بخت دل کو چین نہیں ہے کسی طرح
لگتی ہیں گالیاں بھی ترے منہ سے کیا بھلی
قربان تیرے پھر مجھے کہ لے اسی طرح
پامال ہم نہ ہوتے فقط جورِ چرخ سے
آئی ہماری جان پہ آفت کئی طرح
نے جائے واں بنے ہے نہ بن جائے چین ہے
کیا کیجیے ہمیں تو ہے مشکل سبھی طرح
معشوق اور بھی ہیں بتا دے جہاں میں
کرتا ہے کون ظلم، کسی پر تیری طرح
ہوں جاں بلب، بتان ستم گر کے ہاتھ سے
کیا سب جہاں میں جتنے ہیں مومن اسی طرح

ہم دامِ محبت سے ادھر چھوٹے، اُدھر بند
پرواز بھی کی، آہ تو جوں طائرِ پر بند

غربت میں گل کھلائے ہے کیا کیا وطن کی یاد
جیسے قفس میں مرغِ چمن کو چمن کی یاد

نہ کیوں کو بس موا جاؤں کہ یاد آتا ہے رہ رہ کر
وہ تیرا مسکرانا کچھ مجھے ہونٹوں میں کہہ کہہ کر

جاتے تھے صبح رہ گئے بے تاب دیکھ کر
طالع ہمارے چونک پڑے، خواب دیکھ کر

پایا جو دشمنوں نے ترے پاس اعتبار
آنکھیں چراتے ھیں مجھے احباب دیکھ کر
روئے وہ میرے حال پہ حیران کیوں نہ ھوں
آنکھیں سی کھل گئیں در نایاب دیکھ کر
ھے ھے تمیزِ عشق و ھوس آج تک نہیں
وہ چھیڑے پھرتے ھیں مجھے بے تاب دیکھ کر
مومن یہ تاب کیا کہ تقاضائے جلوہ ھو
کافر ھو اس دین کے آداب دیکھ کر

یاد اُس کی گرمیٔ صحبت دلاتی ھے بہار
آتش گل سے مرا سینہ جلاتی ھے بہار
آمد آمد ھے چمن میں کس سمن اندام کی
سبزۂ خوابیدہ سے مخمل بچھاتی ھے بہار
جوشِ گل سے یاد آتی ھیں تری رنگینیاں
رنگِ رفتہ سے مرے کیا رنگ لاتی ھے بہار
امتیازِ دل دھی و دلبری میں فرق ھے
تم کو بھاتی ھے خزاں اور ھم کو بھاتی ھے بہار
غنچہ ھائے آرزوئے مومن اب کھلنے کو ھیں
خیر مقدم گلشنِ ایماں میں آتی ھے بہار

بے مروت ، ناتواں ہیں ، ھنس دے ، روتا دیکھ کر
دل دیا میں نے اُسے کیا جانیے ، کیا دیکھ کر
اس کے ھٹتے ھی اندھیرا آ گیا ایسا کہ بس
گر پڑا میں روزنِ دیوار کو وا دیکھ کر
پھر گئی آنکھوں کے آگے ، اُس کی چشم شرمگیں
پھر گئیں آنکھیں مری ، نرگس کا جھکنا دیکھ کر

دشمنی دیکھو کہ تا الفت نہ آ جائے کہیں
لے لیا، منہ پر دوپٹہ، حال میرا دیکھ کر
کیوں نہ گھبرائے وہ، میں گھبرا گیا بل بے ہجوم
حسرتیں آتی ہیں کیا کیا، اُس کو تنہا دیکھ کر
جو نقاب اٹھی مری آنکھوں پہ پردہ پڑ گیا
کچھ نہ سوجھا، عالم اُس پردہ نشیں کا دیکھ کر

لب پہ دم آیا و لے، نالہ نہیں ہے ہنوز
نغمۂ غم بھی ترا، پردہ نشیں ہے ہنوز
چاکِ سرا پردہ سے جھانکے تھے وہ ایک دن
سجدۂ محرابِ در، شغل جبیں ہے ہنوز

موت بھی ہو گئی ہے پردہ نشیں راز رہتا نہیں نہاں افسوس
تھا عجب کوئی آدمی مومن مر گیا کیا ہی نوجواں افسوس

روز ہوتا ہے بیاں غیر کا اپنا اخلاص
چشم بد دور، تمہیں ہم سے بھی ہے کیا اخلاص
اُس ستم گر نے بناوٹ کی لگاوٹ بھی نہ کی
ہائے قسمت مری، کچھ کام نہ آیا اخلاص
موت بھی آ نہ پھری پاس ہمارے شبِ ہجر
سچ تو یہ ہے کہ بُرے وقت میں کیسا اخلاص

ہر غنچہ لب سے، عشق کا اظہار ہے غلط
اس مبحثِ صحیح کی تکرار ہے غلط
کرتے ہو مجھ سے راز کی باتیں تم اس طرح
گویا کہ قولِ محرم اسرار ہے غلط

وہ جو زندگی میں نصیب تھا ، وہی بعدِ مرگ رہا قلق
یہ قلق ہے کیسا کہ ہے ستم ، گئی جان ، پر نہ گیا قلق
پے ہم ہے حالت جاں کنی ، غرض اب تو جان پر آ بنی
یہ عذابِ مرگ ہے یا تپش ، یہ خدا کا قہر ہے یا قلق
یہ کہاں کی جی کو بلا لگی ، مری ہائے کیوں کہ ہو زندگی
کوئی کیا جیے جو ہو ایک سا ، شب و روز ، صبح و مسا قلق
نہیں چاہ مری اگر انھیں ، نہیں راہ دل میں تو کس لیے
مجھے روتے دیکھ کے رو دیا ، مرا حال سن کے ہوا قلق
غمِ ہجرِ یار کے ہاتھ سے ، شب و روز ہوں میں عذاب میں
ہے ہمیشہ ایک نئی تپش ، ہے مدام ایک نیا قلق
کہا، جاں بلب ہوں جو آئے تو ، مری زندگی ہو تو یوں کہا
ترے جینے کی مجھے کیا خوشی ، ترے مرنے کا مجھے کیا قلق
یہی دین اگر ہے تو چھوڑ دو ، طرف اس صنم کے نہ رخ کرو
جسے مومن آپ کے واسطے ، ہے مثال قبلہ نما قلق

قہر ہے ، موت ہے ، قضا ہے عشق سچ تو یوں ہے بری بلا ہے عشق

امتحاں کے لیے جفا کب تک التفاتِ ستم نما کب تک
نہ بلائیں گے وہ نہ آئیں گے جوش لبیک و مرحبا کب تک

اس چمن زار کا حسرت سے نظارہ کر لے
اے نگہ ، دیدۂ ہر سو نگراں ہونے تک
کون جیتا ہے نگاہوں میں سبک ہونے کو
سخت جانی ہے ترے دل پہ گراں ہونے تک

کل کا جلسہ بھولتا ہرگز نہیں اے اضطراب
آج پھر لے چل ، کسی ڈھب سے ، مجھے تو واں تلک
نیند میں یا رب دوپٹہ کس کے منہ سے ہٹ گیا
ہے زمیں سے روشنی ، افلاک نور افشاں تلک

شب رہے تجھ بن ز بس بے چین و بے آرام ہم
صبح تک رویا کیے ، لے لے کے تیرا نام ہم
آن بیٹھا کون کوٹھے پر جو یوں حیران سے
خاک پر چپکے پڑے تکتے ہیں سوئے بام ہم
تو خبر لا ، کیا کہا قاصد سے ، چھپتے پھرتے ہیں
ہمدم اس پردہ نشیں کو بھیج کر پیغام ہم
گر ترے کوچے کو دی کعبہ سے نسبت کیا گناہ
مومن آخر تھے کبھی اے دشمنِ اسلام ہم

پا بوسِ یار کرتے ہوئے کھینچ دیوے تو
تصویر میری چوم لے ، بہزاد کے قدم
اے ہم دمانِ باغ رہا ہوں پہ کیا کروں
اٹھتا نہیں ہے کوچہ سے صیاد کے قدم

اب اور سے لو لگائیں گے ہم جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم
برباد نہ جائے گی کدورت کیا کیا تری خاک اڑائیں گے ہم
بگڑے تو کریں گے ، اور سے صلح تجھ پر بھی بُری بنائیں گے ہم
دل دے کے اک اور لالہ رو کو ہر داغ پہ داغ کھائیں گے ہم
گر تیری طرف کو بے قراری کھینچے گی ، تو ، لوٹ جائیں گے ہم
گر دیکھ کے ہنس دیا ، ہمیں تو منہ پھیر کے مسکرائیں گے ہم
بتخانۂ چین ہو گر ترا گھر مومن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم

آ چکے کل تم جھوٹ ہے ایسی باتوں میں ہم کب آتے ہیں
اس سے کہو جو تم کو نہ جانے، آپ کسے فرماتے ہیں
پھرتے ہیں سو سو وسوسے جی میں، دل میں سودے آتے ہیں
کوٹھے پر وہ دھوپ میں اپنے بال کھڑے سکھلاتے (کذا) ہیں
سوزشِ دل جب کہتے ہیں، تب آنسو وہ بھر لاتے ہیں
موم کے مانند آتشِ غم سے پتھر کو پگھلاتے ہیں
ہوش گئے یاں دل سے پہلے، ہووے سمجھ تو سمجھیں بات
یہ تو سمجھیے حضرت ناصح، آپ کسے سمجھاتے ہیں
کنجِ قفس میں بیٹھ کے گاہے روتے ہیں تنہائی پر
یادِ سیر موسمِ گل گاہے جی بہلاتے ہیں
شام سے اپنے سو رہے وہ تو، اور ہم اُن کے کوچے میں
ولولہ ہائے شوق سے کیا کیا، پھرتے ہیں گھبراتے ہیں
کیا کسی بت کے دل میں جگہ کی، کوئی ٹھکانا اور ملا
حضرتِ مومن اب تمھیں کچھ ہم مسجد میں کم پاتے ہیں

عشق نے یہ کیا خراب ہمیں　　کہ ہے اپنے سے اجتناب ہمیں
شبِ فرقت میں خاک جھپکے آنکھ　　یاد ہے چشم نیم خواب ہمیں
کس کی زلفوں کی بو نسیم میں تھی　　ہے بلا، آج پیچ و تاب ہمیں
اب کوئی کیا کرے علاج افسوس　　موت نے بھی دیا جواب ہمیں

ہے جلوہ زیر، نورِ نظر، گرد راہ میں
آنکھیں ہیں کس کی فرش تری جلوہ گاہ میں
مت کیجو، دیر آنے میں، کیا جانے کیا بنے
پھینکا ہے جذبِ شوق نے یوسف کو چاہ میں
جانے دے چارہ گر، شبِ ھجراں میں مت بلا
وہ کیوں شریک ہو، مرے حالِ تباہ میں

تا نہ پڑے خلل کہیں، آپ کی خوابِ ناز میں
ہم نہیں چاہتے کمی، اپنی شبِ دراز میں
کیوں کہ نہ آدھی رات، جاگے وہ جس کا دھیان ہو
آ ہوئے نیم خواب میں، نرگس نیم باز میں
بن ترے بزم سُور میں، ہیں یہ قباحتیں، کہ ہے
نغمۂ صور کا اثر، نغمۂ نے نواز میں
پردہ نشیں کے عشق میں، پردہ دری نہ ہو کہیں
ہوتی ہیں بے حجابیاں، جانِ نہفتہ راز میں
یادِ بتاں میں لاکھ بار، فرطِ قلق سے ہم بھی تو
بیٹھے اٹھے ہیں مومن آپ گر رہے، شب نماز میں

دن بھی دراز رات بھی، کیوں ہے فراق یاد میں
کاہے سے فرق آ گیا، گردشِ روز گار میں
مرگ ہے انتہائے عشق یاں رہی ابتدائے عشق
زندگی اپنی ہو گئی، رنجشِ بار بار میں
پوچھا ہے اس نے کیا مری، بے خودی و قلق کا حال
ہوش نہیں حواس میں، تاب نہیں قرار میں
خاک اڑائی گل نے یہ کس کے جنونِ عشق میں
آئے ہے کچھ آئی ہوئی، بادِ صبا غبار میں
دھیان میں مومن آ گئے مبحثِ جبر و اختیار
قابوئے یار میں ہیں ہم، وہ نہیں اختیار میں

دوست کرتے ہیں ملامت، غیر کرتے ہیں گلہ
کیا قیامت ہے مجھی کو سب بُرا کہنے کو ہیں
ترجمانِ التماسِ شوق ہے تغییر رنگ
جوں زبانِ شمعِ عاشق، بے صدا کہنے کو ہیں

میں گلہ کرتا ہوں ، اپنا تو نہ سن غیروں کی بات
ہیں یہی کہنے کو وہ بھی اور کیا کہنے کو ہیں
وہ نہیں آتے نہ آویں ؛ مرگ ظالم تو تو آ
یاں لبِ شوق و تمنا مرحبا کہنے کو ہیں

ترے فراق میں آرام ایک آن نہیں
یہ ہم سمجھ چکے ، گر تو نہیں تو جان نہیں
نہ پوچھو کچھ مرا احوال ، میری جاں مجھ سے
لو یہ دیکھ لو کہ مجھے طاقتِ بیان نہیں
شبِ فراق میں پہنچی نہ دل سے جان تلک
کہیں اجل بھی تو ، مجھ سی ہی ناتواں نہیں

دشمن سے ہے چشم مہربانی محروم نگاہ آشنا ہوں
خود بینی و بے خودی میں ہے فرق میں تم سے زیادہ کم نما ہوں
بیزار ہے سوزِ عشق سے جی کس شعلہ مزاج سے خفا ہوں
مجھ رمز شناس سے یہ باتیں کیا خوب میں غیر سے برا ہوں
اس نام کے صدقے جس کی دولت مومن رہوں اور بتوں کو چاہوں

ہر دم رہینِ کشمکشِ دست یار ہیں
چلون کے بند ، کس کے گریباں کے تار ہیں
کیسے ، گلے رقیبوں کے ، کیا طعنِ اقربا
تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

آہِ فلک فگن ترے غم سے کہاں نہیں
جو فتنہ خیز اب ہے زمین آسماں نہیں

کہنا پڑا مجھے پئے الزام پند گو
وہ ماجرا جو لائقِ شرح و بیاں نہیں
ڈرتا ہوں آسماں سے بجلی نہ گر پڑے
صیّاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں
اظہارِ دوستی کی خوشی کیا شبِ وصال
دشمن سے سن چکا ہوں کہ تو مہرباں نہیں
پیشِ عدو، سمجھ کے ذرا حال پوچھنا
قابو میں دل نہیں، مرے بس میں زباں نہیں
بے صرفہ جاں کنی کا مری کچھ تو ہو حصول
محنت کسی کی آج تلک رائگاں نہیں
کرتے وفا، امید وفا پر تمام عمر
پر کیا کریں کہ اُس کو سرِ امتحاں نہیں
میں اپنی چشم شوق کو الزام خاک دوں
تیری نگاہِ شرم سے کیا کچھ عیاں نہیں
اتنے سبکِ نظر میں ہیں اوضاعِ روزگار
دنیا کی حسرتیں مرے دل پر گراں نہیں
اُس بت کی ابتدائے جوانی مراد ہے
مومن کچھ اور فتنۂ آخر زماں نہیں

تاثیر صبر میں، نہ اثر اضطراب میں
بے چارگی سے جان پڑی، کس عذاب میں
تم نکلے بہرِ سیر تو نکلے گا مہر بھی
ہووے گا اجتماع شبِ ماہتاب میں
کھولا جو دفترِ گلہ، اپنا زیاں کیا
گذری شبِ وصال ستم کے حساب میں

کہتے ہیں تم کو ، ہوش نہیں اضطراب میں
سارے گلے تمام ہوئے اک جواب میں
چینِ جبیں کو دیکھ کے دل بستہ تر ہوا
کیسی کشودِ کار ، کشادِ نقاب میں
آنکھ اس کی پھر گئی تھی دل اپنا بھی پھر گیا
یہ اور انقلاب ہوا ، انقلاب میں
ہے اختیارِ یار میں ، سود و زیاں ، مگر
فاضل تھے ہم جہاں سے قضا کے حساب میں
دونوں کا حال ایک ہے ، یہ مدعا ہو کاش
وہ ہی خط اس نے بھیج دیا کیوں جواب میں
تقدیر بھی بری ، میری تقریر بھی ، بری
بگڑے وہ پرششِ سببِ اجتناب میں
کیا جلوے نظر آئے کہ اپنی خبر نہیں
بے بادہ مست ہوں میں شب ماھتاب میں
ہے منتوں کا وقت ، شکایت رہی رہی
آئے تو ہیں منانے کو وہ ، پر عتاب میں
پیہم سجود پائے صنم پر دمِ وداع
مومن خدا کو بھول گئے اضطراب میں

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو
ہے بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو
اس بت کے لیے میں ہوسِ حور سے گذرا
اس عشقِ خوش انجام کا ، آغاز تو دیکھو
چشمک مری وحشت پہ ہے کیا ، حضرت ناصح
طرز نگہِ چشم فسوں ساز تو دیکھو

اس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا چمک جائے ہے آواز تو دیکھو
دیں پاکیٔ دامن کی گواہی مرے آنسو
اس یوسف بیدرد کا اعجاز تو دیکھو
جنّت میں بھی مومن نہ ملا ، ہائے بتوں سے
جورِ اجلِ تفرقہ پرداز تو دیکھو

آئے ہو جب بڑھا کر دل کی جلن گئے ہو
جوں سوزِ دل کہا ہے تم آگ بن گئے ہو
ہے کچھ تو بات مومن جو چھا گئی خاموشی
کس بت کو دے دیا ، کیوں بت سے بن گئے ہو

اے ناصحو آ ہی گیا ، وہ فتنۂ ایام لو
ہم کو تو کہتے تھے بھلا اب تم تو دل کو تھام لو
کیا قہر ہے کب تک کوئی ، رہ جائے آنسو پی کے یوں
ہنس ہنس کے میرے آگے تم ، دستِ عدو سے جام لو
دن رات فکر حور میں ، یوں رنج اٹھانا کب تلک
میں بھی ذرا آرام لوں تم بھی ذرا آرام لو
وہ آئے یا نہ آئے ، زیست میری ہو نہو ، لیکن
ذرا اے چارہ سازو ، زحمتِ تدبیر تو کھینچو

گریہ پہ میرے زندہ دلو ہنستے کیا ہو آہ
روتا ہوں اپنے میں ، دلِ جنت مقام کو

ہم سمجھتے ہیں آزمانے کو عذر کچھ چاہیے ستانے کو
صبح عشرت ہے وہ، نہ شامِ وصال ہائے کیا ہو گیا زمانے کو

کوئی دم ہم جہاں میں بیٹھے ہیں آسماں کے ستم اٹھانے کو

صد حیف سینہ سوز فغاں کار گر نہ ہو
یاں جاں پر بنے، ترے دل میں اثر نہ ہو
ایسے سے قدر مہر و وفا کی امید کیا
جس کو ہنوز اپنے ستم کی خبر نہ ہو
عابد فریب شوخی و رغبت فزا نگاہ
میں کیا کسی سے صبر تجھے دیکھ کر نہ ہو
اے گردشِ زمانہ کبھی تو تغیر آئے
حسرت مجھے قبول اگر اس قدر نہ ہو
سوتے سے اٹھ کر آئے ہیں یا رب نہ جائیں
شرمندہ آہِ شب سے دعائے سحر نہ ہو

اعجاز سے زیادہ ہے، سحر اس کے ناز کا
آنکھیں وہ کہہ رہی ہیں جو لب سے بیاں نہ ہو
لکھتا ہوں اس کو بستگیٔ دل کا ماجرا
آنسو رواں نہ ہو تو سیاہی رواں نہ ہو
کرنی نہ تھیں بگاڑ کی باتیں گلہ میں ہائے
کیسی بنے جو دل سے وہ نا مہرباں نہ ہو
عزم سفر جہاں سے کروں کیا شبِ فراق
میں جانتا ہوں چین کہاں تو جہاں نہ ہو
مومن بہشت و عشقِ حقیقی تمہیں نصیب
ہم کو تو رنج ہو جو غم جاوداں نہ ہو

چل پرے ہٹ مجھے نہ دکھلا منہ اے شب ہجر تیرا کالا منہ
آرزوئے نظارہ تھی، تو نے اتنی ہی بات پر چھپایا منہ

شب غم کا کیا بیان کیجیے ہے بڑی بات اور چھوٹا منہ

ق

گھر میں بیٹھے تھے کچھ اداس سے وہ بولے بس دیکھتے ہی میرا منہ
ہم بھی غمگین سے ہیں آج کہیں صبح اُٹھے تھے دیکھ تیرا منہ

سیماب ہے پہلو میں مرے، دل تو نہیں یہ
اس دل نے ستایا مجھے غارت ہو کہیں یہ
یاں کاہے کو وہ آنے لگا، اے کشش دل
تو لاکھ کہے پر کوئی آتا ہے یقیں یہ

ق

بے دم سا پڑا تھا کوئی اس کوچہ میں اس نے
دروازے میں آ جھانک کے دیکھا جو کہیں یہ
اس رحم کے صدقے وہیں گھبرا کے کہا، ہاں
جا کر کوئی دیکھو، کہیں مومن تو نہیں یہ

دل بستگی سی ہے کسی زلف دوتا کے ساتھ
پالا پڑا ہے ہم کو، خدا کس بلا کے ساتھ
کب تک نبھائیے، بتِ نا آشنا کے ساتھ
کیجیے وفا، کہاں تلک، اس بیوفا کے ساتھ
یاد ہوائے یار نے کیا کیا نہ گل کھلائے
آئی چمن سے نکہت گل، جب صبا کے ساتھ
مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی
آخر کو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ
یا رب وصال یار میں کیوں کر ہو زندگی
نکلی ہی جان جاتی ہے ہر ہر ادا کے ساتھ

ہر دم عرق عرق ، نگہ بے حجاب ہے
کس نے نگہِ گرم سے دیکھا ، حیا کے ساتھ
آتے ہی ترے چل دیے ، سب ورنہ یاس کا
کیسا ہجوم تھا ، دل حسرت فزا کے ساتھ

اُلٹے وہ شکوے کرتے ہیں کس ادا کے ساتھ
بے طاقتی کے طعنے ہیں عذر جفا کے ساتھ
اس کی گلی کہاں یہ تو کچھ باغ خلد ہے
کس جائے مجھکو چھوڑ گئی ، موت لا کے ساتھ
تھے وعدے سے پھر آنے کے خوش یہ خبر نہ تھی
ہے اپنی زندگانی ، اسی بے وفا کے ساتھ
اللہ ری گمرہی بت و بتخانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبے کو اک پارسا کے ساتھ

دور خمار کا بھی ہے کچھ دھیان یا نہیں
اے مستِ حسن شیشۂ دل کو نہ توڑ دیکھ

منظورِ نظر غیر سہی ، اب ہمیں کیا ہے
بے دید ، تری آنکھ سے ، دل پہلے پھرا ہے
بس بس نہ کرو بات کہ یاد آئے ہے مجھکو
ناصح سے جو کچھ بے خودیوں میں بھی سنا ہے
کس طرح نہ اس شوخ کے رونے پہ ہنسوں میں
نظروں میں مروت ہے نہ آنکھوں میں حیا ہے
یا رب کوئی معشوقۂ دل جو نہ ملے اب
جو اُن کی دعا ہے وہی اپنی بھی دعا ہے

مومن نہ سہی بوسۂ پا سجدہ کریں گے
وہ بت ہے جو اوروں کا، تو اپنا بھی خدا ہے

پھر اب کے لا ترے قربان جاؤں جذبۂ دل
گئے ہیں یاں سے وہ سوگند کھا کے آنے کی
کروں میں وعدہ خلافی کا شکوہ کس کس سے
اجل بھی رہ گئی، ظالم سُنا کے آنے کی

میں اگر آپ سے جاؤں تو قرار آ جائے
پر یہ ڈرتا ہوں کہ ایسا نہ ہو یار آ جائے
کلفتِ ہجر کو کیا روؤں ترے سامنے میں
دل جو خالی ہو تو آنکھوں میں غبار آ جائے

ہے نگاہِ لطف دشمن پر تو بندہ جائے ہے
یہ ستم اے بے مروت کس سے دیکھا جائے ہے
سامنے سے جب وہ شوخ دلربا آ جائے ہے
تھامتا ہوں پر یہ دل ہاتھوں سے نکلا جائے ہے
حالِ دل کس سے کہوں میں، کس سے بولا جائے ہے
سر اٹھے بالیں سے کیا، کچھ جی ہی بیٹھا جائے ہے
رو رہا ہوں خندۂ دنداں نما کی یاد میں
آبِ گوہر کے لیے آنکھوں سے دریا جائے ہے
پند گو اب تو ہی فرما، کس کو سودا ہے یہ کون
اور کی سنتا نہیں اپنی ہی بکتا جائے ہے
دیکھیے انجام کیا ہو مومنِ صورت پرست
شیخِ صنعاں کی طرح، سوئے کلیسا جائے ہے

ہوئی تاثیر آہ و زاری کی رہ گئی بات بے قراری کی
یاد آئی جو گرم جوشیٔ یار دیدۂ تر نے شعلہ باری کی

ناوک انداز جدھر دیدۂ جاناں ہوں گے
نیم بسمل کئی ہوں گے، کئی بے جاں ہوں گے
تابِ نظارہ نہیں، آئینہ کیا دیکھنے دوں
اور بن جائیں گے تصویر، جو حیراں ہوں گے
تو کہاں جائے گی، کچھ اپنا ٹھکانا کر لے
ہم تو کل خوابِ عدم میں شبِ ہجراں ہوں گے
ناصحا دل میں تو اتنا تو سمجھ اپنے کہ ہم
لاکھ ناداں ہوئے کیا تجھ سے بھی ناداں ہوں گے
کر کے زخمی مجھے نادم ہوں، یہ ممکن ہی نہیں
گر وہ ہوں گے بھی تو بے وقت پشیماں ہوں گے
ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیماں کہ بس
ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہوں گے
ہم نکالیں گے سُن ری موجِ ہوا، بل تیرا
اس کی زلفوں کے، اگر بال پریشاں ہوں گے
صبر یا رب میری وحشت کا پڑے گا کہ نہیں
چارہ فرما بھی کبھی، قیدیٔ زنداں ہوں گے
منتِ حضرت عیسیٰؑ نہ اٹھائیں گے کبھی
زندگی کے لیے شرمندۂ احساں ہوں گے
چاک پردے سے یہ غمزے ہیں تو اے پردہ نشیں
ایک میں کیا کہ سبھی چاک گریباں ہوں گے
پھر بہار آئی، وہی دشت نوردی ہوگی
پھر وہی پاؤں، وہی خارِ مغیلاں ہوں گے

سنگ اور ہاتھ وہی ، وہ ہی سر و داغِ جنوں
وہی ہم ہوں گے ، وہی دشتِ و بیاباں ہوں گے
عمر ساری تو کٹی ، عشق بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

آج اس بزم میں طوفان اٹھا کے اٹھے
یاں تلک روئے کہ اس کو بھی رولا کے اٹھے
شعر مومن کے پڑھے بیٹھ کے اس کے آگے
خوب احوال دل زار ، سُنا کے اٹھے

بے پردہ پسِ چلون ، یکبار تم آ بیٹھے
ہے تابِ نظر کس کو ، کیوں جلوہ گری اتنی
یہ کون کہے اس سے ، کی ترک وفا میں نے
کر تو ہی ذرا ناصح ، پیغام بری اتنی

منتظر کس کے یہ رہتے ہیں کہ ہم ہر شب کو
تا سحر شام سے ، اٹھ اٹھ کے ہیں گھر میں پھرتے
ایک دم ، گردشِ ایام سے آرام نہیں
گھر میں ہیں تو بھی ہیں دن رات سفر میں پھرتے
گر گئے تھے تو تسلی کو مری کہ جاتے
کہ اب آتا ہوں ، وہ گو آٹھ پہر میں پھرتے
سرمہ گیں چشم کی گردش جو نہ بھا جاتی تو
خاک یوں کاہے کو ہم ڈالتے سر میں پھرتے

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے
اس کا نہ دیکھنا نگہِ التفات ہے

چھٹ کر کہاں ، اسیرِ محبت کی زندگی
ناصح یہ بندِ غم نہیں ، قیدِ حیات ہے
بد نامیوں کے ڈر سے عبث تم چلے کہ میں
ہوں تیرہ روز ، میری سحر بھی رات ہے
پیغام بر رقیب سے ہوتے ہیں مشورے
سنتا نہیں کسی کی ، یہ کہنے کی بات ہے
کیوں کر خدا کو دوں کہ بتوں کو ہے احتیاج
مومن یہ نقدِ دل ، زرِ جاں کی زکات ہے

وہ سر جو کل ترے زانو پہ تھا سو آج اے ظالم
کبھو رہتا ہے پتھر پر ، کبھو رہتا زمیں پر ہے
جفا کا شکوہ اب کیوں، جو کیا ، اچھا کیا اس نے
سزا ہے اے دلِ نادان ، اس الفت ، اس محبت کی

وہ چلا ، جان چلی ، دونوں یہاں سے کھس کے
اس کو تھاموں کہ اسے ، پاؤں پڑوں کس کس کے
مجھ کو مارا مرے حالِ متغیر نے کہ ہے
کچھ گماں اور ہی دھڑکے سے ، دلِ مونس کے

تمھیں تقصیر اس بت کی کہ ہے میری خطا لگتی
مسلمانو ذرا انصاف سے کہیو خدا لگتی
تڑپنے ، لوٹنے ، رونے کا باعث ، تجھ پہ بھی کھلتا
ترے دل کو بھی میری سی اگر اے بے وفا لگتی
وہ پھر ہے گرم نظارہ ، کہاں تک زخمِ دل ٹانکوں
کہ ہے ہر ہر نگہ کے ساتھ اک برچھی سی آ لگتی

بلائے جاں ہوا دھیان اُس سیہ کاکل کی چوٹی کا
نہ لگتا تو دل کے پیچھے کاہے کو بلا لگتی
کہیں سے ڈھونڈ کر لانا بتِ کافر کو اے مومن
طبیعت سیرِ جنت میں نہیں اس کے سوا لگتی

کسی کے ہنسنے کا تصوّر ہے شب و روز کہ یوں
گدگدی دل میں کوئی آٹھ پہر کرتا ہے
عیش میں بھی تو نہ جاگے کبھی تم ، کیا جانو
کہ شبِ غم ، کوئی ، کس طور سحر کرتا ہے
بختِ بد نے یہ ڈرایا ہے کہ کانپ اٹھتا ہوں
تو کبھی لطف کی باتیں بھی اگر کرتا ہے

دیکھ گریاں مجھے وہ چشم کو تر کرتا ہے
اشکِ غماز بھی آنکھوں میں جو گھر کرتا ہے
ذکر کر بیٹھے برائی ہی سے شاید میرا
اب وہ اغیار کی صحبت سے حذر کرتا ہے

کیوں رمِ جانانہ کی بدلی ہے از خود رفتگی
کس لیے شوخی ہوئی ہے ، بیقراری آپ کی
منفعل سازِ دم ناہید نغمہ کیا ہوئی
کیوں گزرتی ہے فلک سے آہ و زاری آپ کی
مجھ کو حیراں دیکھ کر حیران رہ جاتے ہو کیوں
ایسی محوِ یاس ہے اُمیدواری آپ کی
کیوں ہے رنگِ زرد پر گلگونہ اشکِ سُرخ کا
کس لیے ملنے لگی ، رنگت ہماری آپ کی

دل گیا ، دم پر بنی ، آنکھیں لڑیں کہتے ہی حال
بیقراری ، آہ و زاری ، اشکباری آپ کی

صبر وحشت اثر نہ ہو جائے
کہیں صحرا بھی گھر نہ ہو جائے
رشکِ پیغام ہے عناں کشِ دل
نامہ بر ، راہ بر نہ ہو جائے
ہجرِ پردہ نشیں میں مرتے ہیں
زندگی پردہ در نہ ہو جائے
میرے تغییر رنگ کو مت دیکھ
تجھ کو اپنی نظر نہ ہو جائے
میرے آنسو نہ پوچھنا دیکھو
کہیں دامان تر نہ ہو جائے
بات ناصح سے کرتے ڈرتا ہوں
کہ فغاں بے اثر نہ ہو جائے
اے دل آہستہ آہِ تاب شکن
دیکھ ٹکڑے جگر نہ ہو جائے
مومن قبول دل سے مجھے
وہ بت آزردہ گر نہ ہو جائے

نہ انتظار میں یاں آنکھ ایک آن لگی
نہ ہائے ہائے میں تالو سے شب زبان لگی
گلی میں اُس کی نہ پھر آتے ہم تو کیا کرتے
طبیعت اپنی نہ جنّت کے درمیان لگی
ہنسو نہ تم تو مرے حال پر ، میں ہوں وہ ذلیل
کہ جس کی ذلت و خواری سے تم کو شان لگی
سدا تمھاری طرف ، جی لگا ہی رہتا ہے
تمھارے واسطے ہے دل کو مہربان لگی
وہ کینہ ورز تھا مومن تو دل لگایا کیوں
کہو تو کیا تمھیں ایسی بھلی ، وہ آن لگی

آتا نہیں ہے تو ، تو نشانی ہی بھیج دے
تسکینِ اضطرابِ دل زار کے لیے

چلنا تو دیکھنا کہ قیامت نے بھی قدم
طرزِ خرام و شوخی رفتار کے لیے
جینا اُمیدِ وصل پہ، ھجراں میں سہل تھا
مرتا ھوں زندگانیٔ دشوار کے لیے

کہاں تک دم بخود رھیے نہ ھوں کیجیے نہ ھاں کیجیے
کہاں تک کھائیے غم، کب تلک ضبطِ فغاں کیجیے
غرض ھمسائے میں بھی اُس کا رھنا کیا قیامت ھے
کہ سُن لیتا ھے وہ گھر میں، جو کچھ مذکور یاں کیجیے

جفائے یار کو سونپا معاملہ اپنا
اب آگے ھو نہ ھو، اُمیدِ انفصال تو ھے
شبِ فراق میں بھی زندگی پہ مرتا ھوں
کہ گو خوشی نہیں ملنے کی، پُر ملال تو ھے

تسلی دمِ واپسیں ھو چکی ھمیں ھو چکے، جب نہیں ھو چکی
قلق کشتۂ سخت جانی ھے پھر اُمیدِ اجل آفریں ھو چکی
بلا اس سیہ روز کو بزم میں شبِ عیش، اے مہ جبیں ھو چکی
کہو مرگ سے ھاں نوازش کرے کہ اس سے زیادہ نہیں ھو چکی

شوق کم ملنے سے اندوہ فزا ھوتا ھے
ھائے پرھیز سے یہ درد سوا ھوتا ھے
جاں بلب ھوں خبرِ وصل سنا دے قاصد
لب ھلانے میں ترے کام مرا ھوتا ھے
ھو کے آزردہ پشیماں ھوں، کہ میں جس سے کہوں
وھی کہوے، کوئی ایسے سے خفا ھوتا ھے

دل دیا جس نے وہ ناکام رہا تادمِ زیست
فی الحقیقت کہ بُرا کام بُرا ہوتا ہے
واقعی سجدۂ در، ایسی ہی تقصیر ہے اب
جور جو بندہ پہ ہوتا ہے بجا ہوتا ہے
اے دل آ جانے دے، اُس زلفِ مسلسل کا خیال
جان کر کوئی گرفتار بلا ہوتا ہے
ناتوانی مری مت پوچھ، کہوں کیا ہمدم
بات کہنے میں مرا دم ہی ہوا ہوتا ہے
ہو نہ بیتاب غمِ ہجرِ بتاں میں مومن
دیکھ دو دن میں، بس اب فضلِ خدا ہوتا ہے

کیوں کر یہ کہیں منتِ اعدا نہ کریں گے
کیا کیا نہ کیا عشق میں، کیا کیا نہ کریں گے
ہنس ہنس کے وہ مجھ سے ہی مرے قتل کی باتیں
اس طرح سے کرتے ہیں کہ گویا نہ کریں گے
کیا نامہ میں لکھوں دلِ وابستہ کا احوال
معلوم ہے پہلے ہی سے وہ وا نہ کریں گے
بیمارِ اجل چارہ کو گر حضرتِ عیسیٰ
اچھا بھی کریں گے، تو کچھ اچھا نہ کریں گے
کس وقت کیا مردمکِ چشم کا شکوہ
اے پردہ نشیں، ہم تجھے رسوا نہ کریں گے
ناصح کفِ افسوس نہ مل، چل تجھے کیا کام
پامال کریں گے مجھے وہ، یا نہ کریں گے

توبہ ہے کہ ہم عشق بتوں کا نہ کریں گے
وہ کرتے ہیں اب جو نہ کیا تھا نہ کریں گے

ٹھہری ہے کہ ٹھہرائیں گے ، زنجیر سے دل کو
پر برہمیٔ زلف کا سودا نہ کریں گے
اندیشۂ مژگاں میں اگر خوں نے کیا جوش
نشتر سے علاجِ دلِ دیوانہ کریں گے
ہے عہد کہ پھر جا نہ پھریں کوئے بتاں میں
پھر جائیں اُس عہد سے ایسا نہ کریں گے
اے حضرتِ مومن یہ مسلّم جو ہے ارشاد
بھولے سے بھی اب ذکر بتوں کا نہ کریں گے
لیکن جو بتوں نے ہی بھلا آپ سے کی بات
پھر آپ ہی فرمائیں کہ کیا کیا نہ کریں گے

نہ کٹی ہم سے شب جدائی کی — کتنی ہی طاقت آزمائی کی
رشکِ دشمن بہانہ تھا سچ ہے — میں نے ہی تم سے بے وفائی کی
گر نہ بگڑو تو کیا بگڑتا ہے — مجھ میں طاقت نہیں لڑائی کی
گھر تو اُس ماہوش کا دور نہ تھا — لیک طالع نے نارسائی کی
مومن آؤ تمھیں بھی دکھلاؤں — سیر بتخانہ میں خدائی کی

شب تم جو بزمِ غیر میں آنکھیں چرا گئے
کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے
تھی بد گمانی اب اُنھیں کیا عشقِ حور کی
جو آ کے مرتے دم ، مجھے صورت دکھا گئے

از بس جنوں ، جدائی ُگل پیرہن سے ہے
دل چاک چاک نغمۂ مرغِ چمن سے ہے
خود رفتگی میں چین وہ پایا کہ کیا کہوں
غربت جو مجھ سے پوچھو تو بہتر وطن سے ہے

کیا کیا جوابِ شکوہ میں باتیں بنا گیا
لو اب بھی دل درست اسی دل شکن سے ہے

جذبِ دل ، زور آزمانا ، زور آزمانا چھوڑ دے
پائے نازک کا ستانا چھوڑ دے
پردہ کی ، کچھ حد بھی اے پردہ نشیں
کھل کے مل ، بس منہ چھپانا چھوڑ دے

پھر سینہ سوز ، داغ غم شعلہ فام ہے
پھر گرم جوشی دل و سودائے خام ہے
پھر زیبِ سر ہے شعلۂ داغِ جنوں سے تاج
پھر دور باش ، نالہ اثر اہتمام ہے
پھر دل ہے داغ ، مطلعِ خورشید دیکھ کر
از بسکہ یادِ جلوۂ بالائے بام ہے
اس آہوئے رمیدہ کو پھر ڈھونڈھتا ہے دل
رم کردہ شوقِ وصل ، پھر اک صیدِ رام ہے
پھر آ گیا ہے کون سے بے باک کا خیال
یہ کیا ہوا کہ رخصتِ ناموس و نام ہے
جاں لوٹتی ہے پھر کہ وہی عیش ہو نصیب
ہم ہیں وہ مستِ ناز ہے اور دورِ جام ہے
چلون سے کس پری کا نظارہ ہوا نصیب
پھر اپنے تنکے چننے کی کیوں دھوم دھام ہے
پھر کس نے مسکرا کے مجھے بے وفا کہا
کیوں کہ رہا ہوں بندہ تو صاحب غلام ہے
دیکھا نگاہِ ناز سے کس شوخ چشم نے
پھر مضطرب نظر کو جہاں نیم گام ہے

کس کم سخن نے دیکھ مجھے آہ کی کہ پھر
اپنے بھی چپکے رہنے میں ، کچھ کچھ کلام ہے
پھر کیوں نہ کام ہووے کہ اس کینہ پر کہا
سو بار مجھ کو تم سے ، تمھیں مجھ سے کام ہے
پھر کچھ صدائے پا سے دلِ مردہ جی اٹھا
پھر جلوہ ریز کون قیامت خرام ہے
پھر دوریٔ بتاں میں نہیں خواب کا خیال
مومن مرے بھی دین میں سونا حرام ہے

میں احوالِ دل مر گیا کہتے کہتے   تھکے تم نہ بس بس سنا کہتے کہتے

یوں بنا کر حالِ دل کہنا نہ تھا   بات بگڑی میری ہی تقریر سے

صبح دم جاتا ہے پہلو سے مرے وہ مہِ جبیں
دن سیہ ہوتے ہیں کیا کیا مہر کی تنویر سے

بزمِ دشمن سے نہ اٹھے وہ کسی تدبیر سے
مل گئے ہم خاک میں محشر تری تاخیر سے

مومن سُوے شرق اس بتِ کافر کا تو گھر ہے
ہم سجدہ کدھر کرتے ہیں اور کعبہ کدھر ہے
ایسے دم آرام ، اثر خفتہ کب اٹھا
ہم کو عبث امید دعا ہائے سحر ہے
ہم حال کہے جائیں گے سنیے کہ نہ سنیے
اتنا ہی تو یاں صحبتِ ناصح کا اثر ہے

اب بھی نہیں جاتی ترے آجانے کی امید
گو پھر گئیں، یہ نگہ جانبِ در ہے
دل کھول کے مل لیجیے، مومن صنموں سے
اس سال میں، گر سوئے حرم، عزمِ سفر ہے

دل میں اُس شوخ کے جو راہ نہ کی ہم نے بھی جان دی پر آہ نہ کی
کون ایسا کہ اُس سے پوچھے کیوں پرسشِ حالِ داد خواہ نہ کی
میں بھی کچھ خوش نہیں وفا کر کے تم نے اچھا کیا نباہ نہ کی
گریہ و آہ بے اثر دونوں کس نے کشتی مری تباہ نہ کی
تھا مقدر میں اُس سے کم ملنا کیوں ملاقات گاہ گاہ نہ کی
دیکھ دشمن کو اُٹھ گیا، بے دید میرے احوال پر نگاہ نہ کی
مومن اُس ذہنِ بے خطا پر حیف فکرِ آمرزشِ گناہ نہ کی

بندھا خیالِ جنان بعدِ ترکِ یار مجھے
کیا ہے یاس نے کیا کیا امید وار مجھے
وہ شامِ وعدہ جو آئے تو بے خود و سر مست
رہا وصال میں بھی وہ ہی انتظار مجھے
نہ ہو وہ بات کہ جس سے وفا میں آئے خلل
کہیں نہ کیجیو ناصح سے شرمسار مجھے
امیدِ مرگ پہ ہر فتنہ راحت جاں ہے
شبِ فراق میں کیا بیمِ روزگار مجھے
اگر حسابِ وفا، امتحاں کے بعد نہ ہو
قبول عذر ستم ہائے بے شمار مجھے
نہ سیرِ گل نہ قدح نوشی اُس کے ساتھ ہوئی
غمِ خزاں ہے نہ کچھ حسرت بہار مجھے

پسِ شکستن خم ، زجر محتسب معقول
گناہ گار نے سمجھا ، گناہ گار مجھے
ہر آن ، آنِ دگر کا ہوا میں عاشقِ زار
وہ سادہ ایسے کہ سمجھے وفا شعار مجھے
صواب ترکِ صنم سچ سہی ، ولے مومن
یہ کیا سبب کہ سناتے ہو بار بار مجھے

دعا بلا تھی شبِ غم سکونِ جاں کے لیے
سخن بہانہ ہوا ، مرگِ ناگہاں کے لیے
خلافِ وعدۂ فردا کی ہم کو تاب کہاں
امیدِ یک شبہ ہے ، یاس جاوداں کے لیے
ہے اعتماد مرے بختِ خفتہ کو کیا کیا
وگرنہ خواب کہاں چشم پاسباں کے لیے
کہاں وہ عیش اسیری ، کہاں وہ امنِ قفس
ہے بیم برق بلا روز آشیاں کے لیے
بھلا ہوا کہ وفا آزما ستم سے ہوئے
ہمیں بھی دینی تھی جاں اس کے امتحاں کے لیے
رواں فزائے سحرِ حلالِ مومن سے
رہا نہ معجزہ باقی ، لبِ بتاں کے لیے

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی — تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی
کہا ہے غیر سے تم نے مرا حال — کہے دیتی ہے بیباکی ادا کی
مجھے اے دل تیری جلدی نے مارا — نہیں تقصیر اس دیر آشنا کی
جفا سے تھک گئے تو بھی نہ پوچھا — کہ تو نے کس توقع پر وفا کی
کہا اس بت سے جب مرتا ہے مومن — کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی

یہ حالت ہے کیا تو حاصل بیاں سے — کہوں کچھ اور کچھ نکلے زباں سے
بُرا ہے عشق کا انجام یا رب — بچانا فتنۂ آخر زماں سے
وہ آئے ہیں پشیماں لاش پر اب — تجھے اے زندگی لاؤں کہاں سے
نہ بجلی جلوہ فرما ہے نہ صیّاد — نکل کر کیا کریں ہم آشیاں سے
جہاں سے تنگ تر جنت نہ ہو جائے — بہت حسرت بھرا جاتا ہوں یاں سے
برا انجام ہے آغاز بد کا — جفا کی ہو گئی خو امتحاں سے
خدا کی بے نیازی ہائے مومن — ہم ایماں لائے تھے ناز بتاں سے

فردیات

وقت وداع یار عجب اپنا حال تھا — کیا کرتے ہم رہی، کہ ٹھہرنا محال تھا
اس نے نامہ لکھا نصیب پھرے — نامہ بر کیا پھرا، نصیب پھرے

جہاں نے جوں خاک ہم کو روندا، نہ تم سے ملتے نہ ایسے بنتے
ہوئی ہے مٹی خراب کیا کیا، نہ تم سے ملتے نہ ایسے بنتے

مومن اپنے اشعار کی روشنی میں

مومن اپنا مسلک قلندرانہ بتاتے ہیں ، وہ کسی مشرب اور آئین کے پابند نہیں اور نہ ہی آپنے آپ کو قرار دیتے ہیں لیکن دنیا انہیں اپنے اپنے مسلک کا پابند بنانے کی کوشش کرتی تھی اسی لیے انہیں کہنا پڑا :-

لبیک حرم ہم ہیں نہ ناقوس کلیسا
پھر شیخ و برھمن میں ہے کیوں غلغلہ اپنا

انھوں نے اپنے تخلص سے مقطع میں فائدہ اٹھایا ہے ، کبھی وہ تخلص کی آڑ میں اپنے مشرب اور مسلک کو بھی ظاھر کر جاتے ہیں مثلاً کہتے ہیں :

غنچہ ھائے آرزوے مومن اب کھلنے کو ہیں
خیر مقدم گلشن ایماں میں آتی ہے بہار
ذکر شراب و حور کلامِ خدا میں دیکھ
مومن میں کیا کہوں مجھے کیا یاد آگیا

عشق اور محبت ہے جس کا خمیر ہو اس کو ہر شے میں محبت کی کار فرمائی کیوں نہ نظر آتی ، مومن نے حسینوں کی محبت میں کیا کچھ نہ کیا ہوگا، وہ تسخیر محبوب کی خاطر مسجد میں وظائف بھی پڑھ چکے ہیں ، ان کا بیان ہے :

نہ تھی مسجد میں برکت ورنہ وہ بت رام ہو جاتا
گئے مومن فسوں پڑھنے پئے تسخیر اکثر ہم

مومن محبوب کی جدائی کا اظہار کتنی عمدگی سے کرتے ہیں :-

وصل بتاں کے دن تو نہیں یہ کہ ہو وبال
مومن نماز قصر کریں کیوں سفر میں ہم

واعظ کی خبر سبھی نے لی ہے اور کیا کچھ کہا نہ ہے لیکن مومن

اپنی حالت سے واعظ کا تقابل کرتے ہوئے کیا خوب کہتے ہیں :-

شرم کی بات نہیں ہے یہ اثر ہو کیوں کر
نہ میں مومن ہوں نہ تو پیرِ مغاں اے واعظ

محبوب کی گلی عاشق کی نظر میں جنت سے کم نہیں اور دنیا میں کعبے سے محترم مسلمان کی نظر میں نہیں ، مومن خشنودیٔ جاناں کے لیے کوچۂ جاناں کو کعبے سے تشبیہ دے بیٹھے - محبوب اس تعریف سے مطمئن نہ ہوا بلکہ اس کی برھمی بڑھ گئی کہ اس کی گلی کا درجہ گھٹا دیا گیا ہے ، آخر مومن معذرت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میرا تعلق اسلام سے بھی رہ چکا ہے، گذشتہ تعلق مذہب کی وجہ سے کعبے کی حرمت کا خیال کرتے ہوئے میں نے تیرے کوچے کو کعبے سے تشبیہ دی تھی ، اس میں ناراضی کی کیا وجہ تھی ، اتنی طولانی داستان کو مقطع میں کس خوبی سے ادا کیا ہے :-

گر تیرے کوچے کو دی کعبے سے نسبت کیا گناہ
مومن آخر تھے کبھی اے دشمن اسلام ہم

مومن تخلص کو کس عمدگی سے استعمال کیا ہے ، اس کا اندازہ مندرجہ ذیل مقطعات سے کیا جا سکتا ہے :-

شبِ ہجراں کو سمجھا روزِ جزا
مومن ایسا سیاہ کار ہے دل

چاھتا ھوں میں تو مسجد میں رھوں مومن ولے
کیا کروں بت خانے کی جانب کھنچا جاتا ہے دل

مر چلے اب تو اس صنم سے ملیں
مومن اندیشۂ خدا کب تک

جلتا ھوں اھلِ نار کی تبدیلِ جلد سے
مومن غضب ہے آتشِ لذت فزاے داغ

مومن اس زھد ریائی سے بھی کیا بد تر ھے
اُس بتِ دشمنِ ایماں سے ھمارا اخلاص

کافر ھے کون ھم میں سے ، مومن پھرے ھے تو
کعبے کے آس پاس ، تو میں دل کے آس پاس

توڑنا مومن نہ پیمانِ الست
ھیں مسلّم عاشقی کے فن میں ھم

مومن تو مدتوں سے ھوئے پر بقول درد
دل سے نہیں گیا ھے خیالِ بتاں ھنوز

کر دیا خاک آپ کو اُس بت کے دَر پر ھائے ھائے
جل گیا جی لاش کو مومن کی جلتا دیکھ کر

مومن یہ تاب کیا کہ تقاضائے جلوہ ھو
کافر ھوا میں دین کے آداب دیکھ کر

خدا کو مان اپنی راہ لے ، کعبہ کو جا مومن
صنم خانے میں کیا لیوے گا ، اے گم گشتہ رہ رہ کر

اگرچہ مومن کی غزل غزلیت سے بھر پور ھوتی ھے اور پند و نصائح ، فلسفہ و اخلاق وغیرہ سے دامن کشاں گذر جاتے ھیں البتہ کبھی کبھی غیر ارادی طور پر دوسرے مضامین بھی بے اختیار زبان پر آ جاتے ھیں ، سیاسی رنگ آمیزی دیکھیے :—

منقوش دل خلق ھے پرھیز کی خوبی
کتنا ھی کرے ، ظلم وہ بدنام نہ ھوگا

بیٹھا رھوں کیا منتظر دور میں ساقی
اتنوں میں کوئی میکدہ آشام نہ ھوگا

خار و خس میں گلشن کے بوئے گل جو آتی تھی
رشک سے کیا برباد ، آپ آشیاں اپنا

نہ جاؤں کیونکہ سوئے دام آشیانے سے جب
خیال حسرت مرغانِ ہم قفس گذرے
خون دل پیتے ہیں خو کردۂ محنت اے کاش
ساغر دہر میں ساقی مئے بیداد بھرے
محتسب یہ ستم غریبوں پر
کبھی تنبیہِ بادشاہ نہ کی
رندوں پہ یہ بیداد خدا سے نہیں ڈرتا
اے محتسب ایسا تجھے کیا شاہ کا ڈر ہے

مومن پست ہمتی کے قائل نہ تھے، وہ عزم بلند رکھتے تھے :—

ہاں جوشِ طپش چھیڑ چلی جائے کہ "پر" تو
جھڑ جائیں گے، فرسودہ اگر دام نہ ہوگا
ہم جواں مردِ محبت بھی سمجھ لیں گے بھلا
اپنی ایذا سے تو ہاتھ اے فلکِ پیر نہ کھینچ
حوض میخانہ پیے سے مرا جی نہ بھرا
کیا تنگ ظرف ہیں جو 'خم سے' سبو بھرتے ہیں
وہ رندِ خُم کدہ کش ہوں کہ زہر دیتے ہیں
تنگ آکے حریفانِ بادہ خوار مجھے

مذہب سے مومن کو خاص لگاؤ تھا لیکن واعظ اور محتسب کو وہ بھی ناپسند کرتے، جابجا واعظ اور محتسب کا مذاق اڑایا ہے :—

ہاں تو کیوں کر نہ کرے ترکِ بتاں اے واعظ
ایسی حوریں تیری قسمت میں کہاں اے واعظ
جو ملیں تجھ سے بصد شوق وہ کیا ہونگی، نہ کر
بس مرے سامنے، حوروں کا بیاں اے واعظ

حوروں کی ثنا خوانی ، واعظ یونہیں کب مانی
لے آ کہ ہے نادانی ، باتوں میں بہل جانا

خاک میں حیف یہ شراب ملے
محتسب بادہ خوار ہونا تھا

پسِ شکستن خم ، زجر محتسب معقول
گناہ گار نے سمجھا ، گناہ گار مجھے

لیکن واعظ اور محتسب پر لے دے کرتے ہوئے بھی وہ ایک مومن اور مجاہد بنتے ہیں اور مقطع میں اپنے تخلص سے خاص فائدہ اٹھاتے ہیں - سید احمد شہید کا بھی غزلوں میں کہیں کہیں حوالہ دے جاتے ہیں :-

چاہتا ہوں میں تو مسجد میں رہوں مومن ولے
کیا کروں بتخانے کی طرف کھنچا جاتا ہے دل

توڑنا مومن نہ پیمانِ الست
ہیں مسلّم عاشقی کے فن میں ہم

شوخی ادا اور نزاکت خیال مومن کے کلام کی روح ہے ، داغ نے اس رنگ سے فائدہ اٹھا کر شہرت عام حاصل کی :-

تارے آنکھیں جھپک رہے تھے
تھا بام پہ کون جلوہ گر رات

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

چارۂ دل سوائے صبر نہیں
سو تمہارے سوا نہیں ہوتا

بوئے سمن سے شاد تھے اغیار بے تمیز
اس گل کو اعتبار نسیم و صبا گیا

کیا رشک غیر تھا کہ تحمل نہ ہو سکا
میں جان کر حریفِ تغافل نہ ہو سکا

فارسی تراکیب کثرت سے استعمال کی ہیں اور ان میں جدت پائی جاتی ہے مثلاً :—

آڑتے ہی رنگِ رخ مرا ، نظروں سے تھا نہاں
اس مرغِ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا
دشنامِ یارِ طبعِ حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا
ہر چند اضطراب میں ، میں نے کمی نہ کی
تو بھی وہاں تغافل بسیار کم ہوا
طوطیاں سیکھیں ، کہاں سے نالۂ رشک آفریں
ہو نہ زیبِ پشت آئینہ تری تصویر سے
جلانے سے بھی تیرے شاکر ہوں میں
گلہ نالۂ آتش افگن سے ہے
آہِ فلک فگن ، تیرے غم سے کہاں نہیں
جو فتنہ خیز اب ہے زمیں آسماں نہیں
سوجھے کیوں کر فریب دل داری
دشمن آشنا نما ہے عشق
اے ستم پیشۂ مرے بعد کہاں نشۂ عشق
دیکھ خمیازۂ حسرت ہے یہ شمشیر نہ کھینچ
اشکِ واژونہ اثر ، باعثِ صد جوش ہوا
ہچکیوں سے میں یہ سمجھا کہ فراموش ہوا
پروردۂ وفا سے کب ترک عاشقی
کیا ناز تھے کہ مجھ سے تحمل نہ ہو سکا

دردِ بے درماں مرا منت کشِ مرہم نہیں
داغ نو ہے چارۂ داغِ کہن کی فکر میں

جنبشِ نرگسِ جنت نے ، رلایا مومن
چشمِ کافر کے اشارے ہیں نظر میں پھرتے

رو رہا ہوں خندہ دنداں نما کی یاد میں
آبِ دریا کے لیے آنکھوں سے دریا جائے ہے

امیدِ سرمہ میں تکتے ہیں راہ ، دیدۂ زخم
شمیم سلسلۂ مشک سا کے آنے کی

یا رب کوئی معشوقۂ دل جو نہ ملے اب
جو ان کی دعا ہے وہی اپنی بھی دعا ہے

چشمک مری وحشت پہ ہے کیا حضرتِ ناصح
طرز نگہِ چشم فسوں ساز ، تو دیکھو

جنت میں بھی مومن نہ ملا ، ہائے بتوں سے
جورِ اجلِ تفرقہ پرداز تو دیکھو

کیوں کر نہ آدھی آدھی رات جاگے ، وہ جس کا دھیان ہو
آہوئے نیم خواب میں ، نرگس نیم باز میں

رخنہ در سے غیر پاس ، دیکھا کسے کہ آج ہے
رخنہ گری کچھ اور ہی ، نالۂ رخنہ ساز میں

مومن عشق پردہ نشین کے قائل تھے - اگرچہ امۃالفاطمہ ایک طوائف تھی لیکن وہ بھی دہلی آئی تو پردہ نشیں کی حیثیت سے اس لیے مومن کے اشعار میں پردہ نشین کو بار بار خطاب کیا گیا ہے :—

اہل ماتم اپنے روئیں کس طرح منہ ڈھانک کر
مرتے مرتے پاس اس پردہ نشیں کا تھا ہمیں

کیا پڑی رہتی ہے اے پردہ نشیں جوں بیار
بد دعائیں تری چلون کو جو ہم دیتے ہیں

بسکہ پردہ نشیں پہ مرتے ہیں
موت سے آئے ہے حجاب ہمیں

اے پردہ نشیں نہ چھپ کہ تجھ سے
پھر دل بھی یونہی چھپائیں گے ہم

وحشت ہے عشقِ پردہ نشیں میں دم بکا
منہ ڈھانکتے ہیں پردۂ چشمِ پری سے ہم

چاک سرا پردہ سے، جھانکے تھے وہ ایک دن
سجدۂ محراب در، شغل جبیں ہے ہنوز

مر بھی گئے جدائی میں پردہ نشیں کی پر
آیا نہیں زبان پہ درد نہاں ہنوز

اس کے ہٹتے ہی اندھیرا آگیا ایسا کہ بس
گر پڑا میں روزنِ دیوار کو وا دیکھ کر

اے مہروش، یہ حسن نو ہرگز نہ چھپ سکے
چلون تو کیا ہے پردے کا بھی چھوڑنا عبث

اے پردہ نشیں، چلون اٹھا دے کہ نہ جل جائے
کرتا ہوں میں سوز غم پنہاں کی شکایت

پھرتے ہیں کیسے پردہ نشینوں سے منہ چھپائے
رسوا ہوئے کہ اب غم پنہاں نہیں رہا

نیم جلوہ کو بھی وہ گنتے ہیں اب بے پردگی
جسم کاہیدہ یہ کس کا صرف چلمن ہو گیا

دیکھیں گے مومن یہ ہم ایمان بالغیب آپ کا
اس بتِ پردہ نشیں نے، جلوہ گر دکھلا دیا

چلون کے بدلے مجھکو زمیں پر گرا دیا
اُس شوخ بے حجاب نے پردہ اُٹھا دیا
تیرے پردہ نے کی، یہ پردہ دری
تیرے چھپنے سے کچھ چھپا نہ رہا
بسکہ اک پردہ نشیں سے دل بیمار لگا
جو مریضوں سے چھپاتے ہیں وہ آزار لگا
موت کے صدقے کہ وہ بے پردہ آئے لاش پر
جو نہ دیکھا تھا تماشا عمر بھر ، دکھلا دیا

اسی ذیل میں اپنی بیتی سناتے ہیں، غالباً محبوبۂ دویمیں سے اس شعر میں خطاب کیا ہے:—

ہٹ گیا ہوگا دوپٹہ منہ سے سوتے میں کہیں
شب یہاں رہنے کا تیرے، سب میں چرچا ہوگیا

معاملہ بندی اور محاکات میں مومن مقام امتیاز رکھتے ہیں، اسی رنگ میں وہ اور جرأت مشترک نظر آتے ہیں، چند اشعار قابل دید ہیں:—

سوزشِ دل سے ہوا کیا ہی میں پانی پانی
وہ جو پہلو سے پسینے میں نہا کے اُٹھے
وہ بگڑنا وصل کی رات کا، وہ نہ ماننا کسی بات کا
وہ نہیں نہیں کی ہر آن ادا، تمھیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
اپنی آواز قدم سے بھی وہ ڈر کر رات کو
مڑ کے پیچھے دیکھ لیتا، ہر قدم پر رات کو
دم قدم سے ہے لگا، جان نکل جائے گی
دیکھو سینے سے مرے، پاؤں اُٹھاتے ہو کیوں

نیند میں یا رب دوپٹہ کس کے منہ سے ہٹ گیا
ہے زمیں سے روشنی افلاک نور افشان تلک
دشمنی دیکھو کہ تا الفت نہ آ جائے کہیں
لے لیا منہ پر دوپٹہ ، حال میرا دیکھ کر
میرا گلا ، ہنسی سے نہیں گھونٹتے تھے وہ
کیا سوچ کر ، رقیب خوش آیا ، خفا گیا
چپکے سے ترے ملنے کا گھر والوں میں تیرے
اس واسطے چرچا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا
زلفیں اٹھاؤ رخ سے کہ دل کی جلن مٹے
بجھ جائے ہے جہان میں ، وقت سحر چراغ

مومن کا یار ہر جائی ہے اس لیے رشک عدو تو ہونا ہی تھا ، خود کہتے ہیں :—

میرے گھر بھی چلتے پھرتے ایک دن آ جائے گا
دو مبارک باد اب کے یار ہر جائی ملا
مجھ سے مل ورنہ رقیبوں سے میں سب کہ دونگا
دشمنی اب کی تری ، اور وہ پہلا اخلاص
ساتھ سونا غیر کے چھوڑ اب سیمیں بدن
خاک میری ہو گئی ، نایاب تر اکسیر سے
دیکھ دشمن اٹھ گیا بے دید
میرے احوال پر نگاہ نہ کی
شب وصل عدو کیا کیا جلا ہوں
حقیقت کھل گئی روز جزا کی
ملے دشمن سے کیوں کر بے حجاب آپ
نہ شرم آئی مرے شوق نہاں سے

کبھوں گر غیر سے مت مل تو کبھو بے طعن سے رک کر
یہ کیوں کس واسطے، ہم ایسے تیرے ہوگئے بس میں

کبھی مومن کی غیرت عدو کو پسند نہیں کرتی تو وہ محبوب کو دھمکی دیتے ہیں اور ایسے مقام پر محبوب سے مساویانہ سلوک کے متقاضی نظر آتے ہیں - یہ حقیقت ہے کہ مومن رشکِ عدو کے قائل نہ تھے اس لیے اپنی زندگی میں اُنھوں نے بار بار عشق کیا اور چھوڑا :-

گر نہیں ملتے ، ملوں گا اور سے
کیوں مجھے کیا پاس رسوائی نہیں
مدعا یہ ہے کہ غیرت سے میں سم کھا جاؤں
اس لیے غیر کو وہ اپنی قسم دیتے ہیں

چنانچہ ایک پوری غزل بطرز واسوخت کہی ہے :

اب اور سے لو لگائیں گے ہم
جوں شمع تجھے جلائیں گے ہم
بگڑے تو کریں گے اور سے صلح
تجھ پر بھی بری بنائیں گے ہم
دل دے کے اک اور لالہ رو کو
ہر داغ پہ داغ کھائیں گے ہم
گر تیری طرف کو بے قراری
کھینچے گی تو لوٹ جائیں گے ہم
پھر تیری ہوا کا دم بھرا تو
جی ہی کو ہوا بتائیں گے ہم
بت خانہ چیں ہو گر تیرا گھر
مومن ہیں تو پھر نہ آئیں گے ہم

مومن کے بعض سوانح نگار

مرزا وجیه دہلوی نے امروز کے سنڈے ایڈیشن (جنوری ۱۹۵۳ء) میں مومن کی نجی زندگی کے کچھ حالات لکھے ہیں جس میں بےشمار غلطیاں ہیں؛ حکیم نامدار خاں کو مومن کا چچا لکھا ہے جو دادا تھے، حکیم غلام علی صاحب کو مومن کا چچا ظاہر کیا ہے، غلام علی نام کے کوئی چچا نہ تھے البتہ غلام حسن نامی چچا گذرے ہیں۔ بچپن سے عاشق مزاج اور متقی بتایا ہے یہ تضاد قابلِ غور ہے، استغنا کے ذیل میں دو حکایتیں نقل کی ہیں۔ نواب یوسف علی خاں والیٔ رام پور کا دہلی جانا اور قلعہ معلیٰ میں بزم شعر و سخن کا منعقد ہونا، یوسف علی خاں کا بہادر شاہ ظفر سے استدعائے شاگردیٔ مومن کرنا اور دوسرے دن قلعے میں بزم مشاعرہ منعقد ہونا اور مومن کا نہ آنا اور شاگردوں کے اصرار پر کہنا کہ کسی پوربیے کو اُردو زبان نہیں آ سکتی اور آخر یوسف علی خاں کا شاگرد غالب ہو جانا، یہ روایت سرتاپا غلط ہے۔ اول تو یوسف علی خاں کی نسبت انتخاب یادگار میں ہے کہ وہ پہلے مومن کے شاگرد تھے اور پھر غالب کے سلسلے میں داخل ہوئے، یہ بیان نواب کلب علی خاں خلف نواب یوسف علی خاں کا مصدقہ ہے۔ پھر یوسف علی خاں دہلی میں مدتوں مقیم رہے اور اُن کے چچا زاد بھائی عباس علی خاں بےتاب اصغر علی خاں اصغر اور عنایت علی خاں عنایت مومن کے شاگرد تھے اور مومن سے خصوصی تعلقات یوسف علی خاں کے تھے؛ چنانچہ ولی عہد کے ایام میں جب وہ دہلی پہنچے تو مومن نے مدحیہ قطعہ لکھا (مشمولہ دیوان فارسی)، پھر جب ۱۲۷۲ء میں یوسف علی خاں نواب رام پور ہوئے، اُس سے چار سال پہلے مومن دنیائے فانی کو خیرباد کہ چکے تھے۔

دوسری حکایت میں کسی رئیس کے یہاں ایک لکھنوی رئیس کا آنا اور مومن سے ملاقات کی تمنا کا اظہار کرنا، رئیس کا مومن کو بازار میں سے بلانا اور ملاقات کرانا وغیرہ، اس حکایت میں مومن کا جو حلیہ درج ہے، وہ

مرزا فرحت اللہ بیگ کے مندرجہ حلیہ سے نہیں ملتا اس لیے صحیح نہیں ہو سکتی ۔ اس میں مومن کے دو نواسوں کا بھی بیان ہے جو صحیح نہیں ، دو پوتے صحیح ہیں۔ عبدالرحمٰن آہی کو برادر نسبتی لکھنا درست نہیں، وہ متبنیٰ بھی تھے اور بھانج داماد بھی ۔ مرزا وجیہ صاحب اگر تحقیق کر کے حالات لکھتے تو مناسب تھا ۔

حیاتِ مومن اور اس کا مقام

محمد مومن خاں مومن کے حالات زندگی ترتیب دیتے وقت نوے سے زائد ماخذ ہمارے پیشِ نظر ہیں ، ان میں دس ایسے ماخذ ہیں جو مومن کی حیات میں مرتب ہو چکے تھے ، باقی ماخذ بعد میں مرتب ہوئے لیکن حیات مومن کے سلسلے میں ہمارے بعد کے تذکرہ نویسوں نے ''آب حیات'' کو ماخذ ٹھہرایا اور سابقہ معاصرانہ شہادتوں کو نظر انداز کر کے مومن کی زندگی کو تاریکی میں پہنچا دیا ۔ آزاد مرحوم نے مومن کے حالات زندگی خود شامل نہیں کیے، آبِ حیات کے اول ایڈیشن میں مومن بار نہ پا سکے تھے، تذکرہ آبِ حیات کی اشاعت پر لوگوں نے آزاد کے اس رویّے پر تنقید کی۔ جب ''آبِ حیات'' کا دوسرا ایڈیشن نکلا تو آزاد مرحوم نے عبدالکریم کے مرسلہ حالاتِ مومن بجنسہ شاملِ کتاب کر دیے ۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں جب آزاد اس خاکے میں رنگ آمیزی کرنے پر تیار نہ تھے ، مومن کی شخصیت کس طرح نمایاں ہوتی ۔

گلشن بے خار (فارسی) پہلا تذکرہ ہے جس میں شیفتہ نے مومن کی شخصیت کو اجاگر کیا لیکن شاگرد کی تعریف طرف داری پر محمول کی گئی اور یہ سلسلہ آگے نہ چلا ۔ آثارالصنادید میں سر سید احمد خاں نے بھی مدح اور ستائش سے کام لیا لیکن کلام سے بے نیاز ہو کر کوئی بھی تبصرہ شاعر کو زندۂ جاوید نہیں بنا سکتا ۔ مومن نمبر نگار ۱۹۲۸ء مولانا نیاز محمد خاں فتح پوری کی اولین کوشش ہے جس میں مومن کا مقام شاعری متعیّن کیا گیا ہے ، پروفیسر ضیاء احمد بدایونی کی مساعی بھی کچھ کم نہیں ۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ مومن کے حالات خود مومن کے اردو اور فارسی کلام سے

ترتیب دیے جائیں ، انشائے مومن (فارسی) سے زندگی کے بہت سے گوشے بے نقاب ہو جاتے ہیں اس طرح مومن کے مستند حالات پہلی بار پیش کیے جا رہے ہیں۔ اس کی روشنی میں مومن کے کلام کا مطالعہ صحیح نتائج برآمد کرنے میں رہبری کرے گا اور مومن کا غالب سے موازنہ کرنے والوں کے لیے آسانی ہو جائے گی ۔

جن کتابوں سے فائدہ اٹھایا ہے اُن کی فہرست آخر میں شامل کر دی گئی ہے ۔ ڈاکٹر وحید قریشی کا خاص طور پر شکر گذار ہوں کہ اُن کے کتاب خانے سے وقتاً فوقتاً مدد ملتی رہی اور اُن کے مشورے سے یہ کتاب موجودہ صورت میں پیش کی جا رہی ہے ۔

ماخذ

۱ آبِ حیات ۔ مولانا محمد حسین آزاد ۱۸۸۰ء ۔

۲ گلدستۂ نازنیناں ۔ مولوی کریم الدین پانی پتی ۱۸۴۴ء ۔

۳ طبقات شعرائے ہند ۔ مولوی کریم الدین پانی پتی ۱۸۴۷ء ۔

۴ روز نامچہ ۔ مولوی عبدالقادر رامپوری ۱۲۴۷ھ مطابق ۱۹۸۳ء ۔

۵ تاریخ ادب اُردو ۔ (مصنف رام بابو سکسینہ ۔ مترجم محمد عسکری) ۔

۶ گلستانِ سخن ۔ مرزا قادر بخش صابر ۱۲۶۹ھ ۔

۷ آثار الصنادید ۔ سر سید احمد خاں ۱۸۴۷ء ۔

۸ شمعِ انجمن ۔ نواب سید صدیق حسن خاں ۱۲۹۳ھ ۔

۹ طورِ کلیم ۔ نواب سید نور الحسن خاں ۱۲۹۸ھ ۔

۱۰ بزمِ سخن ۔ نواب سید علی حسن خاں ۱۲۹۸ھ ۔

۱۱ گلشنِ بیخار ۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ۱۲۵۰ھ ۔

۱۲ گلِ رعنا ۔ مولوی سید عبدالحی ۱۳۴۰ھ ۔

۱۳ سخن شعرأ ۔ مولوی عبدالغفور خاں نساخ ۱۲۸۱ھ ۔

۱۴ قاموس المشاہیر ۔ مولانا احید الدین نظامی ۱۹۲۸ء ۔

۱۵ یادگار شعرأ ۔ (ترجمہ فہرست اشپرنگر ، محمد طفیل) ۔

۱۶ گلستان ہمیشہ بہار ۔ مولوی نصراللہ خاں قمر ۱۲۷۱ھ ۔

۱۷ تذکرۃ الشعرا ۔ از سید فضل الحسن حسرت موہانی (رسالہ اُردو معلیٰ) ۔

۱۸ یادگار غالب ۔ مولانا الطاف حسین حالی ۔

۱۹ سیرت احمد شہید ، غلام رسول مہر ۔

۲۰ تاریخِ ادب ۔ از ڈاکٹر محی الدین زور ۔

۲۱ آردو ادب کی تاریخ ۔ نسیم قریشی ۔
۲۲ تاریخ ادب آردو ۔ ڈاکٹر موہن سنگھ (انگریزی) ۔
۲۳ اعجاز سخن ۔ سرخوش ۔
۲۴ کاشف الحقائق ۔ نواب امداد امام اثر (طبع دوم) ۔
۲۵ بہادر شاہ ظفر ۔ رئیس احمد جعفری ۔
۲۶ حیات مومن ۔ ضمیر الدّین عرش گیاوی ۔
۲۷ تاریخ نظم و نثر آردو ۔ آغا محمد باقر ۔
۲۸ دلی کا دبستانِ شاعری ۔ ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی ۔
۲۹ نغمہ عندلیب ۔ قطب الدّین باطن (طبع نولکشور لکھنؤ ۱۸۷۵ء) ۔
۳۰ گلستان بے خزاں ۔ امام الدّین طالب ۔
۳۱ جلوۂ خضر ۔ صغیر بلگرامی ۔
۳۲ تذکرہ شعرائے رامپور ۔ صاحب رامپوری (مخطوطہ رضا لائبریری رامپور) ۔
۳۳ نگار مومن نمبر ۱۹۲۸ء نیاز فتح پوری ۔
۳۴ نگار مصحفی نمبر ۱۹۳۹ء نیاز فتح پوری ۔
۳۵ تذکرہ کاملان رام پور ۔ حافظ احمد علی خاں شوق ۱۹۲۹ء ۔
۳۶ رسالہ معاصر حصہ اول ۔ مرتبہ قاضی عبدالودود ۔
۳۷ ادب آردو ۔ جنوری و جولائی ۱۹۵۱ء } مرتبہ آل احمد سرور ۔
ادب آردو ۔ جنوری تا مارچ ۱۹۵۲ء
۳۸ آثار الشعرا ۔ (ممتاز بھوپالی) ۔
۳۹ داستان غدر ۔ سید ظہیر الدین حسن ظہیر دہلوی ۔
۴۰ مجموعۂ نغز ۔ از حکیم قدرت اللہ قاسم ۔
۴۱ ریاض الفصحا ۔ غلام ہمدانی مصحفی ۔
۴۲ عقد ثریا ۔ غلام ہمدانی مصحفی ۔
۴۳ تذکرۂ ہندی ۔ غلام ہمدانی مصحفی ۔

۴۴ حدائق الحنفیہ ۔ مولوی فقیر محمد جہلمی ۔
۴۵ یادگارِ ضیغم ۔ عبداللہ خاں ضیغم ۔
۴۶ آئینہ داغ ۔ نثار علی شہرت ۔
۴۷ سوانح امیر مینائی ۔ فصاحت جنگ جلیل ۔
۴۸ تذکرۂ مسرت افزا ۔ امراللہ الہ آبادی ۔
۴۹ دریائے فصاحت ۔ انشا و قتیل مطبع آفتاب عالم تاب مرشد آباد ۱۲۶۶ھ ۔
۵۰ وقائع عالم شاہی ، فراق ۔ مرتب امتیاز علی خاں عرشی ۔
۵۱ ذکر میر ۔ محمد تقی میر ۔
۵۲ طبقات الشعرا ۔ قدرت اللہ شوق رام پوری ۔ خلاصہ از ڈاکٹر ابواللیث ۔
۵۳ لکھنؤ کا دبستان شاعری ۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی (طبع اول) ۔
۵۴ غنچۂ ارم ۔ مولوی محمد علی نجف ، نجف رام پوری ۔
۵۵ مجمع الانتخاب ۔ شاہ کمال الدّین حسین کمال ۔ مخطوطہ ناقص ، انجمن ترقی اردو ہند ۔
۵۶ داغ نمبر رسالہ نگار ۵۳ء و جون ۵۳ء ۔
۵۷ تاریخِ عبرت افزا ۔ مرزا علی رضا محزوں (مترجم) ۔
۵۸ مجمع السلاطین ۔ از نواب غوث محمد خاں والی جاورہ (مطبوعہ بمبئی ۱۲۷۲ھ) ۔
۵۹ عود ہندی ۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب ۔
۶۰ رقعات مرزا قتیل ۔ مطبع سلطانی لکھنؤ ۔
۶۱ تاریخِ لطیف ۔ مہدی علی خاں ممتاز مخطوطہ رضا لائبریری رام پور ۔
۶۲ تاریخِ بدیع جلد اول ۔ امیر اللہ تسلیم لکھنوی مطبوعہ ۔
۶۳ جلوۂ داغ ۔ احسن مارہروی ۔
۶۴ رسالہ آج کل ۔ غالب نمبر ۱۹۵۳ء ۔

٦٥ کمپنی کی حکومت ۔ باری ۔
٦٦ مختصر تاریخ اسلام ۔ ذاکر حسین جعفر رمزی ۔
٦٧ خمخانہ جاوید جلد ۱ تا ۴ ۔ لالہ سری رام ۔
٦٨ سیر کریمی ۔ نواب کریم اللہ صاحب ثروت ۔ مخطوطہ صولت پبلک لائبریری رام پور ۔
٦٩ انتخاب یادگار ۔ مفتی امیر احمد امیر مینائی ۔ ۱۲۹۰ھ
٧٠ کلیات مصحفی ۔ غلام ہمدانی مصحفی ۔ مخطوطہ کتب خانہ پنجاب یونیورسٹی ۔
٧١ کلیاتِ منیر ۔ سید اسماعیل حسن منیر شکوہ آبادی
٧٢ دیوانِ شیفتہ ۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ۔ مخطوطہ رضا لائبریری رام پور ۔
٧٣ دیوانِ اصغر و عاقل ۔ اصغر علی خاں وغیرہ ۔ نظامی پریس بدایوں ۔
٧۴ دیوانِ بیتاب ۔ عباس علی خاں ۔ مطبوعہ رضا لائبریری رام پور ۔
٧٥ دیوانِ عنایت ۔ عنایت علی خاں ۔ مخطوطہ مسودات مصنف رضا لائبریری رام پور ۔
٧٦ دیوانِ شیخ علی بیمار ۔ مخطوطہ رضا لائبریری رام پور ۔
٧٧ دیوانِ تسکین ۔ میر حسین تسکین ۔ مخطوطہ رضا لائبریری رام پور ۔
٧٨ دیوانِ مومن ۔ ۱۸۴٦ء ، رضا لائبریری رام پور ۔
٧٩ دیوانِ مومن ۔ ۱۸۵۵ء انڈین پنچ ، رضا لائبریری رام پور ۔
٨٠ دیوانِ مومن ۔ مطبوعہ نولکشور پریس طبع اول تا ششم ۴۳ء ۔
٨١ دیوانِ مومن ۔ مرتبہ ضیاء احمد صاحب ، شانتی پریس الہ آباد ۔
٨٢ دیوانِ مومن ۔ محبس پریس دہلی (میونسپل لائبریری گوجرانوالا) ۔
٨٣ دیوانِ مومن ۔ مخطوطہ قبل از ۱۳۵۰ھ ۔ رضا لائبریری رام پور ۔
مکتوبہ ۳ رجب ۱۲۵۳ھ بمقام راٹھ ضلع بندیل کھنڈ ، کتاب خانہ ریاست رام پور ، اخبار الصنادید جلد اول صفحہ ٦٦٧ ۔

۸۴ دیوانِ مومن - مخطوطہ رضا لائبریری رام پور -
۸۵ دیوانِ مومن- (فارسی)مکتوبہ آھی، مخطوطہ ۱۲۸۹ھ، رضالائبریری رامپور-
۸۶ انشائے مومن (فارسی) مکتوبہ آھی ، مخطوطہ ۱۲۸۹ھ ، رضا لائبریری رام پور -
۸۷ انشائے مومن (فارسی) مطبوعہ مطبع سلطانی ، مملوکہ کتب خانہ پنجاب یونیورسٹی -
۸۸ دیوانِ مومن (اردو) مکتوبہ آھی ۱۲۸۹ھ - مخطوطہ رضا لائبریری رام پور -
۸۹ رسالہ اردوئے معلیٰ جلد ۸ نمبر ۱ جنوری ۱۹۲۷ء حسرت موہانی -
۹۰ کلیات شیفتہ و حسرتی مرتبہ مولانا نظامی - نظامی پریس بدایوں -
۹۱ رسالہ نئی تحریریں (حلقہ اربابِ ذوق دسمبر ۵۶ء) -
۹۲ رسالہ صحیفہ - مدیر اعزازی سید عابد علی عابد ، جون ۵۸ء -
۹۳ اردو شاعری پر ایک نظر - کلیم الدّین احمد (دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۲ء اردو مرکز پٹنہ) -
۹۴ کلیات اردو قلق - (مطبع انصاری دھلی ۱۲۹۷ھ) -
۹۵ بہارستان ناز - حکیم فصیح الدّین رنج (طبع دوم ، مطبع عثمانی میرٹھ) -
۹۶ کلیات مومن - مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی -
۹۷ انتخابِ مومن - سید وقار عظیم -
۹۸ مومن کا عشق - مقالہ ڈاکٹر عبادت بریلوی - مطبوعہ اخبار امروز لاھور -
۹۹ شرحِ قصائدِ مومن - ضیاء احمد بدایونی -
۱۰۰ تبصرہ کلیاتِ مومن - مولوی محمد زکریا مائل - مطبوعہ قومی زبان کراچی ، یکم اگست ۱۹۶۰ء -
۱۰۱ مراۃ الشعراء - محمد یحییٰ تنہا -
۱۰۲ آئینۂ داغ - نثار علی شہرت -

۱۰۳ جلوۂ داغ - احسن مارہروی -
۱۰۴ تذکرۂ شعرائے متغزلین شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی -
۱۰۵ کمالِ داغ - حامد حسن قادری -
۱۰۶ امیر مینائی - ممتاز علی آہ -
۱۰۷ مومن و غالب معجزِ سہسوانی کی نظر میں - آفاق احمد - ادیب علی گڑھ، مئی ۱۹۶۰ء -
۱۰۸ تنقیدات - نیاز فتح پوری -
۱۰۹ مکتوباتِ نیاز - (ہرسہ جلد) نیاز فتح پوری -
۱۱۰ جلوۂ صحیفۂ زریں - نیّر رخشاں ۱۹۱۵ء -
۱۱۱ ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علماء - انتظام اللہ شہابی -
۱۱۲ داستان تاریخ اردو - حامد حسن قادری (طبع ثانی) -
احوال غالب - مختارالدین آرزو - ۱۹۵۳ - انجمن ترقی اردو ہند - علیگڑھ ۶۵

فہرست غزلیات مومن ردیف وار

ردیف الف

ردیف الباء

ردیف الباء فارسی

ردیف التاء

ردیف العین

ردیف الغین

ردیف الفاء

ردیف القاف

ردیف الکاف

ردیف الکاف فارسی

ردیف اللام

ردیف المیم

ردیف النون

ردیف الواؤ

فردیات ۶۰ شعر ایک مصرع = ۲۶۳۷ + متفرقات معمے (۱۰) + قطعات ۲۶ + ۴۲ + ۸۰ + ۳۶ = ۲۸۳۱

۲۸۳۱ + ۲۱ = ۲۸۵۲ + ۱۹ = ۲۸۷۱ + ۱۸ = ۲۸۸۹ + ۱۸ = ۲۹۰۷ + ۵ = ۲۹۱۲

+ رباعیات ۱۳۱ + مثلث بر غزل عرفی گریستن ۹ مصرع

۲۶۲ + ۲۹۱۲ = ۳۱۷۴

۵ شعر = ۳۱۷۹ + تخمیس غزل حافظ عتابے دارد ۹ بند (۲۷ مصرع / ۱۳½ شعر) = ۳۱۹۲ + ایضاً حافظ هوشیار انند ۱۰ بند (۳۰ مصرع / ۱۵) = ۳۲۰۷ + ایضاً حافظ انجمن باشد ۷ بند (۲۱ مصرع / ۱۰½) = ۳۲۱۸ + تضمین مصرع حافظ خواب این نرگس فغاں تو بے چیزے نیست ۱۰ بند ۲۰ شعر = ۳۲۳۸ + تخمیس غزل نظیری یاد من است ۶ بند (۱۸ مصرع / ۹ شعر) = ۳۲۴۷ + (تضمین مصرع وحشی رفتم / ۱۲ بند ۲۴ شعر) = ۳۲۷۱ + مخمس بر غزل میلی سخن کنند ۔ ۶ بند (۱۸ / ۹) = ۳۲۸۰ + (۷ بند غزل میلی برد / ۲۱ = ۱۰½) = ۳۲۹۰ + ایضاً بیشتر ۷ بند (۲۱ / ۱۰½) = ۳۳۰۱ + تخمیس کایم از من ۷ بند (۲۱ / ۱۰½ شعر) = ۳۳۱۱ + شیفته ۹ بند (۲۷ / ۱۳½) = ۳۳۲۵ + تضمین درد قدس ۱۱ بند ۲۲ شعر = ۳۳۴۷ + صبح دید ۱۰ بند ۲۰ شعر = ۳۳۶۷ + تخمیس قدسی ۹ بند (۲۱ / ۱۰½) = ۳۳۷۷ + تضمین شعر منشی فضل عظیم ۹ بند ۱۸ شعر = ۳۳۹۵ + مسدس به مضمون و اسوخت ۳۰ بند ۹۰ شعر = ۳۴۸۵ + ایضاً ۴۰ بند ۱۲۰ شعر = ۳۶۰۵ + مثمن وا سوز ۳۰ بند ۱۲۰ شعر = ۳۷۲۵ + ترجیع بند ، آں شوخ چناں ربود از من ۱۴ بند ۱۴۰ شعر = ۳۸۶۵ + ترکیب بند به مضمون مرثیه معشوقه ۱۲ بند ۱۳۳ شعر = ۳۹۹۷ ۔

مثنویات (۱) شکایت ستم اشعار ۱۶۲ + ۴۴۳ = ۶۰۵ ۔ (۲) قصۂ غم ۵۳۵ (۳) قول غمیں ۵۵۵ ۔ (۴) تف آتشیں ۳۵۶ ۔ (۵) حزین مغموم ۵۴۰ ۔ (۶) آه و زاری مظلوم ۵۶۵ ۔ (۷) نامه مومن منظوم مثنوی ۹۴ ۔ نامه با سوز و گداز ۳۲ مثنوی ناتمام ۱۱۵ ۔ (۸) مثنوی نا تمام ۱۹۲ ۔ (۹) مثنوی جهادیه ۴۰ ۔ (—) اشعار مثنویات ۳۵۸۴ + ۳۳۹۷ = ۷۵۸۱ + قصائد (۷۰) ۲ (۹۷) ۳ (۱۲۶) ۴ (۷۵) ۵ (۱۲۰) ۶ (۵۹) ۷ (۷۱) ۸ (۱۴۰) ۹ (۱۰۷) = تعداد ۸۷۰ = ۸۴۵۱ ۔

مومن

حالاتِ زندگی اور ان کے کلام پر تنقیدی نظر

از

کلب علی خاں فائق رام پوری

مجلسِ ترقیٔ ادب، ۲۔ نرسنگھ داس گارڈن۔ کلب روڈ۔ لاہور